جگدیش نورؔ
لکیروں کی دیوار
ناول

جگدیش نورؔ

لکیروں کی دیوار

ناول

Noor, Jagdish:
LAKEERON KI DEEWAR
(Novel)
Star New Delhi, 1996.
Rs. 300/-.

ISBN 81-86264-57-4.

ناشر: سٹار پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ
آصف علی روڈ۔ نئی دھلی ۱۱۰۰۰۲

ایڈیشن : 1996
قیمت Rs. 300-00.

پیش لفظ

ایک داستان جس کا مرکزی کردار عہد طفلی سے لے کر بستر مرگ تک تصور کے ہنڈولے میں جھولتا رہا۔ زندگی بھر اس نے دنیاوی جدو جہد سے موہنہ نہ موڑا، مگر قیاس کا دامن بھی نہ چھوڑا۔

پھر خواب اور حقیقت کا فرق یوں ختم ہوا کہ دونوں صورتیں ایک ساتھ نظر آنے لگیں۔ بہت سے عالم فلسفۂ زندگی بیان کر گئے لیکن عقدۂ زندگی عقدہ ہی رہے گا۔ جگدیش نور کا —— یہ ناول اسی عقدہ کی پرتیں کھولتا ہے، جس کا نیا انداز پڑھنے والوں کے دلوں کو آگہی کے ایک نئے سرور سے سرشار کرے گا۔

پبلشر

گورکھ ناتھ بستر مرگ پر پڑا مسکرا رہا ہے۔ اس کا سر تکیے پر نہیں، محبوب کی آغوش میں ساکن ہے۔ ذہن کے تاروں پر خیالات کی ترنگیں نغمے گنگنا رہی ہیں۔ ابھی ابھی اس کی آنکھ لگی ہے۔ ہر طرف ایک سکوت طاری ہے۔ ایک روشنی جھلملا رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس روشنی کی جانب بڑھے' اس سے پہلے کہ تصور میں جھلملاتے نئے نئے دریچے وا ہو کر اسے اپنے دامن میں سمیٹ لیں' وہ وقت کی رہ گذر پر ایک نظر پیچھے مڑکر دیکھنے لگا۔ مبہم سے جانے پہچانے چہرے اور نقوش' دور سے کھسکتے کھسکتے قریب ہو چلے۔ یکایک گورکھ ناتھ کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ از سر نو ان پرانی پرچھائیوں میں کھو گیا۔ تخیل کی اڑان وقت کی کتاب کے اوراق پلٹتی اسے عہد گذشتہ کی جانب لے چلی۔ کب اس نے ہوش سنبھالا' وہ کون سا پہلا منظر تھا جس نے اسے متاثر کیا' کون سا پہلا واقعہ تھا جس نے اس کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ تیزی کے ساتھ نقوش واضح ہونے لگے' جیسے وقت کا یک طرفہ ریلا آگے امڈنے کی بجائے پیچھے کی طرف بہہ چلا ہو' جیسے وہ ابھی ابھی پیدا ہوا ہو اور ابھی ابھی اس نے ہوش سنبھالا ہو۔

گورکھ ناتھ کی یادوں کے دھندلکے سے ابھرا انبالہ شہر' شہر کے ایک گوشے کی تنگ گلی' ایک تین منزلہ قدیم اور وسیع مکان جہاں اس کے بچپن نے آنکھ کھولی۔ اس مکان کے سامنے' دائیں اور بائیں طرف قطار در قطار' بے ترتیب چھوٹے اور بڑے مکان جن کے درمیان محلے کی تنگ گلی' جیسے سانس لینے کے لئے رکتی ہوئی' ایک جانب کچھ دور بڑھ کر تیسری گلی سے جا ملتی اور دوسری جانب بڑھ کر بل کھاتی ہوئی تنگ گلیوں میں لاپتہ ہو جاتی۔ گلی میں داخل ہوتے ہی ایک پرانا شو مندر' جس کے آنگن میں کنواں' اور کنویں کے پاس ہی میونسپلٹی کا نل' جس میں صبح اور شام کو مقررہ وقت پر کچھ دیر کے لئے ہی پانی آتا تھا۔ کنویں سے پانی نکالنے کی مشقت سے بچنے کے لئے محلے کے لوگ صبح اور شام کو لائن لگا کر بالٹیاں اور مٹکے سنبھالے' پانی سپلائی ہونے کے وقت سے پہلے ہی موجود رہتے۔ اکثر اس قطار میں گورکھ بھی شامل ہوتا۔

گلی کی اونچی نیچی شکستہ' سطح سے اوپر' تقریباً" بارہ سیڑھیاں چڑھ کر اس قدیم اور وسیع مکان کا صدر دروازہ تھا' جسے رات کے وقت لکڑی کے شہتیر سے' جو ایک دیوار میں لگے ہوئے لوہے کے ہک میں پیوست ہو جاتا تھا' بند کر دیا جاتا تھا۔ دروازے کے اندر گھستے ہی ڈیوڑھی تھی' جس کے دونوں طرف سیمنٹ کے حوض تھے۔ کسی

زمانے میں یہ جانوروں کو چارہ ڈالنے کے کام آتے ہوں گے اور گائے بھینس بھی وہیں بندھتے ہوں گے۔ اس وقت بھی ایک حوض کے قریب لوہے کا کھونٹا فرش میں گڑا موجود تھا۔ ڈیوڑھی کی تیسری دیوار کے روزن نما دروازے سے گذر کر مکان کی سب سے نچلی منزل پر پہنچا جاتا تھا۔ وہاں داخل ہونے پر ایک بڑا سا آنگن نظر آتا۔ نچلی منزل پر کوئی رہائش نہ تھی۔ آنگن کے چاروں طرف بنے ہوئے کمرے ہمیشہ بند پڑے رہتے اور زنگ خوردہ زنجیروں سے بغل گیر گراں قفل ان کے دروازوں پر جھولتے رہتے۔ بچپن میں گورکھ دروازوں کی دراڑوں سے اندر جھانک کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ ان پرانے کمروں میں کیا عجوبے قید ہیں، مگر اسے تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ مکان بجلی کی روشنی سے محروم تھا۔ دن کے وقت بھی آنگن میں روشنی اندھیروں سے مات کھاتی رہتی۔

آنگن سے بھاری بھرکم سیمنٹ اور لکڑی کے ستون بلند ہوتے ہوئے، مل جل کر پہلی منزل کے چھجے کو سنبھالے ہوئے تھے۔ پہلی منزل پر پہنچنے کے لئے ایک تنگ اور تاریک زینہ آنگن سے اٹھتا، گھماؤ کھاتا ہوا پہلی منزل کی طرف بڑھتا، جہاں چاروں سمت رہائش کے کمرے تھے۔ درمیان کی خالی جگہ کو چار فٹ اونچی منڈیر نے محفوظ کردیا تھا۔ منڈیر سے نیچے جھانک کر آنگن کا اور اوپر نظر اٹھا کر آسمان کا نظارہ لیا جاسکتا تھا۔

پہلی منزل پر تین کنبے رہتے تھے۔ ایک مالک مکان لالہ سوٹا مل اور دو کرایہ دار۔ ان میں سے ایک کرایہ دار گورکھ کے والد گوپال داس تھے اور دوسرا کرایہ دار لالہ بھولا رام۔۔ مکان کے بہترین حصے میں مالک مکان سوٹا مل کی رہائش تھی۔ گلی کی جانب رخ کئے ایک خوب صورت بیٹھک، جسے آپ موجودہ زمانے کا ڈرائینگ روم کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ملتے دو کمرے اور کمروں کے ساتھ زاویہ بناتا رسوئی گھر۔ گورکھ کو سوٹا مل کی بیٹھک بہت اچھی لگتی۔ بیٹھک کی دیواروں پر رنگین نقاشی، پھول پودے، طوطے اور کبوتر۔ ایک جانب چار کرسیاں اور میز، جن کی بناوٹ اور اکھڑا رنگ بیتے دور کی خوش حالی کی طرف اشارہ کرتا۔ دوسری جانب قدرے اونچے چبوترے پر قرینے سے بچھے گدے اور آرام دہ تکئے، جن پر لال جلد کے موٹے موٹے پرانے بہی کھاتے پڑے رہتے۔ ایک چھوٹی سی، نیچی سی، ڈیسک جیسی میز، جس پر پان دان سجا رہتا۔ قریب ہی اگال دان رکھا رہتا۔ بیٹھک کی کھڑکیوں سے لٹکتے پنجروں میں بند طوطے شور و غل مچاتے رہتے۔ ایک کھڑکی کے پنجرے میں ایک نیلے پروں والی چڑیا قید تھی۔ گورکھ نے اسے پنجرے میں ادھر سے ادھر پھدکتے تو ضرور دیکھا تھا، لیکن کبھی اس کی آواز نہ سنی تھی۔ سوٹا مل کی بیوی وقفے وقفے سے سپاری کاٹ کر کتھا چونا لگا کر، زردہ ڈال کر تازہ پان تیار کر کے خاوند کو پیش کرتی رہتی اور سوٹا مل چبوترے پر بچھی چاندنی پر بیٹھا نشے میں اونگھتا رہتا۔

سوٹا مل نے ایک بار گورکھ کو بھی پان کھانے کے لئے للچایا۔ "بغیر تمباکو والا ہے۔ ایک بار چکھ کے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔؟" گورکھ نے سوٹا مل کے اصرار پر پان مونہہ میں رکھ تو لیا، مگر ذرا سا چبا کر ہی تھوک دیا اور دیر تک گلا صاف کرتا رہا۔ سوٹا مل کہنے لگا "جا کر اپنے ہونٹ دیکھ آ"۔ گورکھ کو پان کا سواد تو اچھا نہ لگا، لیکن کتھے سے

رنگے سرخ ہونٹ ضرور اچھے لگے۔ دراصل اس نے پان اسی غرض سے موہنہ میں رکھا تھا۔ سوٹا مل کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ سارے دن حقہ گڑگڑایا‘ پان کھائے‘ سگریٹ یا بیڑی کا دھواں اڑایا یا چھت پر جا کر ناک میں نسوار چڑھا کر بیٹھ گیا۔ ایک روز اسے چھینکیں مارتے دیکھ کر گورکھ پوچھنے لگا۔ ”ناناجی‘ یہ آپ دھوپ میں بیٹھ کر‘ چہرہ سورج کی طرف اٹھا کر چھینکیں کیوں مارتے ہو؟“ ”کیا مزہ ملتا ہے؟“ سوٹا مل بولا ” بیٹے ابھی تم بہت چھوٹے ہو‘ نسوار کا مزہ اور فائدے کیا جانو؟ اس سے سانس کی نلی کی گندگی بالکل صاف ہو جاتی ہے اور زکام‘ کھانسی سے بچاؤ ہے۔“ گورکھ کو یاد ہے کہ اس بات چیت کے چند روز بعد ہی سوٹا مل کو سردی‘ زکام نے آگھیرا تھا اور وہ ایسا بیمار پڑا تھا کہ دو مہینے تک بستر سے چپکا رہا تھا۔

سوٹا مل کے کنبے میں اس کی بیوی ہمیلی کے علاوہ گورکھ کا ہم عمر لڑکا ستو شامل تھا۔ گورکھ ستو کو کیوں کر بھول سکتا ہے؟ سب اسے ستو کہہ کر پکارتے۔ پورا نام ست پرکاش رہا ہوگا‘ لیکن وہ بچپن کا ہم جولی جسے گورکھ جانتا ہے‘ فقط ستو ہے۔ سوٹا مل کی عمر ان دنوں لگ بھگ پچپن یا ساٹھ سال ہوگی۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ گورکھ نے سنا تھا کہ ستو کے ماں باپ دہلی یا کلکتہ میں رہتے تھے۔ ستو کا باپ پرمیشوری ایک کام یاب بیوپاری تھا۔ سوٹا مل رشتے سے ستو کا نانا تھا۔ اس نے ستو کو گود لے لیا تھا۔ رشتے کی تفصیل واضح طور پر کسی کو معلوم نہ تھی۔ گورکھ نے بھی ایسی ہی اڑتی اڑتی سن رکھی تھی۔

ستو کا باپ جب بھی انبالہ شہر آتا‘ اس کے لئے نئے لباس‘ کھلونے اور مٹھائی لے کر آتا۔ اس کے آنے پر گھر میں ہی نہیں‘ محلے بھر میں ایک کھل بلی سی مچ جاتی۔ وہ اس لئے کہ وہ محلے بھر کے بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ سارے محلے میں مٹھائی تقسیم ہوتی۔ گورکھ کے گھر میں بھی آتی۔ گورکھ مٹھائی شوق سے کھا بھی لیتا اور اس کا موہنہ کا مزہ بھی کچھ کرکرا ہو جاتا۔ سوٹا مل تو ناکارہ تھے۔ کرائے داروں کے کرائے سے کہاں تک گزر ممکن ہو سکتی تھی۔ گورکھ نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ستو کا باپ ہی ستو کی پرورش کے بہانے روپے پیسے سے سوٹا مل کی مدد کرتا رہتا ہے۔

مکان کے جنوبی حصے میں لالہ بھولا رام کرایہ دار تھے۔ بھولا رام کی شاید کپڑے کی دکان تھی‘ کیوں کہ بھولا رام کی بیوی ہر روز نئی ساڑیوں میں ملبوس نظر آتی تھی۔ ان کی بھی ایک اولاد تھی۔ گورکھ شنکر کو بھی کیسے بھول سکتا ہے۔ شنکر کی عمر گورکھ سے دو یا تین سال زیادہ ہوگی۔ اسے اسکول میں نالائق سمجھا جاتا تھا اور وہ دو بار فیل ہو چکا تھا۔ شنکر کی ماں کے دھندلے سے نقش ابھی تک گورکھ کے ذہن میں قائم ہیں کہ وہ خوب صورت تھی۔ ستو اور گورکھ کی نسبت شنکر زیادہ خوب صورت تھا۔ لمبا قد‘ تیکھے نقش‘ گورا رنگ۔

مکان کے مغربی حصے میں گورکھ کے والد گوپال داس کرایہ دار تھے۔ وہ امپیریل بینک میں کلرک تھے۔ گورکھ کی ماں اور دادی اور گورکھ کی دودھ پیتی چھوٹی بہن‘ یہی چھوٹا سا کنبہ تھا۔ گورکھ کو یاد آ رہا ہے اس جگہ کا

نقشہ جہاں وہ رہتا تھا۔ دو کمرے اور ایک رسوئی گھر۔ رسوئی گھر کا کچا فرش۔ ایک طرف کوئلے اور لکڑی کا انبار، انگیٹھی، برتن، کچھ زنگ خوردہ ٹین کے ڈبے، تھالیاں اور گلاس، جنہیں دھو کر اونچے سے مچان پر رکھ دیا جاتا۔ بوری کے ٹاٹ، جن پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا اور اس کے بعد لپیٹ کر ایک طرف کھڑا کر دیا جاتا۔ رہائش کا پہلا کمرہ، جس میں لکڑی کے دو دروازے باہر کی طرف کھلتے ہوئے چیں چیں کی آواز پیدا کرتے۔ ان دروازوں سے ہو کر ہی اندر کے کمرے کے دروازے تک پہنچا جا سکتا تھا۔ دیواروں پر اکھڑا ہوا زرد رنگ۔ دو چارپائیاں، چند لوہے اور لکڑی کے صندوق۔ دیواروں میں جا بجا گڑی میخیں اور کھونٹیاں، جن پر کوئی نہ کوئی پہننے کا کپڑا لٹکتا رہتا۔ کمرے کی ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک، سر کی اونچائی سے قدرے اوپر، لوہے کا ایک گول ڈنڈا، جس پر کپڑوں کی گٹھریاں، کمبل، چادریں اور کوٹ لٹکتے رہتے۔ دادی اماں کا چرخا، سوت کے گولے، روئی کی بوریاں ایک گوشے میں پڑے رہتے۔ دوسری جانب ایک لکڑی کی کرسی اور میز، جس پر گورکھ کی اسکول کی کاپیاں اور کتابیں، کھیلنے کا لٹو، دھاگے، سلائی کا سامان اور مٹی کے تیل کی لالٹین جیسی متفرق چیزیں رکھی رہتیں۔ دوسرے کمرے کا بھی تقریباً یہی نقشہ تھا، اس میں ایک کھڑکی موجود تھی، جس سے جھانک کر باہر گلی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

گورکھ کو اس مکان کی یادیں، مکان کی چھت پر لے جانے لگیں۔ پہلی منزل کا زینہ دو بل اور کھا کر چھت تک پہنچ جاتا۔ نچلی منزل کے عین اوپر، چھت کا درمیانی حصہ کھلا رہتا اور اس پر پہلی منزل کی طرح منڈیر بنی تھی۔ چھت کی منڈیر سے نیچے جھانکنے پر پہلی منزل کے کمرے اور آنگن صاف نظر آتے۔ بندروں اور پرندوں سے پہلی منزل کو محفوظ رکھنے کے لئے، لوہے کی سلاخوں کا جال منڈیر سے قدرے نیچے، چھت کے کھلے مونہہ کو بند کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی چڑیا، جال کی سلاخوں سے نکل کر پہلی منزل تک پہنچ جاتی اور جال سے باہر نکل کر آسمان کی طرف اڑ بھی جاتی۔ البتہ کوے اور کبوتر جال سے نہ گذر پاتے، منڈیر پر ہی بیٹھ کر کائیں کائیں یا غٹر غوں کرتے۔ چھت کے مشرق اور مغرب کی جانب ایک ایک کمرہ اکیلا کھڑا تھا۔ وہ دونوں کمرے سوتا مل کے قبضے میں تھے۔ گرمی کے موسم میں سب ہی چھت پر سوتے۔ ایک کمرے میں گدے اور چارپائیاں بھرے رہتے اور دوسرا کمرہ خالی رہتا۔ چھت پر کسی طرف بھی آنے جانے کی روک نہ تھی، پھر بھی وہ تین فرضی حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک حصہ مالک مکان کا، باقی دو کرایہ داروں کے۔ چھت کے مغرب کی جانب تقریباً" دس فٹ چوڑا کھلا برآمدہ بھاری ستونوں پر کھڑا تھا۔ گوپال داس نے برآمدے کے ایک گوشے کو ترپال ڈال کر آگے سے ڈھک لیا تھا۔ اور ایک کمرے کی صورت میں بدل لیا تھا۔ ان کی ایک میز، کرسی اور چارپائی اور بہت سی کتابیں وہاں پڑی رہتیں۔ کبھی کبھی گوپال داس اکیلے اس کمرے میں سوتے۔ گورکھ کو احساس تھا کہ اس کے والد کو جب کوئی خاص توجہ کا کام کرنا ہوتا یا کسی کتاب کا مطالعہ کرنا ہوتا، تو وہ وہیں سو جاتے تھے۔

چھت کی شمالی دیوار کی ایک چھوٹی سے کھڑکی سے گورکھ اکثر نیچے جھانکتا۔ مکان کی دیوار کا نچلا حصہ ہمیشہ

گندے پانی میں ڈوبا رہتا۔ گورکھ نے کبھی اس پانی کو بہتے نہ دیکھا تھا۔ سردیوں میں وہ پانی بالکل سیاہ ہو جاتا اور کچھ نیچے اتر جاتا اور برسات میں کچھ اونچا اٹھ آتا، لیکن رنگت میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھتے ہی چھت کی بائیں جانب ٹٹی گھر تھا۔ مکان میں رہنے والے سب لوگ اسے استعمال کرتے تھے۔

مکان کا یہ بیان ایک اہم جگہ کے ذکر کے بغیر بالکل ادھورا ہے۔ وہ جگہ گورکھ کے لئے خاص معنی رکھتی ہے۔ گورکھ کے تصور میں وہ اندھیری گپھا جیسی کوٹھری پتھر کی لکیر کے ایک دائمی نقش کی مانند موجود ہے۔ اس کے بچپن کی بہت سی یادیں اس کال کوٹھری سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس کے والد گوپال داس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب ایک اور دروازہ تھا، جو تقریباً ہمیشہ بند رہتا تھا۔ دراصل یہ دروازہ نچلی منزل کے کسی کمرے کو پہلی منزل سے ملانے والے زینے کا دروازہ تھا، لیکن مدت سے وہ زینہ کسی نے استعمال نہ کیا تھا۔ لکڑی کا پرانا سامان، ٹوٹی ہوئی میزیں اور کرسیاں، پرانے کپڑے اور مدتوں کا بوسیدہ سامان زینے میں بھرا ہوا تھا۔ اندر ہی اندر واقع ہونے کی وجہ سے دن میں بھی زینے میں گہرا اندھیرا رہتا۔ اگر لالٹین کی روشنی دروازہ کھول کر زینے کو دکھائی جاتی تو چند قدم چل کر ہی ہلکے اندھیرے میں بدل جاتی اور آنکھوں کے سامنے ہوتے مکڑی کے جالے، چوہوں کی مینگنیاں اور ادھر ادھر پھدکتی چھپکلیاں۔

گورکھ بچپن کی معصومانہ شرارتیں بہت کچھ بھول چکا ہے، مگر چند یادیں جو اسے اس کال کوٹھری سے وابستہ کرتی ہیں، ابھی تک سلامت ہیں۔ اسے یاد آرہا ہے کہ کب اور کیوں اسے پہلی بار اس کال کوٹھری کا مونہہ دیکھنا پڑا تھا۔ اسکول سے واپس آکر وہ ہمیشہ کپڑے اتار کر چارپائی پر پھینک دیتا تھا۔ اس کی ماں انہیں تہہ کرکے رکھتے ہوئے اسے بارہا سمجھاتی کہ کپڑے ٹھیک طرح کپڑوں کی جگہ پر رکھا کرے۔ ایک دو دن گورکھ پر اس نصیحت کا اثر رہتا، مگر اس کے بعد پھر وہی طور، یعنی اسکول سے آتے ہی کپڑے اتارے اور چارپائی پر پھینک دئے۔ ایک روز ماں نے کہا "تمہارے پتا جی سے شکایت کروں گی۔ پٹو گے تو تمہارے ہوش ٹھکانے آئیں گے۔" اور ہوا بھی یہی۔ ماں نے ایک دن شکایت کر ہی ڈالی۔ والد اسے سمجھانے لگے : "جو بچے اپنے کپڑوں کی عزت نہیں کرتے، کپڑے بھی ان کی عزت کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ دنیا میں عزت کپڑوں سے ہوتی ہے۔ تمہاری ماں کو دن بھر اور بھی بہت سے کام رہتے ہیں، وہ کہاں تک تمہارا خیال رکھتی رہے؟ تم بڑے ہو رہے ہو، اپنا کام خود سنبھالنا سیکھو۔ دوسروں کی مدد نہ کرو لیکن اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھو۔"

گورکھ سوچ رہا تھا : "ماں میرا کیا کام کرتی ہے؟ تمہارے جاتے ہی، رسوئی کا کام ختم کرکے شنکر کی ماں کے ساتھ اور ستو کی نانی کے ساتھ گپیں ہانکتی ہے۔ رامائن پڑھ لی، دوپہر کو سوئی اور شام کو کھانا بنا ڈالا۔ اس سے زیادہ کام تو میں کرتا ہوں۔ پانی لاتا ہوں۔ چھت پر ٹٹی گھر کے قریب رکھے مٹکے میں اپنی باری کے حساب سے پانی بھرتا ہوں۔ اسکول جاتا ہوں۔ شام کو سبق رٹتا ہوں۔ رات کو بھی پڑھتا ہوں۔" تاہم زبان سے اس نے باپ کو

یہی جواب دیا : "اچھا پتا جی' آگے سے آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں گا۔

لیکن گورکھ اپنا رویہ نہ بدل سکا۔ شاید اسکول سے آکر کپڑے بے ترتیب پھینک دینے سے اس کی تھکان کچھ کم ہوتی تھی یا جسم سے کوئی بوجھ اتر جاتا تھا' جیسے کوئی پردیس سے آکر پیٹھ پر لدا سامان اتار کر راحت محسوس کرتا ہو۔ ماں نے دوبارہ گورکھ کے باپ سے شکایت کی۔ گوپال داس اس وقت کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا سا لکڑی کا گول رولر بھی تھا' جس سے وہ کاغذوں پر سیدھی لکیریں لگایا کرتے تھے۔ انہوں نے گورکھ کے بدن پر بھی اس سے چند لکیریں لگا دیں۔ گورکھ بہت رویا چلایا' مگر سزا ابھی باقی تھی۔ اسے کالی گپھا میں بند ہونا پڑا۔ ماں کو حکم ملا کہ گورکھ کو شام کا کھانا نہ دیا جائے۔

گورکھ کو یاد ہے کہ شام کا وقت تھا۔ کوٹھری میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گورکھ بہت خوف زدہ تھا۔ ایک چوہا پھدکتا ہوا اس کے پاؤں پر سے گذر گیا تو وہ زور سے چلایا۔ اس کے تقریباً" دو گھنٹے تک اندھیرے میں بند رہنے کے بعد گوپال داس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ اس درمیان گورکھ نے ماں کو یہ کہتے سنا تھا : "بس بھی کرو جی' بہت سزا ہو چکی۔ بچہ بھوکا ہے۔" اور والد نے غصے سے جواب دیا تھا : "یا تو مجھ سے شکایت نہ کیا کرو۔ اور اگر کیا کرو تو مجھے اس کا انتظام ٹھیک طرح کر لینے دیا کرو۔ دروازہ کھلتے ہی اسے حکم ہوا کہ پہلے ماں کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگو۔ تب کھانا ملے گا۔ اور اس نے یہی کیا' اگرچہ اس کا دل کہہ رہا تھا : "میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ میری ذرا سی معصومانہ حرکت پر مجھے اتنی بڑی سزا!"

گورکھ پڑھنے میں بہت ہوشیار تھا۔ کلاس میں چوٹی کے دو تین لڑکوں میں اس کا شمار ہوتا۔ لیکن گوپال داس کو جب بھی فرصت ملتی' وہ خود گورکھ کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ گورکھ کو باپ سے پڑھتے ہوئے ڈر لگتا' کیوں کہ لکڑی کا موٹا رولر ہمیشہ ان کے ہاتھ میں گھومتا رہتا۔ جہاں ذرا زبان چوکی' رولر برس پڑا۔ بار بار گورکھ کے کانوں نے یہی سنا تھا : "اگر پڑھے گا نہیں تو نوکری ڈھوئے گا' بھوکا مرے گا۔' اس طرح پڑھائی کے سلسلے میں بھی اسے بہت بار ڈراؤنی کالی گپھا میں رہنا پڑا تھا۔

ایک خاص واقع گورکھ کی یادوں کے ذخیرے سے ابھرتا ہے۔ اس کے دادا شنکر دیال بھی کچھ کم غصے والے نہ تھے۔ شام کا وقت تھا۔ گورکھ اسکول سے لوٹا تھا اور "پہاڑے" رٹ رہا تھا : "چار دونی آٹھ۔۔ آٹھ دونی سولہ۔ سولہ دونی بتیس۔۔۔۔" اس کے دادا دیوار پر لگی گھڑی کا وقت جیب کی گھڑی سے ملا رہے تھے۔ کسی وجہ سے دیوار پر لگی گھڑی بند ہو گئی تھی۔ اس میں دو چابیاں لگتی تھیں۔ ایک گھنٹے کی اور ایک وقت کے اعلان کی۔ جب گھنٹے کی سوئی ۱۲ پر پہنچتی تو گھڑی ۱۲ بار ٹن ٹن کی آوازیں پیدا کرتی۔ گھڑی کا وقت ٹھیک کرنا تو آسان تھا' لیکن وقت کے حساب سے گھڑی کی ٹن ٹن کی آواز ملانا قدرے مشکل۔ دادا گھڑی کی ٹن ٹن کی گنتی کر رہے تھے اور گورکھ پہاڑوں کی۔ یعنی دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ دادا نے اسے دو بار تاکید کی : "چپ ہو جا

سولہ دونی بتیس کے بچے! ورنہ میں تیری بتیسی باہر نکال دوں گا۔" مگر گورکھ کہاں چپ ہونے والا تھا۔ تنگ آکر' بڑے بچے نے چھوٹے بچے کو دبوچ لیا اور دہلیز پر لمبا لٹا کر ایک ہاتھ سے گلا دبا کر بولا "اب بول سولہ دونی بتیس!" اور پھر اسے گھسیٹ کر کالی گپھا میں بند کر دیا۔

جس چیز سے بار بار کسی کو ڈرایا جائے' وہ چیز اپنی دہشت انگیزی کھو بیٹھتی ہے۔ گورکھ کو اب اندھیرے سے بالکل ڈر نہ لگتا۔ مکڑی کے جالے' پھدکتے ہوئے چوہے اور چھپکلیاں' سب اس کے دوست بن چکے تھے۔ وہ اندھیرے میں خاموش بند ہو جاتا۔ اکثر اندھیرا اتنا گہرا ہوتا کہ آنکھیں بند کرنے اور کھول کر رکھنے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ پہلی بار وہ اندھیرے سے کتنا خوف زدہ ہوا تھا' کتنا رویا اور چلایا تھا' کتنا سہما اور ڈرا تھا! وہ ڈر' وہ گھبراہٹ اب کافور ہو چکے تھے۔ وہ آنسو اب سوکھ چکے تھے۔ ایک مرتبہ دو تین چوہے اس کی کمر پر ناچتے' اس کے سر سے گذر گئے اور وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ دھیرے دھیرے گورکھ کو دن کے وقت اندھیرے میں بند ہونا راحت بخش لگنے لگا۔ بند دروازوں کی کسی نہ کسی دراڑ سے کوئی نہ کوئی روشنی کی کرن اندھیرے میں چمک اٹھتی۔ مکڑیوں کے جالوں سے چھنتی وہ روشنی کی کرن کسی میز کی ٹوٹی ٹانگ پر مرہم رکھتی ہوئی گورکھ کو بہت بھلی لگتی۔ وہ روشنی کی کرن رفتہ رفتہ جگہ بدلتی رہتی اور اگر گورکھ سورج ڈھلنے تک اندھیرے میں بند رہتا تو روشنی کو آہستہ آہستہ اندھیروں میں گم ہوتے دیکھتا رہتا۔ ایک بار تو گورکھ یہ بھی بھول گیا کہ اسے اندھیرے میں بند کر کے کوئی سزا دی گئی ہے۔ وہ روشنی کی کرن کے قریب کھسکتا چلا گیا۔ جب تک کہ اس نے اپنی انگلی کی پوار سے روشنی کو نہ چھو لیا۔

گوپال داس بھی سمجھ گئے تھے کہ گورکھ اب اندھیرے سے نہیں ڈرتا۔ تاہم مار پیٹ کے علاوہ گورکھ کو سزا دینے کا یہ طریقہ پھر بھی جاری رہا۔ شاید یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا کہ ایک دن صبح کے اجالے میں زینے سے سانپ نکل آیا۔ گوپال داس جب نہا کر کپڑے بدلنے کے لئے کمرے میں داخل ہوئے تو سانپ دروازے کی دہلیز پر رینگ رہا تھا۔ گوپال داس "سانپ! سانپ!" کہتے ہوئے باہر کی جانب پلٹے۔ سوٹا مل اور بھولا رام لاٹھیاں اٹھائے کمرے میں پہنچ گئے۔ سانپ کو مار دیا گیا۔ اس روز گورکھ نے اپنی ماں کو تشویش کے ساتھ شکایت کرتے سنا! "میں نے کتنی بار کہا کہ لڑکے کو اندھیرے میں مت قید کرو۔ اگر کچھ ہو جاتا تو میں کہیں کی نہ رہتی۔"

گورکھ' ستو اور شنکر لگ بھگ ہم عمر تھے تینوں ایک ہی کلاس' ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے' ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے۔ ایسے میں دوستی' ضد بازی' حسد' جھڑپ' سب کچھ ایک ساتھ چلتا رہتا۔ گورکھ کو یہ خیال ہمیشہ تنگ کرتا کہ اس کے والد کی مالی حالت شنکر اور ستو کے والدین کے مقابلے میں خراب ہے۔ گورکھ کے والد تیس' چالیس روپے مہینے کی تنخواہ پر بینک میں ملازم تھے۔ گھر کا خرچ مشکل سے چلتا تھا۔ کسی سے مالی مدد کی

امید نہ تھی۔ گوپال داس کے والد شنکر دیال نے کچھ سال پہلے کاروبار میں لگاتار نقصان اٹھانے کے بعد سے دنیا کو ایک حد تک تیاگ دیا تھا۔ گورکھ نے سن رکھا تھا کہ جوانی میں شنکر دیال کافی مال دار تھے، لیکن وہ کاروبار ٹھیک طرح نہ سنبھال سکے۔ جس پر انہوں نے بھروسہ کیا، اسی نے دھوکا دیا۔ بیس سال تک کورٹ کے چکر لگانے کر اور نقصان پر نقصان اٹھا کر، مکان، زمین، جائداد سب کچھ گنوا بیٹھے۔ گوپال داس میٹرک پاس کر کے ملازم ہو گئے تھے، کیوں کہ شنکر دیال انہیں کالج میں پڑھانے کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ گورکھ کو اس ناسمجھی کی عمر میں بھی گھر کی مالی حالت کا احساس تھا۔ وہ اپنی کسی ضرورت یا شوق کے لئے کبھی کوئی تقاضا نہ کرتا۔ گورکھ کو اپنے والد گوپال داس پر بہت فخر تھا۔ اگر چہ وہ والد سے زیادہ مار کھاتا تھا، لیکن اس کو باپ کے اونچے اٹھنے کے ارادے اور محنت اور لگن سے کام کرنے کی عادت پر ناز ہوتا تھا۔ بینک اس محلے سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ گوپال داس صبح کو آٹھ بجے ناشتہ کر کے سائیکل پر بینک روانہ ہو جاتے اور دوپہر کا کھانا ساتھ لے جاتے۔ شام کو دیر سے گھر واپس آتے۔ وہ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔ بے چارے ہندوستانی کلرکوں کو کون پوچھتا؟ گوپال داس کا انگریز افسر خوب کس کر ان سے کام لیتا۔ بارہ گھنٹے کام پر گزار کر بھی گوپال داس بینک کے کسی امتحان کی تیاری میں مشغول رہتے۔ شام کے کھانے کے کچھ دیر بعد کتابیں لے کر بیٹھ جاتے۔ گورکھ پر گوپال داس کی اس قدر مشقت کا گہرا اثر ہوا اور محنت کرنے کا پہلا سبق اس نے اپنے والد سے ہی سیکھا۔

جب بھی ستو کا والد پر میشوری چند اس کے لئے نئے کپڑے اور کھلونے لے کر آتا، ستو ان چیزوں کی خوب نمائش کرتا۔ وہ نئے کپڑے پہن کر اسکول جاتا تو لڑکے اسے گھیر لیتے۔ گورکھ ستو کے کپڑوں اور چیزوں کی کبھی تعریف نہ کرتا۔ شاید اسی لئے گورکھ کے سامنے ستو اپنی شان اور بھی زیادہ جتاتا رہتا۔ ایک روز ستو اپنے نئے کپڑوں پر اتراتے ہوئے کہنے لگا۔ اے گورکھ، تیرے پاس بھی کیا ایسے خوب صورت کپڑے ہیں جیسے کہ میں نے آج پہن رکھے ہیں؟

گورکھ نے بھی شان بگھاری۔ ”ضرور بہت سے ہیں میری ماں کے ٹرنک میں بند ہیں۔“

ستو بولا ”ابے مورکھ! انہیں ٹرنک سے باہر کیوں نہیں نکالتا۔ ہم بھی تو تیرا کوئی نیا لباس دیکھیں۔ جب دیکھو وہی قمیض!“

گورکھ بھنا گیا۔ ”دیکھ ستو، تو ایسی باتیں نہ کیا کر۔ میں جیسا بھی ہوں، ٹھیک ہوں۔ تو جیسا بھی ہے، ٹھیک ہے۔ بس یہی سمجھ لے۔“

ستو نے شوشہ چھوڑا : ”سچ بات یہ ہے کہ اگر تیرے باپ کے پاس پیسے ہوں تو تجھے اچھے کپڑے خرید کر دے۔ وہ تو بینک میں کلرک ہے۔“

گورکھ کو غصہ آ گیا۔ ”ستو دیکھ، تو باپ تک مت پہنچ۔ میرا باپ تیرے نانا سے مانگنے تو نہیں جاتا۔ تیرے

باپ نے تو تجھے چھوڑ رکھا ہے!"

ستو نے چڑایا : "تیرا باپ میرے نانا کا کرایہ دار ہے۔ میرا نانا جب چاہے اسے باہر نکال دے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بتا' تیرا باپ کہاں لے کر جائے گا تجھے؟"

گورکھ نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا "تو حد سے آگے مت بڑھ۔ میرا باپ کون سا مفت میں تیرے نانا کے گھر میں رہتا ہے۔ کرایہ دیتا ہے تو رہتا ہے۔"

شنکر کے باپ کی کپڑوں کی دکان تھی۔ شنکر کی ماں روز نئی نئی ساڑیاں پہنتی تھی۔ گورکھ کو احساس تھا کہ اس کی ماں کے پاس تو ایک بھی اچھی ساڑی نہیں۔ گورکھ کو دل ہی دل میں اس بات سے بہت جلن ہوتی۔ جلن میں اضافہ اس لئے بھی ہوتا کہ شنکر کی ماں اس کی ماں سے زیادہ خوب صورت تھی۔

آئے دن کی تکرار کے باوجود تینوں ایک ساتھ اسکول جاتے' ایک ساتھ اسکول کا کام کرتے' تختیوں پر ملتانی مٹی کا لیپ چڑھاتے اور بستہ گلے میں لٹکا کر اسکول جاتے۔ برسات کے دنوں میں چھت پر ایک ساتھ نہاتے' شور مچاتے' لڑتے جھگڑتے۔ زیادہ تر جھگڑے آپس میں ہی ختم ہو جاتے' لیکن کبھی کبھی والدین بھی ان جھگڑوں میں الجھ جاتے۔ گورکھ کوئی نہ کوئی زیادتی کر بیٹھتا۔ ایک بار اس نے شنکر کے بازو پر اس قدر زور سے دانت گڑائے کہ جلد پر خون چھلک آیا۔ شنکر کی ماں شکایت لے کر آئی اور گورکھ کے مونہہ پر طمانچہ جڑ دیا۔ گورکھ نے شنکر کی ماں کو ایک چھوٹا سے پتھر کھینچ مارا' جو اس کی کمر کے نیچے کولہے پر جالگا۔ وہ چلاتی ہوئی رخصت ہوئی تو رات کو بھولا رام شکایت لے کر آئے۔ گوپال داس نے بھولا رام کے سامنے گورکھ کی وہ دھنائی کی کہ وہ تین دن بدن دباتا بستر پر پڑا رہا۔

بچپن کی بہت سی خوش گوار یادیں بھی گورکھ کے دماغ میں تازہ ہیں۔ اسے کئی کام بہت پسند تھے' کئی کھیل تماشے بہت اچھے لگتے تھے ایک کام جسے وہ بخوشی انجام دیتا تھا' مٹی کے تیل کی لالٹین صاف کرنا اور اسے ہر شام روشن کرنا تھا۔ مٹی کے تیل کے کنستر سے تیل تنگ مونہہ کی بوتل میں نکالا جاتا۔ اسے ٹین کی نلکی والا مٹی کے تیل کا پمپ چلانے میں مزہ آتا تھا۔ پمپ کنستر میں ڈال کر اس پر لگایا ہوا ایک اوپر نیچے کرنے سے پمپ "کرائیں کرائیں" کی آواز سے چلتا۔ اس میں بظاہر کوئی خاص مسرت کی بات تو نہ تھی' لیکن گورکھ کو پمپ چلانا اور پمپ کے چلنے کی آواز سننا دونوں ہی اچھے لگتے تھے۔ جب لالٹین کا شیشہ بتی کے دھوئیں سے کالا ہو جاتا تو گورکھ اسے لیموں اور چونے سے صاف کر کے چمکا دیتا۔ لالٹین کی بتی کھسک کر مٹی کے تیل میں ڈوب جاتی تو اسے باہر نکال لیتا' بتی کا جلنے والا سرا ہموار نہ جلنے سے اونچا نیچا ہو جاتا اور روشنی کی لو ٹیڑھی ہو جاتی تو گورکھ بتی کے سرے کو قینچی سے کاٹ کر گول کر دیتا۔ اس کام کے لئے کبھی کبھی اسے شاباشی بھی ملتی۔

گورکھ جب لٹو سے کھیلتا تو خود بھی لٹو ہو جاتا۔ لٹو کے پیندے میں ڈوری لپیٹ کر وہ لٹو کو زمین پر چھوڑتا اور

دیکھتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کتنی دیر گھوم سکتا ہے۔ وہ شنکر اور ستو کو لٹو چلانے میں مات کر دیتا۔ چلتا چلتا گردشیں کاٹتا لٹو ہاتھ کی ہتھیلی پر چڑھا کر' بازو تک گھما کر وہ واپس ہتھیلی پر لا کر زمین پر چھوڑ دیتا۔

لٹو کے کھیل میں ستو اور شنکر بارہا گورکھ سے مات کھا چکے تھے۔ پھر بھی ایک دن ستو گورکھ کو للکارنے لگا: "گورکھ! آج مقابلہ ہو جائے۔"

گورکھ ہنس کر بولا "آج کیا خاص بات ہے کہ تو مجھے مقابلے کے لئے للکار رہا ہے؟"

گورکھ اور ستو نے ایک ساتھ لٹو زمین پر پھینکے۔ گورکھ نے ہر روز کی طرح بڑی مہارت سے لٹو چلایا تھا' لیکن اس روز ستو کا لٹو دیر تک گردشیں کاٹتا رہا۔ گورکھ' ستو کے لٹو کو غور سے دیکھنے لگا تو ستو لٹو لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بعد میں گورکھ کو پتہ چلا کہ ستو کے والد نے اسے بہت بڑھیا لٹو بھیجا تھا۔ کھسیا کر گورکھ نے ستو سے کہا "اگر مقابلے کی ہمت ہے تو دونوں لٹو ایک جیسے ہونے چاہیئیں۔"

گورکھ کو ہواؤں میں اڑتی پتنگیں بہت دلکش لگتیں۔ اس امید میں کہ کوئی اڑتی پتنگ کٹ کر چھت پر آ گرے گی' وہ پہروں نظریں اٹھائے آسمان کی جانب اڑتے پتنگوں کو دیکھتا رہتا۔ یہاں بھی وہ اپنی غریبی سے مات کھا گیا' کیوں کہ پتنگ اور ڈور وہ بازار سے نہیں خرید سکتا تھا۔

گورکھ کو بارش میں نہانے میں بھی بہت مزہ آتا تھا۔ بارش جتنی موسلا دھار ہوتی' گورکھ کے لئے نہانے کا لطف اور بھی بڑھ جاتا۔ اولے پڑنے کا اپنا الگ سرور تھا۔ چھت پر برسات کے پانی کے نکاس کے لئے ایک ہی نالی تھی' جس سے ہو کر پانی نیچے گندے نالے میں گرتا۔ وہ نالی کے مونہہ میں پرانے کپڑے ٹھونس کر پانی کا نکاس بند کر دیتا اور جب چھت پر کافی پانی اکٹھا ہو جاتا تو یکایک نالی کے مونہہ سے کپڑا ہٹا دیتا۔ پانی آبشار کی صورت میں مکان کی باہری دیوار سے ٹکراتا ہوا گندے نالے میں گرتا اور وہ کھڑکی سے یہ نظارہ دیکھتا۔ پانی کا پہلے زور سے گرنا' پھر آہستہ آہستہ بہاؤ کا کم ہونا اور پھر رس رس کر گرنا۔ کتنا دل کش منظر تھا!

گورکھ کے ہم عمر دوست کانچ کی گولیوں سے کھیلتے۔ گولیاں زمین پر بچھا کر دور سے گولی سے گولی ٹکرانا۔ گولی کو زمین پر بنے بل میں گھسانا۔ گورکھ کو یہ کھیل اچھے لگتے تھے۔ مگر اس کا کانچ کی گولیوں کا پسندیدہ کھیل تھا گولیوں کو نالی سے گندے نالے میں گرانا اور انہیں کھڑکی سے گرتے دیکھنا۔ مشکل یہ تھی کہ جب تک وہ نالی کے مونہہ پر گولی رکھ کر کھڑکی تک دوڑتا' گولی نالے تک گرنے کی آدھی اونچائی پار کر گئی ہوتی۔ وہ گولیوں کو نالی کے مونہہ سے نکلتا اور پوری اونچائی سے نالے میں گرتا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے ایک آلہ ایجاد کیا۔ ایک لکڑی کے لمبے ٹکڑے کے کونے میں میخ آدھی ٹھوک کر اس میں لمبی ڈوری باندھ دی۔ لکڑی کو نالی کے مونہہ کے آگے رکھ کر' لکڑی کے پیچھے گولیوں کی قطار لگا دی۔ اب گولیاں اپنی مرضی سے نالی کے مونہہ میں نہیں جا سکتی تھیں۔ ڈوری کا دوسرا سرا ہاتھ میں تھامے' کھڑکی سے باہر گردن نکالی اور لکڑی کو ڈوری کے ذریعہ

آہستہ سے نالی کے مونہہ سے ہٹایا۔ اس طرح گولیوں کی قطار سے پہلی گولی کو نالی کے مونہہ کا راستہ مل گیا اور ایک ایک کر کے ساری کی ساری گولیاں نالی کے مونہہ سے گزر کر گندے نالے میں گرنے لگیں اور گورکھ گولی کو گرتے اور پانی میں ڈبکی لگاتے دیکھتا رہا۔ تاہم یہ تماشا گورکھ کو بہت مہنگا پڑتا۔ جیب خرچ کے لئے اسے پیسے بہت کم ملتے تھے۔ جب بہت دنوں کی جمع کی ہوئی گولیاں کچھ منٹ میں گندے نالے کے سپرد ہو جائیں تو وہ دوبارہ گولیاں اکٹھی کرنا شروع کر دیتا۔

گلی میں کھیل تماشے والے آتے رہتے تھے۔ بندر' بندریا کا ناچ۔ طوطا طوطی کے کرتب' بازی گروں کی اچھل کود' سارے محلے کے لوگ اکٹھے ہو جاتے اور تماشا دیکھتے۔ پیسہ دو پیسہ پھینکتے اور چلے جاتے۔ یہ سب تماشے گورکھ کے دل کو بھی لبھاتے تھے۔ وہ تماشا دیکھ تو لیتا' مگر پیسہ دھیلا اس نے کبھی نہ پھینکا۔ ایک تماشا ایسا بھی تھا جو اسے سب سے اچھا لگتا تھا اور جسے وہ بغیر پیسے کے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ تھا چلتا پھرتا "سینما"۔ جب بھی گلی سے آواز آتی : "تاج محل دیکھو۔ دہلی کا لال قلعہ دیکھو۔ جادو کا کھیل دیکھو۔ دو من کی دھوبن دیکھو۔" تو اس کا دل مچل اٹھتا اور وہ گلی کی طرف بھاگتا۔ سینما کیا تھا ایک لکڑی کا مسدس بکس تھا' جس میں تصویریں بند تھیں۔ دکھانے والا بکس پر لگا ہوا ہینڈل گھماتا۔ ایک ایک کر کے تصویر نظر کے سامنے آتی اور چھپ جاتی۔ گورکھ کو دو من کی دھوبن بہت خوب صورت لگتی۔ سج دھج کر چارپائی پر کہنی کے بل جھک کر لیٹی ہوئی۔

اسکول میں آدھی چھٹی کی گھنٹی بجتی تو سب لڑکے باہر کی جانب بھاگتے۔ وہاں خوانچے والوں کی قطار لگی ہوتی۔ موتی چور کے لڈو۔ چنا مرمرا۔ ہیرا پنا۔ پیٹھے کی مٹھائی۔ لکڑ ہضم پتھر ہضم چورن۔ گورکھ کا دل تو بہت للچاتا' مگر جیب خالی ہوتی۔ چورن والے کی ریڑھی پر رنگا رنگ بوتلیں سجی ہوتیں۔ لمبی گردن والی' چوڑے پیندے والی' موٹے پیٹ والی' کھلے مونہہ والی۔ ان میں طرح طرح کے چورن بھرے ہوتے۔ سب سے زیادہ مقبول تھا ماچس لگا کر آگ سے جلا چورن۔ وہ نظارہ بھی دیکھنے کے قابل ہوتا۔ چورن فروخت کرنے والا دو تین بوتلوں سے خاص خاص چورن نکال کر کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر رکھتا اور جیسے ہی ماچس لگاتا' سارے کا سارا مرکب کچھ دیر کے لئے بھڑک اٹھتا۔ جیسے ہی آگ کا شعلہ بجھتا' چورن تیار ہوتا اور لڑکے اس کو چٹخارے لے لے کر کھاتے۔ اس آگ سے جلے مرکب کی قیمت ہوتی' فقط ایک پیسہ۔ ستو تقریباً" ہر روز اس قسم کا چورن کھاتا۔ گورکھ تھوڑی دیر ادھر ادھر خوانچے والوں کے پاس لڑکوں کی بھیڑ میں گھومتا' پھر واپس کلاس میں آ جاتا۔

ایک دن چورن والا آگ لگا لگا کر چورن بیچ رہا تھا اور ستو مزے لے لے چورن کھا رہا تھا کہ گورکھ کو چھیڑنے کے لئے اس سے کہنے لگا "گورکھ کبھی چو .ن کا مزہ بھی چکھا ہے؟"

گورکھ نے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا: "ارے میں کیوں جلا ہوا چورن کھاؤں؟ مجھے نہیں اچھا لگتا۔"

ستو نے چٹکی لی۔ "بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔ جیب میں دام ہوں تو چورن کھاؤ۔ جب چورن کھانا نہیں ہوتا تو یہاں کیوں منڈلاتا رہتا ہے۔ جا کر اندر بیٹھا کر۔"

گورکھ کو غصہ آگیا "سڑک تیرے باپ کی ہے جو میں اندر بیٹھا کروں؟ اگر میں چاہوں تو تیری طرح ہر روز چورن کھاؤں۔ مگر مجھے اچھا ہی نہیں لگتا۔"

ستو نرم پڑ گیا۔ "سچ بتا، تیرے پاس پیسے ہیں؟"

گورکھ نے شان بگھاری: "تجھے کیا معلوم میرے پاس کتنا پیسہ اکٹھا ہو چکا ہے۔ فرق یہ ہے کہ تو چورن کھا کر پیسہ گنوا دیتا ہے اور میں گھر میں جمع کرتا رہتا ہوں۔ دیکھنا کسی دن اسکول میں کوئی بڑی شاندار چیز خرید کر لاؤں گا۔"

ستو چڑ گیا۔ "تو شیخی مت بگھارا کر۔ نئے کپڑے تیرے گھر میں پڑے ہیں، پیسہ تیرا گھر میں پڑا ہے اور تو یہاں کھڑا ہے! لے آجا، چورن کھا لے۔"

گورکھ کھسیا کر بولا۔ "ستو، اگر تو ایسی بات کرے گا تو میں کل تجھے چورن خرید کر اور کھا کر دکھا دوں گا۔"

ستو نے ہنس کر کہا۔ "جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ کل آئے گی تو میں بھی دیکھ لوں گا۔"

گورکھ کچھ سوچتا ہوا واپس کلاس میں چلا گیا۔ اسے فکر لگی تھی کہ کل کو کہاں سے ایک پیسہ لائے گا۔ اس کی عزت کا سوال تھا۔ ماں سے مانگنے سے رہا۔ باپ سے وہ مانگنے سے رہا۔ یا خدا کوئی راہ بتا!

چھٹی ہونے پر گورکھ پریشان سا گھر پہنچا ہی تھا کہ ساوتری نے کہا "جا بیٹے، حلوائی کی دوکان سے دو پیسے کا دہی لے آ۔"

دو پیسے جیب میں ڈال کر گورکھ دہی لینے چل دیا۔ حلوائی کی دوکان کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ مندر پار کر کے دائیں طرف مڑ کر پہلی دوکان تھی۔ اکثر وہ وہاں سے دودھ دہی خریدنے آتا تھا۔ آج اس کے جیب میں دو پیسے تھے اور دہی کے ساتھ عزت کا سوال تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر وہ کسی طرح دہی بھی گھر لے جائے اور دو پیسے جیب کے جیب میں ہی رہیں۔ لیکن حلوائی کیوں ادھار کرنے لگا؟ وہ تو دہی دینے سے پہلے ہی دام وصول کرے گا۔

گھر سے حلوائی کی دوکان تک کا راستہ اس روز جیسے بہت لمبا ہو گیا۔ اس کی چال سست ہوتی گئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا حلوائی کی دوکان کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اور خیالات کی لہریں اٹھ اٹھ کر دماغی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر اسے گرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گھر میں دہی لے کر جانا بھی ضروری تھی اور کل کو چورن کھانا بھی ضروری تھا۔ کیا دو پیسے میں یہ دونوں کام نہیں ہو سکتے؟ ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک پیسہ جیب میں رکھ لے اور حلوائی سے کہے کہ دو پیسے کا دہی تول دے۔ وہ باقی ایک پیسہ ادھار کا پھر کبھی لوٹا دے گا۔ کبھی نہ کبھی تو ماں بغیر

مانگے اسے ایک پیسہ خرچ کرنے کے لئے دے گی ہی۔ لیکن حلوائی کیوں اتنی دیر کا ادھار کرنے لگا؟ اگر وہ ایک پیسے کا دہی خریدے تو ایک پیسہ بچ سکتا ہے۔ اس خیال کے دماغ سے گزرتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چوری کرے گا؟ جھوٹ بولے گا؟ لعنت ہے اس کی ستو کے ساتھ ضد بازی پر! اگر اس کے پاس خرچ کرنے کو پیسہ نہیں ہے تو وہ ستو سے مانگتا تو نہیں۔ کیا حرج ہے اس بات کا اقرار کرنے میں جو سچائی ہے؟ اگر وہ ستو کو سچ سچ بتا دے تو شاید ستو آئندہ چھیڑنا بھی چھوڑ دے۔ چونکہ وہ جھوٹی شان جتا کر ستو کی برابری کرتا ہے' اسی لئے ستو اسے کھینچتا رہتا ہے۔ یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی کہ اس کے ماں باپ اسے فضول خرچی کے لئے پیسہ نہیں دے سکتے۔ جیب میں پیسہ نہیں ہے تو کیا گناہ ہے؟ گناہ ہے ماں سے جھوٹ بولنا' چوری کرنا' جھوٹی شان جتانا' دوسروں کی بے وجہ برابری کرنا۔ یہ خیال پانی کے ریلے کی طرح اس کے دماغ میں آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ وہ اس قدر اپنے آپ میں محو تھا کہ ایک تانگے والا اسے 'اندھا' کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

خیالوں میں ڈوبا وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا رہا تھا۔ مگر حلوائی کی دکان بھی کون سی دور تھی اب کچھ گز کا ہی فاصلہ باقی رہ گیا تھا' مگر اس کی ادھیڑبن ختم نہ ہوئی تھی۔ اگر وہ ایک پیسے کا دہی لے کر گھر جائے گا تو ماں کو ضرور شک ہو گا۔ شاید ڈیڑھ پیسے اور دو پیسے کے دہی کا فرق نہ پہچانا جائے۔ لیکن چورن والا کل اسے دھیلے کا چورن نہیں دے گا۔ بات پھر بھی نہیں بنے گی۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ حلوائی نے پوچھا "کچھ چاہئے بھی یا یوں ہی گاہکوں کا مونہہ دیکھنے چلے آئے ہو۔"

"خیالوں کی کڑیاں ٹوٹیں اور گورکھ نے دھیرے سے کہا" مجھے دہی چاہئے۔ ڈیڑھ پیسے کا۔ لیکن ذرا ٹھیک تول کر دینا۔"

"حلوائی اس کی طرف عجب نظروں سے دیکھتے ہوئے دہی کٹوری میں ڈالنے لگا۔ اس نے کہا۔ "مجھے تولنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ہاتھ تلے ہوئے ہیں۔ تم روز تو دہی لے جاتے ہو۔ آج کیا خاص بات ہے؟"

گورکھ نے دھیلا (آدھا پیسہ) بچالیا۔ چوری کی' جھوٹ بولا۔ اس کا دل اندر ہی اندر اسے لعنت بھیج رہا تھا۔ لیکن ایک اور آواز بھی ساتھ ہی ساتھ اٹھ رہی تھی۔ آدھا دام تو ہاتھ لگ گیا اور دہی بھی اتنا کم نہیں لگ رہا ہے کہ شک پیدا ہو۔ اسی ادھیڑبن میں ڈوبا ہوا گورکھ اسی چال سے آہستہ آہستہ گھر پہنچا۔ "اسے دیکھتے ہی ساوتری نے پوچھا" کہاں چلا گیا تھا؟ کتنی دیر لگا دی! کیا بات ہے؟ کہاں رہ گیا تھا؟ یہ دو قدم کے فاصلے پر ہی تو کان ہے!"

گورکھ کو ایک جھوٹ اور بولنا پڑا : "حلوائی کی دکان پر بہت بھیڑ تھی اور دوسرے میں اسکول سے آکر کچھ تھک سا گیا تھا۔" پھر کچھ رک کر بولا "بازار سے کوئی اور چیز منگوانی ہو تو لائے دیتا ہوں۔"

ساوتری نے کہا "بس اب جا کر کپڑے بدل لے اور کھانا کھالے۔"

اب مسئلہ یہ تھا کہ بچایا ہوا جو دھیلا جیب میں موجود تھا' اسے کس طرح چھپایا جائے اور کہاں رکھا جائے؟ قمیض اگر ماں کے ہاتھ لگ گئی؟ اگر وہ کل بولی دوسرا نکر ڈال جا۔ آج میں اسے دھودوں گی۔ تو تمام زحمت مٹی میں مل جائے گی۔ اس نے کاپی سے کاغذ نکالا۔ دھیلا اس میں رکھ کر کاغذ موڑ کر پڑیا بنائی اور اسے اسکول کے بستے میں کتابوں کے نیچے چھپا دیا۔ اسکول کے بستے کو تو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ یہ سب سے محفوظ جگہ تھی۔

وہ آہستہ آہستہ کپڑے بدل کر' اسکول کے کپڑوں کی تہہ لگا کر سلیقے سے رکھنے لگا کہ ماں سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ "آج کیا ہو گیا ہے تجھے؟ بڑے جتن سے کپڑے رکھ رہا ہے تو!۔" وہ بولا "میں اب اس طرح ہی کپڑے ٹھیک کر کے رکھا کروں گا۔ اس سلسلے میں بہت بار مار کھا چکا ہوں۔ ویسے بھی کپڑے اچھی طرح رکھنے چاہئیں۔ میں بڑا بھی تو ہو رہا ہوں۔"

ساوتری کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ یہ انہونی بات کیسے ہو گئی۔ بولی "اچھا' بھگوان تجھے سمجھ دے۔" اس کے لہجے میں پیار کی جھلک تھی۔ "چل اب مونہہ ہاتھ دھو کر کھانا کھالے۔"

گورکھ دیر تک ڈرتا رہا کہ کہیں کوئی یہ نہ کہے : "دہی کم کیوں ہے؟ حلوائی نے تجھے بچہ سمجھ کر بے ایمانی کی ہے۔" جب اس نے کھانا کھالیا' والد نے کھانا کھالیا اور دہی استعمال ہو گیا تو اس کی جان میں جان آئی۔

گورکھ کے پاس ایک دھیلا یعنی آدھا پیسہ موجود تھا۔ مگر مشکل پوری طرح حل کہاں ہوئی تھی؟ شام ہو رہی تھی۔ پھر رات ہو گئی۔ ایک دھیلا اور کہیں سے ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ رات کو سوتے ہوئے بھی اسے قرار نہ تھا۔ وہ دیر تک جاگتا رہا۔ آخر سویرا ہو گیا۔ گورکھ نے ناشتہ کیا۔ اسکول جانے کا وقت آگیا۔ گورکھ اسکول پہنچ بھی گیا۔ جب بھی اس کی نظریں ستو سے ملتیں اسے محسوس ہوتا کہ ستو ہنس رہا ہے' اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ یا خدا! وہ کیا کرے؟ پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ آدھی چھٹی کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ بستے سے دھیلا نکل کر جیب میں آچکا تھا۔ مگر وہ ایک اور دھیلا کہاں سے لائے؟ کس سے مانگے؟ کون اسے دے گا؟ اس ادھیڑبن میں آدھی چھٹی ہونے میں ایک گھنٹہ رہ گیا۔ اس کے پاس گھڑی کہاں تھی کہ وہ آدھی چھٹی ہونے کا صحیح وقت معلوم کر سکتا۔ وہ چھٹی سے پہلے باہر نکلنا چاہتا تھا۔

"ماسٹر جی نمبر ایک "اس نے ماسٹر سے کہا۔ ماسٹر نے اسے اجازت دے دی تو وہ چھوٹتے ہی پیٹ کو پکڑے ہوئے باہر کی طرف لپکا۔ ڈرتا ہوا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ چورن والا اپنا خوانچہ لگا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں لڑکوں کی بھیڑ اسے گھیر لے گی اور ان میں ستو بھی شامل ہو گا۔

وہ چورن والے کے پاس پہنچ کر بولا "بھائی چورن والے مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ امید ہے کہ تم میری بات مان لو گے۔"

چورن والے نے ذرا سختی سے کہا "کیا بات ہے؟"

گورکھ بولا "میرے پاس ایک دھیلا ہے اور مجھے ایک پیسے کا آگ سے جلا چورن' آدھی چھٹی ہوتے ہی چاہئے۔ میری ایک لڑکے سے شرط لگی ہوئی ہے کہ میں آج چورن کھاؤں گا۔ تم مجھے ایک پیسے کا چورن دے دو اور یقین کرو میں تمہارا ایک دھیلے کا ادھار دو چار دن میں چکا دوں گا۔ تمہیں یقین نہ ہو تو یہ لو' میری اسکول کی ایک کتاب رکھ لو۔" گورکھ سب کچھ ایک ہی سانس میں بول گیا۔

چورن والا ہنس پڑا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔ تو میں ایک پیسہ کا چورن دے دیتا ہوں۔"

گورکھ بولا "نہیں' ابھی نہیں' یہ لو ایک دھیلا۔ جیسے ہی میں اشارہ کروں' دے دینا۔"

چورن والا اس سودے پر آمادہ ہو گیا۔

کچھ ہی دیر میں آدھی چھٹی کا گھنٹہ بجا۔ گورکھ نے چورن والے کو آنکھ ماری۔ چورن والے نے بوتلوں سے چورن نکال کاغذ پر ڈالا اور جیسے ہی ستو چورن والے کے پاس پہنچا' چورن والے نے آگ لگا کر چورن گورکھ کے حوالے کر دیا۔

گورکھ نے چورن ذرا سا چکھا۔ کتنا مزہ دار' کھٹا میٹھا۔ اور چٹپٹا چورن تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اسے دیر تک آہستہ آہستہ چاٹتا رہے۔ لیکن اس نے چٹکی بھر موںہہ میں ڈال کر ناک سکوڑی اور چورن کا کاغذ ستو کی طرف بڑھا کر کہا "لے تو ہی کھالے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

ستو کی بولتی بند تھی۔ وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے چورن لینے کے لئے ہاتھ بھی نہیں بڑھایا۔ بس پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ گورکھ نے چورن پاس ہی نالی میں پھینک دیا۔ اور اسکول کی طرف واپس چلا گیا۔

اس دن ستو مات کھا گیا تو گورکھ کو عجیب خوشی کا احساس ہوا۔ سارا دن اسکول میں ستو نے اس سے آنکھ نہ ملائی اور نہ کچھ بولا۔ ستو کو شرمسار پا کر گورکھ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ ماں سے جھوٹ بولنے' چورن والے سے ادھار لینے اور چوری کرنے کا سارا ماجرا بھول گیا۔ اس وقت وہ خوش تھا' بے حد خوش۔ کسی سے بازی جیت لینے کی پہلی خوشی۔ جس کی بنیاد جھوٹ' چوری اور مکاری پر رکھی گئی تھی۔

سنتو کا مونہہ بند کر دینے کی خوشی بہت عارضی ثابت ہوئی۔ ایک دھیلے کا قرض سر پر آپڑا تھا، جسے چکانے کا راستہ چوری اور جھوٹ کا راستہ تھا۔ ایک بار تو گورکھ وہ راستہ اختیار کر چکا تھا، مگر دوبارہ وہ اس سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ جیب خرچ کے لئے ماں سے پیسے مانگتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ کبھی کبھی ماں خود ایک آدھ پیسہ دے دیتی تھی، لیکن اس کے لئے انتظار ضروری تھا۔ اور بہتر یہی تھا کہ چورن والے کا قرض ایک دو دن میں ہی اتار دیا جائے۔ اتفاق سے گورکھ کی یہ مراد بھی پوری ہو گئی۔ ماں نے دوسرے روز پھر دہی لانے کو کہا۔ اس بار بھی گورکھ کے دل نے بہت لعنت ملامت کی۔ مگر پہلے سے کم۔ قدم بھی راہ پر تیز تیز پڑے۔ اس نے پھر ایک دھیلا بچالیا۔ اور تیسرے دن چورن والے کا قرض اتار دیا۔

دوبارہ چوری کرنے سے گورکھ کو چوری کی عادت سی پڑ چلی۔ اب وہ بے دھڑک سودے سلف میں سے کچھ پیسے بچالیتا۔ اور تو اور، اگر پورے پیسوں کا دہی خرید تا تو راستے میں ملائی اتار کر ہڑپ کر جاتا۔ ماں کہتی: ”حلوائی سے کہنا آج کل دہی میں ملائی بہت کم کر دی ہے۔“ کبھی کبھی گورکھ راستے میں ہی کچھ دہی کھا جاتا۔ وہ سوچتا: آخر بھگوان کرشن بھی تو چوری کر کے مکھن اور دہی کھاتے تھے۔ اگر وہ بھی یہی کام کرتا ہے تو کیا برا کرتا ہے؟

ہوتے ہوتے وہ ہر چیز میں پیسے بچانے اور جھوٹ بولنے کی تاک میں رہنے لگا۔ سبزی باسی اٹھا لاتا۔ تول میں کم لاتا۔ پیسے بچا کر برفی کھالیتا۔ اسکول میں آدھی چھٹی کے وقت باہر خوانچے والوں سے اکثر کچھ نہ کچھ خریدتا نظر آتا۔ گرمیوں میں اس کی پسندیدہ چیز تھی ہیرا پنا۔ وہ لال، پیلے، نیلے، شربت کی بوتلیں دیکھ کر مچل اٹھتا۔ بنانے والا پہلے برف کی سلی کو لے کر لکڑی کے ایک تختے پر آگے پیچھے پھراتا۔ لکڑی کے تختے میں تیز لوہے کا چاقو پیوست ہوتا۔ جیسے لکڑی کو رندے سے رگڑنے پر اس کے چھلکے اترتے ہیں، ویسے ہی برف مہین ریزوں میں چھل کر لکڑی کے تختے سے نیچے گرتی۔ ریزہ ریزہ برف مختلف کپوں میں بھر کر اور چاروں طرف سے دبا کر لکڑی کے ایک پتلے سے تنکے پر کھڑی کر لی جاتی۔ یعنی کہ یہ برف ایک چھتری نما شکل اختیار کر لیتی۔ پھر شربت کی بوتلوں سے نیلی، پیلی اور لال دھاریں ڈال کر برف کی چھتری پر پھول پتے یا دائرے بنا دئے جاتے۔ یہ تھا ”ہیرا پنا“ جسے گورکھ بڑے شوق سے چوس چوس کر ٹھنڈے، میٹھے ذائقے سے لطف اٹھاتا۔

گورکھ کی چوری اور جھوٹ کچھ مہینے ہی چل سکی۔ ایک دن وہ دہی لے کر گھر لوٹ رہا تھا۔ اس دن شاید

اسے وہی کچھ زیادہ لذیذ معلوم ہوا۔ گھر کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے بھی کھاتا چلا گیا۔ جیسے ہی رسوئی میں گھسا ساوتری سے آمنا سامنا ہو گیا۔ وہ کہنے لگی "آج تو دہی بہت کم ہے۔ کیا ہو گیا ہے حلوائی کو؟ بہت بے ایمانی کرنے لگا ہے! یا تو بے ایمان ہو گیا ہے؟"

گورکھ بولا "ماں کیوں بے ایمان ہونے لگا؟ حلوائی نہ تو ملائی ڈالتا ہے اور نہ ہی ٹھیک طرح دہی تولتا ہے۔"

ماں کو غصہ آگیا۔ "تو بہت بے شرم ہو گیا ہے۔ چل تجھے آئینے میں تیرا مونہہ دکھاؤں۔"

گورکھ ماں کے ساتھ ہو لیا۔ ماں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ آئینے میں گورکھ نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں کے کناروں پر کچھ سفیدی سی چیز لگی ہوئی ہے۔ ماں بولی "کھول مونہہ۔ ابھی پتہ چلتا ہے۔"

جیسے ہی گورکھ نے مونہہ کھولا' زبان پر دہی کی سفیدی موجود پائی۔ ماں نے کہا "ہائے رام! کتنا بے شرم ہو گیا ہے تو۔ تجھے کیا میں کھانے کو نہیں دیتی۔ جو چوری کر کے کھاتا ہے؟ سارے دن لڑائی جھگڑے' مار پیٹ' دنگا فساد۔ اور اب سونے پر سہاگا' چوری اور جھوٹ۔ میں تو جیتے جی مر گئی۔ پتہ نہیں بڑا ہو کر کیا کرے گا۔ چور' ڈاکو ہی بنے گا۔ آنے دے اپنے باپ کو' ساری بات نہ بتائی تو پھر کہنا۔"

چوری پکڑی گئی تھی۔ گورکھ ماں سے لپٹ کر بولا۔ "اب کی بار معاف کر دے۔ دیکھ تیرے پاؤں پکڑتا ہوں۔ اب کبھی چوری نہیں کروں گا اور نہ کبھی جھوٹ بولوں گا۔ اپنی چیزیں بھی ٹھیک طرح سے رکھوں گا۔ اور لڑائی بھی نہ کروں گا۔" وہ ایک سانس میں بہت سے وعدے کر گیا' اس ڈر سے کہ والد کو پتہ چلے گا تو بہت زیادہ پٹائی ہو گی۔

شام کو باپ دفتر سے لوٹے تو گورکھ ماں کے آگے پیچھے گھومتا رہا۔ دیکھتا رہا کہ کہیں شکایت تو نہیں کر رہی ہے۔ لیکن شاید ماں کو اس پر رحم آگیا تھا۔ ایک بار پکڑے جانے پر گورکھ ہوشیار ہو گیا۔ چوری تو کرتا' مگر سنبھل کر۔ اس وقت ایک خیال آتا کہ وہ وعدہ شکنی کر رہا ہے' جب بھی سر اٹھاتا' وہ اسے دبا دیتا۔ "اگر کھانے پینے کے لئے چوری کر بھی رہا ہوں تو کیا غضب کر رہا ہوں؟ کون سا گناہ کر رہا ہوں؟"

ستو کی نسبت گورکھ کے تعلقات شنکر سے زیادہ دوستانہ تھے۔ شنکر اسے بہت کم چھیڑتا تھا اور اس کے سامنے شیخی بھی کم بگھارتا تھا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی بدمزگی کا واقعہ ہو ہی جاتا تھا' جس کا قصوروار گورکھ کو ہی ٹھہرایا جاتا تھا۔

ایک بار شنکر کے والد پوجا کے لئے دو تصویریں خرید کر لائے۔ ایک جٹادھاری شنکر کی اور دوسری رام' لکشمن' ہنومان اور سیتا کی۔ تصویروں پر سنہرا فریم چڑھا تھا۔ دونوں ہی تصویریں گورکھ کا دل لبھا گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ان میں سے ایک تصویر کسی طرح حاصل کر لے۔ شنکر نے اسے دونوں تصویریں دکھائیں اور کہنے لگا "یہ پوجا کرنے کے لئے لائے ہیں۔" گورکھ للچائی نظروں سے تصویروں کو دیکھتا' بار بار ان پر ہاتھ پھیرتا۔ اس نے

آج تک ایسی تصویریں نہ دیکھیں تھیں۔ تصویروں کی کشش روز بروز بوھتی ہی گئی۔ ایک دن شنکر کی ماں گھر سے باہر گئی ہوئی تھی۔ شنکر بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید چھت پر تھا۔ رسوئی گھر سے ہو کر شنکر کے گھر کا دروازہ پڑتا تھا' جہاں پوجا کی چوکی پر دونوں تصویریں موجود تھیں۔ گورکھ پہلے ہی ان تصویروں کا جائزہ لے چکا تھا۔ اس روز موقع پاتے ہی گورکھ نے جٹادھاری شنکر کی تصویر اٹھائی۔ دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر اس نے تصویر کو آٹا پیسنے کی چکی پر رکھا جو قریب ہی پڑی تھی۔ اگلے ہی پل اس نے تصویر پر ایک پتھر زور سے دے مارا۔

اتفاق سے اس وقت شنکر کی ماں پاروتی آگئی اوڑاس نے یہ سب نظارہ دیکھ لیا۔ وہ زور سے چلائی : "یہ کیا کیا تو نے تصویر کا شیشہ ہی چکنا چور کر دیا۔ تصویر بھی خراب ہو گئی۔ بڑا پاپی ہے تو! بھگوان شنکر کی تصویر میرے مندر سے چوری کر کے توڑ ڈالی۔ آنے دے شام کو اپنے باپ کو۔"

پاروتی کی بلند آواز سن کر گورکھ کی ماں ساوتری بھی باہر آگئی اور سب نظارہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کہنے لگی "کیا کروں بہن' معلوم نہیں کہاں سے یہ دشٹ پیدا ہو گیا۔ اس کو ہر روز نئی نئی شرارتیں سوجھتی ہیں۔ نہ جانے کب بھگوان اسے سمجھ دے گا۔ تم ناراض نہ ہو۔ جتنے دام تصویر کے ہوں' میں تمہیں دے دوں گی۔ تم اور تصویر منگوا لینا۔"

بہت دنوں بعد ماں نے گورکھ کے کان کھینچے۔ زیادہ تر تو والد ہی اس کی پٹائی کرتے تھے لیکن اس روز ماں کو بھی غصہ آگیا۔ گورکھ کسی کو بھی تصویر توڑنے کی وجہ نہ بتا سکا۔ دراصل اس نے شیشے میں جڑی تصویر پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کو حیرت ہوئی تھی کہ وہ تصویر کے کاغذ کو کیوں نہیں چھو سکتا۔ کاغذ کے ساتھ کیا چمکتی شے جڑی ہے۔ شاید یہ شے پتھر یا ہتھوڑا مارنے سے ٹوٹ جائے اور وہ تصویر کے کاغذ کو چھو سکے۔

اپنے لال کانوں کو سہلاتے ہوئے گورکھ آہستہ آہستہ شیشے کے ٹکڑے چننے لگا۔ اسے شیشے کے وہ بے ترتیب ٹوٹے ٹکڑے اچھے لگ رہے تھے۔ کوئی ٹکڑا کسی دوسرے ٹکڑے کا ہم شکل نہ تھا۔ گورکھ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ ٹکڑے واپس نہیں جڑ سکتے؟

گورکھ نے تمام ٹکڑے چن لئے اور انہیں ایک کاغذ میں باندھ لیا۔ ماں بولی "بے وقوف! ان ٹکڑوں کا کیا کرے گا؟ کسی کے سر میں مارے گا۔ یا خون خرابا کرے گا۔

ماں کے مونہہ سے ابھی یہ لفظ نکلے ہی تھے کہ بد حواسی میں ایک چھوٹا سا شیشے کا ٹکڑا گورکھ کی انگلی میں گڑ گیا اور ٹپ ٹپ خون ٹپکنے لگا۔ گورکھ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوئی۔ خون بہتے دیکھ کر پاروتی اور ساوتری کے دلوں میں ترس ابھرا۔ ساوتری نے گورکھ کی انگلی پر گیلی پٹی باندھی پاروتی دوڑ کر روئی لے کر آئی۔ ٹکڑا کچھ زیادہ اندر تک چوٹ کر گیا تھا' کیوں کہ خون آہستہ آہستہ رس کر ہتھیلی کے اوپر تک پہنچ گیا۔ گورکھ کی نظریں ابھی تک شیشے کے ان چمکتے ٹکڑوں پر ٹکی تھیں۔ جنہیں وہ زمین سے چن نہ سکا تھا۔

چورن کے معاملے میں مات کھانے کے بعد ستو نے بہت دن کوئی ڈینگ نہیں ہانکی۔ لیکن وہ ہمیشہ کے لئے کب باز آنے والا تھا۔ ایک دن گورکھ سے کہنے لگا "معلوم ہے یہ اتنا بڑا گھر کس کا ہے؟"

"اچھی طرح معلوم ہے۔ تیرے نانا کا ہے اور کس کا ہوتا؟" گورکھ نے کہا۔

"تیرے باپ دادا کے پاس بھی کیا کوئی ایسا مکان ہے؟"

"میرا دادا کسی زمانے میں بہت امیر تھا۔ تیرے نانا کو کوڑی کے مول خرید سکتا تھا۔ ابھی تک گاؤں میں ہمارا اپنا گھر ہے' اپنی زمین ہے۔"

"گاؤں کے گھر بھی کوئی گھر ہوتے ہیں؟ کسی شہر کی بات کر۔ کسی ایسے مکان کی بات کر جیسا میرے نانا کے پاس ہے۔"

گورکھ۔ "تیرا نانا کرتا کیا ہے؟ سارے دن پان چباتا رہتا ہے اور نسوار چڑھا کر دے چھینکوں پر چھینکیں۔ اس کے ناک میں کیا چھپکلی گھسی ہوئی ہے جسے وہ ہر دم باہر نکالنے پر تلا رہتا ہے۔؟"

"تیرا باپ کیا کرتا ہے۔ سارے دن دفتر میں کرسی پر بیٹھا سر کھپاتا رہتا ہے۔ اس سے تو میرا نانا اچھا ہی ہے۔ تو بات مت پلٹ مکان کی بات کر۔"

گورکھ جھنجھلا گیا۔ "دیکھ ستو میں تیرا مکان توڑ کر گندے نالے میں بہا دوں گا!"

ستو کو بھی طیش آگیا۔ "ارے کیا بات کرتا ہے؟ تو اس مکان کی ایک اینٹ بھی نہیں ہلا سکتا۔"

گورکھ نے دھمکی دی : "اچھا دیکھ لینا۔ ایک اینٹ تو میں تجھے ضرور نکال کر دکھاؤں گا۔"

گورکھ کہنے کو تو کہہ گیا' مگر پھر سوچنے لگا: کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتا ہے۔ ستو۔ بے کار کی ڈینگ ہانک کر تنگ کرتا رہتا ہے۔ دراصل اس کی بات کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔ بہتر تو یہی ہے کہ جب وہ ایسی بے تکی باتیں کرے تو وہ چپ رہے۔ لیکن گورکھ نے ستو کو دھمکی دی تھی کہ وہ مکان کی ایک اینٹ ضرور نکالے گا۔ وہ تو اسے ہر حال میں نکالنی ہی ہوگی۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ کہاں سے اینٹ نکالی جائے۔ گھر میں سب لوگ موجود ہوتے ہیں۔ کہیں بھی ہتھوڑا چلائے گا تو سب کو پتہ چل جائے گا۔ گورکھ کو سب سے مناسب جگہ چھت کی منڈیر لگی۔ منڈیر میں کئی جگہ دراڑیں بھی پڑیں تھیں لیکن سیمنٹ کی تہہ کافی موٹی تھی۔ ہتھوڑا حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کوئلہ توڑنے کی ہتھوڑی کام آسکتی تھی۔ اس سے سیمنٹ بھی نکالا جا سکتا تھا' کیوں کہ وہ ایک طرف سے نوکیلی اور دوسری طرف سے چپٹی تھی۔ گورکھ کو معلوم تھا کہ جب وہ ستو اور شنکر اسکول چلے جاتے ہیں تو ستو کی نانی' شنکر کی ماں اور اس کی ماں تینوں مل کر پڑوسیوں کے گھر چلی جاتی ہیں یا پڑوسی عورتیں گھر میں آجاتی ہیں۔ لیکن ستو کے نانا کا کیا کیا جائے۔؟ وہ تو سارا دن گھر میں پڑا رہتا ہے یا چھت پر لیٹا رہتا ہے۔

گورکھ ابھی مناسب موقع ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ بیمار پڑ گیا۔ پہلے کھانسی ہوئی' پھر بخار۔ اس دن بیماری کا تیسرا دن تھا۔ دو دن بعد بخار اترا تھا۔ جسم میں کمزوری تھی۔ گورکھ بستر میں پڑا تھا۔ ان دنوں ستو کا باپ بھی آیا ہوا تھا۔ وہ گورکھ کا حال پوچھنے بھی آیا تھا۔ اتفاق سے اس روز ستو کا باپ' ستو کی نانی' اور ستو کا نانا' سب باہر گھومنے نکل گئے تھے۔ ستو اور شنکر اسکول میں تھے۔

دوپہر کا وقت تھا کہ ماں گورکھ کے پاس آئی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "اب تو بخار نہیں ہے۔ دیکھ' میں اور شنکر کی ماں تھوڑی دیر کے لئے پڑوس میں جا رہے ہیں۔ تو بستر میں آرام کرنا۔"

جیسے ہی وہ دونوں سیڑھیوں سے نیچے اتریں گورکھ بستر سے نیچے اترا۔ کوئلہ توڑنے کی ہتھوڑی اٹھا کر وہ چھت پر پہنچا۔ اس نے کافی محنت کے بعد منڈیر سے ایک اینٹ نکالی۔ کافی سیمنٹ اور چونا ساتھ میں اکھڑ گیا۔ گورکھ کمزوری کے مارے پسینے میں لت پت ہو گیا۔ اینٹ نکال کر اس نے منڈیر پر رکھی اور پھر واپس آکر بستر میں لیٹ گیا۔

گورکھ دو گلاس پانی پی چکا تھا' لیکن پیاس ابھی تک قائم تھی۔ دھیرے دھیرے شام ہوئی اور گھر والے سب گھر لوٹ آئے۔ سب سے پہلے شاید شنکر نے ٹوٹی دیوار دیکھی۔ وہ زور سے چلایا: "کوئی ہماری منڈیر توڑ گیا! ایک اینٹ نکلی پڑی ہے۔"

ستو کے کان کھڑے ہو گئے۔ سب چھت پر پہنچے۔ گورکھ بستر میں ہی لیٹا رہا۔ اس کے والد نیچے آئے اور اس سے پوچھنے لگے "کیا تو نے یہ حرکت کی ہے؟"

گورکھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب دو تین بار پوچھا گیا اور کوئی جواب نہ ملا تو گوپال داس زور سے چلائے: "کام اسی کا ہے۔ ستو بھی یہی کہہ رہا تھا۔"

اگرچہ گورکھ بیمار تھا' لیکن والد کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔ وہ ساوتری سے بولے "میری موٹھ والی چھڑی لانا۔" وہ موٹھ والی چھڑی بھی بڑی خوب صورت چیز تھی۔ اس کے مونہہ پر چاند کا خول چڑھا ہوا تھا۔ چھڑی موٹھ سے لے کر دم تک بڑی نازک ڈھلوان لئے گول' روغن دار اور پتلی ہوتی چلی گئی تھی۔ ہوا میں گھماؤ تو خوب لچکتی تھی۔ لیکن اگر جسم کے کسی حصے پر پڑ جائے تو اپنی خوب صورتی کا نشان چھوڑ جاتی تھی۔ گورکھ نے سن رکھا تھا کہ وہ چھڑی اس کے دادا کی تھی اور والد کو ورثے میں ملی تھی۔

ساوتری بولی "کیا کرتے ہو! لڑکا دو دن سے بخار میں پڑا ہے۔" لیکن گوپال داس کا غصہ چھڑی کو دو چار لچک دے کر ہی ٹھنڈا ہوا۔ انہیں حیرت تھی کہ دیوار سے اینٹ نکالنے کا مقصد کیا تھا؟

گوپال داس صبح' شام پابندی سے پوجا کیا کرتے تھے۔ صبح کو اٹھ کر پہلے لوگ یوگ آسن کرتے' پھر غسل

کے بعد آسن لگا کر بھجن گاتے اور آخر میں آنکھیں بند کر کے مالا پھیرتے۔ گرمی ہو یا سردی، اور کوئی کام ہو تا یا نہ ہو تا، مگر پوجا کبھی نہ چھوٹتی۔ پوجا کئے بغیر غذا کا ایک لقمہ گلے سے اتارنا ان کے لئے گناہ تھا۔ پوجا کے فوراً بعد ہی اگر ناشتے میں دو منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو گوپال داس کا غصہ ابلنے لگتا۔ "تم وقت پر مجھے ناشتہ نہیں دے سکتیں۔ مجھے سارے دن بینک میں کام کرنا پڑتا ہے۔" اگر قمیض کا کوئی بٹن ٹوٹا ہوتا: تو پھر غصے کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔

گوپال داس کو سادھو، سنتوں، مہاتماؤں اور فقیروں کی سنگت کا بہت شوق تھا۔ ذرا معلوم ہو جائے کہ کوئی مہاتما پدھار رہے ہیں تو وہ ضرور اس سے ملنے جاتے، اس کا اپدیش سنتے، کتھا کیرتن میں حصہ لیتے۔ گورکھ کی ماں پر بھی بھگتی کا شوق سوار رہتا تھا۔ وہ بھی رامائن بھگوت گیتا اور مہابھارت پڑھتی رہتی۔ یہ سب گرنتھ ہندی زبان میں گھر میں موجود تھے۔ ساوتری طرح طرح کے برت بھی رکھتی تھی گھر میں ستیہ نارائن کی ہمیشہ پوجا ہوتی جس میں محلے کی عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے۔

ایک دن گورکھ ماں سے پوچھنے لگا "راون نے رام کی سیتا کیوں چرائی۔"

"وہ بہت خوب صورت تھی۔" ماں نے جواب دیا۔

گورکھ نے جرح کی۔

اگر کسی کی بیوی خوب صورت ہو تو کیا اسے چرا لیتے ہیں؟ راون کے حرم میں تو بہت سی خوب صورت بیویاں موجود تھی۔"

"اسی لئے تو راون کا ناش ہوا کہ اس نے رام کی سیتا چرالی۔" ماں نے سمجھایا

"لیکن راون سیتا کو کیوں اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا؟ اس کے پاس تو بہت سے نوکر تھے۔ وہ تو راجا تھا۔"

ماں چپ ہو گئی۔ ایک دو پل بعد بولی۔ "ابھی تم اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ کسی کی عورت پر بری نظر رکھنا اور اس کی چوری کرنا مہاپاپ ہے۔"

گورکھ بھی چپ ہو گیا، اگرچہ اسے ماں کی بات کچھ کھوکھلی سی لگی۔

گوپال داس ایک مہاتما کو بہت مانتے تھے۔ ان کا نام تھا جگ جگ سوامی (یعنی دنیا کے مالک)۔ گوپال داس کو اپنے سے زیادہ جگ جگ سوامی پر اعتماد تھا۔ وہ اکثر کہتے کہ جگ جگ سوامی کا وردان ضرور پھل لائے گا۔ وہ اپنے کو بھاگیہ وان سمجھتے کہ ان کی جان پہچان جگ جگ سوامی سے ہوئی۔

جگ جگ سوامی ایک طرح خانہ بدوش تھے۔ کبھی ایک بھگت کے گھر قیام تو کبھی دوسرے گھر پر ڈیرا۔ ایک مقام پر زیادہ دن نہ ٹھہرتے۔

ان دنوں جگ جگ سوامی گوپال داس کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ ان کے رہنے کے لئے چھت پر علیحدہ کمرہ

خالی کر دیا گیا تھا۔ وہ چھت پر ہی رہتے تھے۔ کھانا بھی چھت پر پہنچا دیا جاتا تھا۔ بہت کم نیچے اترتے تھے۔ گوپال داس کہتے : مہاتما مہان یوگی ہیں۔ تھوڑے سے پھل' دودھ اور سبزی ہی غذا ہے۔ باقی وقت بھجن پوجن کرتے رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی دھارمک کتاب پڑھتے رہتے ہیں۔ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ بھگوان سے بات کر چکے ہیں۔ بھگوان کا نور ان کے دل و دماغ میں سمایا ہوا ہے۔ ان کا من ہیرے کی طرح روشن ہے' گنگا کی طرح پاک ہے۔"

گورکھ کی ستو اور شنکر سے فقط ضد' بحث ہی نہیں چلتی تھی۔ دوستی بھی گہری تھی۔ اکثر وہ مل جل کر شرارتیں بھی کرتے۔ ایک دن گورکھ کے دماغ نے ایک معصومانہ شرارت سوچی۔ اس نے ستو اور شنکر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ وہ سب تالاب پر جا کر ایک کنول کا پھول لائیں گے' کنول ڈنڈی سمیت۔ کنول کی ڈنڈی کو چھوٹا چھوٹا کاٹ کر دھاگے میں پرو کر اس کی مالا بنائیں گے اور کنول کا پھول بیچ میں لٹکا دیں گے۔ پھر وہ مالا مہاتما کو پیش کریں گے۔ کنول کا پھول اور کنول ڈنڈی حاصل کرنا کافی مشکل ثابت ہوا۔ شہر کے باہر ایک تالاب میں گھس کر گورکھ نے گندے پانی سے کنول کا پھول حاصل کیا۔ ماں کی سوئٹر بننے کی لمبی سلائی چرائی۔ دادی کے سوت کے گولے سے دھاگے نکالے۔ دھاگوں کو بل دے کر مضبوط ڈوری تیار کی۔ چاقو سے ڈنڈی کو کاٹ کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنائے اور مالا تیار کی۔

دوپہر کے تین بجے ہوں گے۔ مالا تو پچھلے دن ہی تیار ہو گئی تھی۔ اسے پانی میں بھگو کر تر و تازہ رکھا گیا تھا۔ اب ستو' شنکر اور گورکھ مالا لے کر چھت پر پہنچے۔ مہاتما کے کمرے میں داخل ہونے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ شاید آدمی کے پاؤں پڑتے ہی کمرہ ناپاک ہو جاتا ہو گا۔ سب گھر والے کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر ہی مہاتما سے بات کرتے تھے۔ ان کا کھانا بھی کمرے کی دہلیز کے باہر رکھ دیا جاتا تھا اور خالی برتن کمرے کے باہر سے اٹھائے لئے جاتے تھے۔ اس لئے مالا پیش کرنے کے لئے ایک لمبا لکڑی کا ٹکڑا تلاش کیا گیا' جس کے سرے پر مالا کو لٹکا کر اسے مہاتما کی طرف بڑھا دیا گیا۔ اس وقت مہاتما رام نام جپ رہے تھے۔

ستو اور شنکر نے مالا بنانے اور کمل ڈنڈی لانے میں ضروری گورکھ کی مدد کی تھی' مگر وہ مہاتما کو مالا پیش کرنے کے کام سے دور ہی رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے سب کا لیڈر گورکھ تھا۔ مالا کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر مہاتما کا چہرہ تمتما اٹھا۔ غصے کی لہر ان کے چہرے کو بگاڑ گئی وہ کچھ دیر کے لئے بھجن بھول گئے۔ ابھی مالا ان تک پہنچی نہ تھی کہ جگ سوامی نے ہاتھ بڑھا کر لکڑی چھین لی اور بڑبڑاتے ہوئے مالا کو کھڑکی کی طرف اچھال دیا۔ مالا کھڑکی میں لگی لوہے کی چھڑوں سے لپٹ گئی اور کھڑکی کا ہار بن گئی۔ لکڑی اٹھا انہوں نے زور سے گورکھ کی طرف پھینک دی اور غصے میں بلند آواز سے بولے۔ "دشٹ کہیں کے! ذرا شام ہونے دو۔"

گورکھ سنجیدہ چہرہ لئے دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ ستو اور شنکر پہلے ہی رفو چکر

ہو چکے تھے۔ گورکھ سوچنے لگا : تو یہ ہے مہاتما کا اصل روپ' جو ایک ذرا سی حرکت پر اتنا پریشان ہو گیا۔ گورکھ نے سنا تھا کہ مہاتما نے گھر بار چھوڑ رکھا ہے۔ اپنی نئی بیاہتا بیوی چھوڑ رکھی ہے۔ دنیا چھوڑ رکھی ہے۔ لیکن غصہ اور گھمنڈ تو نہیں چھوٹا۔ شام کو آنے والے طوفان سے بے خبر گورکھ نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑا۔ مالا کی الجھنیں اس کے گلے کا پھندہ بنتی گئیں۔

جیسے ہی گوپال داس کام سے آکر کھڑے ہوئے فوراً" ان کی' ستو کے نانا کی' اور شنکر کے والد کی چھت پر طلبی ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد تینوں نیچے اترے۔ گوپال داس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ غصے سے کانپ رہے تھے۔ چھٹتے ہی دو چار گھونسے اور مکے گورکھ کے جڑ دیئے۔

مکے پر مکا برستا رہا تو گورکھ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ گوپال داس کے ہاتھ شاید مکے اور تھپڑ برسا کر تھک گئے تھے۔ انہوں نے چاندی کی موٹھ والی چھڑی طلب کی۔ ساوتری نے ڈرتے ڈرتے چھڑی لا کر پیش کی اور کہنے لگی "بہت مار لیا اب بس بھی کرو۔" لیکن گوپال داس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ چھڑی کئی بار ہوا میں اڑی اور گورکھ کے جسم کو چوم گئی۔ اب ساوتری سے نہ رہا گیا۔ وہ چلائی: کیا مار ہی ڈالو گے بچے کو!"

چھڑی کی حرکت تو رک گئی لیکن گوپال داس کے غصے کا بہاؤ جاری رہا۔

گورکھ رویا تک نہیں۔ اس کے سارے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ ہاں چھڑی پڑتے وقت ذرا سا "اف" کر لیتا۔ مار سہنے کی طاقت سے ہی شاید گوپال داس کو زیادہ شہہ ملی ہوگی۔ ابھی سزا باقی تھی۔ وہ گورکھ کو گھسیٹتے ہوئے چھت پر لے گئے۔ انہیں زیادہ گھسیٹنے کی بھی ضرورت نہ پڑی' کیوں کہ گورکھ جیسے رضامندی سے دھکے کھاتا' کان کھنچواتا ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ کھردری بان کی رسی جو چارپائی کا نچلا حصہ بننے کے کام آتی ہے' گوپال داس کے ہاتھ میں آگئی۔ پہلے گورکھ کے ہاتھ باندھے گئے اور اس کے بعد پاؤں۔ رسی میں کئی گھماؤ ڈال کر گورکھ کو ستون کے ساتھ کھڑا کر کے باندھ دیا گیا' کچھ اس طرح جیسے کوئی بیل کو باندھتا ہے۔ ماں کو حکم دیا گیا:

خبردار جو اس بدمعاش کو دو دن تک کچھ بھی کھانے کو دیا۔"

ستو کے نانا نے تو شاید ستو کو دو چار تھپڑ ہی لگائے ہوں گے۔ وہ اس لئے بچ گیا کہ اس نے سارا الزام گورکھ کے سر تھوپ دیا۔

تھوڑی دیر میں شنکر کے والد بھی شنکر کو گورکھ کے پاس اگلے ستون سے باندھ گئے۔ لیکن شنکر کے صرف ہاتھ بندھے تھے اور پٹائی کا کوئی نشان نظر نہیں آرہا تھا۔

شنکر روتے ہوئے بولا "کرے کوئی بھرے کوئی۔"

گورکھ کے موںہہ میں زبان کی حرکت بند ہو گئی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ شنکر کی رسی کافی ڈھیلی تھی۔ دس پندرہ منٹ ستون کے ساتھ لگے کھڑے رہنے کے بعد وہ بیٹھ گیا۔ کچھ وقت اور گزرا تو اس کا باپ اسے

رہا کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔

ستون سے بندھے گورکھ کو تقریباً" دو گھنٹے ہونے کو آئے اس کی ساری کمر دکھ رہی تھی۔ بدن پر جہاں جہاں چھڑی پڑی تھی، لمبے لمبے یاقوتی نشان چھوڑ گئی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ گورکھ کی زبان اور حلق سوکھے جا رہے تھے۔ سورج اب بھی جل رہا تھا۔ اور جلا رہا تھا۔ آخر رفتہ رفتہ سورج غروب ہونے لگا۔ کھڑے کھڑے گورکھ کے پاؤں ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح بندھن کچھ ڈھیلے ہو جائیں، تا کہ وہ ذرا ستون کے سہارے بیٹھ سکے۔ مگر خود کو ان رسیوں کے جال سے چھڑانا مشکل تھا۔ کیوں کہ ہاتھ اور پاؤں الگ الگ باندھ دیئے گئے تھے۔

کافی دیر کی کوشش کے بعد گورکھ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ ستون پر رسی کا ایک بل ذرا ٹیڑھا میڑھا پڑا تھا۔ وہ بل سیدھا ہوتے ہی رسی کچھ ڈھیلی ہو گئی اور گورکھ ستون کے سہارے بیٹھ گیا۔

نیچے رسوئی سے کھانا پکانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ گورکھ کا خیال تھا کہ والد کو اس پر رحم آجائے گا اور کم سے کم کھانے سے پہلے تو اسے ضرور آزاد کر دیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ کھانے کا وقت گزر گیا۔ نیچے سے مہاتما کے لئے کھانے کی تھالی چھت پر آگئی تھی۔ مہاتما نے بھی کھانا کھا کر تھالی کمرے کی دہلیز کے باہر کی طرف سرکا دی۔

گورکھ کے ساکت خیالات میں دوبارہ ہل چل شروع ہوئی۔ اس کے دل میں مہاتما کے لئے سخت قسم کی نفرت پیدا ہوئی۔ کس طرح کا مہاتما ہے کہ ایک بچے کو اتنی مار پڑی، اور کچھ نہیں بولا۔ چھ گھنٹے سے ستون سے بندھا بھوکا پیاسا بیٹھا ہوں، لیکن اس نے کچھ نہیں کہا اور اب مزے سے اپنا کھانا کھا کر چارپائی پر آرام کر رہا ہے۔ لعنت ہے ایسے مہاتما پر! اس مہاتما سے کہیں زیادہ تو وہ مہاتما ہے جس نے ذرا سی معصوم حرکت پر اتنی مار کھائی اور اف تک نہ کی۔ بھگوان کی مار ایسے مہاتما پر!

ستو اور شنکر کب کے کھا پی کر اور سارا قصہ بھول کر گلی میں کھیل رہے تھے۔ کیسے خود غرض دوست تھے! بیٹھے بیٹھے رات کے آٹھ بجنے کو آئے، لیکن کوئی گورکھ کے پاس نہ پھٹکا: صرف ساوتری ایک بار اسے دیکھنے آئی اور اسے ستون کے سہارے بیٹھا دیکھ کر واپس نیچے چلی گئی۔ گورکھ سوچنے لگا : آج یہ بے جان ستون سب جان داروں کو مات کر گیا۔ اسی نے مجھے کچھ سہارا دیا۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ چھت پر چارپائیاں بچھنے لگیں۔ ستو اور شنکر اپنی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے اور شاید سو بھی گئے۔ روزانہ چھت پر چارپائیاں بچھانا اور بستر لگانا گورکھ کا کام تھا، لیکن اس دن ساوتری چارپائیاں بچھا کر، بستر لگا کر چلی گئی تھی۔ اس کا بستر نہیں بچھایا گیا تھا، اسے خیال آیا کہ شاید ساری رات اسے بھوکے پیاسے ستون کے سہارے ہی کاٹنی پڑے گی۔ اس نے مونہہ پھیر کر بے جان ستون کو چوم لیا۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ والد مہاتما سے دھرم اپدیش سن رہے تھے۔ باتوں کی دھیمی آواز گورکھ کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ اور سوچ رہا تھا کہ اس کی آہ گوپال داس اور مہاتما کا دھرم پھونک ڈالے گی۔

نیند پر کس کا بس چلا ہے؟ اگرچہ گورکھ بھوکا پیاسا تھا۔ اور اس کے جسم کا عضو عضو دکھ رہا تھا' مگر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

گورکھ کی آنکھ کھلی تو اسے گوپال داس کے پاؤں نظر آئے۔ شاید وہ کچھ دیر سے قریب کھڑے تھے۔ بولے "اٹھ کھڑا ہو۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نہ آنسو تھے' نہ شکایت۔ نہ اس کی گردن جھکی تھی نہ اس کا دل۔ ہاں جسم ضرور دکھ رہا تھا اور پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔

گوپال داس کا خیال تھا کہ گورکھ گڑگڑائے گا' معافی مانگے گا' رسی کھولنے کے لئے کہے گا۔ لیکن جب گورکھ نے ایسا کچھ نہیں کہا تو قدرے حیران ہو کر انہوں نے رسیاں کھول دی اور بڑے صوفیانہ انداز سے بولے "مہاتماؤں کی بددعا نہیں لینی چاہئے۔ تم نے جو کیا بہت ہی غلط کیا۔ تمہیں خود پر شرمندہ ہونا چاہئے۔"

گورکھ کے مونہہ سے پھر بھی ایک لفظ نہ نکلا۔ وہ آنکھیں پھاڑے باپ کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا "بچوں کی بددعائیں بھی نہیں لینی چاہئیں۔" گوپال داس کہہ رہے تھے۔

چلو' چل کر مہاتما سے معافی مانگو۔" وہ خاموش' باپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ معافی مانگنے والی اس نے کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ کیوں معافی مانگے؟ معافی تو اس بدمعاش مہاتما کو مانگنی چاہئے۔ ضرور اس کی ہائے مہاتما کو تباہ کر دے گی۔ لیکن بھوک سے پیٹ میں چوہے کود رہے تھے۔ بھوک بری بلا ہوتی ہے۔

جیسے ہی گورکھ معافی مانگنے کے لئے جھکا' مہاتما نے اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لئے۔ کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ۔ وہ ایک کھونٹی والی کھڑاؤں پہنتا تھا اور اس کے بہت سے فائدے بیان کیا کرتا تھا۔ گورکھ سوچنے لگا کہ اگر وہ کھڑاؤں کی کھونٹی میں پھنسا ہوا مہاتما کا انگوٹھا چاقو سے کاٹ کر صاف کر دے تو؟

ساوتری رسوئی میں تھی۔ کھانے کے برتن دھل کر اپنی جگہ پہنچ چکے تھے۔ چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ سالن اور روٹی ماں نے نکال کر گورکھ کے سامنے رکھی تو وہ بولا "ماں' تم بھی کھالو۔" اس کا خیال تھا کہ اسے کھلائے بغیر ماں نے کھانا نہ کھایا ہو گا۔

ماں بولی "میں نے کھا لیا ہے۔ تمہارے لئے رکھا ہے۔ تم کھالو۔"

وہ ماں کے چہرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ کھانا کھا کر وہ چھت پر لوٹ آیا اور چارپائی بچھا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ساوتری سرسوں کا تیل اور ہلدی گرم کر کے لائی۔ بولی "قمیض اتار' ذرا چوٹ پر لگا دوں۔"

اس نے ماں کا ہاتھ زور سے جھٹکا تو تیل کی کٹوری اور ہلدی کی پوٹلی زمین پر آ پڑی۔ ساوتری نے دونوں

چیزیں اٹھا کر قریب ہی رکھ دیں اور بستر پر لیٹ گئی۔

تیسری جماعت کا سالانہ امتحان ہو چکا تھا۔ اسکول میں چھٹیاں تھیں۔ گورکھ کو کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ خاص طور سے پریوں کی کہانیاں۔ اڑنے والے گھوڑے، شہزادے، محل، بیابان جنگل کی دنیا۔

گلی ڈنڈے کے کھیل کا شوق پیدا ہوا تو گورکھ اسی کھیل میں مست رہنے لگا۔ ایک بار اس نے ستو اور شنکر سے کہا "بڑے دغاباز دوست ہو۔ مجھے اتنی مار پڑی اور میں ستون سے بندھا رہا اور تم لوگ کھاپی کر، کھیل کود کر آرام سے بستر میں سو گئے۔"

وہ بولے "ہم کیا کر سکتے تھے؟ تمہارے باپ کو ہی وہ مہاتما بڑے اچھے لگتے ہیں میرا باپ تو کہتا ہے وہ پاکھنڈی ہے "گورکھ بولا" اور کچھ نہیں تو کم سے کم ایک گلاس پانی تو پلا سکتے تھے۔ پاس آکر تو کھڑے ہو سکتے تھے۔

"وہ بولے "ہمیں تمہارے پتا جی سے ڈر لگتا ہے۔"

کڑی سے کڑی سزا گورکھ کی شرارتیں نہ روک سکی۔ لیکن مہاتما کو پھول مالا پیش کرنے کی معصومانہ حرکت کے مقابلے میں سب شرارتیں ہیچ تھیں۔

امتحان کا نتیجہ نکلا تو گورکھ اوپر سے دوسرے یا تیسرے نمبر پر تھا اور ستو اور شنکر نیچے سے دوسرے یا تیسرے نمبر پر! گوپال داس اسی خوش فہمی یا وہم میں مبتلا رہتے کہ ان کی استادی کی وجہ سے گورکھ اچھے نمبر حاصل کرتا ہے۔ دراصل ان کے پڑھانے کا طریقہ چاندی کی موٹھ والی چھڑی چلانے سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ذرا سی غلطی پر ڈانٹ : "اسے پانچ بار لکھو۔ اس کو بیس بار رٹو۔ جب تک شام کو یاد کر کے مجھے نہ سنالو، سونا منع ہے، کھانا منع ہے۔ یوں پڑھائی میں ہوشیار ہونے کے باوجود گورکھ کو پڑھائی کے سلسلے میں بھی مار کھانی پڑتی، جب کہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کے والد بھی کوئی خاص پڑھے لکھے نہ تھے۔ کالج کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ میٹرک پاس کر کے ملازم ہو گئے تھے۔

چوتھی جماعت میں گورکھ کا ٹکراؤ ایک بھاری بھرکم لڑکے سے ہوا جو جسمانی طور پر گورکھ سے بہت بڑا لگتا تھا۔ دراصل عمر میں بھی وہ گورکھ سے بڑا تھا۔ تین بار فیل ہو چکا تھا۔ سب اسے "بنیا" کہہ کر پکارتے تھے۔ کالا رنگ، چہرے پر چیچک کے داغ، لمبا سا قد۔ اس کے باپ کی پنساری کی دکان تھی۔ بنئے کو پڑھائی کی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ اسکول صرف وقت گزاری کے لئے آتا تھا۔ اس کے کچھ خاص دوست اسے گھیرے رہتے تھے۔ وہ سب ٹولی بنا کر گھومتے۔ دوسرے لڑکوں کو تنگ کرتے۔ کبھی کبھی ہاتھاپائی کی نوبت آجاتی۔ گندی، اوچھی باتیں کرتے۔ کچھ ہی دنوں میں گورکھ سمجھ گیا کہ بنئے اور اس کی ٹولی سے بچ کر رہنا چاہئے۔ ستو اور شنکر نے بھی اسے چوکنا کیا کہ بنئے سے دشمنی مول نہ لے۔ وہ بہت سرپھرا اور دبنگ ہے۔ کئی بار فیل ہونے سے اسے ماسٹر کا بھی ڈر نہیں رہا ہے۔

سب اس کی شکایت کرنے سے ڈرتے ہیں۔ بنئے کو پتہ چل جائے کہ کسی نے اس کی شکایت کی ہے تو وہ اسے نہیں چھوڑتا۔ کسی نہ کسی بہانے اسکول کے اندر یا اسکول کے باہر اس کی ٹولی مل کر شکایت کرنے والے کی ایسی پٹائی کرتی ہے کہ بولتی بند!

بنئے نے ایک لڑکے کے بازو کی ہڈی توڑ دی تھی۔ کافی جھگڑا فساد ہوا۔ لڑکے کے ماں باپ ہیڈ ماسٹر سے بھی ملے۔ بنیا صاف مکر گیا۔ اس کی ٹولی کے سب لڑکے اس کے ہم نوا ہو گئے۔ اور ٹوٹی ہڈی والے لڑکے کے حق میں کسی نے گواہی نہ دی۔ اس واقعہ سے بنئے کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا۔ گھر میں کھانے پینے کی کمی نہیں۔ پڑھائی کر کے اسے کیا کرنا ہے۔ ایک دو بار اور فیل ہوا تو اسکول چھوڑ کر دکان پر بیٹھ جائے گا۔

یہ ساری باتیں سن کر گورکھ کے دل میں بھی ایک خوف سا بیٹھ گیا۔ وہ بنئے کے اور اس کی ٹولی کے مونہہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔ عادت کے مطابق بنیا ہر نئے لڑکے کو چھیڑتا۔ سب لڑکے اس کی طاقت سے مرعوب تھے' اس لئے چپ ہو جاتے۔ گورکھ بھی خاموش رہتا۔

تیسری کلاس پاس کرنے کے بعد گورکھ کو تختی ملتانی سے چھٹی مل گئی تھی۔ قلم اور سیاہی کا استعمال شروع کروا دیا گیا تھا۔ ٹاٹل کے قلم سے اردو لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ انگریزی کی اے بی سی بھی شروع ہو گئی تھی۔ انگریزی چار لائنوں والی کاپی پر نب لگے قلم سے لکھی جاتی تھی۔ ان کاپیوں کی جلد نرم کاغذ سے بنی ہوتی تھی اور لکھتے وقت کاپی کے کاغذ لچک جاتے تھے۔ عموماً" لڑکے گتے یا لکڑی کا ٹکڑا ساتھ لاتے' جس پر کاپی رکھ کر لکھنے کی مشق کرتے۔

گورکھ گھر سے ایک گتا اٹھا لایا' جس کی دوسری جانب ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر چپکی ہوئی تھی۔ بنئے کی نظر اس تصویر پر پڑ گئی تو آدھی چھٹی کے وقت وہ گورکھ کے ہاتھ سے تصویر چھین کر لے گیا اور اپنی ٹولی کے کسی لڑکے کو تھما دی۔ کچھ ہی دیر میں وہ تصویر ہاتھوں گھوم گئی اور واپس گورکھ کے پاس پہنچ گئی۔ یکایک بنئے کو نہ جانے کیا سوجھی کہ دائیں ہاتھ کی مٹھی بنا کر' ہاتھ اوپر اٹھا کر بولا۔ "پاؤڈر والی۔ ہائے ہائے!" اس کی ٹولی کے سب لڑکوں نے اس کا ساتھ دیا اور اسی کی طرح ہاتھ اوپر اٹھا کر چلائے : "پاؤڈر والی' ہائے ہائے!"

اس روز کے بعد گورکھ وہ تصویر دوبارہ اسکول میں نہ لایا۔ مگر تصویر اپنا کام کر چکی تھی۔ بنئے کی ٹولی نے گورکھ کا نام "پاؤڈر والی" رکھ دیا۔ جب بھی چھٹی ہوتی یا وہ اکیلا ہوتا تو بنئے کی ٹولی اسے گھیر لیتی اور سب زور زور سے نعرے لگاتے : "پاؤڈر والی' ہائے ہائے!"

ایک روز گورکھ اسکول سے گھر لوٹ رہا تھا۔ ستو اور شنکر بھی اس کے ساتھ تھے۔ یکایک بنئے کی ٹولی سامنے آ گئی۔ پھر کیا تھا' وہ آگے آگے اور ٹولی پیچھے پیچھے۔ سب نعرے لگاتے ہوئے پیچھا کر رہے تھے : "پاؤڈر والی' ہائے ہائے!" محلے کی گلی کا موڑ آتے ہی بنئے کے ساتھی رفو چکر ہو گئے۔ گورکھ ستو اور شنکر سے کہنے لگا

"کوئی ترکیب نکالو۔ اس بنئے نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ کیا کیا جائے؟"

ستو اور شنکر بولے "بہتر ہے کہ تم چپ رہو۔ جھک مار کر اپنے آپ ہٹ جائے گا۔ مار پیٹ میں ہم ساتھ نہ دیں گے۔"

گورکھ نے بھی یہ سوچ کر صبر کر لینا مناسب سمجھا کہ اسکول صرف چار جماعتوں تک ہے "کچھ دن کی یہ مصیبت اور سہہ لی جائے، پھر بنئے سے اور اسکول سے چھٹکارا ہو جائے گا۔ یہ اسکول ہے بھی بے کار۔ نہ ماسٹر پروا کرتے ہیں، نہ طالب علم سنتے ہیں۔"

ایک روز آدھی چھٹی کا گھنٹہ بجا تو گورکھ کلاس کے کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ تقریباً" سب لڑکے پہلے ہی باہر نکل گئے تھے۔ آدھی چھٹی کے وقت ماسٹر بھی کھانا کھانے یا چہل قدمی کرنے کے لئے غائب ہو جاتا تھا۔ یکایک بنیا اپنی ٹولی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ دو لڑکوں نے گورکھ کے بازو پکڑے اور دو نے اس کے پاؤں اور زبردستی اسے زمین پر لٹا دیا۔ بنیا کھڑا ہنستا رہا۔ ایک لڑکے نے سیاہی کی دوات کھولی اور دوسرے نے اپنا اردو لکھنے کا موٹا قلم نکالا۔ گورکھ سمجھ نہ پایا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ شاید اس کے کپڑوں پر سیاہی الٹ دی جائے گی۔ لیکن ایک کے ہاتھ میں قلم دیکھ کر وہ ٹھیک اندازہ نہ لگا سکا۔ اچانک جس لڑکے کے ہاتھ میں قلم تھا، وہ قلم سیاہی میں ڈبو ڈبو کر گورکھ کی ران پر کچھ لکھنے لگا۔ پھر دوسری ران کی باری آئی اور اس پر بھی کچھ لکھ دیا گیا۔ لکھائی ختم ہوتے ہی چاروں لڑکوں کی گرفت ڈھیلی پڑی تو گورکھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا، ایک ران پر لکھا تھا : "بنیا" اور دوسری پر "پاؤڈر والی۔" بنیا ہنسا اور بولا " آج سے پاؤڈر والی میری۔"

وہ سات تھے اور گورکھ اکیلا۔ پھر بھی وہ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ بولا "جا کر اپنے باپ کی ران پر لکھ!" اس کا کہنا یہ تھا کہ بنئے کی ٹولی کے سب لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن ایک دم بنیا چلایا۔ "ہٹو! بھاگ جاؤ! میری پاؤڈر والی کو مت مارو۔"

ٹولی کے لڑکے ہنستے ہنستے ہٹ گئے اور بنیا مسکراتا ہوا چلا گیا۔ گورکھ نے کاپی سے کاغذ پھاڑا اور نیکر کو بچا کر اپنی دونوں رانیں صاف کیں۔ پھر نل کے پانی میں کاغذ گیلا کر کے رانوں پر پھیرتا رہا۔ اس کے بعد بھی سیاہی کے کچھ داغ باقی رہ گئے۔

گورکھ کے گھر سے کافی دور آرام باغ تھا۔ چھٹی والے دن کبھی کبھی گورکھ اپنے باپ کے ساتھ صبح یا شام کو سیر کو نکل جاتا۔ پھول، پتے، پیڑ، ہری گھاس، ترتیب سے بنی کیاریوں میں رواں پانی اور رنگا رنگ پھول۔ جگہ جگہ کیاریوں کے کنارے تاکید کے طور پر لکڑی کی پٹی یا لوہے کے چھوٹے سے بورڈ پر لکھا رہتا : پھول توڑنا منع ہے۔ "خدا نے پھولوں کو خوب صورت بنا کر ان کی زندگی کم کر دی۔ کوئی انہیں مندر میں چڑھانے کے

لئے توڑلیتا ہے توکوئی پوجا کے لئے' کوئی سجاوٹ کے لئے اور کوئی خوشبو کے لئے۔ گورکھ چوری سے پھول توڑ کر جیب میں رکھ لیتا۔ اسے احساس ہوتا کہ ایک خوب صورت اس کے دل کے قریب ہو گئی ہے۔

ایک روز گوپال داس باغ میں کسی مہاتما کا لیکچر سننے گئے۔ گورکھ بھی ساتھ تھا۔ وہ دونوں باغ میں پہنچے تو مہاتما ایک اونچے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ نیچے دریاں بچھی تھیں اور لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ گورکھ کو لیکچر میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ باغ میں گھومنا چاہتا تھا۔ اس نے باپ سے اجازت مانگی: "میں باغ میں گھوم آتا ہوں۔ آپ لیکچر سن لیجئے کچھ ہی دیر میں آجاؤں گا۔

گوپال داس نے کچھ سوچ کر کہا "ٹھیک ہے مگر زیادہ دور مت جانا اور ایک گھنٹے کے اندر ضرور واپس آجانا۔"

گورکھ مہاتما کا ڈیرا چھوڑ کر کچھ ہی دور بڑھا تھا کہ اسے بنیا اور اس کی ٹولی دکھائی دی۔ بچنے کی کوشش بے کار تھی' کیوں کہ انہوں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ آمنا سامنا ہوتے ہی بنیا بڑے نرم لہجے میں بولا میں برا لڑکا نہیں ہوں۔ بس مجھے ذرا سا ہنسی مذاق اچھا لگتا ہے۔ اس میں برائی بھی کیا ہے؟

بنئے کے ساتھیوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ بولے "ہم میں سے کوئی برا نہیں ہے۔ ہم سب ہی اچھے ہیں۔ لوگ ہمیں برا ضرور سمجھتے ہیں۔"

گورکھ کچھ نہ بولا۔ بس سوچتا رہا کہ آج وہ سب کیوں میٹھی میٹھی باتیں کر رہے ہیں۔ دال میں ضرور کالا ہے۔ اس کو چپ پاکر بنیا پھر بولا "میری بات مانو۔ آج سے ہماری ٹولی میں شامل ہو جاؤ۔ بہت مزہ رہے گا میری پارٹی سے سب ہی ڈرتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ طاقت کے آگے سب سر جھکاتے ہیں۔ تم ہماری پارٹی میں مل جاؤ' پھر دیکھو تمہاری کتنی عزت بڑھے گی۔"

گورکھ سنتا رہا اور سوچتا رہا : خاک عزت بڑھے گی۔ مانا کہ وہ ستو اور شنکر سے لڑتا ہے' شرارتیں کرتا ہے' ضد بازی کرتا ہے' لیکن وہ بنئے اور اس کی پارٹی سے بالکل جدا ہے۔ اس کی حرکتیں بڑی حد تک معصومانہ ہیں۔ ستو سے اسے ضد بازی اور حسد ضرور ہے' لیکن سارا قصور اس کا تو نہیں۔ کیوں ستو بار بار اسے جتاتا ہے کہ اس کا نانا' اس کا باپ بہت امیر ہیں' اس کے پاس بہت سی اچھی چیزیں ہیں جن سے وہ محروم ہے۔ ورنہ اسے ستو سے کوئی دشمنی نہیں۔ ستو سے بھی امیر لڑکے کلاس میں موجود ہیں۔ وہ کون سا ان سے حسد کرتا ہے۔ لیکن بنیا جو کرتا ہے' کوری غنڈا گردی ہے۔

کوئی جواب نہ پاکر بات پلٹتے ہوئے بنیا پھر بولا "چلو' سوچ کر جواب دے دینا۔ میں کب کہتا ہوں کہ تم آج ہی میری ٹولی میں شامل ہو جاؤ۔ جب بھی چاہو' ہو جانا۔ اور آج سے میری ٹولی میں سے کوئی بھی تمہیں تنگ نہ کرے گا۔"

گورکھ نے کہا "اچھا، سوچ کر بتاؤں گا۔" (وہ سوچ رہا تھا، برے کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔ کہاں مصیبت میں پھنسا کہ سیر کرنے آیا اور بنئے کی ٹولی کا سامنا ہو گیا)۔

بنیا بولا "آج سے ہم دوست ہیں۔ اکیلے آئے ہو کیا؟"

گورکھ نے جواب دیا : اکیلا نہیں ہوں۔ میرے پتا جی ساتھ ہیں۔ وہ اس کونے میں جو تنبو لگا ہے، وہاں کوئی مہاتما لیکچر دے رہے ہیں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے گھومنے چلا آیا۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں واپس چلتا ہوں۔"

بنئے نے کہا "بڑی اچھی بات ہے کہ تمہارے پتا جی دھرم کرم کا اتنا دھیان رکھتے ہیں۔ سب کو بھگوان کی پوجا کرنی چاہئے۔ یہاں باغ میں تین مندر ہیں۔ تم نے نہ دیکھے ہوں تو ہم تمہیں دکھائے دیتے ہیں۔ چلوگے ہمارے ساتھ؟"

گورکھ سوچتے ہوئے بولا "میں نے مندر تو دیکھے ہیں، جو ساتھ ساتھ ہی کھڑے ہیں۔ تیسرا مندر تو میرے خیال میں باغ میں کوئی نہیں ہے۔"

بنئے نے اپنی ٹولی کے لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہے کیوں نہیں؟ چلو ہم دکھاتے ہیں۔"

گورکھ بنئے کی ٹولی کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دور جا کر ٹولی نے ایک مندر کی طرف اشارہ کیا، پھر دوسرے مندر کی طرف اشارہ کیا۔

گورکھ بولا "میں نے کہا تھا نا کہ یہاں بس دو ہی مندر ہیں۔ یہ دونوں میں نے دیکھ رکھے ہیں۔"

بنیا ہنس پڑا۔ بس یہی تو بات ہے سب لوگ یہ دو مندر دیکھ کر ہی چلے جاتے ہیں۔ تیسرے تک کوئی کوئی ہی پہنچ پاتا ہے۔ وہ اتنا خوب صورت تو نہیں، لیکن ہے بہت پرانا۔ مندر نیا ہو یا پرانا ہے تو مندر۔ دراصل پرانا مندر زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہو کہ اس مندر میں کون سے دیوی، دیوتا کا سایہ ہے....."

گورک کو بنئے سے یہ امید نہ تھی کہ وہ مندروں کے بارے میں اتنی باتیں کرے گا یا اتنی آگاہی رکھے گا۔ اس نے سوچا کہ کچھ دور آگے بڑھنے میں کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے زیادہ دور نہیں چلنا پڑا۔ دونوں مندروں کے مغرب میں کچھ کھنڈر تھے۔ وہ وہاں سے کئی بار گزرا بھی تھا۔ کسی زمانے میں ضرور کوئی عمارت وہاں کھڑی رہی ہوگی۔ پرانی اینٹیں اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کھنڈر کے چاروں طرف لوہے کے کانٹے دار تار کی باڑھ تھی۔ بنیا اور اس کی ٹولی ان ہی کھنڈرون کی جانب بڑھے جا رہے تھے۔ گورکھ زیادہ صبر نہ کر سکا۔ کہنے لگا۔ "ان کھنڈروں کو تو میں جانتا ہوں۔ یہاں کوئی مندر نہیں۔

بنیا بولا۔ "کھنڈروں کے درمیان وہ ایک چھوٹا سا کمرہ جو ابھی سلامت کھڑا ہے، وہی مندر ہے۔ اندر دیوی کی مورتی لگی ہے۔ گنے چنے لوگ ہی یہاں پوجا کرنے آتے ہیں۔"

گورکھ بنئے اور اس کی ٹولی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ وہ سب ایک چھوٹے سے اندھیرے کمرے کے سامنے رک گئے۔ کمرے کا ایک دروازہ ٹوٹا ہوا تھا' دوسرا آدھا کھلا زنگ لگے قبضوں پر جھول رہا تھا۔ باہر کی دیواریں پرانے پتھر کی بنی تھی' جو جگہ جگہ سے اکھڑے گئے تھے۔ برسات کی وجہ سے دیواروں پر ہری کائی جمی ہوئی تھی' جس کے درمیان گھاس اگی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ادھر قدم بھی نہ رکھتا ہوگا۔

یہ سارا نقشہ دیکھ کر گورکھ ٹھنک گیا اور واپس مڑنے لگا۔ تو ایک لڑکے نے آواز لگائی :: "اتنی دور آگئے ہو تو دیوی کی خوب صورت مورتی جو اس مندر میں ہے' وہ تو دیکھ جاؤ۔"

گورکھ کو یقین نہیں آرہا تھا۔ سوچا' ایک نظر اندر جھانکنے میں کیا حرج ہے؟ بنئے اور اس کی ٹولی کو اندر گھستے دیکھ وہ بھی اندر چلا گیا۔

اندر کافی اندھیرا تھا۔ دروازہ مغرب کی طرف واقع تھا اور شام ہونے کو آئی تھی۔ سورج کی روشنی دروازے سے چھن رہی تھی۔ چند کرنیں ٹوٹی دیواروں کی دراڑوں سے ہو کر اندھیرے فرش پر چند روشن لکیریں کھینچنے میں کام یاب ہو گئیں تھیں۔

کمرے میں داخل ہونے کے کچھ دیر بعد گورکھ کو دھندلا دھندلا نقشہ دکھائی دینے لگا۔ لیکن کسی دیوی کی مورتی وہاں موجود نہ تھی۔ سامنے دیوار پر قدیم نقش و نگار کے آثار ضرور واضح تھے۔

گورکھ بولا "میں پہلے ہی کہتا تھا کہ یہاں کوئی دیوی کا بت نہیں ہے اور نہ کوئی مندر ہے۔"

یہ کہہ کر وہ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلنے لگا' ایک طاقت ور لڑکے نے اسے زور سے دھکا دیا۔ پیچھے سے دو لڑکیوں نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور دو نے ٹانگیں پکڑ کر اسے زمین پر پٹک دیا۔

گورکھ کی عقل کہہ رہی تھی کہ پٹائی ہونے والی ہے۔ اگر پٹنا ہی ہے تو کیوں نہ مقابلہ کیا جائے؟ لیکن اکیلا لڑکا سات کے ساتھ کیا مقابلہ کرتا؟ اس کے زمین پر گرتے ہی لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے۔ دو لڑکوں نے دو دو ہاتھوں سے اس کے بازو تھام لئے اور اسی طرح دو نے اس کے پاؤں جکڑ لئے۔ ایک لڑکا اس کی پیٹھ پر کھڑا ہو گیا اور جو باقی ایک بچا اس نے گورکھ کا نکر نیچے سرکا دیا۔

اس درمیان بنیا اپنے کپڑے اتار چکا تھا۔ آنکھوں میں مٹی پڑ جانے کی وجہ سے گورکھ کی نظر دھندلا گئی۔ جیسے ہی اس کا سر اٹھتا' لڑکے اس کی گردن نیچے دبا دیتے۔ بنیا گورکھ کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ گورکھ نے زور لگا کر ایک بار تو بنئے کو نیچے گرا دیا' بنیا کہاں ہار ماننے والا تھا۔ کشمکش کا یہ دور چلتا رہا اور بنئے کی ٹولی کے لڑکے ہنستے رہے۔

بنیا گورکھ سے الگ ہوا تو ایک اور لڑکا بولا "اب میری باری ہے" بنئے نے اس کے موہنہ پر تھپڑ رسید کیا۔ چند لمحوں میں سب وہاں سے رفو چکر ہو گئے اور گورکھ دیر تک زمین پر اوندھا پڑا رہا۔ یکایک اسے وقت کا خیال آیا تو وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔ اس کے کپڑے دھول مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ حلق تک مٹی کا ذائقہ تھا وہ

کھانس کر تھوکنے لگا تو مٹی سے بھرا لعاب ٹپک پڑا۔ گھٹنوں کی جلد چھل گئی تھی اور لال مٹی کا لیپ مرہم کا کام کر رہا تھا۔

گورکھ کو یہ فکر تھی کہ اپنے جسم کی صفائی کیسے کرے؟ چھپتا ہوا مندر والے پانی کے نل کی طرف روانہ ہوا۔ پاپی پاپ کر کے بھاگ چکے تھے اور گورکھ خود کو گناہ گار سمجھ رہا تھا۔ جہاں تک ہو سکا' اپنا مونہہ' بال اور جسم صاف کر کے گورکھ نے کتھا کے منڈپ کی طرف رخ کیا۔ کتھا ختم ہو چکی تھی۔ گوپال داس دیر سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے سامنے دیکھ کر غصہ سے غرائے: "کہاں چلا گیا تھا؟ میں نے کہا تھا دور مت جانا۔"

گورکھ سوچ رہا تھا وہ دراصل کتنی دور چلا گیا؟ باپ کی نظر اس کے جسم اور کپڑوں پر پڑی تو غصہ کافور ہوا۔ "مل گیا ہوگا کوئی اسکول کا دوست جس سے ہاتھا پائی کر بیٹھا ہوگا۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ لڑائی جھگڑے سے دور رہا کر۔ لیکن تیرے سر پر جوں تک نہیں رینگتی۔"

اگلے دن گورکھ اسکول پہنچا تو بنیا اور اس کی ٹولی کے لڑکے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ جیسے اس کے بدھو ہونے کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ انہیں معلوم تھا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ شکار اب کبھی پنجرے میں واپس نہ آئے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مار پیٹ کر سکتے ہیں' مذاق اڑا سکتے ہیں' پھبتیاں کس سکتے ہیں' بے عزتی کر سکتے ہیں۔

کئی دن تک بنیا کلاس کے لڑکوں کو جلوس نکالنے کے لئے ڈراتا اور پھسلاتا رہا۔ جلوس کی خبر کانوں کان سب لڑکوں تک پہنچ گئی' لیکن جلوس میں کیا ہوگا' یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ کچھ لڑکے صرف ڈر سے اور کچھ لڑکے صرف تماشے کے طور پر رضامند ہو گئے۔ جلوس کا دن اور وقت کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ بنیا کہتا کہ تاریخ اور وقت سب کو کچھ دیر پہلے بتا دیا جائے گا۔ تاکید تھی کہ جلوس کی بات اسکول کے ماسٹروں سے خفیہ رکھی جائے۔

سنیچر کے روز اسکول میں آدھے دن ہی پڑھائی ہوتی تھی۔ اس روز صبح سے کانوں کان سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ جیسے ہی گورکھ بستہ اٹھا کر گھر چلنے کے لئے تیار ہوا اور اسکول کے دروازے سے باہر نکلا' لڑکوں کی بھیڑ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ان میں بنئے کی ٹولی کے لڑکے تو تھے ہی' گورکھ کی کلاس کے اور دوسری کلاسوں کے لڑکے بھی شامل تھے۔

جیسے ہی گورکھ آگے بڑھا' جمگھٹ سے نکل کر بنیا اس کے ساتھ ہو لیا اور اونچی آواز سے بولا "مل کے بولو رام رام! پاؤڈر والی نے بنئے سے۔۔ مندر بھی ناپاک کر دیا!" سب لڑکے چلائے! "مندر بھی ناپاک کر دیا!"

گورکھ تیز رفتار سے بھاگا تو سب اس کے پیچھے نعرے لگاتے ہوئے دوڑے۔ وہ رکا اور پیچھے مڑا تو لڑکے آگے نکل گئے۔ نعرے ابھی تک بلند ہو رہے تھے۔ وہ گھر کے راستے پر ان سے کافی دور پیچھے رہ گیا۔ لڑکوں کا ہجوم

نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر بنئے کو خیال آیا کہ گورکھ کہیں پیچھے رہ گیا۔ اس کے ساتھی اس کو گھیر لائے۔
دکان داروں نے نعرے سنے اور لڑکوں کے مجمع کو بڑھتے دیکھا تو کچھ دکانوں میں بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگے، کچھ حیرت سے دیکھنے لگے۔ پاس کھڑے گاہک بھی خریداری بھول کر نعرے سننے اور ہنسنے لگے۔
ایک دکان دار سے نہ رہا گیا اس نے اتر کر بڑھتے ہوئے جلوس سے ایک لڑکے کو پکڑ لیا اور اس سے پوچھا "تم کون سے اسکول میں پڑھتے ہو؟"
لڑکے نے اسکول کا نام بتایا۔ دکان دار بولا "تمہیں شرم نہیں آتی؟ سڑک پر ایسی گندی باتیں کرتے ہو! اسکول میں یہی سیکھتے ہو؟
لڑکے نے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بنئے نے کہا تھا اس لئے ہم اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔"
دکان دار نے پوچھا۔ "بنیا کون؟ کیا کرتا ہے اس کا باپ؟"
لڑکے نے جواب دیا : "اس پنساری کی دکان ہے۔" لڑکے نے جگہ کا نام بھی بتایا۔
دکان دار نے کہا۔ میں جانتا ہوں اس کے باپ کو بڑا بدمعاش لڑکا ہے اس کا۔ اور یہ پاؤڈر والی کون ہے؟
لڑکے نے گورکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا : "اسے پاؤڈر والی کہتے ہیں۔ بنئے کی ٹولی نے اس کا یہی نام رکھا ہے۔"
دکان دار نے پلٹ کر گورکھ سے پوچھا۔ "کیا بنیا سچ کہتا ہے؟"
گورکھ ہڑبڑا کر بولا "بالکل جھوٹ! وہ ہر روز مجھے اسی طرح بے عزت اور ذلیل کرتا ہے۔ مار پیٹ بھی کرتا ہے۔"
دکان دار نے کہا "تم ہیڈ ماسٹر کے پاس کیوں نہیں جاتے؟"
گورکھ نے جواب دیا : "مجھے اپنی جان پیاری ہے۔"
دکان دار بولا "میں سوموار (پیر) کو اسکول کھلنے پر تمہارے ہیڈ ماسٹر کو سارا قصہ بتاؤں گا۔"
پیر کا دن آیا اور گزر گیا۔ اسی طرح کئی پیر آئے۔ یہاں تک کہ سالانہ امتحان کا وقت آگیا۔ امتحان کے بعد اسکول میں چھٹیاں ہوئیں۔ تعطیلات کے بعد نتیجہ نکلا۔ گورکھ کلاس میں اول آیا تھا۔ اس دن اسکول کا آنگن لڑکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بنیا فیل ہو گیا تھا۔ ستو اور شنکر مشکل سے پاس ہوئے تھے۔ بہت سے لڑکے گورکھ کو گھیرے مبارک باد دے رہے تھے۔ بنیا سامنے آیا اور کہنے لگا "پاؤڈر والی' افسوس کہ اب تو چلی جائے گی۔ مندر دوبارہ ناپاک نہ ہوگا۔"
گورکھ نے یکایک ایک زوردار تھپڑ بنئے کے مونہہ پر جڑ دیا۔ بنیا لڑکھڑایا تو پیچھے کھڑے ہوئے دو لڑکوں نے اسے سنبھال لیا۔ گورکھ چلایا "کیوں ڈرتے ہو اس بدمعاش سے کیوں ڈرتے ہو اس کی ٹولی سے اگر تم سب مل

جاؤ تو کیا مجال یہ کسی کو کچھ کہہ سکے۔"

جھگڑے کی آواز سن کر کلاس کا ماسٹر آگیا اور بنئے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا : "تمہیں ہر وقت بدمعاشی کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا۔ تین بار فیل ہو چکے ہو۔ اسکول کا نام بدنام کر رکھا ہے۔ سارا دن آوارہ گردی کرتے ہو۔ کھلنے دو اسکول ہر روز تمہارا مرغا بنایا کروں گا۔" (ان دنوں مرغا بننے کا طریقہ یہ تھا کہ ٹانگوں کے درمیان ہاتھ نکال کر کان پکڑو اور کمر اونچی رکھو۔ جہاں کمر جھکی ماسٹر کی لات پڑی)۔

رات کو سوتے سوتے گورکھ کئی مرتبہ چونک کر اٹھتا۔ عجیب سے سائے اور نقوش اسے خوابوں میں نظر آتے۔ کبھی کبھی وہ چہرے اس قدر قریب ہو جاتے کہ گورکھ کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ دوبارہ سونے کی کوشش کرتا تو محسوس ہوتا کہ کوئی اس کے قریب موجود ہے۔ چھت پر سوتا تو نظر بار بار اندھیرے کنجوں کو ٹٹول لیتی۔ سردی کے موسم میں کمرے میں سوتا تو اندھیروں میں کچھ ذہنی مبہم سے نقوش ابھر آتے' جو سرگوشیاں کرتے' اس کی جانب تکتے۔ گورکھ اٹکل لگاتا کہ باہر ہواؤں میں کوئی چیز سرسرا رہی ہوگی۔ کسی حد تک وہ چہرے' وہ نقوش' وہ صدائیں' گورکھ کا دل لبھا جاتیں' مگر ایک خوف سا بھی طاری ہو جاتا۔ یہ سلسلہ بیماری کی صورت میں بہت بڑھ جاتا' خاص طور سے جب اسے بخار ہوتا۔ لالٹین کی مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوتی' جس میں ہر شے ایک پرچھائی' ایک سایہ چھوڑتی ہوئی کمرے میں عجیب سا ماحول پیدا کرتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ ہر شے کچھ عجیب سی شکل لئے ہے۔ روزمرہ کی چیزیں' کپڑے' چرخہ' میز' کرسی' گھر کے دروازے' دروازوں پر لٹکی لوہے کی زنجیر جیسے اپنی ہیئت بدل رہی ہیں۔ اس کا بستر زمین سے اوپر اٹھ رہا ہے۔ وہ چارپائی پر نہیں ہے۔ صرف اس کا جسم وہاں موجود ہے۔ وہ ہر طرف کمرے میں بھٹک رہا ہے۔ کمرہ مکان سے جدا ہو چکا ہے' کہیں ہواؤں میں ڈول رہا ہے' ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ شاخ پر لگے پتے کی طرح ہچکولے کھا رہا ہے۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ سر گھوم رہا ہے۔ وہ جیسے کسی بھنور میں پھنسا ہے اور ڈوبنے والا ہے۔ کوئی اسے نہیں بچا سکتا' کیوں کہ وہ بالکل اکیلا ہے۔ وہ آواز دینا چاہتا ہے' چیخنا چاہتا ہے' لیکن اس کے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتا بھنور سے نکلنے کی کوشش میں ہے' مگر پانی کا تیز بہاؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اچانک بھنور سے کوئی شے اسے اوپر اچھال دیتی ہے۔ اب وہ بھنور میں نہ ہو کر بھنور کے اوپر منڈلا رہا ہے۔ بہت اونچائی سے گر رہا ہے۔ نیچے سخت زمین ہے' جسے چھوتے ہی وہ کانچ کے ٹکڑے کی طرح چکنا چور ہو جائے گا۔ اسی ڈر سے وہ چلاتا ہے کہ ساوتری پاس کھڑی کہہ رہی ہے : "ابھی بخار تیز ہے۔"

یہ بھی نہ تھا کہ صرف بخار کے دوران ہی گورکھ کو ہر چیز بدلی بدلی اور خواب جیسی نظر آتی۔ کبھی کبھی کھانا کھاتے ہوئے' بستر میں آرام کرتے' کتاب پڑھتے ہوئے' پاس ہی کسی اجنبی کی موجودگی کا احساس ہوتا۔ جیسے وہ اجنبی اس کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہا ہے۔ کبھی کبھی گورکھ بے وجہ اداس ہو جاتا۔ اتنا اداس اور غمگین کہ جسم

بے حرکت ہو جاتا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے پہروں آسماں کی طرف نظریں اٹھائے پڑا رہتا۔ جسم چارپائی کا ایک جز بن جاتا۔ وہ محسوس کرتا کہ آہستہ آہستہ دل کی دھڑکنوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ وہ چارپائی پر پڑا پڑا بہت بھاری ہو گیا ہے۔ خود اٹھنا تو در کنار' اگر کوئی اسے اٹھائے تو بھی اسے اٹھا نہ پائے گا۔ اگرچہ نظریں آسمان پر ہوتیں' لیکن وہ محسوس کرتا جیسے کسی اندھیرے غار میں گرتا جارہا ہے۔ یہاں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اس غار کی دیواریں آہستہ آہستہ قریب آتی جارہی ہیں۔ اور غار تنگ ہوتا جارہا ہے۔ لیکن غار کے فرش کی کوئی تھاہ نہیں۔ اگر دیواریں اسی طرح قریب آتی گئیں تو وہ کہیں دیوار سے لٹک جائے گا اور کبھی واپس اوپر نہ اٹھ سکے گا۔ وہ گھنٹوں بے حس و حرکت پڑا رہتا اور وقت جیسے ٹھہر جاتا۔ اسے محسوس نہ ہوتا کہ کتنی دیر سے وہ چارپائی پر آدھا سویا پڑا ہے۔ نیچے سے کسی کی آواز آتی۔ کوئی پاس آکر کھڑا ہو جاتا اور اسے پکارتا تو حواس واپس لوٹتے۔ یکایک دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا۔

خواب آخر خواب ہوتے ہیں۔ ان میں حقیقت کا جز کتنا ہے' یہ کوئی نہیں جانتا۔ بچپن کے سارے خواب وہ بھول چکا ہے۔ ان کے نقوش دھندلے پڑ چکے ہیں۔ لیکن ایک خواب جو گورکھ کی نظروں کے سامنے آج بھی واضح ہے۔ وہ خواب کچھ اس طرح تھا۔ جاڑوں کا موسم ہے۔ رات کو سوتے سوتے یکایک اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ ایک جوان عورت اس کے قریب کھڑی ہے اور اس کے چہرے پر جھک رہی ہے۔ اس قدر قربتیں ہیں کہ وہ اس کی سانس کی گرمی اپنے رخساروں پر محسوس کر سکتا ہے۔ شاید وہ اس کا بوسہ لینا چاہتی ہے۔ شلوار اور قمیض میں ملبوس ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے اور ماتھے پر سہاگ کی بندی لگائے۔ اس نازنین کے لب قریب آرہے ہیں۔ وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ دوبارہ آنکھیں کھولتا ہے تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی ہے۔ مگر اس کی جانب بغیر پلکیں جھپکے دیکھ رہی ہے۔ آہستہ سے ہاتھ اٹھا کر انگلی کے اشارے سے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ اس کی شباہت اور لباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گاؤں سے ابھی ابھی چل کر آئی ہے۔ اس کے ننگے پیروں میں چاندنی کی پازیب ہے۔ وہ مسلسل پازیب کی چھن چھن سن رہا ہے۔ وہ موہنہ پھیر کر اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوششیں کرتا ہے۔ مگر نیند کافور ہو چکی ہے۔ کچھ دیر بعد گردن گھما کر دیکھتا ہے تو وہ قدرے اور پیچھے ہٹ گئی ہے۔ اب وہ دروازے کے قریب ہے' مگر لگاتار اشاروں سے اسے قریب بلا رہی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ایک کم سن لڑکی اس کی انگلی تھامے آکھڑی ہوتی ہے اور وہ بھی اشاروں سے اسے بلاتی ہے۔ گورکھ دوبارہ کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ مگر احساس جاری ہے کہ کہیں وہ دونوں پھر قریب نہ آجائیں' اس لئے تیسری بار گردن گھما کر دیکھتا ہے۔ وہ دونوں دروازے کے باہر کھڑی اس کی طرف حسرت سے تک رہی ہیں۔ گورکھ بھی مسلسل ان دونوں سے نظریں ملائے رکھتا ہے' یہاں تک کہ وہ عورت پائل چھنکاتی' کم سن لڑکی کی انگلی تھامے دیوار کے قریب غائب ہو جاتی ہے۔

محلے کے شو مندر میں گورکھ کو ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور جانا پڑتا' کیوں کہ ماں باپ کا ساتھ دینا بھی ضروری تھا۔ کبھی کبھی زیادہ بار بھی جانا پڑتا۔ مندر کے پاس ہی کنواں تھا۔ محلے کے لڑکے کنویں کی منڈیر سے کنویں میں جھانک کر زور سے چلاتے اور اپنی آواز کی گونج سنتے۔ یعنی کنویں سے گنبد کا کام لیتے۔

ستو کو کنوئیں سے گونج کر لوٹتی صدا۔ سننے کا بہت شوق تھا۔ شام ہونے میں ابھی دیر تھی۔ گورکھ اور ستو کنویں کے قریب کھیل رہے تھے۔ ستو منڈیر کے قریب کھڑا' گردن کنوئیں میں جھکا کر باز گشت سن رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ کنویں کی منڈیر سے وہ کس قدر زیادہ اندر جھانک رہا ہے۔ گورکھ نے ستو کو خبردار کیا : "ستو! ہوشیار! کہیں گونج سنتے سنتے کنویں کے اندر ہی نہ چلے جانا!"

ستو نے ناراضگی سے جواب دیا "میں کیا پاگل ہوں؟ ایک ہاتھ سے منڈیر پکڑ کر نیچے جھکتا ہوں۔ اندر کیسے گر سکتا ہوں؟"

گورکھ بولا "یار اگر پاؤں پھسل گیا تو؟"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ستو کہنے لگا "چلو مندر میں چلتے ہیں۔"

گورکھ کو مندر کے اندر جانے کا کوئی شوق نہ تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ ماں باپ کے ساتھ اسے جانا پڑتا تھا۔ کم سے کم مٹھائی تو پرشاد کی صورت میں حلق سے نیچے اترتی۔ گورکھ بولا "ستو' تم ہی چلے جاؤ۔ ابھی مندر میں کوئی نہیں ہے۔ آرتی کا وقت نہیں ہوا۔ شو شنکر سویا پڑا ہوگا۔ کیوں اسے جگاتے ہو؟"

ستو ضد کرنے لگا تو گورکھ اس کے ساتھ ہو لیا۔ مندر کے آنگن میں شو لنگ تھا' جس پر ایک مٹکا لٹکتا رہتا۔ مٹکے کے پیندے میں سوراخ سے بوند بوند پانی لنگ پر گرتا رہتا اور چاروں طرف کھدی ڈھلوان سے ہو کر ایک طرف سے نکل جاتا۔ لنگ کے چاروں طرف دیئے جلتے رہتے۔ ستو پچھم کی طرف مونہہ کر کے بیٹھا تھا اور گورکھ پورب کی طرف' یعنی دونوں آمنے سامنے تھے۔ گورکھ اور ستو نے ہاتھ جوڑے' آنکھیں بند کیں اور سر جھکایا۔ ہاتھ تو شاید گورکھ نے بھی جوڑے' مگر سر نہ جھکایا۔ گورکھ نے دیکھا کہ جب ستو نے سر جھکایا تو اس کے سر کے بال ایک دیئے کی لو کو چھو گئے اور جل اٹھے۔ گورکھ نے اپنی قمیص اتاری' لنگ کے گرد کھڑے پانی میں ڈبوئی اور ستو کی طرف لپکا۔ ابھی آگ زیادہ نہ بھڑکی تھی۔ گیلی قمیص سر پر لگتے ہی فوراً' بجھ گئی۔ ستو کے کافی بال جل گئے اور پیشانی پر آنچ بھی آئی۔

گورکھ ہنستے ہوئے ستو سے کہنے لگا "دیکھا اس پرانی قمیص کا کمال۔ جس کا تو ہر وقت مذاق اڑاتا ہے؟ آج تیری جان اسی نے بچائی" ستو کچھ نہ بولا۔

دونوں گھر پہنچے تو چمیلی ستو کا سر دیکھ کر چلائی : "دیکھ تیرے لڑکے نے ستو کی کیا حالت بنا دی ہے۔

تک جلا ڈالا۔ معلوم نہیں لڑکا ہے کہ راکھشس!"

ستو کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا یہ الفاظ سن کروہ غصے سے چلایا : نانی! تمہیں کچھ معلوم نہیں اور تم خوامخواہ میرے دوست پر الزام لگائے جاتی ہو!"

ستو سے ساری داستان سن کر سوٹا مل اور چمیلی گورکھ کی طرف لپکے۔ ساوتری جو گورکھ کو غصے کی نظر سے دیکھ رہی تھی' یکایک ٹھنڈی پڑ گئی۔ چمیلی نے پہلی بار گورکھ کے رخسار چومے۔ اتنے میں بھولا رام کو بھی پتہ چل گیا۔ سب گورکھ کے گرد جمع ہو گئے کوئی کہہ رہا تھا : شرارتی ضرور ہے' مگر بہت اچھا لڑکا ہے۔" کوئی کہہ رہا تھا : لڑکا کیا ہے' ہیرا ہے! دل کا بہت صاف ہے۔"

پاروتی بھول گئی کہ گورکھ نے کبھی اس کے پتھر مارا تھا۔ گورکھ کو کھینچ کر اس نے چھاتی سے لگالیا۔ گورکھ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ اتنا اچھا تو نہیں ہے جتنی اس کی تعریف ہو رہی ہے۔ لیکن وہ اتنا برا بھی نہیں کہ دوست کی جان نہ بچائے۔

مندر والے حادثے کے بعد ستو شنکر اور گورکھ کی دوستی اور گہری ہو گئی۔ ستو نے گورکھ کے سامنے شیخی بگھارنا تقریباً" بند کر دیا تھا۔ تینوں کا داخلہ آریہ اسکول میں ہو گیا۔ اسکول کا ایک ماسٹر رام جس ان کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا۔ گوپال داس' سوٹا رام' بھولا مل' سب اسے جانتے تھے۔ اسکول میں داخلے سے پہلے اسے گھر بلایا گیا اور گزارش کی گئی کہ گورکھ' ستو اور شنکر کا خاص خیال رکھا جائے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی اور چال چلن کے سلسلے میں بھی۔ نئے اسکول میں نئی جماعت میں کوئی بنیا موجود نہ تھا۔ رفتہ رفتہ گورکھ کی شرارتوں میں کمی آگئی' لیکن اس کا دل ہمیشہ ہچکولے کھاتا رہتا۔

گورکھ نے سنا تھا کہ اصلی سنیما بے حد دل کش ہوتا ہے۔ اسکرین پر تصویریں زندہ ہو اٹھتی ہیں۔ وہ صرف چلتی پھرتی ہی نہیں بلکہ بولتی بھی ہیں۔ اس زمانے میں نوجوانوں کو بھی سنیما دیکھنے کی ممانعت تھی' بچوں کی تو بھلا بات ہی کیا تھی۔ پھر گورکھ کو کہیں سے اتنا پیسہ ملنے کی امید بھی نہ تھی کہ وہ سنیما کا ٹکٹ خرید سکے اور جا کر فلم دیکھ آئے۔ ایک دن اچانک یہ آرزو پوری ہو گئی۔ گورکھ شنکر کے ساتھ اس کے والد کی دکان پر موجود تھا کہ شنکر کے والد کو کوئی شخص سنیما کے دوپہر کے شو کے دو پاس مفت میں دے گیا۔ شنکر کا باپ خود تو دکان بند کر کے جا نہیں سکتا تھا۔ اس لئے وہ شنکر اور گورکھ دونوں کو قریب ہی سنیما ہال میں بٹھا آیا۔ دونوں پہلی بار سنیما دیکھنے گئے تھے۔ اسکرین' پردے' ہال کی وسعت' کرسیاں' ہال میں اندھیرا' سب کچھ ان کے لئے کشش کا باعث تھا۔ اسکرین کے سامنے پہلی قطار چھوڑ کر وہ دونوں دوسری قطار میں بینچ پر بیٹھے تھے۔ گورکھ پوچھنے لگا۔ "شنکر' آگے بینچ اور پیچھے کرسیاں' یہ الٹی بات کیوں؟"

شنکر کچھ جواب نہ دے سکا۔ بعد میں انہیں پتہ چلا کہ جتنا پیچھے جاؤ' ٹکٹ اتنا ہی مہنگا ہوتا ہے' تصویریں

بھی دور سے زیادہ اچھی نظر آتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ قیمت کا ٹکٹ چھت سے لٹکے چھجے، یعنی بالکونی کا ہوتا ہے۔

دروازوں پر لگے پردے کھینچ دیئے گئے۔ ہال میں اندھیرا کر دیا گیا اور فلم شروع ہوئی۔ فلم ختم ہوئی تو بھولا رام انہیں گھر لے جانے کے لئے باہر کھڑا تھا۔ دونوں گھر پہنچے۔ گوپال داس اور ساوتری کو معلوم نہ تھا کہ گورکھ سنیما دیکھنے گیا ہے۔ وہ بہت گھبرا رہے تھے۔ اندر قدم رکھتے ہی ڈانٹ کر پوچھنے لگے: "کہاں گیا تھا شنکر کے ساتھ آوارہ گردی کرنے؟"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، بھولا رام بولے۔ "قصوروار میں ہوں۔ میں انہیں سنیما دکھانے لے گیا تھا۔"

گوپال داس بڑبڑائے: ابھی سے انہیں فلم کی کیا ضرورت پڑی تھی؟"

بھولا رام نے جواب دیا: دھارمک پکچر تھی۔ "تلسی داس" بچوں پر اچھا ہی اثر پڑا ہوگا۔"

رات کو فلم کے مناظر گورکھ کی نظروں کے سامنے تازہ ہو اٹھے کہانی اس کی سمجھ میں کم آئی تھی، لیکن رامائن اس نے پڑھی تھی۔ تلسی داس پہلے اپنی بیوی پر فدا ہوا، پھر رام پر۔ کیا کوئی عورت اتنی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے۔ جیسی سنیما کے پردے پر تلسی کی بیوی؟ وہ دومن کی دھوبن جو مسدس لکڑی کے بکس میں بند، ذرا دیر کے لئے سامنے آکر روپوش ہو جاتی اور جیسے وہ کئی بار گلی کے چلتے پھرتے سنیما میں دیکھ چکا تھا، یکایک کشش کھو بیٹھی۔ وہ سوچنے لگا: دراصل معبود تو تلسی کی بیوی تھی، جسے تلسی چھوڑ گیا! فلم کے پردے کی اس حسین صورت کا اثر اس کے معصوم دل پر ایسا پڑا کہ اکثر وہ صورت اس کے تصور میں جھلک مارتی اور وہ چند لمحوں کے لئے کسی دوسری نئی دنیا میں کھو جاتا۔ بے پناہ حسن کا پرکشش احساس اسے بے چین کر دیتا اور وہ سوچتا کہ کاش وہ اسی حسن کے نزدیک جا کر بیٹھ جائے اور پھر کبھی نہ اٹھے۔

ان ہی دنوں گورکھ کی دوسری بہن کی پیدائش ہوئی۔ ماں کمرے میں بند تھی۔ ہمیلی، پاروتی اور دائی کمرے میں تھیں۔ پیدائش کے بعد گورکھ کو بلایا گیا۔ اور ہمیلی اس سے کہنے لگی: "دیکھ ایشور نے تجھے ایک اور بہن دی ہے۔ اسے چھونا نہیں بس دور سے دیکھ لے۔"

گورکھ حیران رہ گیا۔ "یہ کہاں سے آگئی! پہلے ہی ایک بھائی اور ایک بہن کیا کم تھے؟"

ہمیلی نے اسے سمجھایا: "ایسے نہیں کہتے۔ سب کو بھگوان دیتا ہے۔ جو بھگوان سے مانگتے ہیں بھگوان ان کی سن لیتا ہے اور ایک دن بچہ وہاں پہنچا دیتا ہے۔"

گورکھ بحث پر اتر آیا۔ "کیوں جھوٹ بول رہی ہو؟ تمہارے کوئی لڑکا کیوں نہیں ہے؟ تم نے کیوں بھگوان

سے نہیں مانگا؟ اور جو اتنے دن سے ماں بیماری کا بہانہ کر کے پیٹ پھلائے پھر رہی تھی مجھے سب معلوم ہے۔"
چمیلی نے پیار بھری جھڑکی دی : بڑا بد معاش ہے رے تو!"
گورکھ بولا "اچھا یہ تو بتاؤ' یہ ہیجڑے کیا ہوتے ہیں' جو دو دن سے یہاں آ آ کر شور و غل مچا رہے ہیں؟"
چمیلی نے جواب دیا : یہ نہ تو مرد ہوتے ہیں نہ عورت۔ شکل کے بھی اچھے نہیں ہوتے۔"
گورکھ کو بنیا یاد آ گیا اور اس نے دل ہی دل میں کہا "ان ہیجڑوں سے زیادہ بد صورت انسان بھی دنیا میں موجود ہیں۔ لیکن ہیجڑے کیا ہوتے ہیں؟"

گورکھ مندر کے حادثے اور بنیئے کو نہ بھول سکا۔ زندگی میں کوئی بھی غیر معمولی واقعہ ایک نشان چھوڑ جاتا ہے۔ جیسے آگ بجھ جاتی ہے اور دھواں دیر تک اٹھتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ منظر اس کے سامنے زندہ ہو جاتا اور رات کو سوتے سوتے اس کا ہاتھ اپنی رانوں کے درمیان پہنچ جاتا۔ ایک خاص لذت کا احساس دیر تک قائم رہتا۔ ستو اور شنکر سے دوستی گہری ہو چکی تھی۔ کئی دن سے اس کے ذہن میں عجیب سے خیالات گردش کر رہے تھے۔ وہ ستو اور شنکر کی جانب کسی دوسرے انداز سے دیکھتا' مگر اسے دل کی بات زبان پر لانے کی ہمت نہ ہوتی۔ کبھی کبھی چھت پر یا گلی میں وہ تینوں اکیلے بھی ہوتے۔ ایک دن تنہائی پا کر گورکھ ان سے کہنے لگا : گورکھ "میں تم دونوں کو ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں' مگر مجھے ڈر ہے کہ تم فوراً" کسی نہ کسی کے سامنے اگل دو گے۔"
ستو اور شنکر نے کچھ حیرت سے اسے تکتے ہوئے کہا "آج تمہیں کون سی راز کی بات سوجھی ہے؟ ذرا ہم بھی تو سنیں۔"
گورکھ سنجیدگی سے بولا "وہ بات ایسی ہے کہ اس کا بتانا اور سمجھانا بہت مشکل ہے۔ لیکن بات بڑے پتے کی ہے۔" ستو اور شنکر کے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی' کیوں کہ گورکھ پہلے کبھی اس انداز سے ان سے مخاطب نہ ہوا تھا۔ انہوں نے اشتیاق ظاہر کیا : "گورکھ' پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ بتانا ہے تو صاف صاف بتاؤ۔"
گورکھ نے کہا "لیکن پہلے تم قسم کھاؤ کہ کسی سے بھی اس کا ذکر نہ کرو گے۔ ستو' تم اپنے نانا' نانی کو بھی نہیں بتاؤ گے۔ شنکر' تم اپنے ماں باپ کو بھی نہیں بتاؤ گے۔"
دونوں ایک ساتھ بولے : ہم قسم کھاتے ہیں۔"
گورکھ نے کہا "میں نے تمہارا یقین کیا۔ اب جو میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں' تم بھی اس کا یقین کرنا۔ بتاؤ' بچے کہاں سے آتے ہیں؟"
ستو اور شنکر ہنس پڑے "آتے کہاں سے ہیں؟ بھگوان دیتا ہے۔ بس یہی بات بتانے چلے تھے؟"
گورکھ بولا "تم دونوں ناسمجھ ہو۔ کچھ بھی نہیں جانتے۔"

ستو اور شنکر ہنستے ہوئے کہنے لگے اچھا استاد جی تم ہی سمجھاؤ۔
گورکھ بولا "بات ہنسنے کی نہیں' بات سمجھنے کی ہے۔ اگر تم اسی طرح ہنستے رہے تو میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"
ستو نے کہا "میں نے تو اپنی نانی سے یہی سنا ہے کہ بھگوان بچے بانٹتا رہتا ہے۔"
شنکر نے ہاں میں ہاں ملائی : "میں نے بھی اپنی ماں سے یہی سنا ہے۔"
گورکھ نے کہا "بڑے لوگ بھی بچوں سے جھوٹ بولتے ہیں۔ ابھی میری بہن کی پیدائش ہوئی۔ کیا تم مانتے ہو کہ بھگوان آیا اور بچہ رکھ کر چلا گیا؟ اور کسی نے اسے دیکھا بھی نہیں؟ شنکر' تم اکیلے ہو۔ ستو' تم بھی اکیلے ہو۔ میرے ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ بے وقوفو! ذرا سوچو۔ عقل سے کام لو۔"
دونوں سنجیدہ ہو کر سوچ میں پڑ گئے۔ انھیں چپ دیکھ گورکھ نے اپنا لیکچر جاری رکھا : "بات کہنی بہت مشکل ہے۔ الف سے شروع کرتے ہیں۔ بتاؤ' آدمی کے جسم کا یہ حصہ (اپنے عضو مخصوص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کس کس کام آتا ہے؟"
ستو اور شنکر ہنس پڑے۔ "کیا بے وقوفی کا سوال پوچھ رہے ہو! سویرے شام' دوپہر کے وقت' نیز جب ضرورت پڑے' پیشاب کرتے ہو کہ نہیں؟"
گورکھ بولا "بے وقوف میں نہیں تم ہو۔ بتاؤ' مرد عورت سے شادی کیوں کرتا ہے؟"
ستو اور شنکر پھر ہنس پڑے۔ "آج تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ شادی کر کے آدمی اور عورت ایک ساتھ رہتے ہیں۔ عورت گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ آدمی باہر سے پیسہ کما کر لاتا ہے۔ گھر اسی طرح چلتا ہے۔ گورکھ' آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"
گورکھ اپنی رو میں بولتا رہا : "ذرا سوچو' کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی کنواری لڑکی کے بچہ پیدا ہو گیا؟ یا کسی مرد کے بچہ پیدا ہو گیا۔ بچہ صرف شادی کے بعد عورت کے ہی کیوں پیدا ہوتا ہے؟"
ستو اور شنکر' دونوں چکرا گئے۔ انہوں نے کبھی اس مسئلے کو اس انداز سے نہ دیکھا تھا۔ ان کی ہنسی بند ہو گئی اور وہ راز کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں' بے تاب ہو اٹھے۔
خود کو' بنئے کو اور مندر کے حادثے کو قطعی الگ رکھ کر جو فعل اس کے ساتھ ہوا تھا' وہ اس نے ایک آدمی اور عورت کے درمیان بیان کر کے ستو اور شنکر کو سمجھا دیا۔ وہ حیرت سے سنتے رہے۔ گورکھ بولتا رہا۔ "اس کام کے کرنے سے عورت کا پیٹ پھول جاتا ہے اور بچہ نو مہینے تک اس کے پیٹ میں پلتا ہے پھر وقت پورا ہونے پر کوکھ سے نکل آتا ہے۔ قدرت کا عجیب کھیل ہے کہ تمام آدم ذات ایسے ہی پیدا ہوتی ہے۔ آدم ذات کی بات چھوڑو' جانوروں کے بچے بھی اسی طرح دنیا میں آتے ہیں۔ یہی کام اگر مرد کسی مرد کے ساتھ کرے تو مزہ آتا ہے' مگر بچہ پیدا ہونا ناممکن ہے۔"

اس بات چیت سے ستو اور شنکر کے دماغ میں کھلبلی مچ گئی۔ پہلے تجسّس جاگا' پھر تجربہ کرنے کی سوجھی۔ زیادہ تر شنکر نیچے رہتا' کیوں کہ اس کا جسم سب سے زیادہ بھاری تھا۔ کچھ دن ہی یہ سلسلہ چلا ہو گا کہ ایک دن وہ تینوں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔

تینوں حیران تھے کہ انہیں مار کیوں نہیں پڑی۔ رات کو سوتے وقت تینوں نے والدین کی سرگوشیاں سنی۔ ان ہی کے بارے میں کچھ گفتگو چل رہی تھی۔ صبح کو معمول کے مطابق تینوں اسکول کی طرف چل دیئے۔ تینوں کے دل دھڑک رہے تھے کہ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ سب سے زیادہ حیرت گورکھ کو اپنے باپ پر تھی کہ انہوں نے کیسے غصہ پی لیا۔ شرم کا احساس تینوں میں ٹ سے کسی کو بھی نہ تھا' ایک ڈر ضرور سوار تھا۔ زبان پر سکوت اور دماغ میں ہلچل۔ اسکول پہنچتے پہنچتے کسی نے زبان نہ کھولی۔

اسکول میں پہلا گھنٹہ اطمینان سے گزر گیا۔ دوسرے گھنٹے میں اچانک ماسٹر کرسی سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔ دوبارہ داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں دو چھڑیاں تھیں۔ وہ انہیں اسکول کے میدان میں لگی جھاڑیوں سے کاٹ کر لایا تھا۔ واپس کرسی پر بیٹھنے کی بجائے وہ شنکر سے مخاطب ہوا : "کھڑا ہو جا!" بغیر کوئی قصور بتائے وہ شنکر پر ٹوٹ پڑا۔ تھپڑوں اور مکوں کی برسات ہوتی رہی۔ شنکر پہلے رویا' پھر کراہنے لگا۔ لیکن ابھی چھڑی کا کرتب باقی تھا۔ وہ چلتی رہی چلتی رہی' جب تک چل سکی' چلتی رہی۔ شنکر کراہتا ہوا زمین پر گر پڑا۔

پھر ستو کو حکم ملا : "کھڑا ہو جا!" ابھی ماسٹر کے دو چار گھونسے ہی پڑے تھے کہ ستو زور زور سے رونے چلانے لگا۔ اس کا پیشاب نکل گیا' جو فرش پر بہنے لگا۔ شاید اسی لئے اسے زیادہ مار نہ پڑی۔

گورکھ کی حالت بھی شنکر جیسی ہوئی۔ نہ وہ رویا' نہ چلایا۔ اس پر دوسری چھڑی نے دم توڑ دیا۔

اتنی مار کھانے کے بعد اسکول میں باقی گھنٹے گزارنا تینوں کے لئے ناممکن تھا۔ اسکول سے چھٹی لے کر تینوں تانگے میں بیٹھ کر گھر پہنچے۔ شنکر اور گورکھ' ہونٹوں اور مونہہ سے بہتا خون قمیض سے صاف کرتے جا رہے تھے۔ شنکر کو تین دن تک بخار رہا۔ اس کا اور گورکھ کا چہرہ اور جسم ہفتہ بھر تک اکڑے رہے۔ درد کی ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ ہڈیاں سلامت ضرور تھیں۔ ستو اگلے روز ہی ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگا۔

ماسٹر کو گھر پر طلب کیا گیا۔ سب نے اس پر ملامت کی بوچھاڑ کر دی۔ بھولا رام خاص طور سے خفا تھا۔ "تم سے سزا دینے کو کہا تھا۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ لڑکوں کو مار ہی ڈالو۔ اگر کسی کی ہڈی ٹوٹ جاتی' دماغ پر چوٹ آتی تو ہم کیا کرتے؟ خبردار جو لڑکوں کو پھر اس طرح پیٹا' چاہے وہ کچھ بھی کریں۔ ہم تمہیں سمجھ دار سمجھ کر شکایت کر بیٹھے۔ بجائے کچھ سمجھانے کے تم نے لڑکوں کو مار مار کر کھال ادھیڑ دی!"

چند روز بعد گورکھ نے ماسٹر کو پھر اسی کرسی پر بیٹھے دیکھا تو اس کا جی چاہا کہ ماسٹر کی ناک کاٹ ڈالے' اس کی آنکھ پھوڑ دے یا اسے ٹانگ سے لنگڑا کر دے۔ جب تک وہ اس اسکول میں رہا' ماسٹر کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا رہا۔ کہیں ٹکراؤ ہو جاتا تو سلام کرنا تو در کنار' وہ آنکھ بچا کر نکل جاتا۔

گوپال داس کا تبادلہ لائل پور کے قریب ایک چھوٹے سے شہر گوجرہ میں ہوگیا۔ گورکھ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا کہ اسکول کے ماسٹر کی شکل نہ دیکھنی پڑے گی۔

ستو اور شنکر سے بچھڑنے کا غم۔ ریل گاڑی میں لمبے سفر کی کشش۔ جدائی کا وقت آگیا۔ ستو اور شنکر اور ان کے والدین ریلوے اسٹیشن پر چھوڑنے آئے۔ ستو اور شنکر گلے مل مل کے جدا ہوئے۔ الوداع کے وقت گورکھ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

ریل گاڑی پلیٹ فارم پر آئی۔ تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں اس قدر سواریاں تھیں کہ کسی بھی ڈبے میں پاؤں رکھنا مشکل تھا۔ کھڑکیوں سے سامان اندر دھکیل دیا گیا۔ ساوتری تین چھوٹے بچوں کے ساتھ مشکل سے ڈبے میں چڑھ پائی۔ گرمی اور لوگوں کی بھیڑ۔ کسی شریف آدمی نے ساوتری کو بیٹھنے کی جگہ دے دی۔ گورکھ فرش پر بیٹھ گیا۔ ریل گاڑی پلیٹ فارم سے روانہ ہوئی۔ گورکھ کو لوہے کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز پر ترنم لگ رہی تھی۔ دوسری طرف دم بھی گھٹا جا رہا تھا۔ ہر اسٹیشن پر یہی حال ہوتا مسافر اترتے کم اور چڑھتے زیادہ۔ کھڑے ہوئے مسافر اترنے والوں کی تاک میں رہتے۔ جیسے ہی وہ جگہ خالی کرتے، اس جگہ کو ہتھیانے کے لئے دو تین مسافر ایک ساتھ ٹوٹ پڑتے۔ آپس میں تو تو میں میں ہوتی۔

رفتہ رفتہ گورکھ کو ڈبے کے فرش پر ہی ٹانگیں سیدھی کرنے کی جگہ مل گئی۔ وہ اسی میں خوش تھا۔ رات ہوتے ہوتے کافی لوگ اتر گئے اور سانس لینے میں آسانی ہونے لگی۔ گورکھ رات بھر فرش پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ گاڑی کون سے اسٹیشن پر رکی، کتنی دیر رکی، کون سوار ہوا اور کون اتر گیا، سب سے بے خبر۔ صرف گاڑی کی رفتار کے ساتھ نیند کے جھونکوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا۔

اگلی صبح تک ریل کے سفر کا شوق کافور ہوگیا۔ شوق کی جگہ تکان اور بے صبری نے لے لی کہ کسی طرح جلد سے جلد ریل گاڑی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ ڈبے کی کھڑکی سے باہر جھانکتا تو کوئلے کے انجن کا دھواں اور گرد آنکھیں بند کردیتے۔ ہریالی کہیں پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ ریت اور کوئلے کے ذروں نے ڈبے کے فرش پر ایک موٹی پرت چڑھادی تھی۔

ریل گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تو گوپال داس چلائے : "جلدی کرو۔ سامان اتارو اور خود

بھی اترو۔ گاڑی یہاں کچھ ہی دیر کے لئے ٹھیرتی ہے۔" وہاں سوار ہونے والے مسافر کم تھے۔ پلیٹ فارم پر ان کے اترتے ہی گاڑی روانہ ہوگئی، جیسے صرف ان کے اترنے کے انتظار میں تھی۔

کرائے کا گھر اسکول، اسٹیشن اور گوپال داس کے دفتر، تینوں سے دور تھا۔ شہر سے دور ایک چھوٹا سا محلّہ اور چند ہی رہائش کے مکان۔ محلے کی گلی کے ایک طرف گیہوں اور گنّے کے کھیت۔ دوسری جانب وسیع میدان۔ صبح اور شام کو وہاں رہنے والے ڈبوں اور بوتلوں میں پانی بھر کر میدان میں حاجت رفع کرتے۔ شہر جانے کے لئے اس میدان کو پار کرنا پڑتا۔ ہوا میں ایک خاص بو ہر وقت گھلی رہتی، جو برسات میں خاص گہری ہو جاتی تھی۔ گلی کے دوسرے طرف کھیت تھے۔ وہاں بھی لوگ حاجت رفع کرتے، مگر زیادہ تر میدان ہی اس کے کام آتا۔ ایک طرف عورتیں اور ایک طرف آدمی۔ گھروں میں حاجت رفع کرنے کا شاید رواج ہی نہ تھا اور نہ ہی کوئی جگہ تھی۔ گورکھ کے لئے یہ تجربہ اور نظارہ بڑا عجیب تھا۔

مکان مالکن ایک تیز مزاج عورت تھی۔ گوپال داس پہلی منزل پر رہتے تھے۔ نیچے سے بارہا مکان مالکن کی آواز سنائی پڑتی۔ "آہستہ چلو۔ میری چھت ٹوٹ جائے گی۔ اگر کوئی مالک مکان کے کنبے کا شخص غسل کر رہا ہوتا تو تاکید تھی کہ اوپر نل نہ چلایا جائے۔ پانی کا ذریعہ فقط ہاتھ سے چلانے والا نل تھا۔

اتفاق سے اس گلی میں بھی گورکھ کو اسکول کے دو ہم جماعت مل گئے۔ جوگیندر اور ہربنس۔ جگہ بدلنے سے مصیبتیں کم نہیں ہوتیں۔ صرف ان کی شباہت بدل جاتی ہے۔ اسکول میں پنجابی زبان کا بول بالا تھا۔ حساب اور سائنس تک پنجابی میں پڑھایا جاتا تھا۔ گورکھ اردو، ہندی اور انگریزی پڑھتا آیا تھا۔ پنجابی پڑھنے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن وہاں ہر شخص پنجابی بولتا تھا۔ گورکھ کوشش تو بہت کرتا، مگر پنجابی ٹھیک طرح سے بول نہ پاتا۔ کوئی نہ کوئی لفظ ہندی یا اردو کا ادا ہو جاتا، جس کی وجہ سے وہ مذاق کا نشانہ بنتا۔ جس جگہ آپ رہتے ہیں، اگر وہاں کی زبان نہیں بول سکتے تو کچھ الگ سمجھے جاتے ہیں۔ یہی حال گورکھ کا ہوا۔ وہ اپنی زبان کی وجہ سے سب سے الگ اور اکیلا ہو گیا۔ کوئی اس سے دوستی کرنے کو تیار نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ہم جماعت اسے "یوپی کا بھیا" کہنے لگے۔ اس سے اسے بہت کوفت ہوئی۔ اس نے لاکھ بار انہیں سمجھایا کہ وہ یوپی کا رہنے والا نہیں ہے، لیکن کہاں انبالوی زبان اور کہاں ملتان اور جھنگ کی پنجابی۔ کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ ہوتے ہوتے "یوپی" بھی تعریف سے ہٹا دیا گیا اور وہ بن گیا بھیا.... (عورت کی جائے مخصوص) والا۔" اسکول سے چھٹی ہوتی تو جلوس نکلتا اور نعرے بلند ہوتے : "بھیا.... والا۔"

اسکول سے لوٹتے وقت گورکھ اکیلا نہ رہنے کے خیال سے ہربنس اور جوگیندر کے ساتھ ہو لیتا۔ یہ دونوں پڑوسی ہونے کے ناطے اس کا قدرے احترام بھی کرتے تھے۔ ایک روز تینوں اسکول سے لوٹ رہے تھے کہ گورکھ نے دو پیپر ویٹ دونوں دوستوں کو دکھائے اور کہا۔ "لکھتے وقت انہیں کاغذوں پر رکھ دیا جاتا ہے، تاکہ کاغذ ہوا میں

نہ اڑیں۔"
جوگیندر پیپر ویٹ کو دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا۔ "گورکھ تم ایک سچی کہانی سنو گے؟"
گورکھ بولا "ضرور سنوں گا۔ سناؤ۔"
کہانی کچھ اس طرح تھی کہ منتروں کے ذریعہ پیتل کو سونے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ شام کے وقت پیتل کو کسی درخت کی چھاؤں میں رکھ دو۔ اس پر سفید کپڑا ڈال دو۔ راکھ مٹی کی پرت چڑھا دو۔ دیا جلاؤ۔ اگربتی سلگاؤ۔ پھر ایک خاص طرح سے ایک منتر دل ہی دل میں سو بار دہراؤ۔ منتر کو کسی پر ظاہر کرنے سے منتر کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور پھر پیتل سے سونا نہیں بن سکتا.....
گورکھ سنتا رہا اور ہنستا رہا۔ بات اتنی بے تکی تھی کہ اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جوگیندر چڑ کر بولا۔
"اگر تمہیں یقین دلا دوں؟"
گورکھ کیسے یقین دلا سکتے ہو؟"
جوگیندر نے دعویٰ سے کہا : تمہارے یہ دونوں پیتل کے پیپر ویٹ سونے کے بنا سکتا ہوں۔"
گورکھ ہنس پڑا۔ "اگر ایسے ہی جادوگر ہوتے تو اسکول میں پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟ گھر بیٹھے مالا مال ہو جاتے۔"
جوگیندر نے سینہ پھلا کر کہا۔ "تمہیں کیا معلوم کہ میں پہلے سے ہی بہت مالا مال ہوں۔ سارا سونا گھر والوں سے چھپا کر رکھتا ہوں۔ جہاں بھی پیتل کی کوئی چیز نظر آتی ہے اسے سونے میں بدل کر زمین میں دبا دیتا ہوں۔ میرا سارا سونا ایک خاص جگہ دبا پڑا ہے۔"
گورکھ بولا۔ "میں یہ بالکل نہیں مانتا۔ تم ایک من پیتل کو سونے میں تبدیل کیوں نہیں کر لیتے۔ تمہارے گھر والوں کی کایا پلٹ جائے گی۔ تم سب مالا مال ہو جاؤ گے۔"
جوگیندر نے کہا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ چھ مہینے میں صرف ایک بار منتر پڑھ سکتا ہوں اور کوئی چھوٹی سی چیز ہی پیتل سے سونے میں بدل سکتا ہوں۔
"تمہیں یہ منتر سکھایا کس نے؟" گورکھ نے پوچھا
"یہ بتانا منع ہے۔ بتانے سے منتر کا اثر ختم ہو جائے گا اور میں کبھی سونا نہیں بنا پاؤں گا۔" جوگیندر نے جواب دیا۔
"اب تک کتنا سونا بنا لیا ہے؟"
"ہر ایک ہنر کا راز ہوتا ہے۔ کسی پر ظاہر کرنے سے راز راز نہیں رہتا اور بتانے والا پھر دوبارہ وہ کمال نہیں دکھا سکتا۔"

"ظاہر ہے تم نے کافی سونا بنالیا ہو گا۔ اس سے تم آرام سے زندگی گزار سکتے ہو۔ تمہیں پڑھنے اور اسکول جانے کی کیا ضرورت؟"

بات تو ٹھیک ہے۔ "دراصل میں اسکول چھوڑنے والا ہی ہوں۔ زمین سے دبا ہوا سونا نکال کر خوب عیش سے زندگی گزاروں گا۔ لیکن بات یہ ہے کہ سونا نکالتے ہی میرے منتر کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

گورکھ نے جوگیندر کو آزمانے کی ٹھان لی۔ "تم میرے پیتل کے پیپر ویٹ کو سونے میں بدل دو۔ ایک تمہارا'ایک میرا۔"

جوگیندر بولا "منظور ہے۔ دو دن بعد میں یہ عمل کر سکتا ہوں۔ اسکول سے آکر میں پوجا کا سب سامان اکٹھا کرلاؤں گا اور تم (ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس درخت کے نیچے مجھے مل جانا۔"

گورکھ نے دو دن بے صبری سے کاٹے۔ اسے یقین تو نہ آیا اور وہ سوچتا بھی رہا کہ کئی بار بے وقوف بن چکا ہوں۔ ہر بار لڑکوں کی باتوں میں آجاتا ہوں۔ اور دھوکا کھاتا ہوں۔ لیکن اس بار آزمانے میں کیا نقصان ہے؟ آخر دو پیتل کے پیپر ویٹ ہی تو ہیں۔ اگر سونے میں تبدیل نہ ہوئے تو پیتل سے مٹی تو بننے سے رہے!

دوسرے دن کی شام بھی آگئی۔ جوگیندر مقررہ وقت پر درخت کے نیچے موجود تھا۔ اس کے اسکول کے بستے میں کئی چیزیں موجود تھیں۔ پہلے اس نے زمین پر سفید کپڑا بچھایا اس پر دونوں پیپر ویٹ رکھے۔ پھر انہیں دوسرے کپڑے کے ٹکڑے سے ڈھک دیا۔ پوٹلی سے راکھ جیسی کوئی چیز نکال کر کپڑے پر چھڑکی اور زمین سے کچھ مٹی اٹھا کر کپڑے پر ڈال دی۔ دو موم بتیاں جلائیں اور ایک اگر بتی سلگائی۔ اس کے بعد گورکھ کو تاکید کی کہ آنکھیں بند رکھے اور اس وقت تک نہ کھولے جب تک کہ وہ کھولنے کو نہ کہے۔ جوگیندر خود بھی آنکھیں بند کر کے تن کر بیٹھ گیا۔ دس منٹ کے بعد گورکھ سے آنکھیں کھولنے کو کہا'موم بتیاں بجھائیں اور کپڑے سے راکھ اور مٹی جھاڑ کر دونوں پیپر ویٹ باہر نکال کر گورکھ سے کہنے لگا "دیکھو'یہ دونوں سونے میں تبدل ہو گئے۔"

گورکھ نے شک ظاہر کیا : مجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آرہا ہے۔ کیسے معلوم ہوا کہ یہ سونے کے ہو گئے؟"

جوگیندر بولا "غور سے دیکھو۔ ان کی چمک دیکھو۔"

گورکھ نے غور سے دیکھا۔ شاید جوگیندر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ دونوں پیپر ویٹ پہلے سے زیادہ چمک رہے تھے۔

جوگیندر نے کہا "وعدے کے مطابق'ان میں سے ایک میں رکھے لیتا ہوں۔"

گورکھ بولا "ٹھیک ہے۔ تم ان میں سے ایک لے سکتے ہو۔"

جوگیندر ایک پیپر ویٹ لے کر چلا گیا۔ گورکھ دوسرے پیپر ویٹ کو بڑی احتیاط سے جیب میں رکھ کر گھر واپس پہنچا۔ وہ رات بھر سوچتا رہا کہ ہو سکتا ہے وہ پیتل واقعی سونے میں بدل گیا ہو۔ صبح کو ڈرتا ڈرتا گوپال داس

کے پاس پہنچا اور کہنے لگا ”آپ ذرا اس پیپر ویٹ کو غور سے دیکھیں۔ کیا اس میں کچھ ردوبدل ہوگیا ہے؟“

گوپال داس حیرت سے اس کا مونہہ تکتے ہوئے بولے ”کیوں؟ اس کو کیا ہو جائے گا؟“

گورکھ نے کہا ”رات میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ یہ پیپر ویٹ سونے میں تبدیل ہوگیا ہے۔“

گوپال داس بھڑک اٹھے۔ ”دماغ خراب ہے تمہارا! ابھی تک تو خواب میں صرف شکلیں ہی دیکھتے تھے، اب پیتل کا سونا بھی بنانے لگے!“

اگلے دن اسکول سے لوٹتے وقت جوگیندر قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ گورکھ سے پوچھنے لگا۔ ”اپنا سونے کا پیپر ویٹ کب بیچ رہے ہو؟“

گوپال داس کو گھر سے دفتر دور پڑتا تھا اور گورکھ کو اسکول۔ کچھ عرصہ بعد گوپال داس نے مکان بدل لیا اور شہر میں آگئے۔ یہاں پہلی منزل پر گوپال داس کی رہائش تھی اور نچلی منزل پر مالک مکان کی۔

مکان میں بجلی اور پانی دونوں ہی موجود تھے۔ مٹی کے تیل کی لالٹین سے چھٹکارا ملا۔ شروع شروع میں گورکھ بار بار بجلی کا بلب جلاتا اور بجھاتا، جلاتا اور بجھاتا۔ اسی طرح میونسپلٹی کے نل کی ٹونٹی کھولتے ہی پانی گرنے لگتا۔ ٹونٹی آدھی کھولنے سے پانی کی دھار کم ہوتی، پوری کھولنے سے تیز ہو جاتی اور ٹونٹی بند کرنے سے پانی کی دھار بند ہو جاتی۔ گورکھ کو کئی مرتبہ تاکید کی گئی کہ پانی کے نل کی ٹونٹی اور بجلی کے سوئچ سے کھیلنا بند کردے، اس کا یہ کھیل اس وقت تک جاری رہا جب تک ٹونٹی اور سوئچ کے کھولنے اور بند کرنے کا شوق کشش نہ کھو بیٹھا۔

چند لوہے کے ٹرنک، لکڑی کے بکس اور رسوئی کے برتن یہی گھر کا اثاثہ تھا۔ دو دو چارپائیاں دونوں کمروں میں پڑی رہتیں۔ کچھ لکڑی کا فرنیچر بھی تھا جو انبالہ شہر سے مال گاڑی سے بھیجا گیا تھا وہ اس قدر شکستہ حالت میں موصول ہوا کہ لکڑی جلانے کے لائق رہ گئی۔ گوپال داس نے ریلوے سے اس معاملے میں کافی دنوں تک خط و کتابت جاری رکھی اور آخر میں ریلوے کو گالیاں دیتے ہوئے بڑھئی کو بلا کر کچھ چیزیں درست کروالیں۔ ان میں دو تپائیاں، ایک میز ایک کرسی شامل تھے۔

چلتے چلاتے انبالہ شہر والا جگ جگ سوامی ایک دن گوجرہ آدھمکا۔ اس کو علیحدہ کمرہ چاہئے تھا۔ اپنے کمرے میں کسی کے سونے سے شاید اس کا کوئی بھید کھل جاتا ہوگا۔ ایک کمرے میں مہاتما براجمان ہوگئے۔ اور دوسرے میں سارا خاندان سمٹ گیا۔ دن میں اگرچہ بستر اٹھا دئے جاتے، مگر چارپائیاں اسی طرح بچھی رہتیں۔ مہاتما کو کسی کی تکلیف کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ رات کو ایک چارپائی رسوئی گھر میں بھی بچھتی۔ ہر صبح کو مہاتما کا کمرہ ایک خاص طریقے سے صاف کیا جاتا۔ مہاتما کا حکم تھا کہ کمرے کے فرش کی صفائی اس طرح کی جائے کہ ایک بار

پانی میں کپڑا گیلا کرنے کے بعد دوبارہ اسی پانی میں گیلا نہ کیا جائے۔ اس لئے پانی بار بار بدلنا پڑتا۔ دوسرے یہ کہ جس حصے کو گیلے کپڑے سے پونچھ دیا گیا ہو' اس حصے پر صفائی کرنے والے کے پاؤں دوبارہ نہ پڑیں۔ بڑی سخت ہدایت تھی۔ جب مہاتما نے ۱۵ سال جنگل میں گزارے تھے تو کون سی اپسرا کنیز بن کر ان کی کٹیا کی اس طریقے سے صفائی کرتی ہوگی؟ صفائی کے بعد کمرہ تین گھنٹے کے لئے اندر سے بند ہو جاتا گورکھ کو یہ جاننے کی بڑی خواہش تھی کہ مہاتما بند ہو کر کیا کام کرتا ہے۔ اس نے غور سے دروازے کا معائنہ کیا۔ جہاں لکڑی کے دو تختے باہم پیوست تھے' وہاں چھوٹی سی دراڑ تھی' جو لکڑی میں پینٹ اور مٹی بھر جانے کی وجہ سے بند ہو گئی تھی۔ موقع پاکر گورکھ نے بلیڈ سے پینٹ اور مٹی کھرچی اور آرپار دیکھنے کے لئے ننھا سا جھروکا بنا لیا۔

اگلے دن جب مہاتما نے دروازہ بند کیا تو گورکھ نے اندر جھانکا۔ سردی کا موسم تھا لیکن مہاتما صرف ایک لنگوٹ کس کر آسن جما کر سیدھا بیٹھا تھا۔ گورکھ کچھ دیر دیکھ کر ہٹ گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد اس نے پھر اندر جھانکا۔ مہاتما اسی حالت میں آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہ تھی۔ گورکھ کافی دیر تک اندر جھانکتا رہا کہ شاید مہاتما کے جسم میں کوئی حرکت پیدا ہو' مگر ایسا نہ ہوا۔ جتنی بار گورکھ نے اندر جھانکا' مہاتما کو اسی جگہ اسی طرح آسن لگائے بیٹھا پایا۔ وہ اس قدر ساکن تھا کہ جیسے پتھر کا بت ہو۔

جب مہاتما نے دروازہ کھولا اور صبح کا ناشتہ اس کے کمرے تک لے جانے کا وقت آیا تو گورکھ اصرار کر کے ناشتہ خود کمرے تک لے آیا۔ اس کی نفرت بڑی حد تک دور ہو چکی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ خود دس منٹ کے لئے بھی اتنا ساکت بیٹھ سکتا ہے جتنا مہاتما بیٹھا رہا؟ چاہے وہ بھگوان کو یاد نہ کر رہا ہو' لیکن یہ کیا کم کمال ہے کہ کوئی شخص اپنے جسم کو اتنا قابو میں کر لے؟ سونے پر سہاگا یہ کہ سردی کے موسم میں بدن پر ایک بھی کپڑا نہیں۔ مہاتما جھوٹا نہیں ہے۔ صرف اس نے اسے غلط سمجھا ہے۔ کسی بھی انسان کی شخصیت کا اندازہ کچھ دیر اس کے ساتھ رہ کر یا بات کر کے یا اس کے رہنے سہنے کے طریقے سے لگانا بہت مشکل ہے۔ آج تک وہ جسے پاکھنڈی سمجھتا رہا' ضرور اس میں کوئی خاص بات ہے۔

"پھر ایک اور خیال کی رو اٹھی : پتا جی بھی تو آٹھ گھنٹے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اور وہ بھی تو گھنٹوں اسکول میں پڑھتا رہتا ہے۔ سڑک پر بازی گر کیسے قلابازیاں کھاتے ہیں اور گھنٹوں کھاتے رہتے ہیں۔ اگرچہ جسم کو قابو میں کرنا مشکل ہے' مگر جو جس کا پیشہ ہوتا ہے' وہ ویسا ہی بن جاتا ہے۔ لوہار سویرے سے شام تک لوہے کو ہی پیٹتا رہتا ہے۔ اگر وہ لوہار کا ہتھوڑا چلانے لگے تو کچھ ہی دیر میں تھک کر زمین پر آگرے۔ لیکن پھر بھی وہ کام کرنا جس سے جسم اور دماغ حرکت میں رہیں' اس سے آسان ہے کہ صرف ایک چیز' ایک نکتہ' یا "کچھ نہیں" پر نظر جما کر یا آنکھ بند کر کے گھنٹوں جنبش کئے بغیر بیٹھے رہو۔

کافی دیر سوچنے کے بعد' خود کو مہاتما کے برابر تولنے کے بعد گورکھ اس نتیجے پر پہنچا کہ مہاتما میں کوئی خاص

بات ضرور ہے۔

اگلے دن مہاتما کہنے لگے "ہٹلر بھگوان کا اوتار ہے۔ آج کے دور میں بھگوان اس کے روپ میں دھرتی پر اترا ہے۔ اس کی فتح ضرور ہوگی، جس سے ہندوستان کو بہت فائدہ ہوگا۔"

ان ہی دنوں گورکھ نے پتنگ بازی کا شوق چرایا۔ ہر روز شام کو چھت پر چارپائی بچھا کر وہ اڑتی ہوئی پتنگوں کو دیکھتا رہتا۔ اور پتنگوں کے مانند اس کا ذہن آسمان پر اڑتا رہتا۔ وہ سوچتا کہ کاش وہ آسمان پر اڑتا کاغذ کا ایک ٹکڑا ہوتا۔ اتنے میں ایک چڑیا پھڑپھڑاتی اڑجاتی اور وہ سوچتا کہ کاش وہ ایک چڑیا ہوتا۔ بالکل آزاد۔ ہواؤں کی طرح۔ بادل کی طرح۔ اڑتی پتنگوں کی طرح۔ پھر سوچتا کہ یہ بھی کہاں آزاد ہیں؟ پتنگوں کی زندگی پل بھر کی۔ چڑیا کو باز کا خوف۔ بادل کو بجلی کا۔ سب دور کے ڈھول سہانے لگتے ہیں۔ خیالوں کا یہی سلسلہ دیر تک آسمان کی طرف اڑتا اور زمین کی طرف مڑتا۔ کوئی پتنگ کٹتی تو وہ اسے دیر تک ڈور کے بغیر جھولتے دور کہیں گرتے دیکھتا رہتا۔ قریب میدان سے بہت سے پتنگیں اڑتیں، باہم الجھتیں، کٹتیں اور گرتیں۔ چھوٹے بڑے بچے کٹی پتنگوں کے پیچھے بھاگتے اور اکثر پتنگ کسی کے ہاتھ لگنے سے پہلے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی۔ وہ چھت سے یہ سب تماشا دیکھتا رہتا، لیکن گلی میں کبھی نہ اترتا۔ البتہ کبھی کبھی پڑوسیوں کی چھت پر ضرور چلا جاتا۔ وہاں کوئی اسے پتنگ کی ڈوری کی چرخی سنبھالنے کو کہہ دیتا، کوئی اسے پتنگ کو اونچا اڑا کر ذرا دیر کے لئے تھما دیتا۔ ڈور میں ایک خاص طرح کا کھنچاؤ اور لرزش ہوتی جو اسے بہت بھلی لگتی۔ دل چاہتا کہ دیر تک ڈور تھامے کھڑا رہے۔ اور پتنگ اڑاتی رہے۔ اسے پتنگ کو اونچا اٹھانا اور نیچے گرانا آچلا تھا۔ ہر پتنگ کی اونچے اور نیچے گرنے کی ایک ادا ہوتی ہے۔ چھوٹی پتنگ بار بار ہاتھ ہلا کر ڈور دبا کر اوپر چڑھتی اور بڑی پتنگ ہاتھ کے ذرا سے اشارے سے اوپر اٹھتی اور نیچے گرتی۔ ہوا کا بھی پتنگوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ جب ہوا مناسب ہوتی تو ذرا سی کوشش سے پتنگ ہوا سے باتیں کرنے لگتی۔ ٹھیری ہوئی ہوا میں پتنگ اوپر اٹھانا مشکل ہوتا۔ اور تیز ہوا میں اسے سنبھالنا اور بھی مشکل۔

پتنگ بازوں کی شاگردی سے گورکھ پتنگ بازی کے گر سمجھنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ اگر اس کے پاس اپنی پتنگ ہو تو وہ کسی کے دخل کے بغیر اسے اڑا کر دیکھے۔ گھر کی مالی حالت ابھی تک ٹھیک نہ تھی ہر وقت تنگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ بڑی مشکل سے کچھ پیسے بچا کر گورکھ نے ایک چھوٹی سی پتنگ اور کچھ ڈور خریدی۔ پتنگ کچھ دیر تک قریب قریب اڑتی رہی، کیوں کہ ڈور زیادہ لمبی نہ تھی۔ ڈور کے لئے چرخی خریدنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے پتنگ نیچے اتاری تو ڈور بری طرح الجھ گئی۔ پہروں وہ اسے سلجھاتا رہا۔ دوبارہ پتنگ اڑائی تو سڑک کے پار بجلی کے تاروں میں ایسی الجھی کہ پھر نہ نکل سکی۔

گورکھ کے دوستوں نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ خود پتنگ اور ڈور تیار کرے تو کافی خرچ بچ سکتا ہے۔ گھر میں

تیار کی ہوئی پتنگ اور ڈور کی لاگت بازار میں بکنے والی پتنگوں اور ڈور سے ایک چوتھائی کے قریب ہوگی۔ اگر اسے پتنگ اور ڈور بنانے کا ہنر آجائے تو ایک کے بعد ایک پتنگ جلد سے جلد تیار کر سکتا ہے۔ بات اس کے دماغ میں بیٹھ تو گئی، لیکن کس زحمت سے گذرنا ہوگا، اس کا ابھی اسے اندازہ نہ تھا۔

گورکھ ہر روز شام کو پتنگ فروشوں کی دکانوں کے چکر لگانے لگا۔ کچھ خریدنے کے لئے نہیں، بلکہ یہ دیکھنے کے لئے کہ پتنگ کیسے بنائی جاتی ہے۔ لگاتار ایک ہی دکان پر کھڑے رہ کر تکتے رہنے سے دکان دار خفا ہوجاتے۔ ان ہی دکانوں کا بغیر کچھ خریدے ہر روز چکر لگانا بھی دکان داروں کے دل میں شک پیدا کرنے لگا۔ کئی بار دکانوں کے چکر مارنے، کاریگروں کو پتنگ بناتے اور ڈور پر مانجھا لگاتے دیکھتے رہنے پر اسے ترکیب کا پتہ چل گیا۔ اب باقی رہ گیا عملی کام۔

گورکھ کے خواب اور خیال رات دن پتنگ اور ڈور کے ساتھ بندھے پھرتے۔ ایک عجیب طرح کی بے چینی دل اور دماغ پر چھائی رہتی۔ کچھ نقدی اکٹھی کرکے پہلے وہ پتنگ بنانے کا مہین اور رنگین کاغذ تلاش کرنے نکلا۔ سب سے پہلے اسکول کی کتابیں اور کاپیاں بیچنے والے دکان دار سے دریافت کیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ خاص کاغذ کس جگہ سے مل سکتا ہے۔ ایک دن شام کو دو میل پیدل چل کر اس نے کاغذ کا ٹھکانا ڈھونڈ نکالا۔ دکان دار بولا "میں کم سے کم ایک درجن کاغذ بیچ سکتا ہوں۔ اس سے کم نہیں۔" گورکھ سوچنے لگا کہ ایک درجن کاغذ تو بہت ہوں گے۔ کیا کرے گا وہ اتنے کاغذوں کا؟ جتنی نقدی جیب میں تھی اس سے ایک درجن لال اور پیلے خرید کردہ کاغذ لے کر واپس گھر آگیا۔ چار میل پیدل چلنے کے بعد بھی رات کو دیر تک اسے نیند نہ آئی اور وہ باقی سامان جمع کرنے کے متعلق سوچتا رہا۔

ڈور پر، مانجھا لگانے کے لئے شیشے کو باریک پیسنے کا کام اس سے بھی زیادہ پریشان کن نکلا۔ وہ سڑک پر جس طرف سے نکلتا، ٹوٹے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں کو ہی نظر ڈھونڈتی۔ ایک دن گھر میں بجلی کا بلب فیوز ہوگیا تو اسے بے حد خوشی ہوئی۔ بلب توڑتے وقت اس نے اپنی انگلی زخمی کرلی۔ رفتہ رفتہ بہت سے کانچ کے ٹکڑے اکٹھے ہوگئے۔

مسالے پیسنے کے لئے کبھی کبھی لوہے کی اوکھلی اور موسل مکان مالکن سے مانگ لیا جاتا تھا۔ ایک دن ہمت کرکے گورکھ مکان مالکن کے پاس پہنچا اور بولا "ماں نے آپ کی لوہے کی اوکھلی منگوائی ہے۔ مسالے پیسنے ہیں۔"

گرمیوں کے دن تھے۔ لیکن چھت ہی ایک ایسی محفوظ جگہ تھی جہاں اسے کوئی کانچ پیستے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے کانچ کو پیس کر باریک کرلیا۔ اور آٹا چھاننے کی چھلنی سے اسے چھان بھی لیا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ کانچ میدے کی طرح باریک ہونی چاہئے۔ ماں کے پرانے ململ کے دوپٹے نے یہ مشکل حل کردی۔ وہ

گھنٹوں دھوپ میں بیٹھا کانچ پیس پیس کر ململ سے چھانتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ مہین شیشہ جسم کی جلد پر ہر جگہ سما گیا ہے۔ بار بار پسینہ پوچھنے کے لئے اس کے ہاتھ چہرے پر جاتے اور کانچ کے سفوف کی بھی پرت چھوڑ جاتے۔ کھجلی سے جب برا حال ہونے لگا تو وہ کام کو ادھورا چھوڑ کر غسل کرنے چلا گیا۔

دوسرے دن پھر یہی عمل جاری رہا۔ آخر صحیح مقدار میں شیشہ پس کر تیار ہو گیا' جسے اس نے احتیاط سے بوتل میں بند کر کے چھپا دیا۔ اوکھلی کو پانی سے اچھی طرح صاف کر کے جب وہ واپس کرنے گیا تو مکان مالکن بولی "اوکھلی کی آج تو بڑی اچھی طرح صفائی کی ہے۔ کس نے کی ہے؟"

گورکھ نے جواب دیا "میں نے ہی صاف کی ہے۔ چاروں طرف مسالہ ہی مسالہ لگا ہوا تھا۔"

پتنگ بنانے کے لئے بانس کی لچک دار' پتلی پتلی تیلیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک تیلی پتنگ کے درمیان اوپر سے نیچے تک لگی رہتی ہے اور دوسری نصف دائرے میں گھومتی پتنگ کے دونوں کناروں کو جوڑتی ہوئی کاغذ میں تناؤ پیدا کرتی ہے۔

صبح کی سیر کرتے وقت گورکھ نے سڑک کے دونوں جانب بانس کے پیڑ کھڑے دیکھے تھے۔ بہت بار اس کا دل چاہتا کہ ایک بانس کا پیڑ کاٹ لے' مگر والد ساتھ ہوتے اور ان سے کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ایک روز گورکھ گھر سے چاقو جیب میں رکھ کر باپ کے ساتھ سیر کو نکلا۔ جب وہ بانس کا پیڑ کاٹنے لگا تو گوپال داس نے پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

گورکھ نے جواب دیا : مجھے یہ بانس کا پیڑ چاہئے۔

گوپال داس حیران ہو کر بولے "کیا کرنا ہے تجھے یہ جنگلی بانس کے پیڑ کا؟

گورکھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بانسری بنانی ہے۔

گوپال داس ہنس پڑے "اور تو سب شوق پورے ہو گئے! یہ بانسری بجانے کا بھوت کب سوار ہوا؟"

گورکھ کو بانس کا پیڑ چاہئے تھا' وہ مل گیا۔ چھت پر آ کر اس نے بانس کو آر پار کاٹ کر دو ٹکڑے کئے' پھر دو کے چار۔ اس طرح چاقو سے چھیل چھیل کر پتنگ بنانے کی تیلیاں بنائیں۔ انہیں کچھ روز دھوپ میں سکھانا ضروری تھا' ورنہ تیلیاں سوکھنے پر جب سکڑتیں تو پتنگ کا کاغذ پھاڑ دیتیں۔

اہم ترین چیز ڈور تھی' جس کا بندوبست ابھی باقی تھا۔ نہ وہ زیادہ موٹی ہونی چاہئے' نہ زیادہ باریک۔ اگر زیادہ بھاری ہوئی تو پتنگ کو لے ڈوبے گی۔ اور اگر کمزور ہوگی تو وہ پتنگ کو گنوا بیٹھے گا۔ یہ مشکل ایسے حل ہوئی کہ اسکول کی کاپیاں خریدنے کی بجائے گورکھ انہیں گھر میں تیار کر لیتا تھا۔ یہ کوئی دشوار کام نہ تھا۔ کاغذوں کو ایک ایک کر کے یکجا وہ بخوبی ان کی سلائی کر سکتا تھا۔ اس نے غور کیا تو کاپیوں کو سینے کی ڈور اس نے پتنگ اڑانے کے لئے مناسب پائی۔ وہ ڈور گوپال داس بینک کے دفتر سے لے آتے تھے۔ بینک میں شاید رجسٹر سلنے کے کام آتی

ہو گی۔

ایک دن موقع پا کر گورکھ نے ڈور کا ایک پورا گولا چرا لیا اور اسے لے جا کر چھت پر چھپا دیا۔

ابھی دو چیزیں اور درکار تھیں۔ ایک سریش اور دوسری میدے کی لئی۔ اس نے سنا تھا کہ سریش مچھلی سے بنتا ہے اور بہت چپچپا ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی کی پنساری کی دکان سے مل سکتا ہے۔ سریش کی کھوج بھی اتنی ہی زحمت آمیز تھی جتنی پتنگ کے کاغذ کی۔ کئی بازاروں میں گھوم کر اور تحقیق کر کے اسے چند ٹکڑے سریش کے مل گئے۔

گیہوں کا آٹا گھر میں موجود تھا۔ گورکھ نے وہی پرانا دوپٹا جس سے شیشے کا سفوف چھانا تھا' آٹا چھاننے کے لئے استعمال کیا۔ شیشہ کتنا نوک دار اور کھردرا تھا' لیکن بہت احتیاط کی وجہ سے دوپٹا صحیح سلامت رہا۔ جلد بازی میں آٹا چھانتے چھانتے دوپٹا ایک جگہ سے پھٹ گیا۔ گورکھ بہت گھبرایا۔ اس نے چھاننے والی جگہ سے دوپٹے کو دھو کر جہاں سے نکالا تھا وہیں رکھ آیا۔ ایک دن جب ساوتری نے دوپٹا اوڑھنے کے لئے نکالا تو دو جگہ سے پھٹا ہوا پایا۔ بار بار وہ اپنے آپ سے کہتی رہی "نہ جانے میرا دوپٹا کیسے پھٹ گیا؟" پھر گورکھ سے مخاطب ہو کر بولی "تم نے تو کوئی شرارت نہیں کی؟"

گورکھ بھولا بن گیا "میں بھلا آپ کے دوپٹے سے کیوں کھیلنے لگا؟"

کہنے کو تو وہ کہہ گیا' لیکن دل سے اٹھتی ہوئی ندامت کی آواز نے اسے جھنجوڑ دیا۔ وہ بہت جھوٹا ہو گیا ہے اپنے والدین سے بھی جھوٹ بولتا ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ اپنے مطلب کے لئے' اپنی تمناؤں کے لئے' اپنے شوق پورے کرنے کے لئے دھڑلے سے جھوٹ بھی بول سکتا ہے' چوری بھی کر سکتا ہے۔۔ لیکن ایسا جھوٹ بولنے میں حرج ہی کیا ہے؟ یہ تو ایک معصومانہ جھوٹ ہے۔ سب لڑکے پتنگ اڑاتے ہیں۔ پیسے لٹاتے ہیں۔ وہ گھر کی حالت سمجھتا ہے۔ ماں باپ کو پیسے کے لئے تنگ نہیں کرتا۔ کبھی جیب خرچ نہیں مانگتا۔ لیکن اس کا دل بھی تو آخر دل ہے۔ اس میں بھی کچھ شوق ہیں۔ ان کا کیا کرے۔؟ پتنگ بنانے اور اڑانے کے لئے وہ کتنی محنت کر چکا ہے' کتنی زحمت اٹھا چکا ہے۔ اگر یہ بات والدین پر کھل جائے کہ وہ پتنگ بنانے اور ڈور پر مانجھا لگانے کے چکر میں ہے تو اسے کتنی ڈانٹ پڑ سکتی ہے۔ اس کا سارا جمع کیا ہوا سامان کوڑے کے کنستر کے حوالے ہو سکتا ہے۔ اور پھر اسے کتنا غم ہو گا؟ دراصل یہ بھاگ دوڑ' یہ ایک ایک چیز اکھٹی کرنا' یہ محنت اور مشقت' دو پیسے کے پتنگ بنانے کے لئے' کتنی دل چسپ ہے۔ یہ بے خوابی' یہ دماغی ہلچل' یہ خیالات کا ہر وقت پتنگ بنانے کے سلسلے ایک ہی مرکز پر گھومتے رہنا کس قدر پر کشش اور پر لطف ہے۔ جو لڑکے خرید خرید کر پتنگ اڑاتے ہیں' وہ نکمے ہیں' اس سے کئی درجہ ہیچ ہیں۔ انہوں نے اس مسرت' اس لطف کا مزہ ہی نہیں چکھا۔ جو اسے اس لگن' اس مشقت' اس جنون سے حاصل ہو رہی ہے۔

پتنگ کے بغیر ڈور اور ڈور کے بغیر پتنگ دونوں ہی بے کار ہیں۔ گورکھ نے پہلے ڈور پر مانجھا لگایا۔ ایک ٹین کے پرانے ڈبے میں سریس اور پانی ڈال کر اسے نرم آگ پر آنچ دی۔ رفتہ رفتہ سریش پانی میں گھلتا چلا گیا۔ مانجھا لگانے کا ایک خاص گر یہ ہے کہ اس مرکب کو ٹھنڈا نہ ہونے دیا جائے، نہیں تو مرکب گاڑھا ہوتا چلا جائے گا۔ ڈور کا گولا گورکھ نے گرم گرم مرکب میں ڈبو دیا اور اسے دھیمی آنچ پر رکھا رہنے دیا۔ پھر میدے کی لئی بنا کر اس میں باریک پسا ہوا شیشہ ایک خاص مقدار میں ملایا۔ ڈور کا ایک سرا کھڑکی کی ایک چھڑی کے ساتھ باندھ کر ڈور کو جولاہے کے تانے بانے کی طرح دو کھڑکیوں کی سلاخوں کے درمیان کھینچ دیا۔ پھر گیلی ڈور پر شیشے کا سفوف ملی لئی کاغذ میں بھر کر ڈور پر پھرا دی۔ جب ڈور خشک ہو گئی تو عام ڈور "مانجھے والی ڈور بن گئی" جس سے کوئی دوسری اڑتی پتنگ کاٹی جا سکتی تھی۔

گورکھ نے ڈور پر رنگ بھی چڑھا لیا تھا۔ بازار میں فروخت ہونے والی ڈور کئی رنگوں میں ملتی تھی۔ گورکھ نے لال روشنائی کی دوات سریش اور پانی کے مرکب میں الٹ دی تھی اور ڈور قدرے گلابی رنگ پکڑ گئی تھی۔

ڈور لپیٹنے کے لئے چرخی بنانا مشکل کام تھا۔ اس لئے گورکھ نے ڈور کو ہاتھ سے ڈھیلے گولے کی صورت میں لپیٹ لیا۔

اب پتنگ کی باری تھی۔ کاغذ کو پتنگ کی شکل میں کاٹنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ پتنگ کے درمیان بانس کی تیلی چسپاں کرنا بھی آسان تھا۔ مشکل تھا تو بانس کی دوسری تیلی کو نصف دائرے کی صورت میں گھما کر پتنگ کے دونوں جانب چپکانا۔ ایک کونا تو چپک جاتا۔ مگر جیسے ہی وہ دوسرا کونا چپکانا چاہتا، کاغذ پھٹ جاتا۔ کافی کوشش کے بعد وہ اس قابل ہو سکا کہ بانس کی دوسری تیلی کو بغیر کاغذ پھاڑے چسپاں کر سکے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ سلائی کو گولائی میں گھما کر کسی بھاری چیز سے دبا کر رکھا جائے اور اسے پتنگ کے کاغذ سے چپکاتے وقت خیال رکھا جائے کہ تیلی اپنی سیدھی حالت میں آنے کی کوشش کرتے ہوئے کاغذ کو نہ پھاڑ دے۔

اب پتنگ اور ڈور، دونوں تیار تھے۔ ڈور کو پتنگ کے ساتھ باندھ کر آزمائش کا وقت آگیا۔ پہلے تو دو تین پتنگیں ٹھیک طرح نہ اڑ سکیں، کیوں کہ وہ ٹھیک نہیں بنی تھیں۔ کبھی نیچے کا حصہ، کبھی دائیں اور کبھی بائیں حصے ایک دوسرے کے برابر نہ ہونے سے پتنگ کچھ اونچائی تک جا کر غوطے کھانے لگتی اور اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن گورکھ نے ہمت نہ ہاری۔ چھوٹی پتنگوں سے شروع کر کے وہ بڑی پتنگوں کی طرف بڑھتا گیا اور آخر ایک دن اس نے ایک خوب صورت پتنگ تیار کر لی۔ وہ پتنگ اتنی صفائی سے بنی تھی کہ کوئی پتنگ باز بھی بازار کی اور گورکھ کی بنائی ہوئی پتنگ کی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔

اس دن ہوا مناسب تھی۔ ذرا سی دیر میں گورکھ کی پتنگ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ گورکھ کبھی ڈور کو ڈھیل دے کر اور کبھی کھینچ کر اپنی پتنگ کو اونچا کر رہا تھا۔ کہ یکایک اس کی پتنگ پر ایک اور پتنگ نے حملہ بول دیا۔

گورکھ نے ہمت نہ ہاری سوچا کہ مانجھا آزمانے کا موقع مل رہا ہے۔ چند منٹوں میں ہی حملہ آور کی پتنگ کٹ گئی اور غوطے کھاتی ہوئی ڈولنے لگی۔ یہ نظارہ اس کے دوست' جو اس کے مکان کے سامنے والی چھت پر موجود تھے' تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ گورکھ کی چھت سے کبھی اتنی بڑی پتنگ نہیں اڑی تھی اور نہ کبھی اتنی اونچائی پر پہنچی تھی۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ گورکھ ایک پتنگ کو مات دے چکا تھا۔ دونوں دوست بھاگے بھاگے اس کی چھت پر پہنچے اور پوچھنے لگے "ڈور کہاں سے خریدی؟ پتنگ کہاں سے لائے؟ دونوں ہی عمدہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن چرخی کیوں نہیں خریدی؟ ڈور خراب ہو جائے گی۔"

گورکھ سنتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اکیلا ہی پتنگ اڑانے کا لطف اٹھائے۔ دیر تک ڈور ہاتھوں میں تھامے وہ پتنگ کو آسمان میں اڑتا دیکھتا رہے۔ لیکن ان دوستوں نے تو اسے شروع شروع میں پتنگ اڑانا سکھایا تھا۔ انہیں چھت سے چلے جانے کو کیسے کہہ سکتا تھا؟ ایک نے بڑھ کر گورکھ سے ڈور تھامی اور خوب ڈھیل دے کر دور تک پتنگ بڑھائی۔ گورکھ دیکھتا رہا "ارے ٹھیرو۔ دیکھو' ڈور ختم ہونے والا ہے۔ اور آگے مت بڑھو۔" مگر دوست کہاں ماننے والا تھا۔ اتنے میں ایک اور حملہ آور پتنگ آئی اور پلک جھپکتے ہی گورکھ کی پتنگ کو آسمان سے اتار گئی۔ گورکھ دیر تک اپنی ڈوبتی پتنگ اور سرکتی ڈور کو دیکھتا رہا۔ دوست چپ چاپ اپنی چھت کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد دوبارہ گورکھ نے نہ پتنگ بنائی اور نہ ڈور پر مانجھا لگایا۔ وہ دیر تک چارپائی پر لیٹا آسمان کی طرف آنکھیں جمائے' اڑتے اور گرتے پتنگوں کو دیکھتا رہتا۔ کئی پتنگوں کے اڑنے کا انداز اسے بہت متاثر کرتا۔ آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے کبھی کبھی اس کی آنکھیں پتھرا جاتیں اور وہ محسوس کرتا کہ وہ بھی کوئی اڑتی پتنگ ہے۔ اس کی جیب میں اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں کس جاتیں' جیسے وہ بھی کوئی پتنگ اڑا رہا ہو۔ اور پتنگ آہستہ آہستہ اٹھ رہی ہو' گر رہی ہو' اٹھ اٹھ کر گر رہی ہو' یہاں تک کہ ایسی گری ہو کہ پھر اٹھ نہ سکے۔

کبھی کبھی گورکھ کو ستو اور شنکر یاد آتے رہتے تھے۔ رخصت ہونے کے وقت اور گاڑی کے سفر کے دوران میں گورکھ ان ہی کو یاد کرتا رہا تھا' مگر گوجرہ پہنچنے پر کچھ ہی عرصے میں جیسے وہ انہیں بھلا بیٹھا تھا۔ صرف کبھی کبھی ان کی یاد آتی تھی۔ مگر دوبارہ ملنے کی کوئی خاص تمنا بھی دل میں نہیں اٹھتی تھی۔ البتہ اسکول میں کوئی بھی دوست ستو اور شنکر کی جگہ نہ لے سکا۔ اول تو اسکول کے لڑکے اس کے مقابلے میں ڈیل ڈول میں بڑے لگتے تھے' دوسرے ان کی پنجابی زبان دوستی بڑھانے میں آڑے آتی تھی' کیوں کہ پنجابی وہ ٹھیک طرح نہیں بول سکتا تھا۔ زبان کے اختلاف کی وجہ سے جو لڑکا بھی اس کے قریب آتا' کچھ دیر بعد وہ دور ہوجاتا اور دوستوں کی بجائے "دشمنوں" کے گروہ میں شامل ہوجاتا۔

جب گورکھ کو کوئی دوست نہ ملا تو اس نے کتابوں کا سہارا لیا۔ اسکول کی لائبریری سے کوئی نہ کوئی کتاب اٹھالاتا اور چند روز میں پڑھ کر واپس کردیتا۔ لائبریری میں اردو کی بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ اکثر جادوگروں کے قصے' پریوں کی کہانیاں' قدیم عمارتیں' اڑنے والے گھوڑے' پرانے قلعے' شہزادے اور شہزادیاں تصور میں رنگ بھرجاتے۔ کہانیوں کا وہ ماحول اسے کہیں دور دراز سنہرے خوابوں کے نگر میں لے جاتا۔ کسی قلعہ کے مینار میں ایک شہزادی قید ہوتی جس کی جان ایک خوں خوار جن کے قبضے میں ہوتی۔ شہزادے کو خطرناک مقاموں' آگ' سمندر اور طوفانوں سے گزرنا پڑتا۔ ایک کے بعد ایک منزلیں پار کرتا وہ شہزادی کے نزدیک پہنچنے والا ہوتا کہ جادو کے اثر سے جن اسے پرندہ بنا کر پنجرے میں قید کرلیتا۔ پرندہ خود تو پنجرا لے کر نہیں اڑ سکتا تھا' لیکن شہزادے کی محبت ایک شاہین کو کھینچ لاتی۔ شاہین کسی کہسار کے دامن میں پنجرے کو رکھ کر اڑتا تو ایک لمبی داڑھی والا بوڑھا جادوگر نمودار ہوتا' جو شہزادے کو ایک طلسمی تعویذ دیتا۔ آخر شہزادہ اپنی محبت کو پانے میں کامیاب ہوجاتا۔۔ اس قسم کی داستانیں گورکھ کے خوابوں میں حقیقت بن جاتیں۔ کہانی کے کرداروں اور منظروں کو بار بار تصور میں زندہ دیکھ وہ ان ہی میں کھویا رہتا۔ جیسے کسی مردہ شہزادے کی روح اس کے جسم میں داخل ہوگئی ہو' جیسے اسے بھی کسی کی تلاش ہو۔ سلسلہ در سلسلہ وہ قیاسی منظر اسے اس قدر محو کردیتے کہ وہ حقیقت سے بہت دور جانکلتا۔ افق پر نظر جمائے خوابوں میں گھنٹوں گزار دینا اس کے لئے روز کا معمول ہوگیا۔

ایک روز گورکھ اسکول کی لائبریری میں کچھ کتابیں تلاش کر رہا تھا کہ اس کی ملاقات نہال سنگھ سے ہوئی۔ گورکھ الماری کے سب سے اونچے کے خانے سے کچھ کتابیں نیچے اتار کر دیکھنا چاہتا تھا۔ عموماً" لکڑی کا ایک اسٹول لائبریری میں موجود رہتا تھا، لیکن اس روز گورکھ کو وہ اسٹول نظر نہیں آیا۔ پاس کھڑے ہوئے ایک سکھ لڑکے نے، جو قد میں اس سے کہیں زیادہ اونچا تھا اس سے پوچھا "کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

گورکھ نے جواب دیا : "یہاں ایک اسٹول پڑا رہتا تھا۔ مجھے الماری سے کچھ کتابیں اتارنی ہیں۔

"لاؤ، میں اتار دیتا ہوں، کون سی کتاب چاہیے؟"

"دائیں طرف سے لگاتار پانچ کتابیں اتار دیں۔ شکریہ۔"

گورکھ نے دو کتابیں چن لیں۔ لڑکا پوچھنے لگا "کیا نام ہے تمہارا؟"

گورکھ نے اپنا نام بتایا۔

"تم یہاں کے رہنے والے تو نہیں لگتے۔ پہلے کہاں پڑھتے تھے؟"

گورکھ سوچنے لگا کہ اس کے زبان کھولتے ہی سب پہچان لیتے ہیں کہ وہ پردیسی ہے۔ اس نے اپنی جماعت اور جگہ کا نام بتایا۔

"میرا نام نہال سنگھ ہے" سکھ لڑکا کہنے لگا۔ میں دسویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ یہ اسکول ہے ہی دس جماعت تک۔

گورکھ سنتا رہا۔ وہ باہر جانے کے لئے تیار ہوا تو نہال بھی اس کے ساتھ باہر نکلا۔ اسی وقت چھٹی کا گھنٹہ بجا۔ روز کی طرح کئی لڑکوں نے گورکھ کو گھیر لیا اور نعرے بلند ہوئے۔ نہال سنگھ نے یہ نظارہ دیکھا تو سب کو ڈانٹ پلائی اور بولا "اگر آج کے بعد میں نے کسی کو نعرے بازی کرتے دیکھ لیا تو ایسی پٹائی کروں گا کہ یاد رکھو گے۔"

دراصل نہال سنگھ طالب علم لگتا ہی نہیں تھا۔ لمبا قد۔ بھرا ہوا بدن۔ چھترائی ہوئی داڑھی، سر پر پگڑی۔ کلاس کے لڑکے اس کی ڈانٹ سن کر دم دبا کر بھاگ گئے۔ نہال سنگھ گورکھ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گورکھ خوش تھا کہ کسی نے تو اس کا ساتھ دیا۔ اسکول کے دروازے سے نکل کر نہال سنگھ اس سے پوچھنے لگا "کون سے محلے میں رہتے ہو۔"

گورکھ نے محلے کا نام بتایا تو نہال سنگھ حیرت سے بولا "تعجب ہے کہ آج تک ملاقات نہیں ہوئی! میں بھی اسی محلے میں رہتا ہوں۔ دائیں طرف سے گلی میں داخل ہو کر میرا مکان دوسرے نمبر پر بائیں ہاتھ کو پڑے گا۔ تم کون سے مکان میں رہتے ہو؟

گورکھ نے مالک مکان کا نام اور گھر کا نمبر بتایا۔ نہال سنگھ بولا "کمال ہے! میرے مکان سے کچھ ہی دور پر تو تم رہتے ہو۔ کیا کبھی گلی میں نہیں نکلتے؟"

گورکھ نے کہا "ایسی بات تو نہیں کہ میں ہردم گھر میں گھسا رہتا ہوں بازار سے سودا بھی اکثر میں ہی لاتا ہوں۔ مگر اور لڑکوں کی طرح گلی میں نہیں کھیلتا۔"

نہال سنگھ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "اب ملاقات ہوتی رہے گی۔"

اگلے دن کلاس کے لڑکے گورکھ سے پوچھنے لگے : "کون تھا وہ سردار؟ کہاں سے آیا؟ تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے جو تمہاری طرف داری کر رہا تھا؟"

گورکھ نے بڑی شان سے بتایا کہ وہ اسی اسکول کا طالب علم ہے اور تازہ تازہ اس کا دوست بنا ہے۔ پھر اس نے کہا "مت سمجھنا کہ اب میں اکیلا ہوں۔ ایک ایک کی مرمت کروادوں گا۔ خبردار جو نعرے بازی کی!"

کچھ لڑکے ہنسنے لگے۔ "ارے دیکھ لیں گے تمہارے نہال سنگھ کو، کس کس کی مرمت کرے گا؟ سب مل کر اس پو ٹوٹ پڑیں گے۔ سردار کی پگڑی نہ اڑادی تو پھر کہنا!"

لڑکے واقعی ڈر گئے تھے۔ اس دن بہت کم نعرے بازی ہوئی۔ البتہ نہال سنگھ کئی دن تک گورکھ کو نہ اسکول میں نظر آیا اور نہ گلی میں۔

اس روز بیساکھی کی چھٹی تھی۔ اسکول بند تھا۔ دوپہر کے وقت گورکھ کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ گورکھ نے دروازہ کھولا تو نہال سنگھ ایک عورت کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں کانسے کا تھال سنبھال رکھا تھا جو مٹھائی سے بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ عورت نہال سنگھ کی ماں یا کوئی قریبی رشتہ دار ہوگی۔

مہمان اندر آئے۔ عورت کہنے لگی "آج بیساکھی ہے۔ ہم آپ کے پڑوسی ہیں۔ آپ نئے نئے آئے ہیں۔ ہر سال ہم بیساکھی کے روز سارے محلے میں مٹھائی بانٹتے ہیں۔ یہ رہا آپ کا حصہ۔"

بات آگے چلی تو نہال کی ماں کہنے لگی : "واہ گرو کی بہت مہر ہے۔ مگر میرا نہال بڑا نالائق ہے۔ پڑھنے میں اس کا دل نہیں لگتا۔ دو بار فیل ہو چکا ہے۔ لیکن پڑھ کے کرنا بھی کیا ہے؟ اس نے کون سا دفتر میں کام کرنا ہے؟ زمین ہے، جائداد ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرے گا۔ ہمارے گنے اور گیہوں کے کھیت ہیں۔ ہم تو پنجاب کے کسان ہیں۔ یہ بابو بننا ہمارے بس کا نہیں؟"

ساوتری ان کی باتیں سنتی رہی۔ کچھ کہنے کو نہ سوجھا تو بولی "گورکھ پڑھائی میں تو اچھا ہے، لیکن میں اس کی شرارتوں سے بہت تنگ ہوں۔ ابھی چھوٹا ہے۔ بڑا ہوگا تو اپنے آپ سمجھ جائے گا۔ جہاں سے ہم لوگ آئے ہیں، وہاں ہماری بھی زمین جائداد ہے۔ لیکن گورکھ کے پتاجی کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ نوکری میں ہیں دیکھو، آہستہ آہستہ اور ترقی ہو جائے گی۔"

نہال کی ماں نے کہا "اب اسے اتفاق کی بات ہی سمجھو، ہم پڑوسی ہیں، ہمارے لڑکے ایک ہی اسکول میں

پڑھتے ہیں اور ملاقات آج ہو رہی ہے! خیر اب ملتے رہیں گے۔"

مہمان رخصت ہوئے۔ مٹھائی اچھی تھی۔ گورکھ کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔ جاتے جاتے نہال اسے اپنے گھر آنے کا بلاوا دے گیا۔ نہال کی ماں بھی کہہ گئی : "آجایا کرو بیٹے۔"

گورکھ نہال کے گھر سے بہت متاثر ہوا۔ ہر چیز قرینے سے سجی ہوئی۔ بڑھیا فرنیچر۔ بیٹھنے کا کمرہ الگ۔ دیواروں پر گرونانک اور سکھ گروکی خوب صورت تصویریں۔ صاف ستھرے بستر' اونچے پلنگ۔ نہال کو ایک الگ کمرہ ملا ہوا تھا۔ ایک طرف پڑھنے کے لئے میز اور کرسی۔ دوسری جانب سونے کے لئے خوب صورت مسہری اور بستر۔ لیکن گورکھ سب سے زیادہ نہال کی نئی سائیکل سے متاثر ہوا۔ سائیکل اس لئے خریدی گئی تھی کہ نہال کھیتوں تک آسانی سے پہنچ سکے۔ پڑھائی کے علاوہ اسے کھیت میں کام کرنے والے مزدوروں کی نگرانی بھی کرنی ہوتی تھی۔

نہال گورکھ سے پوچھنے لگا : "میری نئی سائیکل پر سیر کرنے چلو گے؟" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ گورکھ دیر سے سائیکل کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چلنے کو رضامند ہو گیا۔ نہال نے اسے سائیکل پر آگے بٹھایا۔ گلی سے نکل کر' اسکول کے سامنے والی سڑک سے ہو کر' گھماؤ لے کر نہال "گورکھ کے گھر کی جانب مڑا۔ گورکھ چاہتا تھا کہ سائیکل پر ابھی کچھ دیر اور بیٹھا رہے۔ گورکھ کے گھر پہنچ کر نہال بولا۔ "جب جی چاہے آجایا کرو۔ سیر کرنے چلا کریں گے۔"

اتوار کا دن تھا۔ گورکھ شام ہونے کی بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ نہال سے ملنے کا ایک بہانہ یہ بھی تھا کہ وہ نہال کے گھر پڑھنے جا رہا ہے۔ نہال دسویں کلاس میں تھا اور وہ چھٹی میں۔ بظاہر وہ نہال سے پڑھ سکتا تھا' اگرچہ ساوتری کو معلوم ہو چکا تھا کہ نہال پڑھائی میں صفر ہے۔

گورکھ کتابیں اٹھا کر نہال کے گھر پہنچا۔ کچھ دیر بعد کتابیں اس کے کمرے میں پٹک کر کہنے لگا "چلو' آج کہیں دور سیر کرنے چلیں۔"

نہال نے پوچھا "کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"آج نہر تک چلو۔" گورکھ نے کہا۔

"وہ تو کافی دور ہے۔ تقریباً" چھ میل دور تو ہو گی۔ خیر کوئی بات نہیں' چلو چلتے ہیں۔"

گورکھ سائیکل پر آگے کی طرف لوہے کے پائپ پر بیٹھ گیا' جو سائیکل کی گدی کو ہینڈل کے ساتھ ملاتا ہے۔ راستے میں اسے محسوس ہوا کہ نہال کی داڑھی کبھی کبھی اس کے سر کو چھو رہی ہے۔ گردن گھما کر دیکھتا تو نہال کا سر اپنی جگہ ٹھیک موجود ہوتا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ نہال کے گھٹنے سائیکل کے پیڈل کو حرکت دیتے دیتے کبھی کبھی اس کی رانوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ وہ کچھ اور آگے کو کھسک جاتا' مگر اس حرکت میں کچھ فرق نہ پڑتا۔ اس

نے سوچا کہ شاید نہال دانستہ ایسا کر رہا ہو گا۔ پھر سوچا کہ شاید سائیکل چلانے کے وقت پاؤں ایک دم سیدھے نہ چلتے ہوں گے۔ دونوں نہر پر پہنچے اور وہاں دیر تک پاؤں پانی میں لٹکائے بیٹھے رہے۔ گفتگو کا سلسلہ کھیت، نہر اور اسکول کی پڑھائی تک محدود رہا۔ نہال کو معلوم تھا کہ کھیتوں میں کیا بویا ہے کب بویا ہے، کب اگے گا، کب کٹے گا۔ اناج سے لے کر سبزیاں اگانے تک وہ کاشت کاری کا کافی علم رکھتا تھا۔

نہر کے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھنا گورکھ کو اچھا لگ رہا تھا۔ یکایک نہال بولا "میں کچھ دور تک تیر کر آتا ہوں۔ بس اس پل تک جا کر واپس آیا۔" اس نے کپڑے اتارے اور پانی میں کود پڑا۔

کچھ دن پہلے کا ایک خطرناک واقعہ گورکھ کو یاد آیا۔ گوپال داس کے دفتر کے کچھ لوگ نہر پر سیر کرنے نکلے تھے۔ گورکھ بھی ان کے ساتھ تھا۔ باقی سب لوگوں کو تیرنا آتا تھا، لیکن گوپال داس تیرنا نہیں جانتے تھے۔ دوستوں کے سہارے وہ نہر میں اتر تو پڑے، لیکن دوست پیچھے رہ گئے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ بہتے بہتے پل تک چلے گئے۔ کسی نے انہیں غوطے کھاتے دیکھ کر نہر میں کود کر بچا لیا اور وہ ڈوبتے ڈوبتے بچے۔ اس واقعہ نے گورکھ کے رونگٹے کھڑے کر دئے۔ وہ کئی دن تک سوچتا رہا کہ اگر پتاجی کو کچھ ہو جاتا تو وہ سب کیسے گزارا کرتے۔ انہیں کوئی سہارا دینے والا نہ تھا۔ گھر میں پتاجی کی نوکری کے باوجود تنگی سے گزر ہوتا تھا۔ بھگوان کرے اس کے پتاجی ہمیشہ ہمیشہ سلامت رہیں۔ اگر ان کی قسمت میں جلد بلاوا لکھا ہو تو ان کی جگہ وہ مرجائے اور اس کی عمر پتاجی کو لگ جائے، تاکہ اس کی ماں اور بہن بھائی در در کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔

گورکھ ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ نہال تیرتا ہوا واپس آگیا۔ نہر سے باہر نکل کر قریب ہی درختوں کے پیچھے اس نے گیلا انڈرویر اتار کر کپڑے پہنے اور چلنے کو تیار ہوا۔

گورکھ نے جھجکتے ہوئے کہا "اب میں سائیکل کے کیریر پر پیچھے بیٹھوں گا۔" "نہیں نہیں۔ تم آگے بیٹھو گے۔" نہال بولا پیچھے بیٹھنے سے میں سائیکل ٹھیک طرح نہ چلا پاؤں گا۔ توازن بگڑ جاتا ہے۔"

گورکھ نے بہانا بنایا۔ تم تو مزے سے سائیکل کی گدی پر بیٹھ جاتے ہو اور میں سائیکل سے پائپ پر بیٹھے بیٹھے اکڑ جاتا ہوں۔"

نہال نے کہا "اچھا تو یہ بات ہے!" اپنی پگڑی کھولی اور سائیکل کے پائپ پر لپیٹ دی۔ پھر کہنے لگا "آرام سے بیٹھو۔ لمبا سفر ہے۔"

گورکھ کو نہال کی اس حرکت پر حیرت ہوئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سردار اپنی پگڑی کی بہت عزت کرتے ہیں۔ یہ کیا عجیب بات ہے کہ نہال نے پگڑی کھول کر صرف اس کے آرام کے لئے سائیکل کے پائپ پر لپیٹ دی تھی؟ وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گیا اور نہال سائیکل چلاتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہوا۔

لوٹتے وقت بھی گورکھ نے کئی بار نہال کے گھٹنوں کی رگڑ اپنی رانوں پر محسوس کی۔ اسے چوکنا پا کر نہال

بولا "میں تھک گیا ہوں۔ پاؤں ذرا لڑکھڑا رہے ہیں۔ خواہ مخواہ تم سے ٹکرا رہا ہوں۔"

گھر پہنچتے ہی نہال کی ماں نے پوچھا "کہاں تھے تم دونوں؟ بڑی دیر لگا دی!"

"ہم نہر پر سیر کرنے چلے گئے تھے۔" نہال نے جواب دیا۔

"اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی؟" نہال کی ماں نے جرح کی۔

"میرا دوست اصرار کر رہا تھا۔" نہال نے کہا۔

نہال کی ماں گورکھ کی طرف دیکھ کر چپ ہو گئی۔

نہال کے گھر میں بہت سے لوگ رہتے تھے' جو نہال کے نزدیکی یا دور کے رشتہ دار تھے۔ نہال نے تقریباً" سب سے گورکھ کا تعارف کروا دیا تھا سب کے ناتے بھی بتا دیئے تھے۔ دو منزلہ مکان تھا۔ تقریباً" گیارہ کمرے ہوں گے۔ زیادہ تر عورتیں اور لڑکیاں گھر میں نظر آتیں۔ مرد عموماً" کھیت پر رہتے اور شاید رات کو دیر سے آتے یا کھیت پر سو رہتے۔ مردوں کی داڑھی بڑھی رہنے سے گورکھ کو سب مرد ایک ہی صورت کے لگتے۔ اور وہ ان کی شباہت اور ناموں پر دھیان بھی نہیں دیتا تھا۔ البتہ ایک گلاب سا چہرہ اور دو ستاروں جیسی آنکھیں اس کے دل میں سما گئی تھیں۔ وہ نہال کی چھوٹی بہن تھی' جو تقریباً" گورکھ کی ہم عمر تھی۔ بار بار وہ گورکھ کو پر شوق نظروں سے دیکھا کرتی۔

نہال بھی اپنی بہن کی نظریں پہچانتا تھا۔ ایک دن اس کی بہن بولی "تیرا یہ دوست مجھے اچھا لگتا ہے۔ بڑی نمکین صورت ہے اس کی!"

"تو کیوں رال ٹپکاتی ہے؟ بے انت۔ (اس کی بہن کا نام بے انت کور تھا) یہ تیرے ہاتھ نہیں لگنے والا۔" نہال ہنس دیا۔

بے انت۔ حیران آنکھوں سے بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ نہال نے وضاحت کی : "یہ ہندو ہے اور تو سکھ۔ پھر تو اس سے عمر میں بھی بڑی ہے۔ بھول جا میرے دوست کو۔"

ایک دن گورکھ نہال کی سائیکل پر بیٹھا سیر کر رہا تھا کہ نہال بولا "میری ماں کے بچہ ہونے والا ہے۔ دیکھیں بھائی ملتا ہے کہ بہن۔"

گورکھ سوچ میں پڑ گیا۔ نہال کی عمر انیس بیس سال کے لگ بھگ اور اس کی بہن کی عمر تیرہ چودہ سال کے آس پاس رہی ہو گی۔ یعنی نہال کی ماں کو چودہ سال بعد بچہ پیدا ہوا رہا ہے! اس کی ماں کے تو ہر آئے دو تین سال بعد بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ سوچنے لگا : عورت کے بچہ کسی بھی وقت ہو سکتا ہو گا۔ لیکن بوڑھی عورتوں کے نہیں ہوتا۔ اسے بچوں کی پیدائش کے بارے میں جتنا علم تھا' نہال کے سامنے اگل دیا۔ نہال سن کر ہنس پڑا' کیوں کہ گورکھ نے نہال کو وہی بتایا تھا جو اس سے پہلے وہ ستو اور شنکر کو بتا چکا تھا۔ اس کے علم کی بنیاد بننے کے ساتھ اس

کا اپنا تجربہ تھا۔ اسی تجربے میں اپنی جگہ عورت کو رکھ کر اس نے بچے کی پیدائش کا "راز" کھولا تھا۔

نہال سنگھ نے ہنستے ہنستے گورکھ سے پوچھا "یہ اوٹ پٹانگ باتیں تمہیں کس نے بتائیں؟"

"اوٹ پٹانگ؟" گورکھ نے چڑ کر کہا۔

"میں نہیں مانتا کہ واہ گورو یا خدا دبے پاؤں آکر بچے بانٹتا ہے۔"

نہال نے کہا "تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہے کہ واہ گورو یا خدا بچے نہیں بانٹتا۔ لیکن باقی سب غلط ہے۔"

گورکھ بولا "غلط؟ ناممکن!"

"نہال سنجیدہ ہو گیا۔ "تم اپنے کو بہت عقل مند سمجھتے ہو۔ مانا کہ پڑھائی میں ہوشیار ہو' لیکن ہر بات کا علم تو نہیں رکھتے۔ اب مجھے کھیتی باڑی کا بہت علم ہے' کیوں کہ میں نے یہ سب اپنے بڑوں سے سیکھا ہے۔"

گورکھ کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگا "اچھا پھر تم ہی بتاؤ۔ یہ باتیں نہ تو ماں باپ بتاتے ہیں' نہ کتابوں میں لکھی ملتی ہیں نہ اسکول کا ماسٹر بتاتا ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" نہال بولا "بات ہی ایسی ہے کہ کوئی بھی کھلے عام اس کا ذکر نہیں کرتا۔ خاص طور سے بچوں کے سامنے۔ ماں باپ سمجھتے ہیں کہ بچے اپنے آپ کو معلوم کر لیں گے' جب وقت آئے گا۔ اسی لئے تمہاری عمر کے لڑکے اکثر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں جیسے کہ تم ہو۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟" گورکھ نے کچھ مرعوب ہو کر پوچھا۔

"مجھے بھی مجھ سے بڑے لڑکوں نے بتایا اور میں نے کتابوں میں بھی پڑھا۔"

"کیا یہ سب باتیں کتابوں میں لکھی ہوتی ہیں؟"

"ضرور لکھی ہوتی ہیں۔ تم نے کبھی کوک شاستر کا نام سنا ہے؟"

"نہیں۔"

"اچھا تمہیں کل لا کر دکھاؤں گا۔"

گورکھ بے صبری سے کل کا انتظار کرنے لگا۔ رات بھر عجیب سی الجھن میں پھنسا رہا۔ اگلی شام آئی تو وہ نہال کے گھر پہنچا۔ دونوں سائیکل پر سوار باہر نکل آئے۔ کچھ دور پہنچ کر گورکھ نے کہا "دکھاؤ' کہاں ہے کتاب؟"

نہال نے ایک کتاب نکالی۔ وہ پنجابی زبان میں تھی' جسے گورکھ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس میں چند تصویریں ضرور حقیقت بیان کر رہی تھیں۔ نہال ایک ایک صفحہ الٹ کر اسے تصویروں کے معنی سمجھاتا رہا۔ سب کچھ دیکھ کر بھی گورکھ کو یقین نہ آیا۔ اس کے معصوم دماغ نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ عورت اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے جسم کے چھپے حصے میں دو روزن ہوتے ہیں۔ نہال اسے سمجھانے لگا کہ سہاگ رات کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ پردہ بکارت کیا ہوتا ہے؟ عورت' مرد کا ازلی کھیل کیا ہوتا ہے۔ اگرچہ تصویروں سے سب کچھ

صاف ظاہر تھا' پھر بھی گورکھ ضد کرنے لگا کہ اسے اردو زبان میں اس طرح کی کوئی کتاب لا کر دی جائے۔ کچھ دن بعد نہال نے اس کی یہ فرمائش بھی پوری کردی۔ نہال کہنے لگا "لو یہ میری طرف سے تحفہ قبول کرو۔ اچھی طرح اسے پڑھو اور سمجھو۔ زندگی کے اہم راز تو یہی ہیں جو ابھی تک تم سے چھپے رہے ہیں۔ پریوں کی کہانیوں میں کیا ڈھونڈتے ہو؟"

کئی دن تک گورکھ کے دماغ میں ہلچل سی مچی رہی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بڑے راز سے پردہ اٹھ گیا ہو۔ گزری ہوئی باتیں' گزرے افسانے ایک نیا رنگ پکڑنے لگے۔ کائنات جیسے ایک نئے رنگ میں رنگ گئی۔ وہ کشش' وہ بلاوا جو اس نے کئی آنکھوں میں دیکھا تھا' کئی نظروں میں پڑھا تھا ایک نیا پیغام لے کر سامنے آیا۔ ہر وقت وہ کسی حسین خیال میں کھویا رہتا۔ بے وجہ بے قرار رہنا۔ سارے وجود میں سرور ساطاری ہو جانا۔ اف! زندگی کتنی خوب صورت تھی! یوں بے قرار ہونے میں کتنا مزہ تھا۔ بڑھتی ہوئی دل کی دھڑکنوں کے ساتھ خون کا رگوں میں جوش مارنا جیسے ذہن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے گا۔ کتنا لطف تھا یوں دم بدم ٹوٹنے میں!

اس روز کے بعد نہال سے دل کی بات کہنے اور کچھ دریافت کرنے میں گورکھ کے لئے کوئی جھجک باقی نہ رہی۔ لڑکیوں میں اسے عجیب کشش محسوس ہونے لگی۔ وہ کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھتا تو نظریں بچا کر اس کو دوبارہ دیکھتا۔ وہ پہلے والا گورکھ نہ رہا جسے لڑکے اور لڑکی کا فرق معلوم نہ تھا۔ تاہم اس کی ہمت بس ایک نظر دیکھنے تک ہی محدود رہی۔ اس کے بعد خلا ہی خلا۔ کسی لڑکی کے پاس سے گزر جاتا تو اسے محسوس ہوتا کہ جلتی آگ کے پاس سے گزرا ہے۔ لیکن کیا مجال کہ کھل کر کسی سے نظر ملا سکے۔ ہر خوب صورت نقش دماغ میں ایک لہر پیدا کرتا اور وہ لہر دو قدم چل کر فنا ہو جاتی۔ نہال لڑکیوں کی باتیں کرتا تو وہ شرما جاتا۔ نہال کہتا "مرد ہو اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟ کسی کے ساتھ بدتمیزی تو کرتے نہیں۔ ہاں اگر کوئی چیز نظر کو اچھی لگے تو اسے اچھی کہنے میں کوئی خرابی نہیں۔"

وہ نہال کی بات سن کر چپ ہو جاتا۔ "اگر کوئی صورت اچھی لگے بھی تو اسے زبان پر لانے کی کیا ضرورت ہے؟"

ایک دن وہ دونوں سائیکل پر سوار گھوم رہے تھے کہ نہال پوچھنے لگا "سچ بتاؤ تم میرے دوست ہو؟"

"تمہیں آج دوستی پر شک کیوں ہونے لگا؟" گورکھ بولا۔

"پھر بھی بتاؤ کہ دوستی کتنی پکی ہے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ یہی کہہ سکتا ہوں کہ دوستی ہے۔"

"اگر دوستی ہے تو دوستی میں ایک دوست دوسرے دوست سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"

"میں نے تم سے کیا جھوٹ بولا ہے؟"

میں یہ تو نہیں کہہ رہا ہوں کہ تم نے جھوٹ بولا ہے۔ میں ایک سوال پوچھنے والا ہوں۔ اس کا سچائی سے جواب دینا۔"

"پوچھو۔"

"کیا تم سہلا کر' ہاتھ پھیر کر راحت پاتے ہو؟"

گورکھ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اسے ایسا لگا کہ وہ کسی گہرے غار میں گرتا جا رہا ہے' گرتا ہی جا رہا ہے۔ اندھیرا اس قدر بڑھتا جا رہا ہے کہ انبالہ والے تاریک زینے سے بھی کہیں زیادہ۔ اس اندھیرے میں دم گھٹتا جا رہا ہے۔ روشنی کی ایک کرن بھی موجود نہیں۔ غار کی دیواریں قریب' اور قریب سرکتی آ رہی ہیں۔ جلد ہی وہ کسی دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جائے گا' جیسے پکے فرش پر گرنے سے کانچ کی بوتل چور چور ہو جاتی ہے۔ اسے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ وہ اپنے جسم سے بھی بے خبر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ اپنے آپ کو ٹٹولتے ہیں۔ اپنی آنکھوں کو' سر کو' پاؤں کو' ٹانگوں کو اور یکایک رانوں کے بیچ پہنچ کر رک جاتے ہیں۔ وہ بہت اداس ہے' بہت غمگین ہے' لیکن غم کا سبب اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ اس کا دماغ اندھیرے کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ کیا کرے؟ وہ زور زور سے ہاتھ چلانے لگتا ہے' جیسے اندھیرے سمندر میں تیرنے کی کوشش میں ہو۔ جیسے کالی کالی لہریں چاروں طرف اٹھ کر اسے دبوچنے کے لئے مچل رہی ہوں۔ اگر اس نے ہاتھ چلانا بند کر دیا تو وہ ڈوب جائے گا اور پھر کبھی روشنی کا مونہہ نہ دیکھے گا۔۔۔۔

نہال اسے چپ دیکھ کر بولا "کس سوچ میں پڑ گئے؟ میں نے تم سے ایک سوال کیا تھا۔ ویسے مجھے معلوم ہے کہ گورکھ تم ضرور یہ فعل کرتے ہو گے۔"

گورکھ نے سوچا' نہال کو پہلے سے کیسے علم ہو سکتا ہے؟ نہال نے اپنی بات کی وضاحت کی : تم چپ چپ جو رہتے ہو۔ اکیلے رہنے میں تمہیں کوئی خاص مزہ ملتا ہے۔ کسی سے بات نہیں کرتے۔ لڑکیوں کی طرح شرماتے ہو۔ بس یہی نشانیاں کافی ہیں۔"

گورکھ ہنس پڑا۔ "بڑے ہوشیار بنتے ہو۔"

"تمہیں ایک بات کہوں۔ برا نہ ماننا۔ اگر اچھی نہ لگے تو مجھے معاف کر دینا۔ اگر کوئی دوسرا شخص یہ راحت دے تو زیادہ مزہ آتا ہے۔ نہال بولا۔

گورکھ خاموش رہا۔ نہال نے کہا "کیا تم مجھے یہ مزہ عنایت کر سکتے ہو؟"

گورکھ پھر خاموش رہا۔ نہال کہنے لگا۔ "ادھر دیکھو" اس نے سائیکل کی گدی پر بیٹھے بیٹھے اپنے نیکر کے بٹن کھول دیئے اور کہنے لگا "لو ذرا مجھے نہال کر دو۔ میں تو بس نام کا ہی نہال ہوں۔"

گورکھ بولا "شرم کرو۔ سائیکل پر بیٹھے ہو۔ سڑک پر چل رہے ہو۔ اگر کسی کی نظر پڑ گئی؟"

نہال اصرار کرتا رہا "سڑک سنسان ہے۔ یا چلو کسی اور سنسان راہ کی جانب چلتے ہیں۔ اگر کوئی دکھائی دے گیاتو کام بند کر دینا۔"

اس دن کے بعد یہ فعل بار بار ہونے لگا۔ جب بھی سائیکل پر ایک ساتھ سواری کرتے' نہال کی یہی فرمائش ہوتی اور گورکھ نہال کو برابر نہال کرتا رہا۔

نہال کے گھر میں کسی لڑکی کی شادی تھی۔ چونکہ گھر میں بہت سے لوگ رہتے تھے' اس لئے گورکھ کبھی ان کا آپس میں رشتہ نہ سمجھ پایا تھا۔ اس نے ایک دوشیزہ کو کبھی کبھی گھر کے آنگن اور چھت پر دیکھا تھا۔ شاید اسی کی شادی ہوگی۔ گھر میں بہت سے مہمان موجود تھے۔ آنگن میں دھوم مچی تھی۔ عورتیں گیدا گا رہی تھیں' ڈھولک بجا رہی تھیں۔ بجاتے بجاتے جوش آتا تو بھنگڑا بھی ناچنے لگتیں۔

گورکھ نہال کے گھر دوپہر کو ہی پہنچ گیا' جب کہ برات کے آنے کا وقت سورج ڈھلے کہیں سات بجے کا تھا۔ ہر طرف شور اور شادمانی۔ نہال گورکھ کو اپنے کمرے میں لے گیا اور اس نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ کہنے لگا" آج گھر میں بہت سی خوب صورت مہمان لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں۔ ذرا مجھے نہال کر دو۔ پھر باہر چلتے ہیں۔ نہال اور گورکھ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وہ پہلا موقع تھا جب یہ بد فعل گھر کی چار دیواری کے اندر ہونے والا تھا۔ لیکن نہال کا لہجہ التجا آمیز تھا' لہٰذا وہ اس کی بات ٹھکرا نہ سکا۔ کچھ ہی دیر میں گہری سانسیں بھرتے ہوئے نہال اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنی پگڑی اتار گورکھ کے پاؤں پر رکھ دی۔ نہال وہی کرنا چاہتا تھا جو کبھی انبالہ شہر والے بنئے نے اس سے زبردستی کیا تھا۔ گورکھ سوچ میں پڑ گیا۔ نہال کے اس پر کتنے احسان تھے۔ وہ ان احسانوں کو کیوں کر بھول سکتا ہے؟ مگر احسان کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ کوئی بھی ناواجب حرکت کرنا قبول کر لے۔ لیکن گورکھ انکار نہ کر سکا۔ نہال جوان تھا اور جوش میں تھا۔ گورکھ کی چیخ نکل گئی اور اس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ستو اور شنکر اور بنئے کا فعل تو محض کھیل تھا۔ اصل کام تو نہال کر رہا تھا۔

گورکھ کی چیخ کے ساتھ ہی باہر کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ نہال کا ماتھا ٹھنکا اور وہ جلدی سے فارغ ہو کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے کی چٹخنی گرا دی اور دروازہ بند رہنے دیا۔ کچھ دیر کے لئے ڈھولک کی آواز بند ہو گئی۔ کیا بارات وقت سے پہلے آگئی تھی؟ یا دلہن اپنے دلہا کے ساتھ بھاگ گئی تھی اتنے میں نہال کی ماں اور بہن دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔

"تم دونوں یہاں اکیلے بیٹھے کیا کر رہے ہو؟" ماں نے پوچھا۔

"میں اسے پڑھا رہا تھا۔" نہال نے اطمینان سے جواب دیا۔

نہال کی ماں قدرے شک سے دیکھتے ہوئے بولی" آج شادی کا دن ہے۔ ہر روز آوارہ گردی کرتے پھرتے

ہو اور آج پڑھائی کی سوجھی؟"

"ماں اسے کچھ حساب کے سوال کل اسکول لے کر جانے ہیں۔ وہی سمجھا رہا تھا۔"

"اور چیخ کون رہا تھا؟"

نہال نے ایک کپڑے سینے والی سوئی ماں کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے جواب دیا : "نہ جانے بستر میں سوئی کہاں سے آگئی یہی چبھ گئی تھی۔"

نہال سب باتوں کا جواب دیے جا رہا تھا۔ گورکھ خاموش کتاب پر نظریں جمائے بیٹھا تھا کہ نہال کی بہن بولی "اس کا چہرہ تمتمایا ہوا کیوں ہے؟ بڑا اچھا لگ رہا ہے۔"

نہال کی ماں نے کہا "ہٹ بے انتے تجھے ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے!"

"اس روز کے بعد نہال نے لاکھ چالیں چلیں لیکن گورکھ کبھی اس کے گھر نہ گیا۔ اور نہ اس دن کے بعد نہال کی سائیکل پر سوار ہوا۔ اس واقعہ کے بعد دوستی ہی ختم ہو گئی۔ ایک روز نہال گلی میں ملا تو گورکھ سے اس کی نظریں بھی چار نہ ہوئیں۔

یادیں ہی زندگی ہیں۔ اگر سب یادیں ایک دم مٹادی جائیں تو کیا ہو؟ شاید بوڑھا بچہ بن جائے۔ وہ بھول جائے کہ کب پیدا ہوا تھا' کیا نام ہے اس کا' کتنی تعلیم حاصل کی اس نے' زندگی کیسے گذری۔ زندگی کے سارے تجربات اور واقعات اگر دم کے دم مٹا دئے جائیں تو کیا ہو؟ زندگی پھر نئے سرے سے شروع ہوجائے' کینوس پر نئی تصویر بنے' نئے نقوش ابھریں۔ اور جب بہت سے نقوش کوئی خاص جامہ پہن لیں تو وہی انسان زندگی میں نئے معنی ڈھونڈلے گا۔ اس کے نئے تجربات زندگی کی نئی تصویر پیش کریں گے۔ تمام پرانے رشتے اور ناطے جنہیں توڑ کروہ آزاد ہوا تھا' پھر نئے طور سے' نئے رنگوں سے تعمیر کرلے گا۔ یعنی ایک دوسرا انسان بن جائے گا۔ ممکن ہے اس نئے انسان میں اور پہلے انسان میں کوئی نسبت بھی باقی نہ رہے۔ نئی یادیں نئے تجربے ہی اس کے اپنے ہوں گے۔

نئے اور پرانے میں اچھے برے کا امتیاز کرنا کس کے لئے ممکن ہوگا؟ کون اس کا تجزیہ کرے گا؟ کون اسے پرکھے گا؟۔ اس لئے قدرت انسان کو ایک ہی زندگی دیتی ہے' ورنہ کسی کو کسی کا مفہوم سمجھنا بھی محال ہوجاتا۔

"گوپال داس کا تبادلہ انبالہ چھاؤنی ہوگیا۔ انبالہ چھاؤنی انبالہ شہر سے چند ہی میل کی دوری پر ہے۔ یعنی ایک طرح گورکھ لوٹ کر پرانی جگہ کے قریب پہنچ گیا۔ عمر کے ساتھ اس کی ماحول کو پرکھنے کی سوجھ بوجھ میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ذہن ہر واقعہ کو تجسس کی ترازو پر تولتا۔ البتہ طبیعت کی معصومیت جوں کی توں سلامت تھی۔ ہر نئی بات' ہر نیا واقعہ صرف کچھ دیر کے لئے دل کو یک سوئی بخشتا۔ اس کے بعد دل پھر بھٹک جاتا۔ انبالہ چھاؤنی کی یادوں کے سایوں سے ابھرا ایک دومنزلہ مکان جو چوراہے کے ایک گوشے میں کھڑا تھا۔ مالک مکان لوہے کے سامان کا مال دار بیوپاری تھا۔ گوپال داس کو دوسری منزل پر ایک کمرہ اور ایک رسوئی گھر کرائے پر ملا تھا۔ چھت کا زیادہ حصہ خالی پڑا تھا۔ دوسری منزل کے دو اور کمرے مالک مکان کے پاس تھے۔ گوپال داس کے حصہ کا رسوئی گھر کمرے سے الگ بنا ہوا تھا۔ اور چھت کا ایک حصہ طے کرکے اس تک پہنچا جاتا تھا۔ کمرے کے باہر برآمدے میں کھڑے ہوکر سڑک کا نظارہ لیا جاسکتا تھا۔ دوسری منزل پر پہنچنے کے لئے دو زینے تھے۔ ایک روشن اور کھلا' جو پہلی منزل کے کمروں کے سامنے سے ہوکر دوسری منزل تک پہنچتا تھا۔ وہ زینہ مکان مالک کے استعمال میں آتا تھا۔ دوسرا زینہ سڑک کی طرف سے دوسری منزل تک چڑھتا تھا۔ بجلی کی تاریں تو ضرور کچی تھیں لیکن

زینہ کا بلب کبھی نہ جلتا تھا۔ رات ہو یا دن، گورکھ اندازے سے پاؤں رکھتا، آسانی سے اوپر پہنچ جاتا۔ گوجرے کے مکان کے مقابلے میں یہاں رہنے کی جگہ کم تھی۔ نچلی منزل پر دونوں جانب دو کانیں تھیں۔ کیمسٹ کی دکان رات دیر تک کھلی رہتی تھی۔

گورکھ کو دھرم راج کرم راج ہائی اسکول میں داخلہ مل گیا۔ یہ اسکول گھر سے کچھ ہی فاصلہ پر تھا۔ نئے اسکول میں کوئی نعرے لگانے والا تو نہ تھا، لیکن گورکھ کو یہاں بھی سب سے الگ سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ کھیل میں بھی حصہ لیتا، پڑھائی میں بھی ہوشیار تھا، لیکن پھر بھی سب سے جدا تھا۔ ہم جولیوں کے ساتھ ہی ہی کر کے ہنسنا، مذاق اڑانا، اچھل کود مچانا اسے اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔ بچپن کی شرارتیں اب ختم ہو چلی تھیں یا پھر وقت سے پہلے ہی بچپن رخصت ہو چکا تھا۔ ایک سنجیدگی اس کے چہرے پر چھائی رہتی، جو کسی سے چھپی نہ رہتی۔ بارہ سال کی عمر میں اتنا سنجیدہ ہونا، ہم جولیوں سے کترانا اور کھل کر بات نہ کر سکنا بھی مناسب نہ تھا۔ گورکھ نے محسوس کیا کہ وہ کسی گم نام سے خوف کا شکار ہے، اسی لئے بات کرنے سے بھی جھجکتا ہے۔ کلاس میں جب کوئی سوال پوچھا جاتا اور استاد کہتا کہ کوئی بھی اس کا جواب دے تو وہ کبھی پہل نہ کرتا، اگرچہ اسے سوال کا جواب اچھی طرح معلوم ہوتا۔ کئی اور لڑکے جو اتنا اچھا جواب نہ دے سکتے تھے، پہل کرتے اور استاد کہتا "نہیں، سوچ کر جواب دو۔" ٹھیک جواب معلوم ہوتے ہوئے بھی گورکھ سیٹ سے نہ اٹھتا۔ اپنی خاموشی کی وجہ سے وہ مذاق کا نشانہ بننے لگا۔ باقی لڑکوں کو شہ ملتی کہ اسے چھیڑیں، تاکہ وہ مونہہ کھولے۔ لیکن وہ چپ چاپ ایک طرف اپنی سیٹ پر بیٹھا رہتا۔ کلاس روم کی اول لائن کی بینچ پر بیٹھنے سے ہمیشہ کتراتا۔ کلاس روم کی آخری قطار والی بینچ پر بیٹھنے کو ترجیح دیتا۔ اسی لئے اس کا کوئی دوست نہ بن سکا۔ کسی کی طرف وہ قدم بڑھاتا بھی تو اس سے دل نہ ملتا۔ جب بھی ستو اور شنکر کی یاد آتی تو وہ سوچتا کہ آخر ان دونوں میں ایسی کیا بات تھی کہ ہر وقت ان سے خاص تعلق قائم رہتا تھا۔ ستو نے آج کیا کھایا، ستو کے پاس کتنے کھلونے ہیں، شنکر بازار سے کون سی نئی چیز لایا، یہ جاننے کے لئے اس کی آنکھیں ہر وقت ان دونوں دوستوں کو ہی تکتی رہتی تھیں۔ مگر ان دو برسوں میں طبیعت میں اتنا فرق آگیا کہ کس کے پاس کیا ہے، کون کیا کر رہا ہے، اسے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ دوستی قائم کرنے کے لئے جو ایک مشترکہ دائرہ ہوتا ہے وہ اس دائرے سے باہر آ کھڑا ہوا۔ نتیجہ یہ کہ روز بروز وہ اسکول میں اکیلا پڑتا گیا۔ کوئی بھی ایسا کلاس فیلو نہ تھا جسے وہ دوست کہہ سکے۔

ایک خاص واقعہ نے گورکھ کو اور بھی اکیلا کر دیا۔

اسکول کی دو کتابیں خریدنے میں ایک ہم جماعت لڑکے نے گورکھ کی رہ نمائی کی۔ وہ اسے کتابوں کی دکان پر لے گیا۔ نئی کتابیں خریدنے کی بجائے گورکھ نے ایک سال استعمال کی ہوئی پرانی کتابیں خریدیں۔ جب گھر آکر اس نے بستہ ٹٹولا تو کتابیں غائب تھیں۔ گورکھ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ چوری ہوئی تو کب اور کیوں کر۔

گورکھ نے استاد سے کہا تو استاد اس سے دریافت کرنے لگا "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ کتابیں اسکول میں ہی گم ہوئی ہیں؟" اس نے جب "ہاں" میں جواب دیا تو استاد پھر بولا "ٹھیک طرح یاد کرلو۔ شاید گھر بھول آئے ہو گے۔"

"میں اچھی طرح چھان بین کر آیا ہوں۔ کل کتابیں خریدی تھیں آج غائب ہیں۔" گورکھ نے جواب دیا۔

ماسٹر نے سرسری طور پر کلاس میں اعلان کیا : "گورکھ کی دو کتابیں غائب ہیں۔ اگر کسی نے کہیں پڑی دیکھی ہوں تو واپس کردی جائیں۔"

گورکھ جانتا تھا کہ چور کون ہے۔ جس لڑکے نے کتابیں خریدنے میں اس کی رہ نمائی کی تھی، وہ مسکرا رہا تھا۔ گورکھ کو یقین تھا کہ کل وہی لڑکا کلاس میں اس کے پاس بیٹھا تھا اور جب وہ کچھ دیر کے لئے کلاس روم سے باہر گیا تھا تو اتنے میں کتابیں چوری ہو گئیں۔ لیکن گورکھ ثبوت کے بغیر کسی پر الزام نہیں لگا سکتا تھا۔ یوں تو وہ خود بھی چوری کرتا رہا تھا، لیکن کسی دوسرے کی نہیں، صرف اپنے گھر کی۔ ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پیسے اس نے ضرور چرائے تھے۔ بازار سے سودا لاتے ہوئے بے ایمانی ضرور کی تھی۔ لیکن کسی غیر کے مال کی چوری کرنے کے بارے میں سوچنا بھی اس کی نظر میں بہت بڑا گناہ تھا۔

کہتے ہیں ماحول بدلنے سے کبھی کبھی زندگی ہی بدل جاتی ہے۔ تاہم یہ ضروری بھی نہیں۔ بعض اوقات تو انسان ہر ماحول میں ویسا ہی رہتا ہے جیسا وہ ہوتا ہے۔ اگر وہ بدلتا ہے تو اندرونی دل کی صدا سے۔ انبالہ چھاؤنی آنے پر گورکھ سب سے جدا بھی ہوتا گیا اور اپنے بیتے دنوں کے چال چلن پر اسے افسوس بھی ہونے لگا۔ وہ سوچتا رہتا کہ اس نے کتنے کوک شاشتر پڑھ ڈالے، نہال سنگھ کے ساتھ اس کے کیسے گھناؤنے تعلقات رہے۔ خود کو حالات کا شکار سمجھ کر اپنے کئے پر پردہ ڈالنا، خود کو دھوکا دینے کے برابر ہے۔ وہ گناہ گار ہے۔ اس نے چھوٹی سی عمر میں ہی کافی گناہ کما لئے ہیں۔ ماں برت رکھتی ہے، پوجا کرتی ہے، مندر جاتی ہے۔ باپ صبح کو یوگ آسن کرتے ہیں، پوجا کرتے ہیں۔ سویرے سے شام تک کام کرتے ہیں۔ کسی کا برا نہیں سوچتے، برا نہیں کرتے۔ کڑی مشقت کے بعد جو کمائی ہوتی ہے، اس سے گھر کا خرچ چلتا ہے۔ مانا کہ باپ نے اسے بہت پیٹا اور ابھی تک ان کی ڈانٹ ڈپٹ چلتی رہتی ہے، لیکن دراصل وہ اسی کے فائدے کے لئے پیٹتے ہیں۔ باقی بھی تو بہن بھائی ہیں۔ ان کو تو کم ہی مار پڑتی ہے۔ اسے مار اس لئے پڑتی ہے کہ وہ مار کا حق دار ہے۔ وہ بہت گر چکا ہے۔ اگر اس نے اپنے آپ کو اونچا نہ اٹھایا تو اور گرتا چلا جائے گا۔ اسے اپنا چال چلن درست کرنا چاہئے۔ جلق بازی چھوڑ دینی چاہئے۔ والدین کی طرح خدا سے لو لگانی چاہئے۔ اسکول کی لائبریری سے لاکر پریوں اور شہزادیوں کی کہانیاں پڑھنے کی جگہ اسے مذہبی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ ماں کتنی بار رامائن کا پاٹھ کرتی ہے۔ لیکن اس نے آج تک کبھی توجہ سے سنا

بھی نہیں۔ ماں کتنے برت رکھتی ہے' پوجا پاٹھ کرتی ہے' کتھا کہتی ہے۔ اس نے کبھی سنی ہی نہیں۔ خود کو اونچا اٹھانے کا ذریعہ برائیوں کو چھوڑنا اور اچھائیوں کی طرف مائل ہونا۔ اگر انسان خود کو بے لگام چھوڑ دے تو برائیوں کی طرف ہی اس کی زیادہ توجہ رہے گی اور وہ ان ہی کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔

گورکھ نے مذہبی کتابیں پڑھنی شروع کردیں۔ وہ بازار سے لکڑی کے منکے خرید لایا۔ انہیں ریشمی دھاگے میں خوب صورتی سے پرو کر اس نے مالا تیار کی۔ مالا وہ بازار سے بھی خرید سکتا تھا' لیکن مالا بناتے ہوئے اسے وہی احساس ہوا' وہی لطف ملا' جو گوجرہ میں پتنگ بناتے ہوئے حاصل ہوا تھا۔ ساوتری نے ایک تھیلی سی دی۔ مالا کو تھیلی میں رکھ کر اور دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی باہر نکال گورکھ منتر جپنے اور مالا پھیرنے کی مشق کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ منتر اور مالا میں ہی وہ زیادہ وقت صرف کرنے لگا۔ چند ماہ گزر گئے تو شام کو بھی پوجا' مالا اور منتر' یہی ساتھی رہ گئے۔ کیا مجال کہ بغیر مالا پھیرے ایک لقمہ غذا کا یا ایک گھونٹ پانی کا حلق سے نیچے اتارے۔ پوجا میں دلچسپی اس قدر بڑھتے دیکھ والدین کو کچھ تشویش بھی ہوئی۔ گوپال داس کہنے لگے : "پوجا کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم گھنٹوں آسن جما کر بیٹھے رہو۔ طالب علم ہو' تمہارا کام ہے دل لگا کر پڑھنا۔ کسی برائی میں مبتلا نہ ہونا ہی سب سے بڑی پوجا ہے۔"

گورکھ نے رامائن پڑھی تو وہ بھی اسے پریوں کی کہانی سے کچھ کم دلچسپ نہ لگی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پری سیتا تھی اور شہزادہ رام۔ سونے کا مرگ (ہرن)' چھ مہینے بے خبر سونے والا کمبھ کرن' پتھروں کا پانی پر تیر جانا' بندروں کی فوج وغیرہ کی دلچسپیوں کے علاوہ اور بھی کئی باتیں گورکھ کے دماغ میں بیٹھ گئیں۔ جب خدا کے ذرا سے اشارے پر یہ تمام کائنات گردش میں ہے۔ تو کوئی بھی بات ناممکن نہیں۔ وہ ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ پھر بھی وقت کی گردش سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ جب تک زندگی ہے' یہ گردش رہے گی۔

کبھی کبھی گورکھ کا دماغ الجھنوں کا بھی شکار ہو جاتا۔ جیسے ذات کا بڑا یا چھوٹا ہونا۔ جب سب انسان برابر ہیں تو یہ کہاں کا انصاف ہوا کہ چھوٹی ذات والا وہ کام نہ کر سکے جو وہ کرنا چاہے؟ صرف اس لئے کہ وہ چھوٹی ذات میں پیدا ہوا ہے؟ زمانے کے ساتھ کئی چیزیں' کئی رسمیں' کئی رواج بدل دینے چاہئیں۔ کسی حد تک تو وقت انہیں خود بخود بدل دیتا ہے' لیکن بعض اوقات سماج پرانی روایات کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح کی کچھ الجھنیں تو گورکھ خود سلجھا لیتا' لیکن اسے ہر بات کا تسلی بخش جواب نہیں مل سکتا تھا۔ گوپال داس اسے صلاح دیتے : "جو پڑھو اعتماد سے پڑھو۔ ہر چیز' ہر بات کا جواب مت ڈھونڈو۔" شاید وہ صحیح کہتے تھے۔ گورکھ کی وہ تیرہ سالہ عمر فلسفہ پڑھنے کی تو نہ تھی۔ پیچیدہ فلسفوں میں الجھنے کی بجائے یہی بہتر ہے کہ جو انسان کے سامنے ہیں اسی تک محدود رہے۔ اپنے دل کی آواز کو غور سے سنے۔ وہ ٹھیک بتا دے گی کہ قدم غلط اٹھ رہے ہیں یا صحیح پڑ رہے ہیں۔ جب گورکھ نے چوری کی تھی تو کیا دل سے آواز نہ اٹھی تھی؟ ضرور اٹھی تھی پھر بھی گورکھ گزشتہ زندگی کے

بارے میں سوچتا تو گناہ کا احساس اٹھ کر دب جاتا۔ بارہا خیال آتا کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ یہ خیال ڈانوا ڈول ہو جاتا۔ سوچتا کہ کچھ گناہ تو ضرور کیا ہے۔ آخر جھوٹ بولا' چوری کی' اور اس طرح اپنی تمناؤں کی تکمیل چاہی۔ لیکن تمناؤں کو کہاں تک دبایا جائے؟ پھر وہ یہی سوچ کر دل کو تسلی دے لیتا کہ وہ حالات کا شکار ہوا تھا۔ لیکن اب وہ حالات کو حاوی نہ ہونے دے گا۔ وہ خدا سے لو لگائے گا۔ یہی ایک تمنا ہوگی جو سب سے اہم ہوگی۔ باقی سب تمنائیں اس میں تحلیل ہو جائیں گی۔ خدا کیا ہے؟ اس کا کوئی دو ٹوک جواب تو نہیں ہے' لیکن خدا کا ایک وصف ضرور واضح ہے۔ خدا محبت ہے۔ پاک محبت سے اس تک پہنچا جا سکتا ہے' اسے اپنا بنایا جا سکتا ہے۔ خدا کی محبت تمام محبتوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ خدا کی محبت کی یہ خاصیت بھی ہے کہ خدا سے محبت کرنے والے کسی سے نفرت نہیں کرتے۔ وہ بنی نوع انسان سے نفرت نہیں کرتے' زمانے سے نفرت نہیں کرتے۔ زمانہ انہیں کتنا ہی ستائے' پھر بھی وہ کسی کا برا نہیں چاہتے۔ ان کے دل میں محبت کا سیلاب ہوتا ہے' جس میں تمام نفرت تمام سفلی جذبات بہہ جاتے ہیں۔ انہیں کسی سے دشمنی نہیں رہتی۔ ان کا دل سکون پا لیتا ہے۔ یعنی زمانے کا کانٹا خود بخود نکل جاتا ہے۔

لیکن خدا سے محبت اتنی آسان بھی نہیں۔ اسے بغیر دیکھے' بغیر سمجھے' بغیر بات کئے اپنا محبوب تصور کر لینا اور اس کی محبت میں زندگی قربان کر دینا ایک دشوار مرحلہ ہے۔ ان ہی دنوں گورکھ سوچنے لگا کہ وہ کنہیا کی میرا کی طرح ہے۔ وہ بھی اس کی ایک "گوپی" ہے جو اس کے عشق میں دیوانی ہے۔ شام و سحر صرف اس کی محبت کا دم بھرتی ہے۔ سانس آتی ہے تو کرشن کے لئے۔ زندگی ہے تو کرشن کے لئے۔ گورکھ کو یقین ہوتا چلا گیا کہ کہیں نہ کہیں کرشن سے ملنا عین ممکن ہے۔ لیکن اس کے لئے بہت تپسیا کی ضرورت ہے۔ دنیا کو چھوڑنا پڑے گا۔ جنگلوں کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ کیا رکھا ہے پڑھائی لکھائی میں۔ کیا رکھا ہے اس زندگی میں جس میں کرشن کنہیا نہ ہو۔ یہ خیال گورکھ کے ذہن پر اس حد تک چھایا کہ رات کو خوابوں میں اسے کرشن کنہیا نظر آنے لگا۔ پہلے تو وہ دور دور نظر آتا' لیکن آہستہ آہستہ قریب آنے لگا۔ مگر یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے؟ ایک طرف گورکھ کا یقین بڑھنے لگا تو دوسری جانب اسے اپنے احساسات پر شک بھی ہونے لگا۔ کیا پتہ صرف ایک سراب ہو' صرف اس کے خیالات کی پیداوار ہو؟ خدا اتنی آسانی سے نہیں مل سکتا' خواب میں بھی نہیں مل سکتا۔ لیکن اگر وہ سراب ہے تو بھی بہت خوب صورت ہے۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اس سراب میں چلتا چلا جائے اور سب حقیقتیں لاپتہ ہو جائیں۔ وہ ہو اور اس کا محبوب ہو۔

گورکھ ایک روز پوجا پاٹھ کے بعد رات کا کھانا کھا کر بستر پر لیٹا تھا۔ اس روز اس نے دو گھنٹے تک لگاتار پوجا کی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سپنا خیالات کی شدت سے حقیقت بن جائے۔ لیکن اس کے برعکس اثر ہوا۔ اس کا خواب ایک خوفناک صورت اختیار کر گیا۔ اس نے دیکھا کہ گوجرے کا نہال سنگھ بھاگتا ہوا اس کی جانب لپک

رہا ہے۔ اس کی ڈاڑھی اور سر کے بال کھلے ہیں اور اس کی شکل ڈراؤنی ہے۔ نہال نے اسے بھاگ کر دبوچ لیا ہے۔

گورکھ نے اپنی رانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر انگلی سے دباؤ ڈالا تو اسے ایسا لگا جیسے کسی عورت کی طرح وہاں ایک روزن بن گیا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو احتلام کی وجہ سے پاجامہ گیلا تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ بیتے ہوئے واقعات اور تجربات اپنا اچھا یا برا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ جب تک ہوش رہتا ہے' ان کے سائے قابو میں رہتے ہیں' لیکن خوابوں میں ابھرنے سے نہیں چوکتے۔ اسے ان اندرونی تاثرات سے چھٹکارا پانے کے لئے دل کو بہت مضبوط کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد یہ خیال کہ ذہن میں گندے خیالات کے سائے بھرے پڑے ہیں' زور پکڑتا گیا اور خدا سے محبت کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ اس کا یہ ارادہ کہ دنیا کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لے گا' پکا ہونے لگا۔ اس نے یہی پڑھا تھا کہ جنگل میں تپسیا کئے بغیر خدا نہیں مل سکتا' اس لئے سب کچھ چھوڑنا ضروری ہے۔ ماں باپ' بھائی بہن' اسکول' کتابیں' سب کچھ۔ ساتھ میں جائے گا تو صرف ایک کپڑوں کا تھیلا اور ایک مالا کی تھیلی۔ باقی سب گھر میں رہ جائے گا۔

سب سے پہلے گورکھ کو یہ فکر ہوئی کہ جنگل میں پیٹ کیسے بھرے گا؟ کون کھانا پکا کر دے گا؟ اس نے کہانیوں میں پڑھا تھا کہ رشی لوگ کند مول اور پھل کھایا کرتے تھے۔ "کند" کہتے ہیں پیڑوں کے پتوں اور پھولوں کو۔ "مول" کہتے ہیں پیڑ کی جڑوں کو۔ تو یہی چیزیں جنگل میں کھانے کو اب بھی مل جاتی ہوں گی۔ سویرے' شام اگر ان ہی چیزوں سے پیٹ بھر لیا جائے تو نہ کوئلے کی ضرورت' نہ لکڑی کی' نہ برتن کی' نہ آٹے سبزی کی۔ کتنا آسان ذریعہ ہے پیٹ بھرنے کا۔ لیکن سب سے پہلے پیٹ اور بھوک پر قابو پانا چاہئے۔ رفتہ رفتہ گورکھ نے خوراک کم کر دی۔ آدھا پیٹ کھانے لگا۔ ساوتری پوچھتی : "کیا بات ہے آج کل تو کھانا بہت کم کھاتا ہے۔ کمزور ہو جائے گا۔ پہلے کون سا پہلوان ہے جو کھانا اتنا کم کر دیا ہے؟" وہ کہتا "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تجھے تو ہر وقت بے کار کی فکریں گھیرے رہتی ہیں۔ جتنی بھوک ہوتی ہے' اتنا کھا لیتا ہوں۔"

کند مول تو گورکھ کے لئے لانے مشکل تھے' لیکن اس نے کیاریوں سے پھول توڑ توڑ کر کھانے شروع کر دیئے۔ گیندے کا پھول' گلاب کا پھول' چنبیلی کا پھول' سب قسم کے پھول پتے اور ہری گھاس کھا جاتا۔ رات کو جب پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے تو ہوش ٹھکانے آتے اور وہ رسوئی میں جا کر بچی کھچی سبزی چٹ کر جاتا۔ سبزی کھا تو لیتا لیکن بعد میں بہت پچھتاتا۔ سوچتا کہ جنگل میں کون سی رسوئی ہوگی جہاں بھوک لگنے پر چوری کا مال کھائے گا۔ بھوک پر قابو پانا بڑا مشکل کام ہے۔ چند مہینے کی کوشش سے گورکھ نے خوراک کی مقدار تقریباً آدھی کر لی۔ اگر چند مہینوں میں بھوک آدھی رہ سکتی ہے تو پیٹ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ پیٹ کی وجہ سے جنگل کی راہ بند نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن جنگل میں جائے تو کب جائے؟ کیا آج ہی گھر چھوڑ کر چلا جائے یا کچھ دن ٹھہر کر

جائے؟ کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ جنگل میں اور بھی تکلیفیں ہو سکتی ہیں، جیسے سونے کو بستر نہ ملے گا، پہننے کو کپڑے نہ ہوں گے۔ رات کو سوتے سوتے اب وہ چارپائی سے نیچے اتر آتا اور فرش پر سونے کی کوشش کرتا۔ کئی راتوں تک تو نیند نہ آئی، پھر فرش پر اسے چارپائی سے زیادہ گہری نیند آنے لگی۔ فرش پر سونا کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گیا۔ اچھے لباس کا شوق پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اسے کوئی فکر نہ تھی کہ اس کے کپڑے کیسے ہیں۔ اچھے لگتے ہیں یا برے۔ لوگ مذاق اڑاتے ہیں تو شوق سے اڑائیں۔

کئی مہینے تک گورکھ گھر چھوڑنے کے ارادے کو مضبوط کرتا رہا۔ ساوتری سے وہ کئی بار جنگل کی بات کر چکا تھا۔ جنگل میں رشی منی کیسے رہتے تھے؟ کیسے تپ یا کرتے تھے؟ کیا کھاتے تھے؟ کیا پہنتے تھے؟ کیا آج کل بھی لوگ جنگلوں میں رہتے ہیں؟ اگر رہتے ہیں تو کیسے رہتے ہیں؟ ماں کہتی: "ہاں بیٹا، آج کل بھی لوگ جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اگرچہ پہلے جیسا زمانہ نہیں رہا اور بہت سے ڈھونگی پیدا ہو گئے ہیں، لیکن کئی اصلی سنیاسی بھی موجود ہیں جنہوں نے دل سے دنیا چھوڑ رکھی ہے اور خدا کی پرستش میں ہی زندگی لگا دی ہے۔" یہ باتیں سن کر گورکھ کا ارادہ اور بھی پختہ ہو جاتا۔

شاید گورکھ کے ارادوں کو پرکھنے کے لئے ہی ایک روز چھت پر بہت سے بندر آ گئے۔ ویسے تو چھت پر بندر اکثر آ جاتے تھے۔ اگر کپڑے سوکھ رہے ہوں تو کپڑے پھاڑ ڈالتے۔ کھانے کی چیزوں پر مونہہ مار دیتے۔ آم کے اچار کا برتن توڑ دیتے۔ کبھی کبھی گورکھ خود بھی بندروں کو بھنے چنے کھلایا کرتا تھا۔ لیکن بندروں نے کسی پر حملہ نہ کیا تھا۔ جیسے ہی کوئی کنکر یا ڈنڈا اٹھاؤ بندر فوراً بھاگ جاتے۔ اس روز بھی کپڑے چھت پر سوکھ رہے تھے۔ چھٹی کا دن تھا اور دوپہر کا وقت۔ قطار در قطار بندر چھت پر بیٹھے ہی ہی کر رہے تھے۔ ساوتری گورکھ سے کہنے لگی "جا کر ذرا چھت سے کپڑے اتار لاؤ۔ کہیں بندر پھاڑ نہ ڈالیں۔" گورکھ چھت پر پہنچا تو ایک بندر نے اس پر حملہ بول دیا۔ اس کے پاجامے کا نچلا حصہ بندر کے مونہہ میں تھا اور وہ بندر کو ڈرا رہا تھا۔ ہاتھ میں نہ ڈنڈا تھا، نہ کنکر۔ تین بندروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور کئی جگہ سے کاٹ کھایا۔ اس نے چلا کر ماں کو آواز دی تو وہ دوڑی دوڑی آئی۔ کچھ بندروں نے ساوتری کو بھی گھیر لیا اور اسے بھی جگہ جگہ سے کاٹ کھایا۔ بڑی مشکل سے دونوں کمرے کے اندر گھس کر دروازہ بند کر سکے۔ پھر بھی دیر تک بندر دروازے کے باہر اچھل کود مچاتے رہے۔

اس واقعہ کے کچھ روز بعد گورکھ نے ماں سے پوچھا "جنگل میں کیا بندر بھی ہوتے ہیں؟"

ماں نے جواب دیا "بندر ہی کیوں، بھالو، بھیڑیئے، ہاتھی، شیر سب ہی ہوتے ہیں۔"

گورکھ نے پوچھا "تو شیر رشی منیوں کو کیوں نہیں کھا جاتے؟"

"رشیوں میں ایسا نور ہے کہ وہ انہیں نہیں کھا سکتے۔" ماں نے اسے سمجھایا۔

رشیوں میں نور ہے کہ نہیں' یہ تو گورکھ کو معلوم نہ تھا' لیکن اس کا حوصلہ کافور ہو چکا تھا۔ اس نے جنگل جانے کا ارادہ یکایک بدل دیا۔ خیالوں کا ریلا پھر بھی بہتا رہا۔ اگر جنگل میں شیر یا بھیڑئے نے نوالہ بنالیا تو کرشن کنہیا موت کے بعد ہی مل سکے گا۔ وہ تو گائے کی طرح گھاس بھی کھاتا رہا' ایک سال سے زیادہ عرصہ دل وجان سے پوجا بھی کی' کبھی کوئی برا خیال دماغ میں نہ آنے دیا۔ لیکن آج جب بندر کاٹنے لگے تو صرف ماں بچانے کے لئے آئی۔ شاید خدا بندر سے کٹوا کر اس کا امتحان لے رہا ہو۔ کہ ارادا کتنا مضبوط ہے۔ خدا کو پانا تلوار کی نوک پر چلنے سے بھی زیادہ مشکل ہے اور گورکھ پہلے ہی امتحان سے ڈر گیا۔ خدا کو چاہنے والے کسی مصیبت سے نہیں ڈرتے' کسی غم سے متاثر نہیں ہوتے۔ وہ دنیا سے نہیں ڈرتے' یہاں تک کہ موت سے بھی نہیں ڈرتے۔ وہ خدا کے سچے عاشق ہوتے ہیں۔ "جیسے مجنوں لیلیٰ کا عاشق تھا"۔ ایک دم گورکھ کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے۔ مجنوں کے عشق میں اور خدا کے چاہنے والوں کے عشق میں کیا فرق ہو سکتا ہے؟ دونوں ہی عاشق ہیں۔ مجنوں بھی تو خدا کے چاہنے والوں کی طرح جنگل جنگل مارا مارا پھرا۔

معاملہ کچھ بھی ہو' گورکھ بندروں کے حملے کے بعد گھبرا گیا۔ اس نے سوچا کہ اسے خدا سے محبت تو ہے۔ کرشن کنہیا اسے اچھا بھی لگتا ہے' وہ بہت حد تک اس کا دیوانہ بھی ہے' لیکن وہ اتنا دیوانہ نہیں ہے کہ ماں باپ کو چھوڑ کر گھر سے بھاگ جائے۔ اس لئے اس نے گھر سے بھاگنے کا ارادہ کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ وہموں کی دنیا میں بھٹک رہا ہے۔ جو ہونا ہے' ہو ہی جاتا ہے۔ اچھا ہوتا ہے تو خدا کرتا ہے' برا ہوتا ہے تو خدا کرتا ہے۔ خدا کی پوجا کرو' تپسیا کرو' خدا کے نام کی مالا جپو تو خدا خوش ہو جاتا ہے۔ اور بگڑے کام بناتا ہے۔ اگر ناراض ہو گیا تو بنتے کام بگاڑ دیتا ہے۔ بڑا عجیب خدا ہے! کسی خود غرض بادشاہ سے کم نہیں۔ قدیم زمانے میں بادشاہ بھی تو یہی کرتے تھے۔ کسی نے شان میں گستاخی کی کہ سر قلم۔ چاروں طرف سے چاپلوس بھرے رہتے تھے۔ سارے دن وہ اپنی تعریف سن سن کر خوش ہوتے۔ خدا بھی کیا ایسا ہی بادشاہ ہے؟ اگر خدا ایسا ہی ہے تو ایسے خدا سے کچھ دوری ہی بھلی۔ اگر خدا بھی تعریف سننے کا اتنا ہی شوقین ہے تو یہ کہاوت کیوں کہ اس کی محبت گناہ گار اور پارسا' دونوں کے لئے یکساں ہے؟

شہر کے ایک سنیما میں فلم "رام راجیہ" لگی ہوئی تھی۔ گوپال داس اپنے دوستوں کے ساتھ یہ فلم دیکھ آئے تھے۔ ساوتری کا دل بھی للچا رہا تھا۔ گوپال داس بیوی کو دوپہر کی شو میں بٹھا آئے تھے۔ شو ختم ہونے کا وقت قریب آنے لگا تو انہوں نے گورکھ سے کہا کہ سنیما ہال سے ماں کو اپنے ساتھ لے آئے' تا کہ اسے اکیلے نہ آنا پڑے۔ گورکھ سنیما ہال کا شور و غل دیکھنے کے لئے شو ختم ہونے سے پہلے ہی سنیما گھر پہنچ گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شو ختم ہونے میں ایک گھنٹے کا وقت تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ گھر واپس چلا جائے یا وہیں انتظار کرے۔ گھر

سے چلتے وقت اس کو اندازہ نہ تھا کہ اتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔

اتنے میں ایک اجنبی نوجوان اس سے پوچھنے لگا۔ "کسی کو شو سے واپس لینے آئے ہو؟ ابھی شو ختم ہونے میں بہت دیر ہے۔ دراصل میں بھی اسی کام سے آیا ہوں۔ میری ماں بھی فلم دیکھ رہی ہے۔ تم نے پکچر دیکھی ہے؟ دیکھنے کے قابل ہے۔" وہ یہ سب باتیں ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

گورکھ نے اجنبی کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کا لباس صاف ستھرا اور شان دار تھا۔

گورکھ نے مختصر سا جواب دیا کہ وہ بھی اپنی ماں کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہے۔ اجنبی پھر مسکرا کر بولا "عجیب اتفاق ہے۔ کہاں رہتے ہو؟ میرا گھر یہاں سے تھوڑے سے فاصلے پر سڑک کے پار ہے۔" اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا۔

اجنبی کی فرمائش پر کہ چلو تھوڑی دور سڑک پر ہی گھوم لیتے ہیں "گورکھ اس کے ساتھ ہولیا۔ راستے میں باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ گورکھ کو احساس ہوا کہ اجنبی نے چالاکی سے اس کے والد کے بارے میں' بھائی اور بہنوں کے بارے میں' والد کی آمدنی کے بارے میں بہت کچھ دریافت کرلیا ہے۔ اجنبی کوئی سوال پوچھنے سے پہلے اپنے بارے میں بات کرتا' اپنے والد' رشتہ داروں' بھائیوں اور بہنوں کا ذکر کرتا' اس لئے گورکھ بھی گھر کے بھید کھولتا گیا۔ گفتگو کا سلسلہ اس قدر دل چسپ ہو گیا کہ گورکھ کو راستے کا بھی خیال نہ رہا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ چلتے چلتے کافی دور نکل آئے ہیں' واپس سینما ہال کی طرف چلنا چاہئے۔ اس نے جیسے ہی لوٹنے کی خواہش ظاہر کی' اجنبی کہنے لگا : "بس تھوڑی دور اور چلو۔ اس موڑ کو پار کرتے ہی ایک بہت خوب صورت جگہ ہے۔ شاید تم نے کبھی نہیں دیکھی۔ ادھر سے ہو کر واپس چلیں گے۔"

شام کے دھندلکے بڑھنے لگے تھے۔ سورج تقریبا" غروب ہو چکا تھا۔ رات کا اندھیرا طاری ہونے لگا تھا۔ کئی دکانوں پر بجلی کے بلب جل اٹھے تھے۔ یکایک گورکھ کو خیال آیا کہ کسی اجنبی کے ساتھ اسے اتنی دور نہیں آنا چاہئے تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر اجنبی بولا "کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہو؟"

"مجھے تمہارے ساتھ نہیں آنا چاہئے تھا۔ مجھے واپس جانا چاہئے۔"

"کیوں؟ یہ اچانک تمہیں کیا ہوا کہ تم مجھ پر شک کرنے لگے؟"

"آج کل کسی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مجھے پتا جی نے سخت تاکید کر رکھی ہے کہ کسی اجنبی سے دوستی نہ کروں۔ تمہیں بھی معلوم ہو گا کہ انبالہ چھاؤنی میں میری عمر کے بہت سے لڑکے اور بچے لاپتہ ہو چکے ہیں۔"

"کمال ہے! تم مجھے اس قسم کا آدمی کیوں سمجھتے ہو کہ میں تمہیں کچھ نقصان پہنچاؤں گا؟ آتے آتے میں نے تمہیں اپنا گھر بھی دکھادیا ہے۔ میں خاندانی آدمی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کیا کیا سنا ہے۔"

"جس مکان میں میں رہتا ہوں' اس کا مالک مکان کافی مال دار ہے۔ اس کے رشتہ دار کا لڑکا غائب ہو گیا

تھا۔ اس کی کہانی اس کے والد کی زبانی میں نے سنی ہے۔ اس واردات کو یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

اجنبی نے تعجب سے گورکھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ کہانی میں ضرور سنوں گا۔ اور کہانی ختم ہوتے ہی ہم واپس چلیں گے۔"

"یہ کہانی نہیں ہے، صحیح واقعہ ہے۔" گورکھ نے کہا۔

"تو کہانی نہ سہی، صحیح واقعہ ہی دہراؤ۔ جیسا کہ تم نے سنا ہے۔" اجنبی نے اصرار کیا۔

گورکھ کہنے لگا "واقعہ یوں ہے کہ وہ لڑکا جو لاپتہ ہو گیا تھا، میرا ہی ہم عمر ہے، شاید عمر میں مجھ سے کچھ بڑا ہو گا۔ ایک روز وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ سیدھے راستے کی بجائے کھیتوں سے ہو کر نکل جاتا ہوں، راستہ چھوٹا پڑے گا۔ وہ سڑک چھوڑ کر پگ ڈنڈی پر ہو لیا۔ راستے میں اسے دو اجنبی ملے، جنہوں نے اس سے ریلوے اسٹیشن کا راستہ دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ بھی ادھر ہی جا رہا ہے۔ دونوں اجنبی اس کے ساتھ ہو لئے۔ ایک اجنبی نے کمر پر بستر اٹھا رکھا تھا۔ دوسرا اجنبی خالی ہاتھ تھا۔ لڑکے نے سوچا کہ مسافر ہیں، اچھا ہوا کہ ریلوے اسٹیشن تک کا ساتھ مل گیا۔ تینوں چلے جا رہے تھے کہ وہ اجنبی جس کی کمر پر بستر تھا، رک گیا۔ اس نے بستر زمین پر اتار کر رکھ دیا اور دوسرے اجنبی سے کہنے لگا کہ بستر کو دو حصوں میں بانٹ لیں، کیوں کہ وہ تھک گیا ہے۔ چنانچہ بستر کھول دیا گیا۔ ایک اجنبی بستر کھول رہا تھا کہ دوسرے نے جیب سے رومال نکال کر لڑکے کی ناک پر رکھ دیا۔ بے ہوش ہوتے ہوتے لڑکے کو بس اتنا یاد رہا کہ اسے بوری میں بند کیا جا رہا تھا۔ اور بوری کا مونہہ اوپر سے سیا جا رہا تھا۔ بوری کندھے پر لاد کر دونوں اجنبی اسٹیشن کی جانب روانہ ہوئے۔ لڑکا نیم بے ہوش تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں حرکت نہیں کر سکتے تھے اور وہ خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ بے ہوشی ٹوٹی تو اس نے دانتوں اور ناخنوں سے بوری پھاڑ ڈالی۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک اندھیری کوٹھری میں بند ہے۔ اتفاق کی بات کہ وہ برسات کی رات تھی۔ بجلی چمک رہی تھی اور بارش کی بوندوں کی ٹپ ٹپ صاف سنائی دے رہی تھی۔"

"جب لڑکا رات گئے تک گھر واپس نہ آیا تو پولیس میں رپورٹ درج کروا دی گئی۔ والدین گھبرائے ہوئے رات بھر جاگتے رہے۔ لڑکے کے دوستوں اور رشتہ داروں سے معلوم کیا گیا، لیکن لڑکا کہیں نہ ملا۔"

"ادھر لڑکا رات کے اندھیرے میں کوٹھری کا جائزہ لینے لگا۔ اسے کچھ آلات، برتن، کلہاڑی بجلی کی چمک میں دکھائی دئے۔ وہ بھی اس لئے کہ بجلی کی چمک کوٹھری کی ایک دراڑ سے ہو کر چند لمحوں کے لئے کوٹھری میں اجالا پھینک جاتی۔ لڑکے کے ہاتھ میں ایک ہتھوڑا آگیا اور اس نے دیوار کی دراڑ پر لگاتار چوٹ مارنی شروع کی۔ وہ بھوکا پیاسا گھنٹوں ہتھوڑا چلاتا رہا، جب تک اس نے کوٹھری کی دیوار میں اتنا بڑا روزن نہ بنا لیا جس سے وہ رینگ کر باہر نکل سکتا۔"

"باہر نکلتے ہی لڑکا بھاگا۔ لیکن جائے تو کدھر جائے؟ کس جانب مڑے؟ کہاوت ہے کہ زندگی اور موت انسان کے ہاتھ میں نہیں۔ وہ اسی ادھیڑبن میں چلا جارہا تھا کہ اسے ریل گاڑی کے انجن کی سیٹی سنائی دی۔ بس وہ اسی طرف سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ننگے پاؤں۔ بھوکا پیاسا تھکن سے چور۔ لیکن جب جان پر بنی ہوتی ہے تو بدن میں پوشیدہ طاقت ساتھ دیتی ہے۔ بھاگتے بھاگتے لڑکا ریل کی پٹڑی تک پہنچ گیا۔ ابھی تک کسی بھی آدمی یا جانور کا سامنا نہ ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلتا جائے تو کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ریلوے اسٹیشن ضرور آئے گا۔ اور اس نے وہی کیا۔ تقریباً" بیس میل دوڑتا چلا گیا۔ آخر ریلوے اسٹیشن نظر آیا۔ لمحہ بہ لمحہ اسے ڈر لگتا رہا کہ کہیں وہی اجنبی اسے پھر نہ قید کرلیں۔ باقی کا قصہ مختصر ہے۔ جب وہ دو دن بعد گھر پہنچا تو یہ واقعہ بیان کرتے ہی بے ہوش ہوگیا۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا اور دوبارہ اس سے سارا قصہ دہرانے کو کہا گیا تو وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔"

اجنبی ہنس پڑا۔ "کافی مزہ دار کہانی ہے۔ سن کر بھی یقین نہیں آتا۔"

گورکھ چڑ گیا۔ "میں نے کہا نا کہ یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔"

اجنبی کہنے لگا۔ "اگر کوئی کسی کا بچہ اٹھا کر لے جاتا ہے تو کیوں لے جاتا ہے؟ کیوں کوئی کسی کے بچے کو چرانے لگا؟ بچے تو سب کو پیارے ہوتے ہیں۔"

گورکھ نے اجنبی کو ایک راز کی بات بتائی : "سنا ہے بچوں کے خون سے مومیائی تیار ہوتی ہے۔"

"وہ کیا چیز ہوتی ہے؟" اجنبی نے حیرت سے پوچھا۔

گورکھ نے کہا "آج کل جرمنی اور انگلینڈ کی جنگ ہو رہی ہے۔"

"تو جنگ سے بچوں کو چرانے کا کیا تعلق؟" اجنبی کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔

گورکھ نے سمجھانے کے لہجے میں کہا "سنا ہے کہ بچوں کے خون سے تیار کی ہوئی مومیائی باہر کے ملکوں میں سپلائی ہوتی ہے۔ اسے جنگ لڑنے والے سپاہی کھاتے ہیں، جس سے ان کے جسم میں طاقت آتی ہے اور وہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ مومیائی ایسے تیار ہوتی ہے کہ بچوں کے خون کو رفتہ رفتہ گرم گرم تیل میں ٹپکاتے ہیں۔ بچوں کے سر میں لوہے کی میخ ہتھوڑے سے ٹھونک دیتے ہیں۔۔ کتنا ظلم ہے!"

اجنبی پھر ہنس پڑا "بس کرو! بس کرو! تم نے بہت سی بے تکی باتیں سن رکھی ہیں کسی نے تمہیں خوامخواہ ڈرا دیا ہے۔"

باتوں کے ریلے میں گورکھ پھر وقت اور راہ کا اندازہ بھول گیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔ سڑک سنسان تھی۔ دونوں طرف اونچے اونچے پیڑوں کی چوٹیاں ہواؤں سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ سڑک پر کوئی اور راہی نہ تھا۔ یکایک ایک درخت کے سائے سے نکل ایک اور شخص اجنبی کے ساتھ ہولیا۔ لمبی

مونچھیں' داڑھی' سرخ آنکھیں' ڈراؤنی شکل۔ وہ مدھم آواز میں بولا "پھنسالائے مرغا؟ جیب میں رومال ہے کیا؟"

اب گورکھ پر حقیقت کھلی۔ کہانی سناتے سناتے وہ خود ایک کہانی بننے والا تھا' جس کا انجام موت تھا۔ اس نے زور سے چیخنا شروع کیا اور الٹے پاؤں بھاگا۔ کچھ ہی دور پر آبادی شروع ہوگئی۔ وہ اجنبی ابھی تک اس کے پیچھے آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد قدم ملا کر ساتھ ہولیا اور کہنے لگا۔ "تم خوامخواہ ڈر گئے۔"

گورکھ سینما گھر کی راہ بھول گیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ اس اجنبی کے ساتھ چلتا رہا۔ سینما گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے وہ اجنبی رفو چکر ہوگیا۔ شو ابھی تک ختم نہ ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ماں کو ساتھ لے کر گورکھ گھر پہنچا۔ اجنبی والی بات اس نے دل میں چھپا رکھی تھی۔ کئی سال بعد باپ پر ظاہر کی تو وہ سر پکڑ کر بولے۔ "تمہیں کتنی تاکید کی تھی کہ کسی اجنبی سے بات مت کرنا۔ کوئی کھانے کو کچھ دے تو مت کھانا۔ کسی کے ساتھ کہیں نہ جانا۔ شکر ہے خدا کا جس نے تمہاری جان بچائی۔"

اس حادثے پر گورکھ جب غور کرتا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ اس کی قسمت کہ اجنبی کے ساتھی کے پاس رومال نہ نکلا۔ ورنہ کیا ہوتا؟ ہوسکتا ہے وہ سڑک پر بھیک مانگ رہا ہوتا۔ یا اس کی مومیائی کسی فوجی کے پیٹ میں اتر گئی ہوتی۔ وہ جب اس بات کو سوچتا' اسے خدا کی یاد آجاتی۔ کوئی طاقت ضرور ہے جو مارتی بھی ہے اور بچاتی بھی ہے۔ کب کسی کو کیوں مارتی ہے' اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کب کسی کو بچاتی ہے' یہ بھی کوئی نہیں جانتا۔

گورکھ کو یقین ہو گیا تھا کہ خدا کا دیدار کرنا آسان نہیں۔ اگر خدا کو دیکھنا سہل ہوتا تو کائیاں لوگ شاید اسے بھی چوراہے پر نیلام کر رہے ہوتے! پھر بھی خدا سے محبت اور تعلق کا جذبہ گورکھ کے دل میں بڑھتا ہی گیا۔

گورکھ کا گھر سے جنگل کی راہ پکڑنے کا ارادہ اگرچہ بدل گیا تھا' لیکن کنہیا سے اس کا لگاؤ کم نہیں ہوا تھا۔ مالا پھیرنے' منتر پڑھنے اور پوجا کرنے میں بھی اس سے کبھی کوتاہی نہیں ہوئی۔ وہ بازار سے ایک رادھا کرشن کی تصویر خرید لایا اور اسے مندر میں سجا کر ہر صبح اور شام اس کے سامنے چراغ جلانے لگا۔ وہ کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے وہ خوب صورت تصویر اس کے دل و دماغ میں اترتی جا رہی ہے' اس کے قیاس اور تصور میں جھلملا رہی ہے۔ وہ جب چاہے اپنے محبوب کو دیکھ سکتا ہے۔ ایک روز وہ اسی بے خودی میں مدہوش تھا کہ اسے خیال آیا' کیوں نہ اپنے ہاتھوں سے اپنے محبوب کی ایک خوب صورت تصویر بنائے۔ وہ تصویر اتنی خوب صورت ہو' جتنی اس کے دل میں محفوظ ہے۔ اسکول میں دو مضمون ایسے تھے جس میں اس کے سو فی صد نمبر حاصل ہوتے تھے۔ ایک حساب اور دوسرا ڈرائنگ۔ ڈرائنگ کا ماسٹر کہتا تھا: ''تم سچ مچ غضب کرتے ہو۔ آج تک میں نے کسی طالب علم کو ڈرائنگ میں سو فی صد نمبر نہیں دیئے۔ اتنا حقیقی کپ اور پلیٹ بنائی ہے جیسے کپ ابھی پلیٹ سے اٹھ کر ہونٹوں تک پہنچ جائے گا۔'' گورکھ اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوتا۔ اس حوصلہ افزائی کی وجہ سے وہ بہت محنت اور لگن سے اگلی ڈرائنگ تیار کرتا۔ صرف پنسل سے ایسے نقش ابھارتا کہ دیکھنے والا واہ واہ کر اٹھتا۔ ایک دن ماسٹر کہنے لگا : ''تم یہ ہنر کبھی نہ چھوڑنا۔ یہ بھی قدرت کسی کسی کو عطا کرتی ہے۔ تمہارے ہاتھ میں جادو ہے۔ تم بہت اچھے آرٹسٹ بن سکتے ہو۔''

گورکھ ایک خوب صورت تصویر بنانے کی تیاری کرنے لگا۔ پھر سوچا کہ صرف کالی پنسل سے بنی تصویر میں تو کمی رہ جائے گی۔ رادھا کے رخسار اور لب تو سرخ ہونے چاہئیں۔ کرشن کی لنگوٹی زرد ہونی چاہیے۔ رادھا کا بلاؤز نیلا یا لال یا ہرا ہونا چاہیے۔ ابھی تک گورکھ نے رنگوں کا استعمال نہیں کیا تھا۔ نیلی اور لال پنسلیں آسانی سے مل سکتی تھیں۔ گورکھ نے سوچا' شروع میں یہی کافی رہے گا کہ کالی نیلی اور لال پنسلوں سے ہی تصویر بنائی جائے۔ لیکن دل میں چھپی خوب صورتی کو کاغذ پر اتارنا اتنا آسان نہ تھا۔ گورکھ ناک بناتا تو اسے ایسا لگتا کہ خطرناک دونالی بندوق بن گئی ہے۔ آنکھ بناتا تو لگتا کہ بھینگی ہے۔ ایک نظر کدھر اور دوسری کدھر۔ بازو ضرورت

سے زیادہ لمبے یا چھوٹے بنے نظر آتے۔ اور ہاتھوں کی انگلیاں خوب صورت بنانا تو چہرہ بنانے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ لیکن گورکھ نے ہمت نہ ہاری اور لگاتار کوششیں جاری رکھی۔

اسی درمیان گورکھ کی جان پہچان ایک آرٹسٹ سے ہوئی۔ گورکھ نے بڑے شوق سے اپنی تیار کردہ رادھا کرشن کی تصویریں آرٹسٹ کو دکھائیں۔ آرٹسٹ رادھا کرشن کی ساری تصویریں دیکھ کر پوچھنے لگا : "رادھا کرشن کے علاوہ کیا کبھی اور کچھ بنانے کو دل نہیں چاہتا؟"

"نہیں۔" گورکھ نے جواب دیا۔

آرٹسٹ کہنے لگا : "دیکھو، ہر چہرے پر یوں تو دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک اور دو لب ہوتے ہیں، لیکن آرٹسٹ لوگوں نے ساری زندگی صرف کر دی اور پھر بھی بس ایک حد تک ہی حقیقت کے قریب چہرہ بنانے کے ہنر میں مہارت حاصل کر سکے۔ اگر تم رادھا کرشن ہی بنانا چاہتے ہو تو میں تمہیں صلاح دوں گا کہ تم کسی اچھی سی تصویر کو لے کر اس کی نقل کر لیا کرو۔ یہ پہلا سیڑھی ہے۔ نقل کرتے کرتے کبھی نہ کبھی اصل تک بھی پہنچ جاؤ گے۔"

گورکھ کو آرٹسٹ کا مشورہ پسند آیا۔ آرٹسٹ نے اسے اصل سے نقل بنانے کے دو طریقے سمجھائے۔ ایک تو یہ کہ کیسے اصل پر لائنوں کا جال بچھا کر اور کورے کاغذ پر اسی ترکیب سے لکیریں کھینچ کر اصل کا ہر حصہ نقل کیا جا سکتا ہے۔ دوسری یہ کہ کس طرح اصل کا خاکہ کورے کاغذ پر اتارا جا سکتا ہے۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہے۔ گورکھ آرٹسٹ کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ اب اس کی بنائی ہوئی تصویروں میں کچھ جان آچلی ہے اور کسی حد تک وہ خوب صورت بننے لگی ہیں۔ آرٹسٹ نے اسے سمجھایا تھا کہ آنکھ، کان، ہونٹ وغیرہ بڑے پیانہ پر کاغذ پر بنانے کی مشق کرتا رہے۔ جب بڑے پیانے پر بنانے آجائیں تو انہیں چھوٹا کرنے میں آسانی ہوگی اور انہیں ٹھیک طرح چہرہ پر فٹ کیا جا سکے گا۔

تصویر بنانے میں کتنا مزہ تھا۔ اس کے ساتھ پریشانی بھی تھی۔ لائن ذرا سی ہلی کہ خوب صورت چہرہ بگڑ گیا۔ آنکھ کا ڈیلا ذرا ہلا کہ تصویر آنکھ مارنے لگی۔ کتنی مہارت، کتنی محنت چاہئے تھی ذرا سی خوب صورتی کاغذ پر اتارنے کے لئے۔ ایک بیضہ کیسے پنسل کے شیڈ لے کر جیتا جاگتا چہرہ بن جاتا ہے۔ اور تصویر کو لباس پہنانا۔۔۔ کپڑا ہی ڈھال اختیار کر لیتا ہے جس سراپا پر وہ پڑا ہوتا ہے۔ رادھا کا سراپا۔ نازک سی گردن۔ کرشن کو نیم باز ترچھی نظروں سے دیکھتی ہوئی۔ بلاؤز کا سینے پر ذرا سا پھسل کر، ذرا سا کھل کر، ذرا سا نیچے کی طرف، دب کر حسن کی جیتی جاگتی تصویر بن جانا۔ گورکھ اکثر ایک تصویر کو کئی بار بنا ڈالتا۔ بار بار مٹا مٹا کر شیڈ کرتا، رنگ بھرتا، جب تک تصویر وہ نقوش نہ اختیار کر لے جو تصور میں لہراتے تھے۔ آخر اس کی محنت رنگ لائی۔ اس کی بنائی تصویروں میں ایک خاص جمال، خوب صورتی، توازن، بہت کچھ آگیا۔ جو بھی اس کے آرٹ کو دیکھتا، تعریف کئے

بغیر نہ رہتا۔

کنہیا کا جادو گورکھ پر ایسا چلا کہ وہ خود کو کنہیا کی رادھا سمجھنے لگا۔ لیکن رادھا تو عورت تھی اور وہ مرد ہے۔ تو کیا ہوا؟ خدا کے دربار میں مذکر اور مونث کا کیا امتیاز؟ سب خدا کی محبت کے یکساں حق دار ہیں۔ پھر بھی کنہیا سے عقیدت کے جوش میں گورکھ نے لڑکیوں کی طرح بال بڑھانے شروع کر دیئے' کیوں کہ وہ خود کو رادھا تصور کرنے لگا تھا۔ بالوں میں لگانے کا خوشبودار تیل' جسے وہ خاص مواقع پر بالوں میں چپڑتا۔ لپ سٹک' پاؤڈر' کریم۔ کنگھی' تصویریں' مالا' پوجا کا سامان' اگر بتی' دیا سلائی' دھوپ وغیرہ۔ یہ سارا سامان سب کی نظر سے بچا کر رکھنا مشکل تھا۔ گورکھ کو لوہے کی ایک پرانی پیٹی' جو زنگ لگی' بے کار پڑی تھی' اس کام کے لئے موزوں نظر آئی۔ اس نے پیٹی نکال' اسے صاف کیا اور بازار جا کر اس میں تالہ لگوا لایا۔ سب سامان اس میں رکھ کر' قفل بند کر کے چابی کہیں قریب ہی چھپا دی۔ اس نے سوچا' کہیں سے ایک بلاؤز مل جائے تو اچھا ہے۔ جیب خرچ سے کچھ رقم بچا کر وہ بازار سے ایک ریشمی بلاؤز خرید لایا۔ اور اسے بھی پیٹی میں بند کر دیا۔

ایک روز گورکھ غسل کے بعد سب کی آنکھ بچا کر رادھا بننے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے بالوں میں خوشبودار تیل لگایا ہونٹوں پر رنگ چڑھایا اور بنیان اتار کر بلاؤز پہننے لگا۔ یکایک اس نے گوپال داس کو کمرے کے باہر کھڑے پایا۔ تو سٹ پٹا کر بلاؤز پیٹی میں پھینک دیا اور پیٹی بند کر دی۔ گوپال داس نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا اور کچھ سمجھ نہ سکے۔ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ غسل خانے کی طرف بھاگا اور ہونٹوں سے لپ سٹک چھڑانے لگا۔ باپ نے لیکن کھلی پیٹی دیکھ لی تھی۔ گورکھ واپس آیا تو وہ ایک ایک چیز نکال کر حیرت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے : "یہ سب کیا ہے؟ تمہیں کیا سر میں لگانے کو تیل نہیں ملتا۔ یہ تصویریں کیسی ہیں؟ ابھی سے لڑکیوں کی تصویریں چھپا کر رکھتے ہو' کل کیا کرو گے؟ اور یہ کاجل کی ڈبیا' لپ سٹک' بلاؤز۔ لڑکی بننے چلے ہو؟"

گورکھ کچھ نہ بولا اتنی محنت سے اکٹھا کیا ہوا گنجینہ دیکھتے ہی دیکھتے لٹ گیا۔

کچھ دن سے گورکھ گھر میں دیوی کا ذکر بہت سن رہا تھا۔ ماں کئی بار کہہ چکی تھی کہ دیوی کے دربار میں ہے' بال چڑھانے ہیں' دیوی سے منت مانگی ہے۔ بال چڑھانے کا معاملہ گورکھ کی سمجھ میں نہ آیا تو ایک دن وہ پوچھ بیٹھا : "یہ بال چڑھانے کا کیا مطلب ہے؟"

ماں نے جواب دیا : "یہ جو تمہارے سر پر اتنی لمبی کھیتی اگ آئی ہے جس سے تمہاری پیشانی تک ڈھکی رہتی ہے' یہ ساری کھیتی دیوی کو چڑھانی ہے۔ یعنی تمہارے اور تمہارے بھائی کے سر کے بال اتار کر دیوی کو چڑھانے ہیں۔"

گورکھ بولا "مگر اس طرح تو میں گنجا ہو جاؤں گا!"

ماں نے سمجھایا : "تو کیا ہوا؟ بال تو دوبارہ آجائیں گے۔ دیوی کے پاس تو ہم کئی برس بعد جا رہے ہیں۔"
یہ سن کر دیوی کے پاس جانے کا گورکھ کا سارا شوق کافور ہو گیا۔ دیوی کو اس کے سر کے بالوں سے کیا دشمنی یا محبت تھی؟ وہ یہ بات نہ سمجھ سکا۔
جانے کیا تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گٹھڑیاں بندھ رہی تھیں۔ کھانے کے لئے مٹھیاں تلی جا رہی تھیں۔ اور ایک دن صبح کو وہ سب کھچا کھچ بھری بس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ شام کے چار یا پانچ بجے وہ بس سے اترے اور سڑک کے کنارے سامان رکھ کر بیٹھے رہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ سڑک کی دھول پھانکنے سے گورکھ کا سفر کا شوق تقریباً" ختم ہو چکا تھا۔ گوپال داس کسی کو ڈھونڈتے ہوئے ایک جانب نکل گئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک بیل گاڑی میں بیٹھے، کوچوان سے باتیں کرتے ہوئے واپس آگئے۔ گورکھ کو بیل گاڑی دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کیا وہ سب بیل گاڑی میں سفر کریں گے؟ جب اس سے ناامیدی برداشت نہ ہوئی اور وہ سب بیل گاڑی میں بیٹھ گئے تو وہ پوچھنے لگا : "ہم بیل گاڑی میں کیوں جا رہے ہیں؟ بس میں کیوں نہیں چلے گئے؟"
گوپال داس نے جواب دیا : "راستہ خراب ہے۔ بس وہاں تک نہیں جاتی۔"
اتنے میں ایک بس دھول اڑاتی ان کے قریب سے گزر گئی۔ پتہ نہیں باپ نے اس سے سچ کہا تھا کہ جھوٹ، کیوں کہ وہ کئی بسوں کی آمد و رفت بیل گاڑی کا سفر شروع ہوتے ہی اسی سڑک پر دیکھ چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو، اپنے والدین کو، گاؤں والا اور بہت چھوٹا محسوس کر رہا تھا۔ پھر ایک کار سرسراتی ہوئی ان کے پاس سے گزر گئی۔ سڑک اگرچہ کچی تھی، لیکن اس پر گاڑیوں کی آمد و رفت برابر جاری تھی۔
سورج ڈوبنے لگا تھا۔ فضا میں کچھ ٹھنڈک محسوس ہونے لگی تھی۔ گھر سے لایا ہوا کھانا کھا کر اور پانی پی کر سب بیل گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔ دونوں بیل بڑے کم زور اور بھوکے پیاسے لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں گورکھ لمبی کالی، نمی کی لکیریں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جانور کی بھی کیا زندگی ہے! وہ تو پھر بھی آرام سے بیٹھے ہیں اور بے زبان بیل اتنا بوجھ اٹھائے گھسٹتے چلے جا رہے ہیں۔ گورکھ نے روٹی کا ایک ایک ٹکڑا دونوں بیلوں کو کھلا دیا اور خود بھوکا رہ گیا۔ کوچوان کہنے لگا "آپ لوگ آرام سے سو جائیے۔ بیل اپنا راستہ جانتے ہیں۔ رات بھر چلتے رہیں گے۔"
کچھ دیر میں گورکھ کو چھوڑ کر سب نیند کے غلبے سے اونگھنے لگے۔ یہاں تک کہ کوچوان بھی سو گیا۔ مگر گورکھ کو نیند نہیں آئی۔ وہ بیلوں کے بارے میں ہی سوچتا رہا : "جانور ہیں تو کیا ہوا؟ کیا انہیں آرام کی ضرورت نہیں۔ شام کو کچھ دیر کے لئے ہی بیلوں کو گاڑی سے الگ کیا گیا تھا اور اب یہ رات بھر چلتے رہیں گے۔ "آدمی بہت ظالم ہے، بہت ظلم کرتا ہے جانوروں پر!" بیل گاڑی میں سوار ہونے پر خود کو ہیچ سمجھنے کا جو احساس گورکھ کے دل میں جاگا تھا، وہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ رات کی ٹھنڈک، کھیتوں کی راہ سے بیل گاڑی کا گزرنا،

مینڈکوں کی ٹرٹر، جھینگروں کی جھنکار، مٹی کے تیل کی لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی۔ وہ سوچنے لگا کہ ایسا نظارہ کار میں سفر کرنے والوں کے نصیب میں کہاں؟ سفر کے شروع میں وہ بیل گاڑی کے ہچکولوں سے پریشان ہو اٹھا تھا، اب ان ہی ہچکولوں میں اسے رات کی لوریاں سنائی دینے لگیں اور دھیرے دھیرے وہ نیند کی آغوش میں دبک گیا۔

صبح کو گورکھ کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا کہ گوپال داس سیدھے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے، آنکھیں بند کئے، پوجا کر رہے تھے۔ گورکھ کو ایسا کوئی دن یاد نہ تھا جب اس کے باپ نے پوجا نہ کی ہو۔ سورج نکلنے کا منظر بہت دل کش تھا۔ آہستہ آہستہ اندھیرے کا سمٹنا اور آفتاب کا پیڑوں کے جھرمٹ سے اپنا لال لال چہرہ عیاں کرنا۔ اسے بیلوں کا پھر خیال آیا۔ کوچوان سے پوچھنے لگا کیا بیل ساری رات چلتے رہے ہیں؟"

کوچوان نے "ہاں" میں سر ہلایا۔

گورکھ بولا "انہیں راستہ کیسے معلوم ہوتا ہے؟ ہم سب تو سوئے پڑے تھے۔ تم بھی تو سوئے ہوئے تھے؟"

کوچوان نے سمجھایا : "اسی راستے پر میں ہمیشہ گاڑی چلاتا ہوں، اس لئے بیل راستے سے کبھی نہیں بھٹکتے۔ وہ غلط راستے پر کبھی نہیں جاتے۔ اگر کہیں رکاوٹ آجائے تو چپ چاپ گاڑی روک کر کھڑے ہو جائیں گے۔

"سورج کے اونچا اٹھتے ہی رات کی خنکی ختم ہونے لگی۔ ایک آم کے باغ میں پڑاؤ ڈال کر سب نے ناشتہ کیا۔ بیلوں کو بھی چارہ کھانے کو ملا۔ گورکھ آم کے پیڑ کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔ تقریباً" دو گھنٹے کے بعد گاڑی پھر سفر کے لئے تیار تھی۔ اس بار گاڑی کی رفتار پہلے سے کچھ تیز تھی۔ بیل بھی تازہ دم ہو گئے تھے۔ بیلوں کو تیز بھگانے کے لئے لگام اور چابک کے علاوہ کوچوان کے پاس دو فٹ کے قریب لمبا ایک لکڑی کا ڈنڈا تھا۔ اس ڈنڈے کے سرے پر لوہے کی نوکیلی کیل گڑی ہوئی تھی۔ وہ بار بار اس کیل کو بیلوں کے کولہے پر چبھو دیتا اور بیل کچھ دور تیز چل کر پھر دھیمے پڑ جاتے۔ کوچوان پھر یہی حرکت دہراتا۔ کچھ دیر تو گورکھ خاموش دیکھتا رہا، پھر کوچوان سے کہنے لگا : "بیلوں کو آرام سے چلنے دو نا۔ آخر ان میں بھی تو ویسی ہی جان ہے جیسی ہم میں اور تم میں ہے۔"

گورکھ کے اس طرح بھڑکنے پر سب کو حیرت ہوئی۔ کوچوان نے مسکرا کر گوپال داس سے کہا "آپ کا لڑکا تو جانوروں کا بھی خیال رکھتا ہے!"

کچی سڑک کہیں تنگ، کہیں چوڑی، کہیں بل کھاتی ہوئی تھی۔ پیچھے سے ایک اور بیل گاڑی ان کے قریب آئی اور اس میں سوار ایک شخص ہاتھ اٹھا کر بولا "جے دیوی کی!"

گوپال داس بھی بولے "جے دیوی کی!"

"آپ لوگ دیوی کے مندر کی طرف جا رہے ہیں نا؟" اس شخص نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ہم دونوں کی منزل ایک ہی ہے۔" گوپال داس نے خوش دلی سے جواب دیا۔
"کتنے بچے ہیں آپ کے؟" اجنبی پوچھنے لگا۔
"دو لڑکے، دو لڑکیاں۔ اور آپ کے؟"
"میری ایک یہ بڑی لڑکی (لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہے اور یہ اس سے چھوٹا ایک لڑکا۔ اور یہ میری بیوی ہے۔"

گورکھ کی نظریں لڑکی کی نظروں سے چار ہوئیں۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر تک نظروں کے ٹکراؤ کا سلسلہ چلا پھر ان کے پیچھے والی گاڑی آگے نکل گئی۔ وہ بیل گاڑی واقعی خوب صورت تھی۔ بیل بھی ان کی گاڑی میں جتے بیلوں سے کہیں زیادہ طاقت ور اور موٹے تازے تھے۔ کوچوان کو دوسری بیل گاڑی کا آگے نکلنا اچھا نہ لگا۔ اس نے بھی اپنے بیل دوڑا دیئے۔ بار بار فاصلہ کم ہوتا نظر آتا، لیکن پھر بڑھ جاتا۔ کچھ دیر تو گورکھ یہ مقابلہ دیکھتا رہا اور کسی حد تک اسے مزہ بھی آیا، لیکن بیلوں کا خیال آتے ہی اس نے کوچوان سے کہا "کیوں گاڑی بھگانے پر تلے ہو؟ انہیں آگے جانا ہے تو جانے دو۔ اپنے بیلوں کا خیال کرو۔"

کوچوان نے بغیر کچھ کہے بیلوں کی چال دھیمی کردی۔ وہ جانتا تھا کہ آگے نکل جانے والی گاڑی کا وہ مقابلہ نہیں کرسکتا۔

دو رات اور ایک دن کے سفر کے بعد منزل ان کے سامنے تھی۔ ایک ٹیلے پر دیوی کا مندر تھا۔ چڑھائی چڑھتے چڑھتے بیل گاڑی کی رفتار بہت کم ہوگئی۔ صبح کے دس بجے کے قریب وہ مندر میں پہنچے۔ گوپال داس اور ساوتری نے صبح کا ناشتہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ دیوی کے درشن کرکے ہی کچھ کھائیں گے۔ دیوی کے درشن جھوٹے مونہہ نہیں کیا کرتے۔ گورکھ نے بھائی بہنوں کے ساتھ ناشتہ کرلیا تھا۔

سب سے پہلے گورکھ کے اور اس کے بھائی کے بال اتروانے تھے۔ مندر کی ایک دیوار کے ساتھ حجاموں کی قطار لگی ہوئی تھی اور ہر حجام کے سامنے بھی قطار لگی ہوئی تھی۔ جوان اور بچے سب ہی قطار میں موجود تھے۔ ایک یا دو سال کے بچوں کو گود میں اٹھائے کچھ عورتیں بھی قطار میں شامل تھیں۔ گورکھ اور اس کا بھائی بھی ایک قطار میں سب سے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ حجام لوگ سر سے بال اتارنے میں صرف دو یا تین منٹ لگاتے اور سر کی کھال چمک اٹھتی۔ گورکھ اپنے قریب کھڑی ہوئی ماں سے پوچھنے لگا "دیوی کو بال کیوں چڑھاتے ہیں؟ کیوں سر منڈواتے ہیں؟"

ساوتری اس کے سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔ گوپال داس نے بیوی کی مدد کی اور گورکھ کو ڈانٹا "کبھی تو چپ رہا کرو۔ ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا۔"

سر منڈوانے کی بات ابھی گورکھ کے دماغ میں گھوم ہی رہی تھی کہ اس نے سنا، شام کو دیوی پر بکرے کی بلی

چڑھائی جائے گی۔ "بلی" کا مطلب سمجھ میں آیا تو وہ ماں سے پوچھنے لگا۔ "مرے ہوئے بکرے کا سر کاٹتے ہیں یا زندہ کا؟"

ساوتری جھلا گئی۔ "کیا احمقوں جیسی باتیں کرتا ہے۔ کوئی مرے ہوئے بکرے کا سر بھی کاٹتا ہے؟"

تعجب سے گورکھ کی آنکھیں کچھ دیر کے لئے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے سوچا : ہندو تو اہنسا کے پجاری ہیں۔ پھر یہ کیا کہ وہ مندر میں ہی زندہ جانور کو کاٹ ڈالتے ہیں؟ گورکھ کو رام کے اشومیگھ یگیہ کے بارے میں پڑھ کر بھی حیرت ہوئی تھی کہ "یگ" کے بعد گھوڑے کا سر کاٹ دیا جاتا تھا۔ پھر ماں سے پوچھ بیٹھا : "جب بکرا مر جاتا ہے تو اس کا کیا کرتے ہیں؟"

ساوتری نے جواب دیا : "وہ دیوی کا پرشاد بن جاتا ہے۔ بھگت اور پنڈت' سب اسے کھاتے ہیں۔"

یہ بھی گورکھ کے لئے نئی بات تھی۔ اس نے سوچا : اشومیگھ یگیہ کے بعد گھوڑے کا گوشت بھی کھا جاتے ہوں گے؟ مگر اس کے ماں باپ گوشت نہیں کھاتے۔ گوشت کھانے کو وہ دھرم کے خلاف مانتے ہیں۔ کیا وہی دھرم زندہ جانوروں کو مندر میں کاٹنے کی اجازت دیتا ہے؟

کسی بات کو پڑھ لینا اور اسے سامنے ہوتے دیکھنا' دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گورکھ کو جڑ بھرت کی کہانی یاد آئی جو اس نے "بھاگوت پران" میں پڑھی تھی۔ جڑ بھرت اپنے آپ کو فراموش کر چکا تھا۔ رات اور دن' اچھے اور برے کا ہر امتیاز اس کے لئے ختم ہو چکا تھا۔ وہ برہم" (ایشور) میں سما گیا تھا اور برہم اس میں۔ کوئی اسے جانور کی طرح ہل میں جوت دیتا۔ کوئی اسے کہار سمجھ کر اس سے پالکی اٹھانے کی خدمت لیتا' لیکن اس کی پیشانی پر شکن نہ آتی۔ ایک بار اسے دیوی کی بلی چڑھانے کے لئے پکڑ لیا گیا۔ اسے نہلا کر' اچھے کپڑے پہنا کر' اس کی گردن کاٹنے کے لئے لوگ اسے دیوی کے پاس لے گئے' لیکن اس کے چہرے پر کسی خوف اور غم کی پرچھائیں نہ تھی۔ جیسے ہی اس کی گردن کاٹنے کے لئے تلوار اٹھائی گئی دیوی کا بت زندہ ہو اٹھا اور دیوی نے سر کاٹنے والوں کے سر کاٹ ڈالے۔ گورکھ کو یہ سب پڑھنے میں بہت اچھا لگا تھا۔ لیکن آج کل تو بے قصور جانور ہر روز دیوی کے مندر میں کٹتے ہیں اور دیوی خاموش بت بنی سب کچھ دیکھتی رہتی ہے۔ سر کاٹنے والوں کے سر صحیح سلامت رہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں' بلی کا گوشت کھا کھا کر پجاری خوب موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ اس نے کسی' پجاری کو مجنوں نما شکل اور سراپا لئے نہ دیکھا۔

"کیا آج کل بھی "نربلی" ہوتی ہے؟" گورکھ ماں سے پوچھنے لگا۔ جانور کی ہی نہیں' آدمی کی قربانی بھی اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہی تھی۔ ساوتری نے جواب دیا : "شاید ہوتی ہوگی۔ مجھے نہیں معلوم۔ پرانے زمانے میں تو ہوتی تھی۔ سنا ہے' کسی ریاست کا راجا آج کل بھی نربلی دیتا ہے۔"

گورکھ کے دل نے کہا : "آہ! کتنا ظلم ہے دیوی کے نام پر! دیوی کے نام پر بے قصور آدمیوں اور

جانوروں کا خون؟ کس نے شروع کیا تھا یہ چلن؟"

گورکھ کو مندر سے واپس آنے کا راستہ بہت طویل محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بے صبری سے گھر پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔

ایک رات بیل گاڑی کے سفر میں گزار کر وہ سب اسی باغیچے میں پہنچے جہاں آتے وقت انہوں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر وہ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ کسی پرندے نے گورکھ کے گنجے سر پر بیٹ کر دی۔ گورکھ نے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ہاتھوں کی انگلیاں گندی ہو گئیں۔ ساوتری اس کے سر کو پوچھنے کے لئے کوئی کپڑا ڈھونڈھ ہی رہی تھی کہ گورکھ بولا : "رہنے دو ماں۔ یہ تو دیوی کی خاص مہر ہے میرے سر پر۔"

دیوی کی شان میں ایسی گستاخی کی بات سن کر گوپال داس نے گورکھ کو ڈانٹا۔ "دیوی ماں ہوتی ہے۔ تمہیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں؟ پرندے کی بیٹ ہی تو ہے' کسی انسان کی غلاظت تو نہیں۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گورکھ کی نظر قریب ہی بچھی نئی دری اور اس پر آرام کرتے لوگوں پر پڑی۔ یہ وہی لوگ تھے جن کی بیل گاڑی آتے وقت ان سے آگے نکل گئی تھی۔ دو آنکھیں اس کی طرف متوجہ تھیں۔ لیکن ان میں ہنسی کی جھلک تھی۔ دراصل وہ ہنس رہی تھیں اس کے گنجے سر پر اور بگڑی صورت پر۔ اتنے میں اجنبی نے گورکھ کے باپ سے پوچھا "دیوی کے درشن کر آئے؟ منت مانگ آئے؟"

گوپال داس نے جواب دیا : "جی ہاں۔ سنائیے' آپ کا سفر کیسا رہا؟"

"سب دیوی کی مہر ہے۔" اجنبی بولا "لڑکے کا مونڈن کروا آئے اور دل کی مراد مانگ آئے۔ دیوی آپ کی مراد پوری کرے۔"

"دیوی آپ کی بھی منو کامنا (دل کی مراد) پوری کرے۔" گوپال داس نے کہا۔

سب سے بڑی مشکل گورکھ کے سامنے یہ تھی کہ اسکول میں اپنی صورت کیسے دکھائے؟ گنجے سر کیسے اسکول جائے؟ باپ نے کہا "سر پر ٹوپی اوڑھ کر اسکول چلے جاؤ۔" سر کو مزید ڈھکنے کے لئے گورکھ پگڑی باندھ کر اسکول گیا۔ بار بار اسے یہی خیال ستائے جا رہا تھا کہ کیسے لڑکوں کا سامنا کرے گا۔ آدھی چھٹی تک کا وقت خیر سے گزرا۔ جیسے ہی چھٹی کا گھنٹہ بجا' ایک لڑکے نے ہاتھ مار کر گورکھ کے سر سے پگڑی اتار دی۔ دوسرا بولا "یہ منڈائی کا ٹھولا" اور اس نے دو انگلیوں کی گانٹھیں الٹے ہاتھ سے گورکھ کے سر پر جڑ دیں۔ پھر کیا تھا' سب لڑکے سر پر ٹھولے مارنے لگے۔ گورکھ سر جھکائے سیٹ پر بیٹھا رہا اور لڑکے اس کے سر پر طبلہ بجاتے رہے۔ کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب تک گورکھ کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال نمودار نہ ہوئے' لڑکے اس کے سر پر طبلہ بجاتے رہے۔

چند مہینوں بعد ماں نے گورکھ کی تیسری بہن کو جنم دیا۔ اس دن گھر میں کافی ہلچل رہی۔ صبح سے ماں کمرے

میں بند تھی۔ دائی آئی۔ ہیجڑے ناچے۔ جب گورکھ کو کمرے میں نئی بہن کی صورت دیکھنے کو بلایا گیا تو وہ غصے میں تھا۔

"یہ دیکھو، تمہاری نئی پیاری پیاری خوب صورت سی چھوٹی بہن۔" پڑوس کی ایک عورت نے گورکھ سے کہا۔

گورکھ کے دل کا غبار اس کی زبان پر آگیا۔ "مجھے نہیں چاہئے یہ بہن۔ کہو تو باہر سڑک کے کنارے رکھ آؤں، یا کوڑے کے کنستر میں پھینک دوں۔"

گورکھ کی بات سن کر ماں باپ اور پڑوسی اسے ڈانٹنے لگے۔ گوپال داس نے ایک تھپڑ بھی رسید کیا۔

گوپال داس ہر روز صبح پوجا کرتے تھے۔ یوگ آسن کرتے تھے۔ گھر میں کھانے پینے کی بھی کمی رہتی تھی، گورکھ کے بچپن کے ارمان کہاں پورے ہوئے تھے۔ وہ بہت سی چیزوں کو ترستا تھا، لیکن زبان سے کبھی کچھ نہ کہتا۔ بھائی اور دو بہنیں کیا کم تھیں کہ اب تیسری بہن بھی آگئی۔ پیدائش کے راز گورکھ جان ہی چکا تھا۔ کوک شاستر اس نے پڑھ لئے تھے۔ بچوں کو جنم دیتے دیتے ماں مر بھی سکتی ہے۔ کیا فائدہ ایسی پوجا کا؟ ہر دو یا تین سال بعد بہرکیف بچہ پیدا کرنا، گھر کی مالی حالت سمجھے بغیر، کیا ماں پر، سارے خاندان پر ستم نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ گورکھ پر یہ بھی واضح ہونے لگا کہ دیوی کے مندر میں ماں باپ کیا منت مانگنے گئے تھے۔ مانگا تھا لڑکا، مل گئی لڑکی۔ اچھی مراد پوری ہوئی۔ صورت سے بدصورت ہوا اور سر کا طبلہ بجوایا، وہ الگ۔

انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔ گوپال داس کے بینک کا منیجر انگریز تھا۔ لیکن گوپال داس گاندھی اور نہرو کے شیدائی تھے۔ گھر میں اکثر ان کی باتیں کیا کرتے۔ انہیں کسی پیغمبر سے کم نہ سمجھتے۔ ان دنوں انبالہ چھاؤنی میں خبر گرم تھی کہ گاندھی جی قریب ہی سے گزر رہے ہیں۔ ان کی ریل گاڑی انبالہ شہر ہو کر کسی دوسرے شہر جائے گی۔ انبالہ چھاؤنی سے انبالہ شہر کچھ ہی فاصلہ پر ہے۔ گوپال داس کے کئی دوستوں اور مالک مکان کے رشتہ داروں نے منصوبہ بنایا کہ انبالہ شہر جا کر گاندھی جی کا دیدار کر آئیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جس ریل گاڑی سے گاندھی جی سفر کر رہے تھے وہ انبالہ شہر رات کو تقریباً ڈیڑھ بجے پہنچتی تھی۔ گوپال داس نے گورکھ سے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ گورکھ کو گاندھی جی کے دیدار کی کوئی خاص تمنا نہیں تھی۔ بس یہ سوچا کہ اسی بہانے اچھا ہنگامہ رہے گا۔ وہ رضامند ہو گیا۔ شام کو آٹھ بجے کے قریب انبالہ چھاؤنی سے بس پکڑ کر سب انبالہ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ شاید وہ انبالہ شہر جانے والی آخری بس تھی، کیوں کہ بہت سے مسافر اس بس میں گاندھی جی کے درشن کے لئے ہی سفر کر رہے تھے۔ آدھے گھنٹے کا سفر تھا اور ٹرین کے آنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ بس اڈے سے اتر کر ایک ہوٹل میں سب نے رات کا کھانا کھایا اور پھر تانگے میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ رات کے

دس بجنے والے تھے۔ اسٹیشن پر لوگوں کی بھیڑ جمع ہونی شروع ہو گئی تھی۔ سب یہی اندازہ لگا رہے تھے کہ گاندھی جی ریل گاڑی کے کون سے ڈبے میں سفر کر رہے ہوں گے۔ کسی نے کہا کہ وہ ہمیشہ گاڑی کے اگلے حصے میں سفر کرتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں سفر کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب کہہ رہے تھے کہ وہ ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرتے ہیں' بالکل عام لوگوں کی طرح۔ دس بجے سے ہی پلیٹ فارم پر لوگ اپنی اپنی جگہ سنبھالے کھڑے ہوئے تھے' تاکہ گاندھی کو قریب سے دیکھ سکیں۔ کافی ہنگامہ برپا تھا۔ کچھ لوگ کھڑے کھڑے تھک کر پلیٹ فارم پر ہی بیٹھ گئے۔ اور کچھ تو دراز بھی ہو گئے۔ سردی کا موسم تھا۔ لوگ کمبل اور گرم کپڑے لے کر آئے تھے۔ جگہ جگہ پلیٹ فارم پر بستر لگے ہوئے تھے۔ لوگوں کی اتنی بھیڑ گورکھ نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

انتظار میں وقت کم رفتار سے گزرتا ہے۔ گوپال داس سردی سے بچاؤ کا اور پلیٹ فارم پر بستر جمانے کا کوئی انتظام کر کے نہیں آئے تھے۔ وہ لوگوں کی بھیڑ میں کھڑے رہے۔ گوپال داس نے گورکھ کو تاکید کی کہ ساتھ ساتھ رہے۔ اگر ساتھ چھوٹ گیا تو ڈھونڈنا مشکل ہو گا۔

کھڑے کھڑے دو گھنٹے گزر گئے۔ گورکھ کی ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خواہ مخواہ چلا آیا۔ گھر میں آرام سے سوتا۔ جیسے جیسے گاڑی کے پلیٹ فارم پر پہنچنے کا وقت قریب آ گیا' لوگوں کی بے چینی بڑھتی گئی۔ بھیڑ بھی زور پکڑتی گئی۔ ایک بجے تک پلیٹ فارم پر اتنا ہجوم جمع ہو گیا کہ کہیں پانوں رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ ہر قسم کے لوگ اس بھیڑ میں شامل تھے۔ جوان' بوڑھے' عورتیں' مرد' کم سن لڑکے اور بچے۔ گاڑی کے آنے کا وقت نکل گیا۔ قریب کھڑے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ گاڑی لیٹ چل رہی ہے اور تقریباً" ایک گھنٹے بعد انبالہ شہر کے اسٹیشن پر پہنچے گی۔ پھر بھی بھیڑ میں جوش کم نہ ہوا۔ اس قدر بھیڑ کو سنبھالنے کے لئے اسٹیشن پر پولیس کے بہت سے سپاہی موجود تھے۔ ٹرین آنے سے کچھ دیر پہلے سپاہیوں نے لوگوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کیا۔ پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تقریباً" پانچ فٹ جگہ خالی کروا دی گئی اور سپاہی قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ جو بھی آگے آنے کی کوشش کرتا' پیچھے دھکیل دیا جاتا۔ گاڑی کے آتے آتے پلیٹ فارم پر دھکا پیل شروع ہو گئی۔ سپاہی لوگوں کو پیچھے دھکیلتے اور لوگ آگے کو بھاگتے۔ اتنے میں گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی۔ معلوم ہوا کہ گاندھی جی ٹرین کے اگلے حصے کے کسی تیسرے درجہ کے ڈبے میں سفر کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کا پہلے خیال تھا کہ گاندھی جی گاڑی کے پچھلے حصے میں ہوں گے' وہ آگے کی طرف دوڑے۔ گاندھی جی کے ڈبے کو خاص طور پر سپاہی گھیرے ہوئے تھے اور پولیس کا ایک بڑا افسر شاندار وردی میں موجود تھا۔ ٹرین کے پلیٹ فارم پر پہنچتے ہی نعرے بلند ہونے لگے : "مہاتما گاندھی کی جے! مہاتما گاندھی زندہ باد!" اس قدر شور برپا تھا کہ آسماں گونج رہا تھا۔ لیکن گاندھی جی کے ڈبے کا دروازہ بند رہا۔ پھر لاؤڈ اسپیکر پر کسی نے عوام کو پر سکون ہو جانے کے لئے کہا اور اعلان کیا کہ گاندھی جی آرام کر رہے ہیں۔ لوگوں نے سوچا کہ تھوڑی دیر میں وہ ضرور باہر نکلیں

گے۔ گاڑی کو پلیٹ فارم پر لگے ہوئے کوئی پندرہ منٹ گزر گئے۔ جب گاندھی جی باہر نہ نکلے تو پھر نعرے لگانے لگے : "مہاتما گاندھی کی جے!" دوبارہ لاؤڈ اسپیکر پر اسی پولیس افسر نے کہا "مہاتما گاندھی جی سو رہے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھر جائیں۔ رات بہت ہو چکی ہے۔ اس وقت انہیں جگانا مناسب نہیں۔" یہ منادی سن کر لوگ بہت ناامید ہوئے۔ کچھ لوگوں نے اور بھی زور سے نعرے لگانے شروع کئے۔ سب کو امید تھی کہ گاندھی جی گاڑی چلنے سے پہلے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک جھلک ضرور دکھائیں گے۔ جب گاندھی جی کے ڈبے کا دروازہ کھلتا تو لوگوں کو امید بندھ جاتی اور جب بند ہوتا تو ناامیدی کی لہر دوڑ جاتی۔ کچھ ہی دیر میں انجن کی سیٹی زور سے بجی اور ہری بتی دکھائی دی۔ کچھ لوگوں نے ہمت کر کے پولیس افسر کو گھیر لیا اور اس سے التجا کی کہ گاندھی جی تک ان کا پیغام پہنچایا جائے کہ لوگ بہت دور دور سے ان کے دیدار کو آئے ہیں۔ وہ فقط ایک جھلک دکھا دیں۔ پولیس افسر مسکرا کر ڈبے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اسی لمحے گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی۔ لوگوں کو شاید ابھی تک امید تھی کہ گاندھی جی کم سے کم کھڑکی کا دروازہ کھول کر باہر جھانکیں گے۔ لیکن ایسا بھی نہ ہوا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رفتار پکڑتی گئی اور چند ہی منٹوں میں پلیٹ فارم چھوڑ کر دور جاتی نظر آئی۔ کچھ دیر تک لوگوں کی حسرت بھری نگاہیں گاڑی کے پچھلے ڈبے کا تعاقب کرتی رہیں۔

آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹنے لگی۔ جو لوگ تانگے یا رکشا میں آئے تھے، انہیں بہت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ تانگے اور رکشا والے موقع کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ایک ایک تانگے پر بیس، بیس سواریاں تھیں۔ یہی حال رکشاؤں کا تھا۔ رات کے تین بجے کا وقت تھا۔ اتنے رکشا، تانگے کہاں سے آتے؟ رکشا والے مسافروں کو تسلی دے رہے تھے: "آپ فکر نہ کیجئے۔ ابھی گئے، ابھی آئے۔" کچھ لوگ پیدل ہی چل پڑے۔ سردی کا موسم تھا اور اس روز سردی بھی زور کی پڑ رہی تھی۔ گورکھ گوپال داس کے ساتھ قدم ملاتا بس اڈے کی طرف چلنے لگا۔ گوپال داس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ معلوم نہیں تھکن سے یا ناامیدی سے۔ وہ چپ تھے۔ بس اڈے پہنچ کر وہ مسافر خانے میں بینچ پر بیٹھ گئے۔ انبالہ چھاؤنی کے لئے پہلی بس کے چلنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔

بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں چھوٹے آدمیوں کی چھوٹی۔ گورکھ نے سنا تھا کہ گاندھی جی ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرتے ہیں۔ بالکل عام آدمی کی طرح۔ اسے انبالہ شہر سے گوجرے کا سفر یاد آیا اور واپسی کا بھی۔ سب سے زیادہ حیرت اسے اس بات پر تھی کہ کوئی بھی شخص اتنے شوروغل اور نعروں کے درمیان کیسے گہری نیند سو سکتا ہے؟

چند مہینے بعد سڑک پر جا بجا چپکے ہوئے پوسٹروں سے گورکھ بے خبر نہ رہ سکا۔ انگلینڈ نے جرمنی سے جنگ جیت لی تھی۔ ہٹلر نے خودکشی کر لی تھی۔ پوسٹر میں ایک جرمن سپاہی کے بم کا ٹکڑا لگ جانے سے دو حصوں میں کٹ جانے کا منظر تھا۔ جگہ جگہ اسی بات کا چرچا ہو رہا تھا کہ جرمنی جنگ ہار گیا۔

مکان کے مالک کے ایک ہی اولاد تھی۔ ایک لڑکی، جس کا نام تھا کانتا۔ اسے بہت کڑی نگرانی میں رکھا جاتا تھا۔ اسکول چھوڑنے کے لئے اور اسکول سے واپس لانے کے لئے ایک خاص نوکر تعینات تھا۔ کبھی کبھی گورکھ مکان کی سامنے والی سیڑھیوں سے اوپر چڑھتا تو وہ نظر آجاتی۔ رات کے آٹھ بجنے تک مکان کے پیچھے کا دروازہ بند کردیا جاتا اور اس کے ساتھ ہی پچھلی سیڑھیوں کا راستہ بھی بند ہوجاتا تھا۔ آگے کی سیڑھیوں کا دروازہ تقریباً" دس بجے تک کھلا رہتا۔ اس کے بعد چوکی دار سے چابی لے کر مکان میں داخلہ ہو سکتا تھا۔ چھت کی منڈیر سے نچلی منزل پر جھانکتے ہوئے بھی وہ گورکھ کو کبھی کبھی دکھائی دے جاتی۔ ہمیشہ نظریں جھکائے ہوئے، کچھ اداس چہرہ لٹکائے ہوئے۔ گورکھ نے کبھی کسی سہیلی یا اس کی ہم عمر کسی لڑکی کو اس سے ملتے جلتے یا بات کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ عمر میں وہ گورکھ سے تین چار سال بڑی ہوگی۔ مکان مالک کا کہنا تھا کہ ایک دو سال میں وہ اس کی شادی کسی اچھے امیر گھر میں کردے گا۔ پڑھنا یا نا پڑھنا، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ محض ایک شغل ہے۔

گورکھ نے کانتا کو بھی کتاب پڑھتے یا اسکول کا کام کرتے نہ دیکھا تھا۔ گورکھ کے خیال میں کانتا کے ماں باپ کا اسے اس طرح محتاج بنا کر اور تمام آزادی چھین کر رکھنا مناسب نہ تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ گورکھ کمرے کے باہر برآمدے میں کھڑا سڑک پر آمدورفت کا نظارہ کررہا تھا۔ برآمدے کا صرف ایک حصہ جو اس کے کمرے کے ساتھ لگتا تھا، اس کے والد کے پاس تھا، ورنہ برآمدہ دوسری منزل کے تمام کمروں کے باہر ایک جانب سے دوسری جانب تک چلا گیا تھا۔ گورکھ نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ کانتا برآمدے کے ایک کونے میں کھڑی اسے انگلی کے اشارے سے پاس بلا رہی ہے۔ اسے کسی بھی لڑکی سے اور خاص طور پر کانتا سے یہ امید نہ تھی۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید کانتا کو کوئی کام ہوگا، یا کوئی بھی بھاری چیز کمرے سے نکال کر باہر رکھوانی ہوگی۔ گورکھ اشارے کی طرف چل پڑا۔ جیسے ہی وہ اشارے کے قریب پہنچا اشارہ سرک کر چار قدم پیچھے ہٹ کر، کمرے کے دروازے کے اندر گم ہوگیا۔ وہ دروازے پر پہنچا تو کانتا اسے اندر بلانے لگی۔ بولی "میں نے تمہیں یہ کمرہ دکھانے کے لئے بلایا ہے۔"

گورکھ کی نگاہیں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ کمرہ واقعی خوب صورت تھا۔ سجا سجایا۔ عمدہ فرنیچر۔ کرسی میز، صوفے۔ دیواروں پر ہلکا گلابی رنگ۔ تصویریں، پردے، نقاشی اور ایک بہت بڑا، خوب صورت پلنگ۔ اسے انبالہ شہر میں اپنے کمرے اور ستو کے نانا کی بیٹھک کی یاد آئی۔ اس وقت اسے کتنا حسد تھا، کتنی جلن تھی کہ ایسی چیزیں اس کے پاس کیوں نہیں۔ لیکن اب وہ احساس ختم ہوچکا تھا۔

کمرے کا جائزہ لینے کے بعد گورکھ نے کہا "اچھا ہے۔"

"صرف اچھا ہے؟ کہو، بہت اچھا ہے۔" کانتا نے شوخی سے کہا۔

"بہت اچھا ہے۔" گورکھ نے سادگی سے اعتراف کیا۔
"تمہیں پسند ہے؟"
"میں پسند یا ناپسند کر کے کیا کروں گا؟ مجھے تمہارے کمرے سے کیا مطلب؟"
"تم تو ناراض ہو گئے۔ کبھی مجھ سے بات بھی نہیں کرتے۔"
"تمہاری ماں کہاں ہے؟"
"پڑوس میں گئی ہے۔"
"اور باقی لوگ؟"
"سنیما دیکھنے گئے ہیں۔"
"تمہاری آیا اور نوکر؟"
"آیا کی آج چھٹی ہے۔ نوکر بازار سے سامان لینے گیا ہے۔"
"اچھا' میں چلتا ہوں۔"
"تھوڑی دیر تو بیٹھو۔ چلے جانا۔"
"میری ماں تین چھوٹی بہنوں کے ساتھ نیچے کمرے میں سو رہی ہے۔ اس کی آنکھ کھل گئی تو مجھے ڈھونڈتی پھرے گی۔ اگر تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو کچھ کا کچھ سمجھ لے گی اور تمہاری مصیبت آجائے گی۔"
"دس منٹ میرے ساتھ کھیل لو۔ پھر چلے جانا۔"
گورکھ فرش پر بیٹھ گیا۔ کانتا نے کہا "فرش پر کیوں بیٹھتے ہو؟ آؤ اس پلنگ پر بیٹھو۔ چوسر کھیلیں گے تمہیں چوسر کھیلنی آتی ہے؟" گورکھ بولا "چوسر کیا بلا ہوتی ہے؟ مجھے نہیں آتی۔ میں نے اس کے بارے میں کسی کتاب میں نہیں پڑھا۔"
کانتا ہنس پڑی۔ "تم سارے دن پڑھتے رہتے ہو؟ لیکن بہت سی باتوں میں اناڑی ہو!"
"تمہیں چوسر کس نے سکھائی ہے" گورکھ نے کچھ کھسیا کر پوچھا۔
"ہمارے گھر میں سب کھیلتے ہیں۔ ماں کھیلتی ہے۔ سب رشتہ دار کھیلتے ہیں۔ میرے پتا جی کو جب بھی فرصت ملتی ہے' وہ بھی کھیلتے ہیں۔"
کانتا ایک کوڑیوں کی تھیلی اٹھا لائی۔ اس نے چوسر پلنگ پر بچھا دی اور گورکھ کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ پھر گورکھ سے کہنے لگی : "لو یہ کوڑیاں پھینکو' جیسے میں پھینکتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کوڑیاں اس کے ہاتھ پر رکھنے لگی۔ ایک بار پھر اس کی شوخی نے وار کیا!" کتنے نرم ہاتھ ہیں! لڑکیوں جیسے!"
"گورکھ نے دو یا تین بار کوڑیاں پھینکیں۔ دو تین بار کانتا نے پھینکی۔ کانتا نے اس کی بے دلی کو بھانپ لیا۔

بولی "نظریں جھکائے کیوں بیٹھے ہو؟ تمہیں اتنی شرم کیوں آ رہی ہے؟"

"مجھے یہ کھیل اچھا نہیں لگتا۔ میں چلتا ہوں۔" گورکھ صاف گوئی پر اتر آیا۔

"ایک بات بتاؤ گے؟"

"پوچھو۔"

"میں تمہیں اچھی لگتی ہوں۔ میرا مطلب ہے کیا میں خوب صورت ہوں؟"

"گورکھ نے اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا اور کہا "ہاں تم ضرور خوب صورت ہو۔ لیکن اب مجھے چلنا چاہئے۔"

"گانا سنو گے؟" گورکھ کو روکنے کا ایک اور بہانہ کانتا کو سوجھا۔

"سنا دو۔ لیکن جلدی سے سنا دو۔"

"مجھے گانا کہاں آتا ہے؟ یہ سامنے پڑی مشین دیکھ رہے ہو؟ یہی گانا گاتی ہے۔"

گورکھ قدرے تعجب سے کہنے لگا "ذرا کہو تو مشین سے گانے کو۔"

کانتا اٹھی اور ایک ریکارڈ گراموفون پر رکھ کر بولی۔ "دیکھو یہ ہینڈل آہستہ آہستہ گھماتے جاؤ اور گانا سنتے جاؤ۔"

"گورکھ نے پہلے کبھی گراموفون نہیں دیکھا تھا۔ پیتل کی دراز کپی سے گانے کی آواز نکل رہی تھی اور ریکارڈ ہینڈل گھمانے سے آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ اس نے کانتا سے کہا "یہ تو دل بہلانے کا اچھا ذریعہ ہے۔ تمہیں کسی سہیلی یا دوست کی کیا ضرورت؟ جب اکتا جاؤ گانا سن لیا کرو۔"

کانتا نے کچھ اداس نظروں سے گورکھ کو دیکھتے ہوئے کہا "میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

گورکھ نے سٹپٹا کر کہا : "نہیں، میں کیوں مذاق اڑانے لگا؟"

"آج کل تم نے آنکھوں میں کاجل لگانا کیوں چھوڑ دیا؟ پہلے لگایا کرتے تھے تو بہت اچھے لگا کرتے تھے۔"

"اچھا کل لگا لوں گا۔ تم چوری سے یا کھلے عام مجھے دیکھ لینا۔ ایک بات کہوں؟"

"کیا؟"

"مجھے تم سے مل کر اور تمہاری باتیں سن کر اچھا لگا۔"

"سچ؟"

"یہ آخری لفظ سچ فقط ایک لفظ تھا، لیکن ایک ساری کہانی کہہ گیا۔ گورکھ کو محسوس ہوا کہ یہ لفظ کانتا کے اداس دل کے اندھیرے سے نکلا تھا، وہ اندھیرا جس میں روشنی کی ایک کرن پھوٹ پڑی تھی۔

گوپال داس کو بینک میں نوکری کرتے کئی سال گذر گئے تھے، لیکن ابھی تک وہ کوئی خاص ترقی نہ کر سکے تھے۔ پھر پانچ بچوں کی پرورش کی ذمہ داری سر پر تھی۔ تنخواہ میں گزر بسر بہت کھینچ تان کے ساتھ ہوتی تھی۔ جب بنیا راشن اور گوالا دودھ دینے سے انکار کر دیتا' جب مکان مالک کرائے کے لئے تقاضے پر تقاضے کئے جاتا تو مجبوراً" وہ اپنے والد شنکر دیال کو خط لکھ دیتے۔ زمین اور جائداد تو شنکر دیال گنوا چکے تھے' لیکن جمع کیا ہوا سونا اور پرانے زیور موجود تھے۔ شنکر دیال گاؤں سے سونا اور زیور لے کر شہر پہنچے جنہیں بیچ کر تمام قرض چکا دیا جاتا۔ لیکن ایک قرض اتر جاتا تو دوسرا اسی روز شروع ہو جاتا۔ جب دوبارہ تقاضے شروع ہوتے تو گوپال داس کہتے : "کچھ تو لحاظ کیا کرو۔ ہم کیا بھاگے جا رہے ہیں؟ تمہارا پچھلا قرض چکا دیا کہ نہیں۔" یہ سلسلہ برسوں سے چل رہا تھا۔ گوپال داس کو اور کسی ذریعہ سے مالی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی شادی کے کچھ عرصے بعد جوان بیوی کو چھوڑ کر چل بسا تھا۔ ایک بہن تھی' وہ بھی خدا کو پیاری ہوئی۔ ساوتری کے والدین کی مالی حالت بھی خستہ تھی۔ اس لئے زیور بیچ کر قرض چکانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

ان ہی دنوں گورکھ نے سنا کہ والد کو کسی دوسرے بینک میں ملازمت کے لئے بلایا جا رہا ہے۔ تنخواہ بھی اچھی ہے اور عہدہ بھی۔ پھر بھی والد سوچ میں پڑے ہوئے ہیں کہ اتنے سال کی نوکری چھوڑ کر جائیں یا انکار کر دیں۔ کچھ عرصہ سے وہ اسی ادھیڑ بن میں پھنسے ہوئے ہیں۔

گورکھ کے خوابوں کی دنیا تقریباً" ویسی ہی آباد تھی جیسی کہ انبالہ شہر میں تھی یا اس کے ہوش سنبھالتے ہی وجود میں آئی تھی۔ بغیر خواب دیکھے اس کی کوئی رات بسر نہ ہوتی۔ اکثر وہ ایسے مبہم خواب دیکھتا جنہیں بیان کرنا اس کے لئے دشوار ہوتا۔ بہت سے خواب واضح ہوتے ہوئے بھی آنکھ کھلتے ہی ذہن کی گرفت سے دور ہو جاتے اور ان کا بس دھندلا سا نقش باقی رہ جاتا۔ کسی روز جب وہ بے سبب مایوسی کے غار میں گرتا اور بولنا بھی اس کے لئے دوبھر ہوتا یا کسی روز جب تھکن سے جسم چور ہوتا' تو خوابوں کا سلسلہ کچھ اور زور پکڑ لیتا۔ ان خوابوں کی نہ کوئی مخصوص شکل ہوتی' نہ پیغام' نہ مقام۔ وہ ایک دوسرے میں اتنے گڈمڈ ہوتے کہ انہیں پہچاننا مشکل ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی خواب حقیقت کی طرح نظر آتے۔ ایسا ہی ایک خواب گورکھ نے انبالہ شہر میں دیکھا تھا۔ پھر اسی طرح کا حقیقت نما خواب اسے انبالہ چھاؤنی میں نظر آیا۔ وہی عورت جو انبالہ شہر کے خواب میں حقیقی جیسی نظر آئی تھی' انبالہ چھاؤنی کے خواب میں کمرے کا بند دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ گورکھ نے محسوس کیا جیسے وہ بستر میں آنکھیں کھولے اسے اپنے بالکل قریب دیکھ رہا ہے' لیکن وہ خود بولنے کے ناقابل ہے۔ وہ عورت مسکراتی ہوئی اس کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس روز وہ مہین ململ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ گورکھ بالکل پرسکون تھا' [illegible] اپنا اس سے ملنے آیا ہو۔ آہستہ سے اس عورت کے یاقوتی لب ہلے اور وہ کہنے لگی "اپنے پتاجی سے کہو کہ [illegible] نوکری چھوڑ کر نہ جائیں۔ ان کی ترقی ہونے والی ہے۔" گورکھ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے

درخواست کرنے لگا " آپ بیٹھئے تو سہی۔ ذرا دیر رکئے۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ آرام سے چلی جایئے گا۔" لیکن وہ مسکراتی ہوئی اٹھی۔ گورکھ اس کی کمر پر بل کھاتی زلفیں اور ساڑی کا لہراتا آنچل دیکھتا رہا۔ عورت نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اور گورکھ کی نظروں سے او جھل ہو گئی۔

صبح کو جب گورکھ سو کر اٹھا تو اس نے خواب کی بات والد کو بتائی۔ گوپال داس قدرے جھنجلائے۔ "تو وقت بے وقت بس خواب ہی دیکھتا رہتا ہے۔ معلوم نہیں زندگی میں کوئی کام بھی کرے گا یا دن رات خوابوں میں ہی بسر ہوں گے۔" انہیں شاید اس لئے جھنجلاہٹ ہوئی ہو گی کہ انہوں نے نوکری چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ان کی خفگی دور کرنے کے لئے ساوتری کہنے لگی : "لڑکا کوئی جھوٹ تو بولے گا نہیں۔ اسے تو آپ کے فیصلے کے بارے میں بھی معلوم نہیں۔ اس نے خواب دیکھا ہو گا' وہی اس نے آپ کو بتا دیا۔"

دفتر پہنچتے پہنچتے گوپال داس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ دو مہینے بعد ان کی ترقی ہو گئی۔ ان کا عہدہ بھی بڑھا تنخواہ بھی اور ان کا تبادلہ شملہ ہو گیا۔

انبالہ چھاؤنی سے تبادلہ ہو جانے پر گوپال داس اکیلے ہی شملہ روانہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک گورکھ اپنی ماں، بھائی اور بہنوں کے ساتھ انبالہ چھاؤنی میں ہی مقیم رہا۔ اس دوران گھر کا کافی کام اس کے ذمہ آ پڑا۔ بازار سے سامان خرید کر لانا۔ چکی سے گیہوں پسوا کر لانا۔ کوئلے اور لکڑی کا بندوبست، سب گورکھ کو ہی کرنا پڑتا۔ جیسے ہی گوپال داس کو شملہ میں کرائے کا مکان ملا، وہ انبالہ چھاؤنی آئے۔ گھر کا سامان بکسوں میں بند ہونا شروع ہوا اور سب شملہ روانہ ہو گئے۔ کالکا سے شملہ تک ریل کا سفر گورکھ کو دلکش لگا۔ ایک خاص مقام آیا، جہاں پر ریل کی تنگ پٹڑی اوپر، نیچے اور درمیان میں ایک ساتھ نظر آتی ہے۔ آہستہ آہستہ اونچائی کی طرف بڑھتی ہوئی ریل گاڑی، پہاڑوں کے دامن میں رواں دواں جھرنے کہسار کے سینے میں بنی سرنگیں۔ وہ پہلا موقع تھا جب گورکھ نے پہاڑوں کی بلندیاں دیکھی۔ کہاں ہموار زمین اور کہاں حد نظر تک پہاڑوں کی اونچائیاں۔ دور تک پھیلے، دھندلے ہوتے پہاڑی سلسلے۔ چیڑ اور دیودار کے سدا بہار درخت۔ نسیم سحر کے جھونکے۔ کہسار کے دامن میں گرتے سفید بادلوں کے کارواں۔ پتھریلے ٹیلے اور سر اٹھائے کھڑی بلند چٹانیں، جن کی چوٹیوں پر لہراتے، ہواؤں سے سرگوشیاں کرتے بلند درخت۔ گورکھ شملہ پہنچنے سے پہلے ہی ان مناظر پر فدا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کاش والد بہت مدت تک شملہ میں ہی ٹکے رہیں اور شملہ سے ان کا جلد تبادلہ نہ ہو۔

شملہ میں کرائے کا مکان گزشتہ رہائش کے مکانوں سے زیادہ کھلا، بڑا اور صاف ستھرا تھا۔ اسے مکان نہیں فلیٹ کہنا چاہئے۔ ایک سہ منزلہ عمارت کے کئی فلیٹوں میں سے تیسری منزل کا ایک فلیٹ۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک برآمدہ، جس سے ہو کر فلیٹ کے صدر دروازے تک پہنچتے۔ دو کمرے باہم جڑے ہوئے۔ ان کے قریب رسوئی گھر اور اس کے ہمراہ اسٹور، جو لکڑی، کوئلہ اور رسوئی کا سامان رکھنے کے کام آتا۔ ایک چوتھا کمرہ فلیٹ کے برآمدے میں گھستے ہی دائیں طرف مہمانوں کے لئے بنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جو برآمدے میں کھلتا تھا۔ یعنی وہ کمرہ باقی رہنے کی جگہ سے الگ اور کٹا ہوا تھا۔ گوپال داس کی ہدایت کے مطابق گورکھ نے اپنی کتابیں اس کمرے میں سجالیں۔

کہتے ہیں کہ جگہ بدلنے سے دل بدل جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا تو نہیں، کیوں کہ انسان کی طبیعت اور مزاج جگہ کے محتاج نہیں۔ کن کن واقعات، ماحول، تجربات، حادثات، اور اتفاقات سے انسان کی شخصیت وجود میں

آتی ہے، یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن شملہ آنے سے کچھ مہینے پہلے گورکھ کا پوجا پاٹھ سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ مالا پھیرنا اور گیتا پڑھنا، سب کچھ اس نے یکایک بند کر دیا تھا۔ دھارمک کتابیں پڑھنا چھوڑ دی تھیں۔ شملہ پہنچتے پہنچتے انبالہ چھاؤنی کا کرشن کنہیا رادھا کے ساتھ، بانسری بجاتا اس کے ذہن کے تاریک گوشوں میں چھپ گیا تھا۔ اس کی بانسری کی لے خاموش ہو چکی تھی۔

گورکھ کو گورنمنٹ اسکول میں داخلہ مل گیا۔ اس وقت وہ آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔ اسکول کا ہیڈ ماسٹر پیشانی پر چندن کا قشقہ کھینچے، خم دار پگڑی باندھے، ڈھیلی پتلون پہنے، جسے وہ بار بار سینے کی جانب کھینچتا رہتا، ہر روز اسکول کھلنے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں موجود ہوتا۔ چپڑاسی کو حکم تھا کہ ہر صبح کو ایک آدھا انچ موٹی، تین سے چار فٹ تک لمبی، لچک دار، جھاڑیوں یا پیڑوں سے تازہ کاٹی ہوئی شاخ موجود ہونی چاہئے۔ اسکول کے قریب اگی جھاڑیوں اور پیڑوں کی شاخیں تقریباً" ساری کی ساری صرف ہو چکی تھیں، اس لئے چپراسی کو ہر روز نئی شاخ ڈھونڈنے، کاٹنے اور تراشنے کے لئے پہاڑیوں سے نیچے یا اوپر دور تک جانا پڑتا۔ اگر صبح کے وقت تازہ شاخ اس کے کمرے میں موجود نہ ہوتی تو چپڑاسی کی شامت آجاتی۔ وہ لچک دار شاخ اسکول بند ہوتے ہوتے بیسیوں طالب علموں کے جسموں کو چومتی چومتی دم توڑ دیتی۔ ہاتھوں کی ہتھیلی اور پشت، کولھے اور کمر پٹائی کے لئے جسم کے مناسب حصے سمجھے جاتے۔

اسکول میں داخلے کے دوسرے دن ہی گورکھ کو ہیڈ ماسٹر کی خصوصیات کا علم ہو گیا۔ وہ اپنے ایک ہم جماعت سے پوچھنے لگا : "اس کا دماغ تو خراب ہو گا نہیں کہ وہ خواہ مخواہ پٹائی کرتا پھرے۔ لڑکوں سے کوئی نہ کوئی بد تمیزی تو ہوتی ہو گی جس کی سزا انہیں ملتی ہو گی۔"

دو لڑکے اس کے چہرے کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "ابھی نئے نئے آئے ہو۔ آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ صرف پڑھائی میں ہوشیار ہونا کافی نہیں۔"

سب طالب علم ہیڈ ماسٹر سے ڈرتے تھے۔ میدان میں کھیلتے ہوئے، ایک کلاس سے دوسری کلاس کا کمرہ بدلتے ہوئے، برآمدے میں چلتے ہوئے، ہر وقت ان پر دہشت سوار رہتی تھی۔ اچھل کود، دنگا فساد، ہنسی اور قہقہے غائب تھے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر کا ڈر اسکول سے باہر لڑکوں کی طبیعت نہ بدل سکا۔ اسکول سے باہر نکلتے ہی سڑک پر خوب تو تو میں میں بھی ہوتی۔ ہاتھاپائی کی نوبت آجاتی۔ ٹولیاں بنائے لڑکے آوارہ گھومتے۔ جس دن ہیڈ ماسٹر غیر حاضر ہوتا، اسکول کا ماحول بھی بدل جاتا۔

جلد ہی کلاس کے ان چند لڑکوں سے جو لیڈر کہلاتے تھے، گورکھ کی جان پہچان ہو گئی۔ ان میں سے دو پہلوان تھے، کشتی میں ہمیشہ اول آتے تھے ایک کا نام تھا منگت رام، دوسرے کا برجو۔ ایک کبڈی میں سب سے زیادہ پھرتیلا اور چست تھا۔ دو گلی ڈنڈے کے استاد تھے۔ اور باقی دو سگریٹ کے غلام تھے۔ ان کی سگریٹ کی لت

اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ چوری چوری کلاس میں بھی سگریٹ پینے سے نہ چوکتے۔ ہمیشہ کھڑکی کے پاس بیٹھتے۔ جیسے ہی ماسٹر نے بلیک بورڈ کی طرف مونہہ پھیرا' انہوں نے کش لگایا اور دھواں کھڑکی سے باہر پھینکا۔ کئی مرتبہ پکڑے جا چکے تھے اور ہیڈ ماسٹر سے جسم پر تازہ شاخیں بھی تڑوا چکے تھے۔ کلاس کے سارے لڑکے اس ٹولی سے ڈرتے تھے۔ کسی کی بھی ہمت نہ ہوتی کہ ان کی شکایت کرے یا ان کے مونہہ لگے۔

گھر سے اسکول تقریباً" دو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ پہلے ایک گھماؤ دار سڑک کچھ اونچائی پر لے جاتی' پھر سیڑھیاں چڑھ کر دوسری اونچائی پار کر کے پگ ڈنڈی کے راستے ریل کی پٹڑی تک رسائی ہوتی۔ اس کے بعد پگ ڈنڈی کے راستے ڈھلوان اتر کر اسکول آجاتا۔ اگرچہ اسکول دور تھا' لیکن اسکول تک جانے کا راستہ پر فضا تھا۔ اس لئے گورکھ نے گھر سے اسکول تک کی دوری کبھی محسوس نہ کی۔ کبھی گورکھ کو گوتم کا ساتھ مل جاتا۔ وہ اسی کالونی میں ایک فلیٹ چھوڑ کر رہتا تھا اور چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا۔ لیکن ان کی دوستی گہری نہ ہو سکی۔ گوتم کے والد برہمن تھے۔ اور وہ اپنے کو اونچی ذات والے سمجھتے۔ گوتم بھی گورکھ سے کچھ کھنچا کھنچا سا رہتا۔ شاید والدین نے اسے گورکھ سے دور رہنے کی تاکید کی ہوگی۔ گورکھ کو خود بھی کسی سے دوستی بڑھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اگر کوئی بات کرے تو ٹھیک ہے اور نہ کرے تو تنہائی ہی اس کی سب سے عمدہ دوست ثابت ہو چکی تھی۔

"ایک روز اسکول میں آدھی چھٹی کا گھنٹہ بجا تو منگت رام گورکھ سے پوچھنے لگا : "ہمارے ساتھ چلوگے؟ ہم سب باہر جا رہے ہیں۔"

گورکھ بولا "میری ابھی تین کلاسیں باقی ہیں۔"

"منگت نے کہا "کلاسیں تو ہماری بھی باقی ہیں۔ لیکن' پھر بھی ہم سب سیر کو جا رہے ہیں۔ تم اچھی طرح سوچ لو' ہم ہر نئے مرغے کو صرف ایک موقع دیتے ہیں۔ صرف ایک بار پوچھتے ہیں' دوبارہ نہیں۔"

یکایک انبالہ شہر۔ گوجرے اور انبالہ چھاؤنی کے اسکولوں میں گزرا ہوا وقت گورکھ کی آنکھوں کے سامنے تازہ ہو اٹھا۔ وہ سب کے مذاق اور ہنسی کا مرکز بنا تھا۔ پڑھائی میں بہترین نمبروں سے پاس ہو کر بھی اسے عزت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ البتہ لیڈر لڑکوں سے سب ڈرتے تھے۔ ان کے سامنے بولنے تک کی جراءت نہیں کرتے تھے۔ ان اسکولوں میں وہ کتنا اکیلا رہ گیا تھا۔ کتنی زیادتی تھی اسکول کے لڑکوں کی کہ لیڈر لڑکوں سے ڈرتے تھے اور اس جیسے ہونہار کا مذاق اڑاتے تھے' اسے بے وجہ چھیڑتے اور تنگ کرتے تھے' اس کی چیزیں چراتے تھے' اس کا کھانا تک ہضم کر جاتے تھے۔ یہ نیا اسکول ہے۔ اگر یہاں کے لڑکوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ لیڈروں کے گروہ میں شامل ہے تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے۔ نہیں تو عین ممکن ہے کہ یہاں بھی اس کی حالت ویسی ہی ہو جیسی دوسرے اسکولوں میں ہوتی آئی ہے۔ ممکن ہے اس سے بھی کہیں بدتر ہو جائے' کیوں کہ بڑی کلاسوں کے لڑکوں کے بڑے ہتھکنڈے۔ وہ آٹھویں کلاس تک ضرور پہنچ گیا' لیکن اسے

اسکول میں لڑکوں کے ساتھ ملنا جلنا نہ آیا۔ کیوں سب نے اس کا مذاق اڑایا؟ کیوں جس کی جانب بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا، اس نے ہاتھ موڑ دیا؟

ان ہی خیالات میں ڈوبا گورکھ ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ منگت پھر بولا "یار، جواب تو دے۔ نہیں جواب دیتا تو میں چلا۔"

گورکھ نے اپنا فیصلہ سنا دیا : "ٹھیرو، میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

منگت کو شاید اس جواب کی امید نہ تھی۔ کہنے لگا "تم نے پہلا امتحان پاس کرلیا۔ پہلا امتحان یہی کہ اسکول کے وقت اسکول سے غائب رہنا اور آوارہ گردی کرنا۔"

اسکول کے سامنے کی سڑک سے چڑھائی چڑھ کر لڑکے شور و غل مچاتے، اچھلتے کودتے لوور بازار کی طرف چلے۔ گورکھ کا دائرہ اسکول سے گھر اور گھر سے اسکول تک ہی محدود تھا۔ آج اس نے نئی راہ اختیار کی تھی۔ کوئی جوان لڑکی قریب سے گزر جاتی تو ٹولی میں سے کوئی لڑکا کبھی آہستہ سے کبھی زور سے، کبھی آپس میں اور کبھی ہواؤں سے بات کرتے ہوئے کہتا : "ہائے ظالم مار گئی تیر نظر۔۔۔۔ ہو گیا دل کے پار۔" مگر کسی بھی لڑکی نے ایک نظر تک نہ پھینکی اگر پھینکی بھی تو سوچتی ہوگی کہ کتنے بدتمیز لڑکے ہیں۔ معلوم نہیں کس اسکول کے طالب علم ہیں۔ والدین اور اسکول کے ماسٹروں نے سڑک پر تہذیب سے چلنا تک نہیں سکھایا۔

بازار پہنچ کر دو لڑکوں نے سگریٹ خریدے، ایک نے جلیبی خریدی، جو سب نے بانٹ کر کھائی۔ لوور بازار سے بہت سے سیڑھیاں چڑھ کر لڑکے مال روڈ پر پہنچے۔ گورکھ نے اتنی صاف ستھری دکانیں، چوڑی سڑکیں اور صفائی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ جگہ جگہ تاکید کے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے : "گندگی پھیلانے والے پر جرمانہ یا قید بامشقت۔"

مال روڈ سے ہوتے ہوئے وہ سب ایک سنیما ہال پہنچ گئے۔ گورکھ کو یہ امید نہ تھی کہ وہ ٹولی فلم دیکھنے جا رہی ہے۔ اس کی جیب میں تو ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ ٹکٹ کہاں سے خریدے گا۔؟ وہ منگت سے مخاطب ہوا : "میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں۔"

منگت ہنس پڑا : "چپ رہ! کس نے کہا تجھ سے ٹکٹ خریدنے کو؟ دیکھتا جا، ہم کیا بندوبست کرتے ہیں۔"

سب سے نچلے درجے کے ٹکٹ کے لئے کافی بھیڑ جمع تھی۔ لوگ لمبی قطار میں کھڑکی کے سامنے پہلے سے ہی موجود تھے۔ دو لڑکوں نے حساب لگایا کہ اگر لائین کے آخر میں کھڑے ہوئے تو ٹکٹ ملنا ناممکن ہے۔ اس لئے وہ لائن سے باہر ہی ادھر ادھر گھومتے رہے۔ کبھی پکچر کے پوسٹر دیکھ لیتے، کبھی سنیما گھر کی اس دیوار کے قریب یا اس دیوار کے قریب تک ٹہل آتے، کبھی لائن میں کھڑے لوگوں کے قریب چکر کاٹتے رہے۔ جیسے جیسے شو

شروع ہونے کا وقت قریب آتا گیا' لائن اور لمبی ہوتی گئی۔ گورکھ خاموش ایک طرف کھڑا یہ انوکھا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اسے یاد آیا انبالہ شہر میں شنکر کے والد کا اسے باقاعدہ ایک سنیما گھر میں لے جانا اور آرام سے سنیما گھر کے اندر بٹھا آنا۔

اتنے میں ٹکٹ کی کھڑکی کھلی اور ٹکٹ بانٹنے والا زور سے چلایا : "اگر کھڑکی کے اندر دو ہاتھ ایک ساتھ ٹکٹ کے لئے ڈالے گئے تو میں ٹکٹ دینا بند کردوں گا۔"

ٹولی کا ایک لڑکا قطار میں چوتھے نمبر پر کھڑے شخص کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ قطار میں لگے لوگ اسے دھکا دینے لگے اور کہنے لگے "پیچھے قطار میں جاؤ۔ یہاں کہاں سے آٹپکے" اسی لمحے ٹولی کا دوسرا لڑکا آدھمکا اور کہنے لگا : "آپ لوگ بھی غضب کرتے ہیں۔ یہ تو کب سے لائن میں لگا ہے اور میں بھی اس کے ساتھ ہوں۔"

پھر تیسرا بھی آگیا اور بولا : "دیکھئے آپ کو اپنے ٹکٹ لینے ہیں تو بے شک لیں۔ آپ تو قطار میں سب سے آگے ہیں۔ آپ کو تو ٹکٹ مل ہی جائیں گے۔ اس غریب کا حق کیوں چھین رہے ہیں؟"

نتیجہ یہ کہ قطار ٹوٹ گئی اور زور آزمائی شروع ہوئی۔ دو لڑکے کھڑکی کی دیوار سے چپک کر سب سے آگے ہو گئے۔ دو لڑکے بھیڑ کے اوپر سے تیرتے کھڑکی تک پہنچ گئے۔ جو پہلے پندرہ ٹکٹ ملے اس میں سے دس ٹکٹ لڑکوں نے ہتھیا لئے۔

ٹکٹ خرید کر سب لڑکے ایک جگہ جمع ہو کر نقدی کا حساب کرنے لگے۔ گورکھ نے سوچا' کل ملا کر نو لڑکے تھے' پھر دس ٹکٹ کیوں خریدے گئے؟ شاید کسی ایک اور کا انتظار ہو گا۔ یہ راز بھی جلد ہی کھل گیا۔ کھڑکی پر ہنگامہ برپا تھا کہ کھڑکی بند ہو گئی۔ باہر بورڈ لگا دیا گیا : "ہاؤس فل" اب دو لڑکے واپس جانے والوں میں سے' جو زیادہ تر ناامید دکھائی دے رہے تھے' سودا کرنے لگے۔ انہوں نے ۵ آنے کے ۵ ٹکٹ ۱۰ آنے فی ٹکٹ کے حساب سے بیچ دئے۔ یعنی باقی پانچ ٹکٹ انہیں مفت ہاتھ لگ گئے۔ لیکن وہ نو کی تعداد میں ہیں تو پانچ ٹکٹوں میں سب کیسے سنیما دیکھ سکتے ہیں؟ ان میں سے چار کو واپس جانا ہو گا۔ گورکھ نے سوچا کہ واپس ہونے والوں میں وہ ضرور شامل ہو گا۔

ذرا دیر بعد پانچ لڑکے پانچ ٹکٹ لے کر سنیما ہال کے اندر داخل ہو گئے۔ باقی چار' جن میں گورکھ بھی شامل تھا' ہال کے دروازے سے دور ہٹ کر کھڑے رہے۔ چند منٹ میں ایک لڑکا جو سنیما ہال کے اندر گیا تھا' باہر آیا اور اپنے ہمراہ باہر کھڑے لڑکے کو ساتھ لے گیا۔ دونوں لوٹ کر دوبارہ واپس نہ آئے۔ اب وہ تین رہ گئے تھے۔ گورکھ کے ساتھ کھڑے باقی دونوں لڑکے مسکراتے رہے تھے۔

اس کے بعد ایک دوسرا لڑکا جو سنیما ہال کے اندر گیا تھا' باہر نکلا اور باہر کھڑے ایک دوسرے لڑکے کو ساتھ لے گیا۔ دونوں لوٹ کر واپس نہ آئے۔ اب وہ دو باہر رہ گئے۔ اسی طرح ایک اور لڑکا بھی رخصت ہوا' لیکن

جاتے جاتے گورکھ سے کہہ کر گیا : "یہیں رکے رہنا۔ کہیں جانا نہیں۔"

اب کی بار منگت باہر نکلا اور گورکھ کے ہاتھ میں ٹکٹ کا آدھا حصہ دے کر بولا "اگر گیٹ پر کھڑا ٹکٹ دیکھنے والا پوچھے تو یہ دکھا دینا' ورنہ سیدھے اندر چلے آنا۔ میں تمہارے پیچھے رہوں گا۔"

گورکھ دروازے پر پہنچا تو قدرے گھبرایا ہوا تھا۔ ٹکٹ دیکھنے والے نے ٹکٹ مانگا تو اس نے آدھا ٹکٹ اسے دکھایا۔ اور اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے منگت بھی اندر آگیا۔

پکچر شروع ہونے والی تھی۔ سینما کے پردے کے قریب صرف دو قطاروں میں لکڑی کے لمبے بینچ لگے ہوئے تھے' جن پر بیٹھ کر پانچ آنے کا ٹکٹ خریدنے والے فلم دیکھتے تھے۔ لڑکوں نے دوسری قطار کے بینچ پر کافی جگہ گھیری ہوئی تھی۔ پکچر شروع ہوئی۔ بینچوں پر بیٹھنے والے سیٹیاں بجاتے' شور و غل کرتے' مونگ پھلی کھاتے' جگہ جگہ مونگ پھلی کے چھلکے پھینکتے' سگریٹ بیڑی کا دھواں اڑاتے' پردے پر گانے والوں کے ساتھ آواز سے آواز ملا کر گاتے پکچر دیکھنے لگے۔ شو کے درمیان وقفے میں سب ہال سے باہر نکلے' ہیرو اور ہیروئن کی باتیں کرتے' گانوں اور کہانی کو برا بھلا کہتے رہے اور دوبارہ شو شروع ہونے تک پھر ہال میں جا بیٹھے۔ سگریٹ پینے والے لڑکے کش کھینچ کر دھوئیں کے چھلے اوپر کی طرف اڑاتے جو پردے پر گرتی روشنی میں چمک اٹھتے۔

منگت نے بھی کسی کے ہاتھ سے سلگتی بیڑی پکڑلی۔ دو کش لگا کر گورکھ سے پوچھنے لگا : "بیڑی پیو گے؟ کبھی پی ہے؟"

گورکھ نے اعتراف کیا : "نہیں۔"

منگت بولا "تو آج شروع کردو۔"

گورکھ نے کہا "تم پہلوان ہو ورزش کرتے ہو۔ اسکول میں کشتی کے چیمپین ہو۔ تمہیں بیڑی نقصان نہیں کرتی؟"

منگت نے سمجھایا : یار' دو کش لگانے سے کون مرا جاتا ہے؟ کیا نقصان ہو جائے گا؟ کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا؟"

گورکھ نے منگت کے ہاتھ سے بیڑی لے لی۔ ایک کش لگایا۔ گلے میں کچھ خارش ضرور ہوئی' لیکن اس نے دوسرا کش لگایا اور اس کے بعد تیسرا اور یوں ساری بیڑی پی ڈالی۔ منگت اس کے چہرے کی طرف تعجب سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "چھپے رستم ہو! میرا ہی الو کھینچ رہے تھے! میں بھی اڑتی چڑیا کے پر پہچانتا ہوں۔ چوری چوری پینے والوں میں ہو۔ نہیں تو نا ممکن ہے کہ یہ مجنوں جیسی شکل بن جائے۔"

گورکھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کہنے لگا اگر ایک اور بیڑی ہے تو وہ بھی پلا دو۔ اب جب پینے ہی لگا ہوں تو ذرا ٹھیک طرح نشہ میں جھوم تو لوں۔"

پکچر ختم ہوئی۔ شام ہونے کو آئی تھی۔ گورکھ پریشان تھا۔ گھر تقریباً" چار میل کے فاصلے پر تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی۔ گھر جا کر کیا جواب دے گا؟ ہو سکتا ہے والدین پوچھتے ہوئے اسکول پہنچ گئے ہوں اور اس پر طرہ یہ کہ راستہ بھی ٹھیک طرح معلوم نہ تھا۔ ایک لڑکا جو اس کے گھر سے کچھ ہی دور رہتا تھا' کہنے لگا : "گھبراؤ نہیں' میں اسی طرف رہتا ہوں۔ پگ ڈنڈی سے ہو کر راستہ جلد ہی طے ہو جائے گا۔ چلو' چلتے ہیں۔"

گورکھ گھر پہنچا تو ساوتری پریشان تھی۔ گوپال داس ابھی دفتر سے لوٹے نہیں تھے۔

"اسکول میں اتنی دیر تک کیا کرتے رہے؟ رات ہونے کو آئی۔ میری تو جان نکلی جا رہی تھی۔" ساوتری پوچھنے لگی۔"

گورکھ نے جواب دیا : "آپ تو کچھ زیادہ ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔ اسکول سے چھٹی کے بعد فٹ بال کھیل رہا تھا۔ میں فٹ بال کی ٹیم میں آگیا ہوں نا۔ ہمارا دسویں کلاس کی ٹیم سے مقابلہ ہو گا۔ فٹ بال کی ٹیم کے سارے کھلاڑی اسکول بند ہونے پر میدان میں کھیلتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی کبھی کبھی دیر ہو سکتی ہے۔" گورکھ آئندہ دیر سے آنے کی راہ بنا رہا تھا۔

ساوتری نے کہا : جس دن تمہیں دیر سے واپس آنا ہو' مجھے بتا کر جایا کرو' تاکہ فکر نہ ہو اور اتنی رات گئے آنے کا تو کوئی مطلب ہی نہیں۔ اندھیرے میں کیسے کھیلتے ہو گے؟"

گورکھ نے صفائی پیش کی : "جب اسکول سے چلا تھا تو اتنا اندھیرا نہ تھا۔ اسکول سے گھر پہنچنے میں بھی تو وقت لگتا ہے۔"

ماں سے بات کر کے گورکھ سیدھا غسل خانے کی طرف بھاگا۔ اگر ماں کو بیڑی کی ذرا سی بدبو آگئی تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔

کھانا کھا کر وہ جلدی سے لیٹ گیا۔ ساوتری کہنے لگی : "آج اسکول کا کام بھی نہیں کیا؟"

"آج اسکول میں کوئی خاص کام نہیں ملا۔ اور میں فٹ بال کھیل کر تھک گیا ہوں۔" گورکھ کا دماغ شیطان کا کارخانہ بنا ہوا تھا۔ اتنی الجھنیں' اتنے سوال' اتنے خیال دماغ میں رہ رہ کر اٹھ رہے تھے کہ ایک عجیب سا بھاری پن طبیعت پر طاری ہو گیا۔ نیند آنکھوں سے دور تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے دیر تک ساکن پڑا رہا' لیکن نہ خیالات کی رو میں کمی واقع ہوئی اور نہ نیند آئی۔ ایک عجب طرح کی بے چینی بڑھتی گئی۔ والدین' بھائی اور بہنیں' رفتہ رفتہ سب اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے اور سو گئے۔ گورکھ اندھیرے میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دن بھر کے واقعات کا جائزہ لینے لگا۔ بار بار وہی واقعات اس کی نظروں کے سامنے زندہ ہو اٹھتے۔ اسکول سے بھاگ کر آوارہ لڑکوں کے ساتھ دوستی بڑھائی۔ کتنے بدمعاش لڑکے ہیں! سنیما کے ٹکٹ بلیک میں فروخت کیے۔ دھوکے

سے سینما ہال میں گھسے۔ سڑک پر راہ چلتی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ بدتمیزیاں کرتے رہے۔ اگرچہ اس نے خود کچھ برا نہ کیا تھا' لیکن برے لوگوں کا ساتھ تو دیا۔ اور برا کیوں نہیں کیا؟ ضرور کیا۔ دکھاوے کے لئے بیڑیاں پینا کہاں تک واجب تھا۔ پھر سارا ماجرا چھپانے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا۔ آج وہ سچ مچ غلط راہ پر چل نکلا ہے۔ کل تک جو کچھ بھی کیا' معصومانہ انداز سے کیا' لیکن آج جو کیا' وہ دانستہ کیا۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ لڑکوں کی ٹولی کیا کرنے والی ہے؟ وہ تو محض اس لئے ان کے ساتھ ہو لیا تھا کہ دوسرے لڑکوں پر اس کا کچھ اثر جمے اور وہ اسے تنگ نہ کریں۔ بہت سوچنے کے بعد بھی وہ اپنے کو معاف نہ کرسکا۔ اس کا دل اسے لعنت ملامت کرتا رہا۔ وہ سوچتا رہا کہ کل سے ان لڑکوں سے دور ہی رہے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہوسکے گا؟ جو ایک بار پھنسا' وہ پھنسا۔ کل وہی لڑکے سب کے سامنے اعلان کردیں گے کہ وہ ان کی پارٹی میں شامل ہوچکا ہے اور اس نے سگریٹ پی ہے اور اس نے سینما دیکھا ہے۔

پکچر کا خیال آتے ہی اس کے خیالات ایک اور سمت میں بہنے لگے۔ کاش وہ ایک بار پھر "رتن" دیکھ سکے۔ ایک غریب لڑکے کی کہانی جو ایک امیر لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا۔ وہ عشق جو ناکام رہا۔ وہ حسن جو عشق پر قربان تو ہوا' مگر زمانے کے خلاف آواز نہ اٹھا سکا۔ کس دردناک طریقے سے دونوں ایک دوسرے پر مر مٹے۔ محبت کیا اس طرح برباد کردیتی ہے؟ کیوں ایک جواں دل میں کسی کے لئے کشش پیدا ہوتی ہے؟ کیسے اس کی تشریح ہو؟ کچھ بھی ہو' وہ کشش محض جسم کی طلب نہیں۔ وہ پاک ہے' گنگا کی طرح۔ امر ہے' خدا کے نام کی طرح' کسی کے خاص دل میں ہی یہ پاک جذبۂ محبت پیدا ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔ وہ بھی تو غریب ہے۔ وہ بھی کسی امیر لڑکی سے محبت نہ کرے گا۔

اسے پکچر دیکھنے پر کوئی ندامت نہ تھی۔ بلکہ وہ کسی حد تک ان لڑکوں کا شکر گزار تھا جنھوں نے جیب میں ایک پیسہ نہ ہوتے ہوئے بھی اسے اتنی شاندار پکچر دکھائی۔ اب پکچر کے گانے رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونجنے لگے : "مار کٹاری مرجانا۔ یہ انکھیاں کسی سے لڑانا نا" اس کا جی چاہا کہ ابھی اٹھ کھڑا ہو اور برآمدے میں جاکر پکچر کے سارے گانے زور زور سے گائے۔ اگر اسے گانا نہ آتا ہو تو بھی گائے۔ پکچر کا ایک ایک منظر اس کے تصور میں دیر تک چمکتا رہا۔ لعنت ملامت کی آواز کہیں دب کر رہ گئی۔ وہ کسی حسین غزل یا گیت کی دھن کانوں کے پردوں میں بھرے' کسی حسین منظر کے نقش دماغ میں لئے گہری نیند سو گیا۔

اگلے دن اسکول میں گورکھ کا رتبہ سچ مچ بلند ہوگیا۔ ایک ہم جولی جو اس کا اسکول میں داخلہ ہونے کے پہلے دن سے مذاق اڑاتا آیا تھا' خاموش سر لٹکائے بیٹھا رہا۔ اسکول ہوتا تو پڑھائی کے لئے ہے' مگر جو پڑھائی میں اول آئے' اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ گھوٹو ہے' رٹو طوطا ہے' کتاب کے اوراق پھاڑ کر ہضم کر جاتا ہے۔ ا

سکی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ کوئی اس کا دوست نہیں ہوتا۔ سب اس سے جلتے ہیں۔ ماسٹر "شاباش" کہے تو غصے کی لہر کلاس میں دوڑ جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی غنڈہ گردی کرے' بازوؤں کی طاقت آزمائے تو مجال ہے اس کی شان میں کوئی گستاخی کرے۔

ایک ماسٹر صاحب' جن کی کلاس سے وہ سب کل غائب تھے' کہنے لگے : جو لڑکے کل کلاس میں موجود نہیں تھے' وہ بینچ پر کھڑے ہو جائیں۔"

منگت کی ٹولی کے سب لڑکے کھڑے ہو گئے۔ گورکھ بھی کھڑا ہو گیا۔ دو لڑکے اور غیر حاضر ہوں گے۔ وہ بھی کھڑے ہو گئے۔

ماسٹر نے ایک لڑکے سے کہا "کل تم میری کلاس میں کیوں نہیں آئے؟"

لڑکے نے بہانا بنایا : "مجھے کام تھا۔ گھر جانا تھا۔"

ماسٹر نے جرح کی : "گھر سے عرضی لکھوا کر لائے ہو؟"

"جی نہیں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"بڑھاؤ ہاتھ۔" ماسٹر نے حکم دیا۔ چار بار بید لڑکے کے ہاتھ پر چلا کر ماسٹر آگے بڑھا۔

دوسرے لڑکے سے پوچھا گیا۔ اس نے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ اس کے ہاتھوں کو بھی چار بار چوٹ برداشت کرنی پڑی۔

اب منگت کی ٹولی کے ایک لڑکے کی باری تھی۔ جواب تو اس نے بھی وہی دیا جو دوسرے لڑکوں نے دیا تھا' لیکن ماسٹر نے اس کے ہاتھوں پر صرف دو وار کئے۔ ایک دائیں پر' ایک بائیں پر۔ منگت کی باری آئی تو ماسٹر نے اس کے ہاتھ پر ایک ہی وار کیا۔

گورکھ کا نمبر آیا تو اس نے جواب دیا : "مجھے بھی کام تھا۔ میں منگت کے ساتھ ہی تھا۔"

ماسٹر نے ایک بید چلا کر اسے بھی چھوڑ دیا۔ گورکھ نے سوچا : "ماسٹر ضرور منگت سے ڈرتا ہے' اس کی ٹولی کے لڑکوں سے ڈرتا ہے۔ ورنہ سب سے طاقت ور لڑکے کو سب سے کم سزا کیوں؟ پڑھائی میں سب سے نکمے لڑکے کو سب سے کم سزا کیوں؟ اس لئے کہ وہ پہلوان ہے؟"

ابھی شملہ میں آئے چند روز ہوئے تھے کہ دائیں طرف سے دو فلیٹ چھوڑ کر تیسرے فلیٹ میں رہنے والی عورت شیاما ساوتری سے ملنے آئی اور کہنے لگی : "آپ یہاں نئے نئے آئے ہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مانگنے میں ہچکچائیں نہیں"

شیاما کے تین بچے تھے۔ دو لڑکے' جو گورکھ سے عمر میں کہیں زیادہ بڑے اور تیسری لڑکی گوکل' گورکھ سے عمر میں سات سال چھوٹی۔

گوکل جتنی باتونی اور شرارتی تھی، اتنی ہی خوب صورت تھی۔ ایک کلی کی طرح ہمیشہ کھلی رہتی۔ الڑ۔ معصوم۔ سب کا دل جیت لینے والی۔ وہ اکثر گورکھ کے گھر میں گھسی رہتی۔ شیاما بھی آرام کی سانس لینے کے لئے کہتی "تھوڑی دیر کے لئے آنٹی کے گھر بھی ہو آ۔ سویرے سے تیری باتیں سن سن کر سر میں درد ہو رہا ہے۔" گوکل کہتی "میں تو اتنی اچھی باتیں کرتی ہوں کہ سر کا درد دور ہو جائے۔ آپ کے ہی ہوتا ہے میری باتیں سن کر سر درد۔ آنٹی کے تو نہیں ہوتا۔ اچھا، میں چلی"۔ اور وہ بھاگ کر گورکھ کے گھر میں گھس جاتی۔ خوب شرارتیں کرتی۔ کبھی کبھی کھانا بھی کھا لیتی! شیاما کہتی "آپ کے تین لڑکیاں ہیں۔ چلو، یہ چوتھی بھی لے لو۔ میری جان چھٹے گی۔" گوکل کہتی "ماں، یہ آپ فقط کہنے کے لئے کہتی ہو۔ میں آنٹی کے گھر میں ہوتی ہوں تب بھی آپ کا دل نہیں لگتا۔ میرے بغیر۔"

"ایک دن گوکل گورکھ کی گود میں آ بیٹھی۔ کھٹی میٹھی گولیاں کھا رہی تھی۔ کہنے لگی "مجھے چکر دو۔ وہ بھی اپنے دونوں ہاتھ چھوڑ کر۔ میں گروں گی نہیں۔" گورکھ کھڑا ہوا۔ گوکل نے اپنے دونوں بازو گورکھ کے گلے میں ڈال دیئے اور ٹانگیں کمر کے گرد لپیٹ لیں۔ بولی "اب مجھے ہاتھ مت لگانا۔ جتنی تیز مجھے گھما سکتے ہو، گھما دو۔" گورکھ چکر پر چکر لیتا رہا اور گوکل اور تیز گھومنے کی فرمائش کرتی رہی۔

چند منٹ بعد جب گورکھ کا سر گھومنے لگا تو وہ بیٹھ گیا۔ گوکل کی ٹانگیں اب بھی اس کی کمر سے لپٹی تھیں اور بازو گلے سے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اپنے چکر کا زور اتار رہی تھی۔ اس نے اپنا سر گورکھ کے شانے پر رکھ دیا تھا۔ گوکل کے گھنگھریالے بال گورکھ کے رخساروں کو چومنے لگے۔ دیر تک گوکل اسی طرح گورکھ کی گود میں بیٹھی رہی۔ گورکھ نے گوکل کو اور بھی اپنی جانب کھینچ لیا اور اس کے رخسار پر بوسہ لیا۔ گوکل دوسرا رخسار آگے کرتی ہوئی بولی "اس نے کیا قصور کیا ہے؟" کچھ دیر بعد گوکل اٹھ کھڑی ہوئی اور اچھلتی کودتی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

دو دن بعد گوکل پھر چکر لینے کی ضد کرنے لگی۔ گورکھ کی رضامندی کی پروا کئے بغیر وہ اس کی گود میں بیٹھ کر گلے سے چپک گئی۔ چکر لینے کے بعد دونوں کا سر گھوم جاتا اور گوکل دیر تک گورکھ کی آغوش میں دبکی رہتی۔ کبھی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی کبھی زمین پر لیٹ جاتی۔ کبھی کہتی "چکر رکتے ہی زمین پر کھڑا کر دینا۔ میں دیکھتی ہوں کہ میں کھڑی رہ سکتی ہوں کہ نہیں۔" کئی مرتبہ ایک دن میں دو تین بار یہی کھیل ہو جاتا۔ گورکھ ایک دو بار نہیں گوکل کے رخسار کئی بار چوم لیتا۔

ایک دن گورکھ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ گوکل اس کی کتاب چھین کر لے گئی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا تو ساوتری نے اسے ٹوکا : "اور کوئی گوکل سے زیادہ چھوٹا بچہ نہیں ملا ساتھ کھیلنے کو؟ دودھ پیتے بچوں کے ساتھ کھیلا کرو!"

گورکھ بولا "میں کیا کروں، وہ مجھے ستاتی رہتی ہے۔ دیکھو نا، میری کتاب لے کر بھاگ گئی۔"
ساوتری نے کہا "تمہیں جو بھی ملتا ہے، وہی ستاتا ہے۔ بڑے ہو رہے ہو۔ بڑوں جیسی عادتیں بھی سیکھو۔"
گوکل واپس آئی تو کہنے لگی آج میں تین بار چکر لوں گی۔ اس کے بعد کتاب واپس ہو گی۔ میں کتاب ایک جگہ چھپا آئی ہوں۔ تم ڈھونڈ نہیں سکتے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی متوالی ہنسی میں لوٹ پوٹ ہو گئی۔
گورکھ نے گوکل کو ایک بار گلے سے لگا کر گھمایا۔ دوسری بار اسے شانوں پر بٹھا کر گھمایا۔ گوکل نے گورکھ کا سر پکڑ رکھا تھا اور گورکھ نے دونوں ہاتھوں سے گردن۔ لٹکتی اس کی ٹانگیں۔
گردشیں بڑھتے بڑھتے اس قدر تیز ہو گئیں کہ فرش، چھت، دیواریں، کھڑکیاں، دروازے، سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ گورکھ بہت تیزی سے گھومنے لگا۔ گوکل کو خوف محسوس ہوا اور اس دن وہ پہلی بار چلائی : "بس! اور نہیں، اور نہیں! مجھے اتار دو!" گورکھ نے گوکل کو سر سے اتار کر گود میں بٹھالیا اور کہنے لگا "جب تک دماغ سے چکر بالکل ختم نہ ہو جائیں، ایسے ہی بیٹھی رہو۔"
شاید گوکل کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے اس سے لپٹی رہی۔ گورکھ نے گوکل کی کمر پر ہاتھ پر رکھ کر اسے اپنے اور قریب کھینچ لیا۔ چکر کم ہوئے تو دونوں رخساروں پر دو دو بوسے لئے۔ گوکل کہنے لگی "ہر روز مجھے چومتے ہو، آج میں تمہارے گال چوم لوں۔" جیسے ہی گورکھ اپنا رخسار گوکل کے لبوں کے قریب لایا، گوکل نے شرارت سے اس پر دانت گڑا دئے۔ دیر تک وہ گوکل کو سینے سے لگائے، آغوش میں لئے اس کے گھنگھریالے بالوں سے کھیلتا رہا۔
"اب تیسری بار چکر لینے کی ہمت ہے؟" گورکھ پوچھنے لگا۔
"نہیں، آج بہت چکر لے لئے۔ آج بہت مزہ آیا۔" گوکل بولی۔
گوکل دیر تک گورکھ کی آغوش میں بیٹھی اس سے لپٹی رہی، بالکل اسی طرح جیسے پہلی بار چکر لینے کی فرمائش کرتے وقت لپٹی تھی۔ گورکھ نے اس سے پوچھا "تمہارا بھائی تو مجھ سے بھی بڑا ہے۔ تمہیں مجھ سے زیادہ تیز گھما سکتا ہے۔ تم اس سے کیوں نہیں گھمانے کو کہتیں؟" "میرا بھائی میرے ساتھ کبھی نہیں کھیلتا۔ بس ڈانٹتا رہتا ہے۔" گوکل نے معصومیت سے شکایت کی۔
گورکھ اپنی بہنوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ سب سے چھوٹی بہن، جس کے پیدا ہوتے ہی وہ اسے سڑک پر ڈال آنے کی بات کہہ بیٹھا تھا، اس قدر عزیز ہو گئی تھی کہ اسے سینے سے لگائے پھرتا۔ اس کی عمر ابھی تین سال کے قریب ہو گی۔ وہ اس کے پیشاب کے گیلے کپڑے تک بدل دیتا۔
دیر تک گوکل اس کی آغوش میں اچھلتی رہی گورکھ اسے بار بار منع بھی کرتا رہا اور اس کے رخسار بھی چومتا رہا۔ گوکل کہتی : "لو اور چوم لو۔ جتنا دل کرے چوم لو۔ لیکن میں تمہارے گالوں کو ایک بار ضرور دانتوں

سے کاٹوں گی۔

گورکھ کہتا : "کیوں؟ آج کیا گھر سے کھانا نہیں کھا کر آئی؟ اپنی کھٹی میٹھی گولیوں کو کاٹتی چباتی رہ۔" گورکھ کے اتنا کہتے ہی گوکل ایک پل بھی نہ رکتی۔ اس کے گالوں پر دانت گڑا کر ہی دم لیتی۔ گورکھ کہتا : " گوکل، کاٹ لیا کر، مگر اتنی زور سے نہیں۔"

"دیکھنا، کسی دن میں اتنی زور سے کاٹوں گی کہ رو پڑو گے!" گوکل جواب دیتی۔

ایک رات حسب معمول گورکھ اپنے دل کو ٹٹولتا رہا۔ یہ گوکل کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ کہیں وہ اس کی معصومیت کا ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھا رہا ہے؟ نہیں، نہیں اس نے ایسا تو کچھ نہیں کیا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال آیا ہی کیوں؟

گوکل شرارتی ہے۔ شرارت کرنا اس کی طبیعت میں شامل ہے۔ جو بھی ہے، محض ایک کھیل ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن گوکل کا آغوش میں بے جھجک آبیٹھنا، ٹانگیں کمر کے گرد لپیٹ لینا اور بار بار اچھلتے رہنا، اس کے گال پر کاٹ لینا، اس کا بار بار گوکل کو چومنا، بار بار کھینچ کھینچ کر سینے سے لگانا۔ کہیں وہ ایک حد تو نہیں توڑ رہا ہے؟ کہیں اس کی نیت میں کھوٹ تو نہیں؟ کہیں وہ شہوت کا شکار تو نہیں ہو گیا؟ اگر نہیں تو اس کے دل کی دھڑکنیں کیوں تیز ہوتی جاتی ہیں؟ کیوں جسم میں ایک تناؤ سا محسوس ہوتا ہے؟ کیوں وہ یکایک خاموش ہو جاتا ہے؟ کیوں گوکل کو بار بار اپنی ہی جانب کھینچتا ہے؟ ضرور اس کے دل میں داغ ہے، جو نظر نہیں آرہا ہے۔ نہیں نہیں، داغ کیسا؟ ایک الہڑ بچی اس سے پیار کرتی ہے تو اس میں کیا برائی ہے؟ وہ اسے چوم لیتا ہے، وہ اس کا گال کاٹ لیتی ہے۔ اس میں کتنا بچپنا ہے! کتنی معصوم ہے وہ! کتنی بے خبر! اور کتنی خوب صورت!

بہت سوچنے کے بعد گورکھ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے گوکل سے دور ہی رہنا چاہئے۔ اسے دیر تک آغوش میں نہیں بٹھانا چاہئے۔ اس کے رخساروں کو نہیں چومنا چاہئے۔ وہ دل سے اٹھتی ایک مدھم سی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ آواز اسے سمجھا رہی تھی کہ پاک محبت کا جذبہ کہیں ناپاک نہ ہو جائے۔ جب تک دل میں اس طرح کا کوئی خیال نہ آیا۔ گوکل کو آغوش میں کیوں بٹھایا، اس کے بوسے کیوں لئے، تب تک محبت پاک تھی۔ آج جب اپنے دل میں ہی اپنی حرکتوں پر شک پیدا ہونے لگا تو ان حرکتوں کو بند کر دینا ہی واجب ہے۔ اگر گوکل ضد بھی کرتی ہے تو اسے سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہئے۔ کل سے وہ گوکل کے ساتھ نہیں کھیلے گا۔ سڑک پر ہم عمر لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈے کا کھیل کیا کافی نہیں؟ لیکن افسوس، وہ بیڈ منٹن نہیں کھیل سکتا۔ پڑوس کے کئی لڑکے بیڈ منٹن کھیلتے ہیں اور وہ پاس کھڑا انہیں حسرت سے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے پاس نہ کھیلنے کے لئے ریکٹ ہے، نہ وہ چڑی ہی خرید سکتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی لڑکا اسے چند لمحوں کے لئے اپنا ریکٹ تھما دیتا ہے، لیکن اسے کھیلنا نہیں آتا۔ ایک بار اس نے ریکٹ مار کر چڑی کے دو پر توڑ ڈالے۔ اس کے بعد کسی نے اسے ریکٹ نہ دیا۔

کاش وہ بیڈ منٹن کھیل سکتا! چڑی ایک طرف سے اڑ کر دوسری طرف اور دوسری طرف سے اڑ کر پہلی طرف جاتی ہے، اور اس کی آنکھیں چڑی پر جمی رہتی ہیں، جو دونوں جانب مار کھاتی اڑتی رہتی ہے۔ کتنا خوب صورت کھیل ہے! گوکل کو کندھے پر بٹھا کر چکر دینے سے کہیں زیادہ دل کش، کہیں زیادہ پر لطف۔

اگلے دن جب گوکل آئی تو گورکھ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ آتے ہی گوکل روز کی طرح اس کی گود میں سوار ہو گئی۔ وہ اسے دور ہٹاتا ہوا بولا۔ "دیکھتی نہیں کہ میں پڑھ رہا ہوں؟ ابھی میرے پاس تجھے چکروں میں گھمانے کے لئے وقت نہیں۔"

گوکل کا چہرہ لٹک گیا۔ وہ چلبلاہٹ، وہ ہنسی غائب ہو گئی۔ وہ آہستہ سے اٹھی، مگر قریب ہی کھڑی رہی۔ گوکل کی نظر اس پر اور اس کی نظر کتاب پر جمی تھی۔ وہ خاموش صدا سے کہہ رہی تھی : "تم بھی میرے بھائی کی طرح ڈانٹنے لگے! آج سے کٹی! میں کبھی واپس نہیں آؤں گی۔"

"گوکل چلی گئی اور کئی دن تک گورکھ کو نظر نہ آئی۔ وہ اپنی عقل کو لعنت بھیجتا رہا۔ وہ اسے پیار سے بھی سمجھا سکتا تھا۔ جو بھی ہوا، اچھا نہیں ہوا۔ دو دن بعد یہ حال ہوا کہ گورکھ ہر شام کو گوکل کا انتظار کرنے لگا۔ کاش وہ دوبارہ واپس آجائے۔ دس دن گزر گئے، لیکن گوکل نہ آئی۔ اب وہ ہر وقت بے چین رہنے لگا۔ آہ! یہ اس نے کیا کیا؟ ایک معصوم کا دل توڑ دیا۔ کتنے نازک ہیں گوکل کے ہاتھ۔ کیسی سرخ ہیں اس کی ہتھیلیاں۔ کتنی نرم اور پیاری ہیں اس کی انگلیاں۔ کتنی گول اور پتلی ہیں اس کی کلائیاں جنہیں وہ اس کے گلے میں ڈال دیتی تھی۔ جیسے تازہ پھولوں کی دو شاخیں اس کے گلے سے لگی جھوم رہی ہوں۔ ہائے وہ اس کا دبلا سا بل کھاتا جسم جو ایک خوب صورت گرہ کی طرح اس کے جسم سے لپٹ جاتا تھا۔ وہ گردشیں، وہ چکر اس کے دماغ سے ہو کر زمانے کی ہر شے میں بھر جاتے تھے جیسے دنیا کی ہر شے گردش میں ہو، اس کا اپنا وجود گردش میں ہو، زمانہ گردش میں ہو۔ ان چکروں کے زور سے بچنے کے لئے کسی کا آغوش میں ہونا ضروری ہے، کسی کے رخساروں کے قریب لب ہونے ضروری ہیں، کسی کے دل کی دھڑکنوں سے دھڑکنیں ملانا ضروری ہے۔ اس کے لئے گوکل ضروری ہے۔ اس کی ہر ادا، الھڑپن، خوب صورتی، معصومیت، سب اس کے لئے ضروری ہے۔ مکمل گوکل ضروری ہے۔ کیوں مقدر سے ملی دولت کو ٹھکرا دیا؟ کیوں اس نے محبت کی پاکیزگی کو شک کی نظر سے دیکھا؟ گوکل کی الھڑ محبت کو ٹھکرا کر گناہ ہی کمایا ہے۔

لیکن روز گورکھ کو زیادہ دیر آہیں نہیں بھرنی پڑیں۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ گوکل یکایک نظر آئی تو وہ بہشت سے اتری حسین پری سی دکھائی دی۔ گوکل نے ایک نظر اس کی طرف ناراضگی سے دیکھا۔ کہنے لگی "ابھی چلی جاؤں گی۔ میں تم سے ملنے نہیں آئی۔ آنٹی کے پاس آئی ہوں۔ تم مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟ جاؤ، اپنی کتابیں پڑھو۔"

گورکھ نے اس سے کہا تمہاری آنٹی تو سو رہی ہیں۔"
"تو پھر میں چلی۔" گوکل چلنے کو ہوئی۔
"تم ذرا سی ڈانٹ سے اس قدر ناراض ہو گئی؟ میں نے تو پیار سے ڈانٹا تھا۔"
"نہیں، تم نے غصہ سے ڈانٹا تھا۔"
"چلو، ملاپ کر لیتے ہیں۔ کیا میری یاد آئی تھی؟"
"آئی تھی۔ کئی بار چکر لینے کو دل چاہا۔"

گورکھ اس کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ گوکل جھجکتی ہوئی اس کی گود میں بیٹھ گئی۔ وہ پہلے جیسی بے تکلفی غائب تھی۔ گورکھ نے آہستہ سے اس کے رخسار چومے، دیر تک اسے آغوش میں بٹھائے رکھا، بار بار سینے سے لگایا۔

"اب غصہ اترا کہ نہیں؟" گورکھ اس کے کان کی لو سے اپنے لب ملا کر پوچھنے لگا۔
"نہیں اترا۔" گوکل نے جواب دیا "تو پھر کیسے مناؤں؟"
"مجھے اور پیار کرو۔"

"اور کتنا پیار چاہتی ہو؟" رفتہ رفتہ محبت، شہوت، معصومیت ایک دوسرے میں گھل مل کر عجیب سماں پیدا کر گئیں۔ کون سا جذبہ حاوی ہوا کہ نزدیکیاں ایک نیا انداز پیش کر گئیں۔ محبت کی پاکیزگی یکا یک ایک جھٹکے کے ساتھ گورکھ کے لباس میں سرد ھتی، اشک بار ہو اٹھی۔ وہ گوکل کی نظر سے بچتا، اسے گود سے اتار کر غسل خانے کی طرف بھاگا۔ کتنے ہی دن تک کتنی ہی بار یہ سلسلہ دہرایا گیا۔ نزدیکیاں گورکھ کے لئے اندھیرے، گوکل کے لئے چاندنی لے کر آئیں۔ وہ شہوت کے اتھاہ سمندر میں گرتا اور گوکل معصومیت کے خمار میں آسماں پر اڑتی۔ دو دلوں پر کتنا متضاد اثر ہوا۔ اس نے گوکل کی معصومیت کو دل و جاں سے عزیز سمجھا، کبھی ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جس سے اس کی معصومیت پر ناپاکیزگی کا سایہ بھی پڑے مگر ایک نامعلوم سا لطف، جس کا گوکل کو احساس ہوا، وہ گوکل کے لئے محض کھٹی میٹھی گولیاں چوس لینے سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن اس نامعلوم سے احساس نے گورکھ کو خوب لوٹا تھا۔

دو ہفتوں بعد گوکل کے والد کا تبادلہ کسی دوسرے شہر میں ہو گیا۔ آخری بار جب گوکل اس کی آغوش میں سمائی تو اس کی آنکھیں پر نم تھیں۔

"مجھے ہمیشہ یاد رکھو گے؟" اس نے رندھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
گورکھ چپ رہا۔ وہ اسے الوداع بھی نہ کہہ سکا۔

شملہ آئے ابھی چند مہینے گزرے ہوں گے کہ گورکھ کی چوتھی بہن کی پیدائش ہوئی۔ گورکھ کی دماغی حالت کچھ ویسی ہی تھی جیسی انبالہ چھاؤنی میں تیسری بہن کی پیدائش کے وقت تھی۔ کیا ضرورت تھی چوتھی بہن کی؟ مانا کہ والد کی کچھ ترقی ہوگئی ہے اور عہدہ بھی بڑھ گیا ہے' لیکن گھر کی مالی حالت ایسی کہاں سدھری؟ وہی عالم جو پہلے تھا' اب بھی ہے۔ ہر چیز میں کفایت۔ پھر بڑھتی ہوئی مہنگائی۔ گورکھ اپنے باپ کی شخصیت کا جائزہ لینے لگا۔ "ہمیشہ ماں سے بری طرح پیش آتے ہیں۔ پہلے ہی پانچ بچوں کی ذمہ داری تھی اور اب یہ چھٹا آدھمکا۔ ماں سب سے پہلے اٹھتی ہے۔ کھانا بناتی ہے۔ برتن صاف کرتی ہے۔ گھر میں کوئی نوکر موجود نہیں۔ چھوٹی بہنیں دن بھر تنگ کرتی ہیں۔ شام کو پھر کھانا پکانے کا وقت ہوجاتا ہے۔ ماں کیا مشین ہے جسے صبح سے شام تک فقط چلتے ہی رہنا ہے؟ چلنا ہی نہیں بھاگنا ہے۔ صبح سے شام تک ماں کا ناک میں دم رہتا ہے' لیکن والد کی زبان سے کبھی ماں کی تعریف نہ سنی۔ جب سنا ڈانٹتے ہی سنا۔ اگر وہ نوکری کرتے ہیں اور تنخواہ گھر لاتے ہیں تو ماں بھی کوئی گھر میں خالی تو نہیں بیٹھتی۔ اگر کھانے میں نمک زیادہ ہو تو پلیٹ پٹک دیتے ہیں۔ اگر صبح کو قمیض کا بٹن ٹوٹا ہوا ملے تو زور زور سے چلاتے ہیں۔ بچوں پر گرم ہوتے ہیں۔ ضرور دفتر میں افسروں کی ڈانٹ کھاتے ہوں گے' جس کا غصہ گھر آکر بیوی بچوں پر اتارتے ہیں۔ لیکن غصے کی بجائے پیار اور ہمدردی سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ یوں روزانہ خالی پوجاپاٹھ کا کیا فائدہ؟ اس نے اچھا کیا جو پوجاپاٹھ چھوڑ دیا۔ اسے کیا پروا' چاہے تین بھائی اور چار بہنیں اور مل جائیں۔ وہ سب سے بڑا ہے اس کی بھی کچھ ذمہ داری ہوگی۔ ماں تو ابھی سے کہتی ہے کہ وہ بڑا ہوکر گھر کی غریبی کو دور بھگادے گا۔ اچھا ہی ہے کہ انسان کسی نہ کسی بھرم میں پڑا رہے۔ اس سے زندگی چلتی رہتی ہے' ورنہ حقیقت تو بہت کڑوی ہوتی ہے۔ گاؤں میں کسان آئے دن مندر میں ماتھا رگڑتے ہیں' سجدے کرتے ہیں' منتیں مانگتے ہیں کہ اب کے سال خوب بارش ہو' کھیت میں بہت اناج پیدا ہو' بنئے کا قرض اتارنا ہے' اپنی لڑکی کی شادی کرنی ہے۔ جس سال بارش ہوتی ہے' گاؤں والے سمجھتے ہیں' دیوتا خوش ہے۔ جس سال بارش نہیں ہوتی ہے' گاؤں والے سمجھتے ہیں' دیوتا ناراض ہے۔ اپنی ناسمجھی پر سے پردہ اٹھانے کی جگہ دیوتا کی پوجا میں لگے رہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو دیوتا سے بارش کا کیا لینا دینا؟ پھر بھی کسی بھرم کا ہونا ضروری ہے' خواب بننے کے لئے' زندگی جینے کے لئے' موجودہ مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے' ایک مرکز قائم کرنے کے لئے۔ وہ مرکز جو روشن ہے' جو قیاس ہے' جو پہنچ سے دور ہے' جس کے قریب آنے کی امید بندھی رہتی ہے۔ کبھی تو اسے ہاتھ سے چھولیا جائے گا۔ اور سارے کے سارے اندھیرے روشنی میں تبدیل ہوجائیں گے۔

ایک روز کسی بات پر خفا ہوکر گوپال داس نے گورکھ کے چانٹا مارا۔ گورکھ کو ڈانٹ تو اکثر پڑتی رہتی تھی' البتہ پٹائی کم ہوتی تھی۔ گورکھ آٹھویں کلاس میں تھا۔ گوپال داس دسویں کلاس تک پڑھے تھے۔ گورکھ کے حساب کے سوال ان کی سمجھ کے باہر تھے۔ انگریزی میں وہ ضرور ٹانگ اڑاتے تھے۔ باقی مضامین گورکھ اپنے والد

سے بہتر جانتا تھا۔ اس لئے والد کی شاگردی کرتے وقت جو مار پڑتی تھی' اس کا دور ختم ہو چکا تھا۔ شرارتوں کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔ پھر بھی گورکھ کا دماغ ایجاد میں مگن رہتا تھا۔ کوئی نہ کوئی نئی بات سوچ لیتا تھا۔ جیسے ان دنوں گلی ڈنڈے کے کھیل کا اس قدر چسکا لگا تھا کہ اگر کوئی ساتھ نہ ملے تو بھی شام ڈھلے تک اکیلا ہی کھیلتا رہتا۔ کالونی میں لگی جھاڑیوں سے ہر روز شاخیں کاٹ کر گلیاں تراشتا اور شام تک تین چار گلیاں توڑ ڈالتا۔

نچلے فلیٹ میں رہنے والا پنڈت ہر روز ناراضگی ظاہر کرتا : "بڑا شیطان لڑکا ہے! ظالم نے کسی جھاڑی پر کوئی شاخ ہی نہیں چھوڑی۔ تمام شاخیں گلیاں بنا بنا کر ہوا میں اڑا دیں۔ اس دن باپ کے تھپڑ نے گورکھ کے دل میں بغاوت پیدا کر دی۔ وہ اب آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہے۔ اتنے بڑے لڑکے کو ابھی تک مار کھانی پڑتی ہے' یہ کہاں کا انصاف ہے؟ زبان سے بات نہیں ہوتی کیا؟ وہ زور سے چلایا : "خبردار جو مجھ پر ہاتھ اٹھایا!"

گوپال داس نے دو تین چانٹے اور جڑ دئے۔

گورکھ چلاتا ہوا دروازے سے باہر نکل آیا : "بہت مار کھائی' حرام زادے! اپنے مقابلے کے کسی مرد پر ہاتھ اٹھا تو تیری ہڈی پسلی برابر کر دے۔ بچوں پر ہاتھ اٹھاتا ہے' بے شرم! اگر میں نے ہاتھ اٹھالیا؟"

گوپال داس اس رویہ کے لئے تیار نہ تھے۔ انہیں کچھ اور نہ سوجھا تو گورکھ کو دھنتے چلے گئے۔ گورکھ نے ہاتھ تو نہ اٹھایا۔ لیکن پہلی مرتبہ دل کھول کر زبان درازی کی۔ "میں جا رہا ہوں گھر چھوڑ کر! مارنا سر پھر دیواروں پر۔" ہنگامہ اس قدر بڑھا کہ پڑوسی اکٹھے ہو گئے۔ کچھ لوگ گوپال داس کو سمجھانے لگے : "لڑکا بڑا ہو گیا ہے۔ آپ کو ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے' پیار سے سمجھانا چاہئے۔"

کچھ لوگ گورکھ کو سمجھانے لگے : "آخر تمہارے والد ہیں۔ تمہیں ماں باپ کو گالی نہیں دینی چاہئے۔ عزت سے پیش آنا چاہئے۔"

گورکھ غرایا : "یہ ظالم عزت کے قابل ہی نہیں۔ بہت عزت کر لی۔ یہ اسی بے عزتی کا حق دار ہے۔ مجھ سے اور مار نہیں سہی جاتی۔ بچوں میں بھی تو غیرت کا مادہ ہوتا ہے۔ عزت بڑوں ہی کی نہیں' چھوٹوں کی بھی ہوتی ہے' بلکہ چھوٹوں کی عزت بڑوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔" ایک پڑوسی کہنے لگا : ابھی آٹھویں کلاس میں پڑھتے ہو۔ کہاں جاؤ گے کیا کرو گے؟"

گورکھ نے سرکش لہجے میں جواب دیا : "میں چور یا ڈاکو بن جاؤں گا!"

یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی گورکھ کو گڑگڑا کر معافی مانگی پڑی' کیوں کہ گوپال داس نے اس سے کئی دن تک بات نہ کی۔ لیکن معافی سے گورکھ کے دل کی بغاوت کم نہ ہوئی۔ شام آئی اور رات ہوئی' مگر اسے نیند نہ آئی دن کے واقعات کے بارے میں رات بھر سوچنا اس کی عادت میں شامل ہو چکا تھا۔ بستر پر دراز ہو کر' جب سب دئے گل ہو جاتے' جب چادر یا کمبل میں لپٹا اس کا جسم ساکن ہو جاتا تو خیالات کی دوڑ تیز ہو جاتی۔ وہ ہر واقعہ' ہر

بات کا جائزہ لیتا' اس کو عقل کی ترازو پر تولتا۔ ہر بار ایک نیا رنگ' ایک نیا پہلو سامنے آتا۔ کبھی اپنی غلطی کا احساس ہوتا' کبھی زمانے کے طور طریقوں سے اس کا دل اچاٹ ہوجاتا' کبھی یہ طے کرنا مشکل ہوتا کہ ایسا کیوں ہوا' ایسا کیوں نہیں ہوا۔

اس رات گورکھ دیر تک سوچتا رہا کہ کسی کو اس سے محبت نہیں۔ کھانے پینے اور پڑھائی کا خرچ سب ہی والدین اپنی اولاد کے لئے برداشت کرتے ہیں۔ اگر والد کو اس سے محبت ہے تو وہ اس محبت کو نہیں پہچانتا۔ جب گھر میں کسی نئے بچے کی پیدائش ہوتی ہے تو ماں یہی کہتی ہے : ''کہاں سے میری قسمت میں لڑکیاں لکھی ہوئی تھیں!'' لیکن اگر وہ لڑکیاں نہ ہوتیں' بلکہ لڑکے ہوتے تو کیا ان کا خیال نہ رکھنا پڑتا؟ یا انہیں اسکول نہ بھیجنا پڑتا؟ اگر دراصل' اولاد محبت سے پیدا کی ہے تو پھر اس شکایت کی کہاں گنجائش ہے؟ خدا نے اتنے بچے دے دئے' اب وہی بیڑا پار لگائے گا۔ یعنی ایک اعتبار سے بچے بغیر رضامندی کے پیدا ہوگئے۔ اس لئے ان کو پالنا پڑے گا۔ اس رات وہ والدین کی محبت کی تعریف طے نہ کرسکا۔ ماں باپ سے گزر کر اسے بھائی کا خیال آیا' بہنوں کا خیال آیا۔ کتنے معصوم ہیں وہ سب۔ کچھ اسی کی طرح۔ کیا اسے اپنا بھائی اچھا نہیں لگتا؟ کیا اسے اپنی بہنوں سے محبت نہیں؟ ضرور ہے۔ شاید اسے سب ہی سے محبت ہے۔ لیکن اس محبت میں وہ بات نہیں جو سینما کے پردے پر دکھائی جاتی ہے۔ یہ محبت قدم قدم پر کچھ چاہتی ہے' مانگتی ہے' حساب کرتی ہے' سوال کرتی ہے' جواب چاہتی ہے۔ یہ محبت آزاد کہاں؟ یہ پنجرے میں قید پھڑپھڑاتی ہے۔ اور پنجرا تو آخر پنجرا ہے۔ سونے کا ہو یا لوہے کا۔ سینما اسکرین کی محبت آزاد ہے۔ دور وادیوں کے دامن میں سرکتے بادلوں کے کارواں کی طرح' جنہیں وہ ہر روز کھڑکی سے دیکھتا ہے' ہواؤں کی طرح جو کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف بغیر کسی کی اجازت کے بہتی ہیں۔ وہ محبت دائم ہے آفتاب کی طرح جو لاکھوں برس سے ہر صبح و شام طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ اس کے دل میں ایسی ہی آزاد محبت کا جذبہ ہے' ایسی ہی آزاد محبت کا راز ہے۔

گورکھ آسانی سے ہر نئی چیز کی طرف متوجہ ہوجاتا تھا' چاہے کچھ دور چل کر پلٹ آئے۔ عہد طفلی سے ہی اس کی طبیعت آزادی چاہتی تھی۔ وہ جدھر نظر ڈالتا رواج' گھٹن' طور طریقوں اور رسوم کی جکڑ بند دیکھتا۔ اس لئے اس کا ذہن قدرت کے آزاد نظاروں سے زیادہ متاثر ہوتا۔ اس کا جی چاہتا کہ اگر وہ انسان نہ ہوکر ایک آزاد پرندہ ہوتا اور بے روک ٹوک آسمان پر پرواز کرتا۔ ان خیالات کے ہمراہ چند لمحے بعد خیالات کی ایک اور رو اٹھتی۔ کوئی بھی بے جان یا جان دار بالکل آزاد کہاں ہے۔ زمانے نے تو خیالات پر بھی پہرہ لگا رکھا ہے۔ کبھی کبھی گورکھ کے لئے نئے تجربات حاصل کرلینے کی دھن میں اچھے برے کا فرق دھندلا جاتا۔ ایک دن اسے یکایک غلیل میں پتھر بھر کر نشانہ لگانے کی سوجھی۔ یہ شوق بغیر پیسہ خرچ کئے پورا ہوسکتا تھا۔ جھاڑیوں سے شاخیں کاٹ کر غلیاں بنانے کا تجربہ اسے پہلے سے حاصل تھا۔ اب وہ ایسی جھاڑیوں کی تلاش میں رہتا جن میں ایک موٹی شاخ

سے دو ہموار شاخیں ایک ہی زاویے پر پھوٹ رہی ہوں۔ سائیکل کی پھٹی ٹیوب وہ کباڑی کی دکان سے اٹھالایا۔ بس غلیل تیار ہوگئی۔ ایک ٹوٹتی تو دوسری بنالیتا۔ غلیل اور پتھر بستے میں رکھتا۔ جب دیکھتا' جہاں دیکھتا شاخ پر بیٹھی اکیلی چڑیا یا چڑیوں کے جھنڈ پر وار کردیتا۔ لیکن نشانہ ہمیشہ چوک جاتا۔ اس کے نشانہ باز دوست نے سمجھایا کہ پہلے کسی ساکن چیز پر نشانہ باندھو' جیسے سڑک پر بجلی کے کھمبے پر لگے بجلی کے بلب پر۔ جب کوئی بلب توڑلوگے تو چڑیا کو بھی نشانہ بنالوگے۔ یہ بالکل ناواجب کھیل تھا کہ سڑک پر رات کو روشنی کے لئے لگے بجلی کے بلبوں کو نشانہ بنایا جائے۔ لیکن چڑیا مارنے کی دھن سر پر سوار تھی۔ اسکول سے لوٹتے وقت یا اسکول جاتے وقت جب بھی سڑک سنسان پاتا' نشانہ باندھنے لگتا۔

کئی دن کی کوشش کے بعد گورکھ نے ایک بلب توڑ گرایا۔ دھائیں کی آواز سے بلب ٹوٹ کر زمین پر گرا تو گورکھ خوشی سے جھوم اٹھا۔ رفتہ رفتہ نشانہ پکا ہوتا گیا اور اس نے راہ پر لگے کافی بلب توڑ ڈالے۔ پھر بھی چڑیا پر نشانہ ناکام رہا۔ نشانے باز دوست کہنے لگا "چڑیا کو نشانہ بنانے کا شوق تمہیں ہے تو ضرور لیکن اگر نشانہ ٹھیک بیٹھا اور چڑیا مرگئی' تو بہت پچھتاؤگے۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

گورکھ نے بے پروائی سے کہا "میں کیوں پچھتانے لگا؟" کہنے کو تو اس نے کہہ دیا لیکن اسے انبالہ چھاؤنی سے دیوی کے مندر تک جانے کا سارا حال یک بیک یاد آگیا۔ شاید اس کا دوست ٹھیک کہہ رہا تھا۔ چڑیا ہو یا بکرا یا گائے' بیل' کیوں کسی بھی جانور کو انسان صرف اپنے کھیل کے لئے' شکار کے لئے' شوق کے لئے قتل کرے؟ اس لئے کہ جانور اپنا بچاؤ نہیں کرسکتے؟ یا اس لئے کہ آدمی جانور سے زیادہ عقل مند ہے؟ جانور کی موت اور مصیبت کا سبب انسان کی عقل ہی تو ہے۔ جب آدمی' آدمی کا دشمن ہے تو جانور کی تو بات ہی کیا۔ شکاری کبھی اس الجھن میں نہیں پڑتے۔ گولی مارتے ہوئے کبھی نہیں سوچتے۔ کل ہی والد اپنے ایک شکاری دوست کی بات کر رہے تھے' جس کی چودہ سالہ بیٹی نے بڑی نفاست سے شکار کئے ہوئے ہرن کی کھال اتار دی تھی۔ وہ مرغی کاٹ کر اس کے پر نوچ کر' تندور میں اتنے سلیقے سے پکاتی ہے کہ کھانے والا انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہے۔ شیر کبھی گھاس نہیں کھاتا اور ہاتھی کبھی گوشت نہیں کھاتا۔ لیکن انسان کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ ہاتھی ہے کہ شیر۔ اگر گوشت خور جانور دوسرے جانوروں کو کھانا چھوڑ دیں تو بھوکے مرجائیں۔ شاید انسان ہاتھی بھی ہے اور شیر بھی۔ گورکھ نے کل ہی مونہہ پر پٹی لٹکائے' ننگے پاؤں چلتے دو فقیر دیکھے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ جین مذہب کے سادھو تھے۔ مونہہ پر پٹی اس لئے لٹکا رکھی تھی کہ چھوٹے سے چھوٹا کیڑا یا مچھر مونہہ میں نہ چلا جائے اور انہیں اس کی موت کا سزاوار نہ بننا پڑے۔ پاؤں زمین پر اس لئے سنبھال کر رکھے تھے کہ کہیں کسی چیونٹی کی موت نہ ہوجائے۔ کافی غور کرنے کے بعد بھی گورکھ فیصلہ نہ کرسکا کہ اسے چڑیا مارنی چاہئے کہ نہیں۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک چڑیا مار کر دیکھ لے۔ اگر دل نے ملامت کی تو پھر کبھی چڑیا نہ مارے گا۔ ایک چڑیا مارنے سے کون سی

چڑیوں کی تعداد کم ہو جائے گی؟ وہ نہیں مارے گا تو بھی چڑیا کی موت ہو سکتی ہے۔ کوئی جانور جیسے کہ بلی' یا کوئی طاقت ور پرندہ' جیسے کہ باز' چڑیا کو اپنا نوالہ بنا سکتا ہے۔

مشق کرتے کرتے گورکھ کا نشانہ کافی درست ہو چلا تھا۔ اب وہ سڑک پر لگے کسی بھی بلب کو دو یا تین بار نشانہ باندھ کر توڑ سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو پہلی بار میں ہی بلب نیچے آگرتا۔ آخر ایک دن گورکھ کا نشانہ ٹھیک ایک چڑیا کے سینے میں اتر گیا۔ چڑیا پھڑپھڑاتی ہوئی شاخ سے نیچے آگری۔ کچھ دیر پر ہلاتی رہی' تڑپتی رہی۔ گورکھ نے سوچا کہ گھائل ہوئی ہے' ابھی اڑ جائے گی۔ لیکن آہستہ آہستہ چڑیا کے پر ہلنا بند ہو گئے۔ گورکھ دیر تک دعا کرتا رہا کہ چڑیا زندہ ہو جائے اور اڑ کر شاخ پر بیٹھ جائے' لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس نے سوچا' شاید چڑیا میں ابھی کچھ جان باقی ہو۔ وہ چڑیا کے قریب پہنچا اور اسے انگلی سے ذرا سا ہلایا۔ چڑیا میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ گورکھ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ اس کا دل اسے لتاڑ رہا تھا۔ واقعی اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ایک چہکتی' پھدکتی چڑیا کو مار کر اسے کیا ملا؟ خدا اس گناہ کے لئے اسے کبھی معاف نہ کرے گا۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی اسے چڑیا کا حساب چکانا ہی پڑے گا۔ اگر کوئی یکایک اسے گولی مار دے اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دے تو کیا عالم ہو گا؟ کیا وہ قاتل کو کبھی معاف کر سکے گا؟ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ اس نے بستے سے سارے گول پتھر جو چن چن کر جمع کئے تھے' باہر نکالے اور ایک ایک کر کے انہیں اپنے سر پر برسانے لگا۔ غلیل سر پر ماری تو آنکھ کے قریب خون رواں ہو گیا۔ پھر بھی اسے تسلی نہ ہوئی تو دوسری آنکھ کے قریب سے خون رواں کر لیا۔ چڑیا کو قبر میں دفنا کر وہ گھر کی جانب روانہ ہوا۔

گوپال داس کا دفتر گھر سے لگ بھگ دو میل پر تھا۔ راستہ بھی دشوار تھا۔ پہاڑیاں پار کرنی پڑتیں۔ ایک جگہ پہاڑی سڑک پینتالیس ڈگری کا زاویہ بناتی ہوئی اونچائی کی طرف بڑھتی تھی۔ گوپال داس گھر بدلنے کی سوچ رہے تھے۔ دفتر کے بالکل قریب ایک مکان کئی مہینے سے بند پڑا تھا۔ مکان بینک کی ملکیت میں شامل تھا اور بینک کا کوئی ملازم ذاتی سامان مکان میں بند کر کے کسی دوسرے شہر تبادلے پر چلا گیا تھا۔ بینک کے انگریز مینجر نے حکم جاری کیا کہ مکان کا تالا توڑ کر اس کا قبضہ گوپال داس کو دے دیا جائے۔ جو بھی سامان دوسرا ملازم چھوڑ گیا ہے' اسے سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا جائے۔ جب بھی وہ آئے' اپنا سامان لے جا سکتا ہے۔

سامان کی فہرست تیار کر دی گئی۔ گوپال داس نے گھر میں سب کو خبردار کیا کہ کسی سامان کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ گورکھ کو خاص تاکید کی گئی۔

نئے مکان میں دو کمرے' رسوئی گھر اور برآمدہ تھا۔ کمروں کے دروازے برآمدے میں کھلتے تھے۔ اور ایک کمرے کا دروازہ دوسرے کمرے میں اور دوسرے کمرے کا دروازہ رسوئی گھر میں کھلتا تھا۔ برآمدے کے ایک

گوشے میں دونوں دیواروں پر فرش سے لے کر چھت تک صاف و شفاف شیشہ لگا ہوا تھا۔ صبح کی دھوپ بے جھجک اس کنج میں داخل ہوتی اور باہر کی خنک ہوا باہر ہی رہ جاتی۔ سردیوں میں دھوپ سینکنے کا بہت لطف آتا۔ لیکن اس لطف سے بڑھ کر ایک اور بھی لطف تھا۔ مین روڈ سے نکل کر ایک تنگ سڑک ڈھلوان کی طرف چل کر ے کا ہندسہ بناتی ہوئی گھوم کر برآمدے کے عین نیچے سے گزرتی تھی۔ سڑک کے دوسری جانب ایک دو منزلہ مکان تھا' جس کی کھلی چھت برآمدے کے کسی بھی گوشے میں کھڑے ہو کر صاف نظر آتی۔ اس طرح برآمدے میں کھڑے ہونے پر دونوں گھروں کے درمیان صرف سڑک کی چوڑائی حائل رہتی تھی۔

نئے مکان میں قدم رکھے دو ہی دن گزرے تھے کہ گورکھ کی نظر چھت پر کھڑی ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ شاید نہا کر آئی تھی اور دھوپ میں کھڑی اپنے بال جھٹک جھٹک کر سکھا رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے چہرہ اوپر کی طرف اٹھایا' دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ گورکھ چند لمحے اپنی نظریں اس کے چہرے سے نہ ہٹا سکا تھا۔

نئے گھر میں آنے سے گورکھ کے لئے اسکول کا فاصلہ بھی کم ہو گیا۔ پہلے اسے چڑھائی چڑھ کر اسکول پہنچنا پڑتا تھا' اب وہ ڈھلان سے اتر کر سکول پہنچتا۔ اسکول سے بھاگ کر وہ دو نئی فلمیں دیکھ چکا تھا۔ ایک بار باقاعدہ ٹکٹ خریدا تھا اور دوسری بار یار دوستوں نے چالاکی سے اسے ہال میں گھسا دیا تھا۔ ترکیب آسان تھی۔ کم سے کم دو لڑکے ہال کے اندر باقاعدہ ٹکٹ لے کر پہنچ جائیں۔ ان میں سے ایک باہر آئے تو دونوں ٹکٹوں کے نصف حصے لے کر آئے۔ ایک اپنے باہر کھڑے دوست کو تھمادے اور دونوں ہال میں داخل ہو جائیں۔ لیکن یہ ترکیب ہر وقت نہیں چل سکتی تھی۔ کچھ گیٹ کیپر شرارتی لڑکوں کی شکل پہچاننے لگے تھے۔ ایک گیٹ کیپر کو شک ہوا تو اس نے ہال کے اندر پانچ آنے والی کلاس میں بیٹھنے والوں کی مردم شماری کروادی۔ گورکھ اور اس کے تین دوست بے عزت ہو کر ہال سے باہر نکلے۔

گورکھ کے لئے پیسہ بنانے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ سامان وزن میں کم خرید لیا۔ یا اصل سے زیادہ قیمت بتادی یا پھر اسکول کی کتابیں خریدتے وقت کچھ پیسہ بچا لیا۔ لیکن اتنا پیسہ تو سگریٹ خریدنے کے لئے بھی کافی نہ ہوتا تھا۔ اسکول کے قریب ہی پنواڑی کی دکان تھی' جس سے ادھار چلتا رہتا تھا۔ شروع شروع میں پنواڑی نے گورکھ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اتنی کم عمر میں سگریٹ نہیں پینی چاہئے۔ یہ پھیپھڑے پھونک دیتی ہے۔ لیکن سگریٹ کے کش میں جو نشہ ہے اس کا بھی تو جواب نہیں۔ اس دو پل کے نشے کے عوض اگر پھیپھڑا جلتا ہے تو جل جائے۔ مونہہ سے دھواں نکالتے وقت گورکھ اب دھوئیں کے دائرے بنا سکتا تھا' جو کچھ دور اڑ کر ہواؤں میں گھل جاتے۔ وہ سوچتا' اس کے خیال بھی ان دائروں کی طرح ہیں۔ دن بھر کے واقعات ایک دھوئیں کے دائرے کی طرح دل میں قیام کرتے ہیں' رات ہوتے ہی' بستر پر لیٹتے ہی' یہ دائرے ایک ایک کر کے باہر نکلتے ہیں' کچھ دور تک نظر آتے ہیں اور پھر کہیں لاپتہ ہو جاتے ہیں۔

سنیما اور سگریٹ کا شوق پورا کرنے کے لئے گورکھ کو پیسے کی سخت ضرورت رہتی تھی اور وہ اس فکر میں رہتا تھا کہ پیسہ کہاں سے حاصل ہو۔ ایک روز گوپال داس پوجا کر رہے تھے' ساوتری کھانا پکا رہی تھی۔ کہ گورکھ نے چپکے سے والد کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ کچھ نقدی جیب میں موجود پاکر اس نے ایک آنہ چرالیا۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی۔ شام تک یہ جاننے کی ٹوہ میں رہا کہ اس کی چوری کی خبر ہوتی ہے کہ نہیں۔ اسکول سے آکر وہ سہما سہما والد کا چہرہ پڑھتا رہا۔ جب دو دن کا وقفہ پڑ گیا تو اسے یقین ہو گیا کہ چوری کامیاب رہی۔ لہٰذا اس نے پھر ایک آنہ چرالیا۔ جب دوسری چوری نہ کھلی تو گورکھ کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ گوپال داس ریزگاری جیب میں گن کر نہیں رکھتے۔ اب وہ دو ہفتے میں پانچ آنے خرچ کر کے ایک فلم دیکھ سکتا تھا۔ سگریٹ بھی پی سکتا تھا۔ مشکل صرف اتنی تھی کہ کبھی کبھی والد کی جیب میں ریزگاری کم ہوتی' یعنی صرف چند سکے ہی موجود ہوتے۔ اگر وہ ان میں سے ایک سکہ چرالیتا تو پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ البتہ جس دن سکے زیادہ ہوتے تو دو یا تین آنے کی چوری بھی کر لیتا۔

پیسے کا سراغ ملنے کے ساتھ گورکھ کی ہوس بھی بڑھتی گئی۔ اب ایک ہی فلم وہ کئی بار دیکھ ڈالتا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہر روز فلم دیکھتا۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔ شیخ چلی کے خواب کی مانند۔

رفتہ رفتہ گورکھ کو منگت کی ٹولی کے لڑکوں کی ساری کارستانیوں کا علم ہو تا گیا۔ وہ سنیما کے ٹکٹوں کی بلیک ہی نہیں کرتے تھے بلکہ چوریاں بھی کرتے تھے۔ ایک دن وہ سب لوربازار میں گھوم رہے تھے کہ ایک لڑکا گورکھ سے کہنے لگا "سنترا' سیب' ناشپاتی' جو کہو کھلا دیتے ہیں۔ اگر تینوں چیزیں کھانی ہو تو وہ کھلا دیں گے۔ سب ایک پھل بیچنے والے کی دکان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ ایک سیب کے دام پوچھتا تو دوسرا ناشپاتی کے۔ "تنگ ہو کر دکان دار بولا "کچھ خریدنا ہے تو خریدو' نہیں تو اپنی راہ دیکھو۔" اسی ہنگامے میں ایک لڑکا کچھ پھل' جن تک ہاتھ آسانی سے پہنچ سکتا تھا' اٹھا کر کھسک لیا۔ اس چوری میں کامیاب رہنے کا گر یہ تھا کہ لڑکے اس طرح کھڑے ہو کر دام پوچھتے کہ چوری کرنے والے لڑکے کا ہاتھ دکان دار کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔ اگر دکان دار زیادہ پریشان نظر آئے تو کچھ پھل پیسے دے کر بھی خرید لو۔ اسی ترکیب سے گورکھ نے ایک قفل چرایا اور پکڑے جانے سے بال بال بچا۔

چوری کی جھجک کھلی تو گورکھ نڈر ہو کر گھر سے پیسے چرانے لگا۔ پہلے ایک یا دو آنے سے ہی تسلی ہو جاتی تھی' لیکن جب چوری بہت دن تک نہ پکڑی گئی تو اس کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ ایک بار اس نے اٹھنی اڑائی۔ اس طرح ایک فلم اور ایک ہفتے کے لئے سگریٹ کی فراہمی کا انتظام ہو گیا۔ اب فلم ایک بار دیکھنے سے طبیعت سیر نہ ہوتی' اس لئے وہ آئے دن اسکول سے بھاگ کر سنیما کے چکر لگاتا۔ کسی روز کسی وجہ سے ہال میں داخلہ نہ ہو پاتا' اس پر اداسی کی گھٹا چھا جاتی۔

ایک روز گوپال داس نے ساوتری کو کوئلہ منگانے کے لئے دو روپے کا نوٹ دیا۔ ساوتری نے نوٹ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ رات کو جب سب سوئے ہوئے تھے تو گورکھ نے وہ دو روپے کا نوٹ ماں کے کوٹ کی جیب سے نکال لیا اور اپنی کتابوں میں اسے کہیں چھپا آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ دو روپے کے نوٹ کا مطلب یہ تھا کہ وہ پانچ بار سنیما دیکھ سکتا ہے۔ مگر رات بھر ڈرتا بھی رہا۔ خدا سے دعا کرتا رہا کہ ماں صبح ہوتے ہی کوٹ کی جیب میں ہاتھ نہ ڈالے۔

اسکول کی راہ میں گورکھ نے پنواڑی سے کچھ سگریٹ خریدے اور باقی ریزگاری بستے میں رکھ لی۔ اتنی ریزگاری کو چھپا کر رکھنا بھی آسان نہ تھا۔ گورکھ کو اندیشہ تھا کہ اگر اسکول میں منگت کی ٹولی کے کسی لڑکے کی نظر

پڑ گئی تو وہ اپنے سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اگر ریزگاری ماسٹر کے ہاتھ لگی تو چوری کا الزام سر پر آسکتا ہے۔
بہت سوچ کر گورکھ سگریٹ پیتا ہوا بستہ کندھے پر لٹکائے اسکول کے باہر سڑک پر گھومتا رہا۔ دوپہر کے شو سے دو گھنٹے پہلے ہی وہ سنیما ہال میں پہنچ گیا۔ بار بار دعا کرتا رہا کہ منگت اور اس کی ٹولی کا کوئی بھی لڑکا نہ آنکلے۔ یہ بات اس نے پہلے ہی سوچ لی تھی کہ کوئی نئی فلم دیکھنے کی بجائے پرانی فلم ہی پھر دیکھ لی جائے جو کئی ہفتے سے چل رہی ہو۔ وہاں ٹکٹ بھی آسانی سے مل سکتا تھا اور کسی جانی پہچانی صورت کا سامنا ہونے کا امکان کم تھا۔ فلم دیکھ کر، چند سگریٹیں پھونک کر اور کچھ مونگ پھلی کھا کر گورکھ کے پاس ڈیڑھ روپے سے زیادہ بچ گیا۔ شو ختم ہوتے ہی گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اسے یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ ڈیڑھ روپیہ کہاں چھپایا جائے۔ جیسے جیسے گھر قریب آتا گیا، اس کی بے قراری، بڑھتی گئی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماں نے اپنا دو روپے کا نوٹ غائب پایا ہو اور وہ بے چینی سے اس کی راہ دیکھ رہی ہو۔ گھر پہنچتے ہی اگر اس کے بستے کی تلاشی لے لی گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور ایسی مار پڑے گی جو پچھلی سب ماروں کی یاد بھلا دے گی۔ کرے تو کیا کرے؟ بہت غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ریزگاری گھر میں لے کر جانا خطرناک ہوگا۔ کیوں نہ اسے کسی زمین میں دبا دیا جائے جہاں سے اسے آسانی سے نکال سکے۔

سڑک کے ایک طرف ڈھلان پر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ گورکھ کسی جھاڑی کے نیچے ریزگاری دبانے کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیکن سڑک پر آمد و رفت جاری تھی البتہ کچھ اندھیرا ضرور بڑھ چلا تھا۔ گھر قریب آرہا تھا اور گورکھ تھکا تھکا سا چل رہا تھا۔ کمر سے لٹکا بستہ جیسے بہت وزنی ہو گیا ہو۔ مین روڈ سے اتر کر وہ چھپتا ہوا گھر کی سیڑھیاں نہیں چڑھا، بلکہ سڑھیوں کے نیچے، جہاں گھر کی دیوار زمین سے اوپر اٹھتی تھی، وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ قریب ہی پڑے ایک لکڑی کے ٹکڑے سے اس نے دیوار کے ایک طرف مٹی کھود کر ساری نقدی زمین میں دبا دی۔ قریب کیاری سے کچھ گھاس لا کر کھدی ہوئی جگہ پر ڈال دی، تاکہ زمین تازہ کھدی ہوئی نہ لگے۔ پھر بستہ اٹھا کر وہ گھر میں داخل ہو ہوا۔

گورکھ کا گمان ٹھیک نکلا۔ ساوتری بہت بے چین تھی۔ دو روپے بڑی رقم تھی۔ ماں نے چھوٹتے ہی پوچھا "تم نے کہیں دو روپے کا نوٹ تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں تو۔ مجھے کیا معلوم آپ کے دو روپے کے نوٹ کے بارے میں؟" گورکھ بھولا بن گیا۔

"کل تمہارے باپ نے تمہارے سامنے ہی تو مجھے دو کا نوٹ دیا تھا اور میں نے اسے اس کوٹ کی جیب میں رکھا تھا۔ اس طرح گھر سے اور وہ بھی کوٹ کی جیب سے نوٹ کیسے گم ہو سکتا ہے؟"

والد گھر آئے اور انہیں نوٹ غائب ہونے کا پتہ چلا تو وہ ماں کو ڈانٹنے لگے : "تم کوئی چیز سنبھال کر نہیں رکھتی۔ بہت بے پرواہو۔ اب کوئلہ کہاں سے آئے گا؟ جلاؤ میرا سر اور پکاؤ روٹیاں۔"

گوپال داس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے باقاعدگی سے چھان بین شروع کی۔ انہوں نے ساوتری سے پوچھا "کیا تم دن میں کوٹ پہن کر کہیں گئیں تھیں؟"

ساوتری بولی "ہاں گئی تو تھی، مگر اس وقت مجھے نوٹ کا خیال نہیں آیا تھا۔ سوچا تھا کہ کوٹ کی جیب میں ہی ہوگا۔ میں نیچے پڑوسیوں کے گھر تک گئی تھی۔"

سیڑھیوں سے لے کر پڑوسیوں کی سڑک تک نوٹ کی تلاش کی گئی۔ ساوتری بہت پریشان تھی۔ وہ یکایک رونے لگی۔ سر پر ہاتھ مار کر کہنے لگی : "میں کیا کروں؟ میری تو قسمت ہی پھوٹی ہے!"

گورکھ سے دوبارہ پوچھا گیا۔ اس نے پھر معصومانہ انداز سے جواب دیا :

"مجھے کیا معلوم نوٹ کے بارے میں؟"

"جاؤ، اپنا بستہ لے کر آؤ" گوپال داس نے اسے حکم دیا۔

گورکھ کے بستے کی تلاشی لی گئی۔ اس کی جیب کی تلاشی لی گئی۔ گھر کی الماریوں میں ایک ایک چیز الٹ پلٹ کر دیکھی گئی، لیکن نوٹ کہیں نہ مل سکا۔

آخر یہ سوچ کر صبر کر لیا گیا کہ جب ساوتری پڑوس کے گھر گئی ہوگی تو نوٹ کسی طرح جیب سے نکل کر ہواؤں کو پیارا ہو گیا ہوگا۔ اب معلوم نہیں ہوائیں کتنی دور، کس طرف اسے اڑا کر لے گئیں اور وہ نوٹ کس خوش نصیب کے ہاتھ لگا۔

اگرچہ انبالہ چھاؤنی سے شملہ تبادلہ ہونے پر گوپال داس کچھ اونچے عہدے پر آئے تھے اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا تھا، لیکن گھر کی مالی حالت پھر بھی ابتر تھی۔ چار بہنیں، ایک بھائی اور وہ، کل ملا کر چھ بچوں کا خرچ، کھانا، پینا، کپڑے، پڑھائی۔ مشکل سے پیٹ بھرتا۔ ساوتری ہفتے میں تقریباً چھ دن آلو اور پیاز کا سالن بناتی اور کوئی دال پکالی جاتی۔ کسی کے پاس پہننے کو ڈھنگ کے کپڑے نہ تھے۔ اسی زمانے میں ایک سیاہی مائل موٹے کھدر جیسا کپڑا چلا تھا، جسے "ملیشیا" کہتے تھے۔ سب بچوں کے لئے اس کے پاجامے بنتے۔ کسی پھٹے سویٹر کے دھاگے ادھیڑ کر اور کچھ نئے دھاگے ملا کر ساوتری سویٹر بن لیتی۔ سردیوں کے موسم میں کسی بچے کے پاس پہننے کو کوٹ نہ تھا۔ ساوتری کے پاس ایک کوٹ تھا اور گوپال داس کے پاس دو۔ گورکھ کو کالے ملیشیا کا پاجامہ پہننا پسند نہ تھا۔ اسکول کے لڑکے ملیشیا پہننے والوں کا خوب مذاق اڑاتے تھے۔ جب بدن کو چیرتی برفیلی ہوائیں چلتیں، آسمان سے سفید پھول برستے تو" گورکھ ملیشیا کا پاجامہ نیچے پہن کر اس پر سفید لٹھے کا پاجامہ پہن لیتا۔ بنیان کے اوپر آدھی آستین کا سوئیٹر اور اس کے اوپر قمیض۔ اسکول میں لڑکے پوچھتے : "تجھے سردی نہیں لگتی۔ وہ جواب دیتا : "میں نے بنیان کے اوپر پشمینے کا سوئیٹر پہنا ہوا ہے اور اوپر سے قمیض، تاکہ پشمینے کو کسی کی نظر نہ لگے۔" کچھ لڑکے تو اس کی بات سن کر چپ ہو جاتے۔ لیکن کچھ شیطان کہنے لگتے "آ تیرا پشمینہ دیکھیں" اور

قمیض کے اندر ہاتھ گھسا دیتے۔ دیکھتے رنگ برنگے پرانے، چتکبرے اون سے بنا ہوا سویٹر اور خوب ہنستے۔ گورکھ بھی ان کے ساتھ ہنستا۔ بلکہ ان سے زیادہ زور سے ہنستا۔

ایک دن ساوتری اور گوپال داس کو یکایک خیال آیا کہ جوانی گزری جا رہی ہے یا گزر چکی ہے، چھ بچے پیدا ہو چکے ہیں، اس سے پہلے کہ چہرے کو جھریاں ڈھک لیں، ایک فوٹو ہی کھنچوالیں۔ ساوتری کے پاس ایک بھی ساڑی نہ تھی جسے پہن کر وہ فوٹو کھنچوالیتی۔ ساڑی بہت مہنگی چیز تھی جسے گوپال داس مہیا نہ کر سکتے تھے۔ لیکن ساڑی میں فوٹو کھنچوانا بھی ضروری تھا۔ کسی سے مانگتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ ساوتری نے بازار سے چھ گز کپڑا خریدا۔ اور بڑے سلیقے سے اس پر نیلا رنگ چڑھایا۔ رنگتے رنگتے ہاتھ بھی رنگ گئے۔ فوٹو کھچوانے سے پہلے ہاتھوں کا زنگ اتارنا ضروری تھا۔ ہفتہ بھر بعد ہاتھوں کا رنگ اترا تو ساوتری نے دو انچ چوڑا سفید گوٹا لے کر کپڑے کے تین جانب ہاتھ سے سی دیا۔ یہی وہ نایاب پہلی ساڑی تھی جسے پہن کر چھ بچوں کی پیدائش کے بعد ساوتری نے گوپال داس کے ساتھ فوٹو کھنچوایا۔

شملہ میں بہت سے دیکھنے لائق مقام تھے، جن میں وائسرائے کی کوٹھی بھی شامل تھی۔ یہ کوٹھی سال میں چند دنوں کے لئے ہی عوام کے لئے کھلتی تھی۔ گوپال داس اپنے دوست بھٹناگر کے ساتھ کوٹھی دیکھنے جا رہے تھے کہ گورکھ بھی ساتھ ہو لیا۔ کوٹھی کے انتظام کے لئے سینکڑوں کی تعداد میں ملازم تھے، وسیع کمرے، ہال، غالیچے، تصویریں، ولایتی سازو سامان، جگہ جگہ دیواروں پر لٹکے خوب صورت، مردہ جانوروں کے سر، تلواریں، نیزے، بھالے، بندوقیں، الماریاں۔ زیورات، سونا، چاندی۔ کوٹھی تھی کہ عجائب گھر! گورکھ نے پہلی مرتبہ اتنی شان و شوکت کا دیدار کیا تھا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ کوئی بھی شخص، خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اس قدر سازو سامان کا کیا کرتا ہوگا؟ پھر یہ سوال کہ واسرائے کو یہ شان و شوکت گورنمنٹ کی طرف سے مفت میں کیوں حاصل ہے؟ کوٹھی کے باہر میلوں تک پھیلے ہوئے خوب صورت پھول، پودے، فوارے، قرینے سے کٹی ہوئی ہری گھاس۔ کیا مجال کہ کہیں کوئی ایک پتہ بھی بے قاعدہ نظر آئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں مزدور اور مالی، باغ کی دیکھ بھال کے لئے تعینات۔ اس کے والد جیسے کروڑوں لوگ ایک طرف اور وائسرائے ایک طرف۔ پھر بھی وائسرے کی مالی حالت ان کروڑوں لوگوں کی مالی حالت کو ایک ساتھ جمع کر دینے کے بعد بھی بہتر ہوگی۔ گورکھ امیر، اور غریب کا فرق بخوبی پہچانتا تھا، لیکن امیر اور امیر کا فرق اس دن ہی اس کی سمجھ میں آیا۔

کوٹھی کی سجاوٹ سے چکا چوند نظریں لئے باہر نکلے تو باغ کی سجاوٹ۔ چکا چوند پیدا کر گئی۔ جگہ جگہ تاکید کے طور پر بورڈ لگے تھے: ''پھول توڑنا منع ہے۔ گھاس پر چلنا منع ہے۔''

بھٹناگر نے آنکھ بچا کر ایک گلاب کا پھول توڑ لیا۔ وہ پھول کو رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھنے کی تیاری میں تھا کہ ایک کتیا کہیں سے بھاگتی ہوئی آنکلی اور بھوں بھوں کرتی اس کی طرف لپکی۔ بھٹناگر پہلے سٹپٹایا، پھر

چٹکیاں بجا بجا کر کتیا سے مخاطب ہوا :

"ہیلو ڈاگی! ہیلو ڈاگی!" کتیا نے بھونکنا بند کیا تو وہ بولا "ہیلو جیکی! ہیلو جیکی!" کتیا بھونکنا بند کر کے دم ہلانے لگی تو اس نے کہا "ہیلو جوکی! ہیلو جوکی!" کتیا دم ہلاتی ہوئی قریب کھسک آئی تو وہ کتیا کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کتیا اسے غور سے دیکھے جا رہی تھی، جیسے پسند کر رہی ہو اور وہ "جوکی، جوکی" کی مالا جپے جا رہا تھا۔ کتیا یکایک زمین پر لوٹنے لگی۔ اس نے پنجے آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔ بھٹناگر نے اس کے پنجے سہلانے شروع کیے۔ جیسے وہ تینوں وہاں سے رخصت ہونے لگے، کتیا دم ہلاتی پیچھے پیچھے چل پڑی۔ صدر دروازے سے باہر نکلنے کے بجائے وہ سب بغل کے دروازے سے نکل کر کوٹھی سے باہر نکل گئے۔ کچھ دور جا کر بھٹناگر نے پھر چٹکیاں بجانی شروع کیں اور "جوکی، جوکی!" جپنے لگا۔ کتیا جو کچھ دور رہ گئی تھی، بھاگ کر قریب آ گئی۔ بھٹناگر نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ کتیا اس کا ہاتھ چاٹنے لگی۔ بھٹناگر کہنے لگا "بڑی اچھی نسل کی معلوم دیتی ہے۔ کتنی صاف ستھری اور صحت مند ہے۔" کچھ دور جا کر اس نے نیا پٹا خرید کر کتیا کے گلے میں ڈال دیا اور اس کی چمڑے کی ڈور تھامے گوپال داس کو الوداع کہہ کر چلتا بنا۔

اس واقع کا گورکھ کے دل پر گہرا اثر پڑا۔ کیا دنیا میں سب ہی چور ہیں؟ کوئی چھوٹا چور اور کوئی بڑا چور۔ گھر سے دو روپے کا نوٹ چرانے کا معاملہ دوسرا ہے۔ کیا اسے اپنے والدین کی غربت کا خیال نہیں؟ کیا وہ انہیں عزت اور محبت کی نظر سے نہیں دیکھتا؟ کیا گھر کی مالی حالت اور ذرا ذرا سی چیز کے لئے تنگی اس سے چھپی ہوئی ہے۔؟ پھر بھی فلم اور سگریٹ کا شوق پورا کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ وہ ضرور برائی کے غار میں گرتا جا رہا ہے؟ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے میں قطعی ناکام ہے۔ ایسی کیا چیز ہے جو اسے سینما اور سگریٹ میں الجھائے ہوئے ہے؟ وہ بارہا غور کرتا، لیکن اپنا چلن نہیں بدل سکتا تھا۔ فلم دیکھنا ضرورت میں شامل ہو چکا تھا۔ جیسے بھوک لگنے پر کھانا چاہئے اور سردی سے بچنے کے لئے جسم پر لباس ہونا چاہئے، ویسے ہی دل کو بہلانے کے لئے فلمیں چاہئیں، سگریٹ چاہئے۔

اس زمانے کی کئی فلمیں آج بھی اس کے دماغ میں تازہ ہیں، اگرچہ ان کے نقوش بہت کچھ دھندلے ہو چکے ہیں۔ "انمول گھڑی" "ڈاک بنگلہ" "پریزیڈینٹ" "مرزا صاحباں" "جگنو"۔ محبت میں شرابور داستانیں، جن کا خاتمہ عاشقوں کی موت پر ہوتا رہا۔ فلم تو وہ ایک یا دو بار دیکھتا لیکن فلم کے مناظر پردہ تخیل پر بار بار دیکھتا۔ عاشقوں کے آنسو اور آہیں اس کے ذاتی آنسوؤں اور آہوں میں تبدیل ہو جاتے۔ وہ عشق کے ایک سنہرے جال میں گرفتار ہو جاتا۔ کون کھینچ رہا ہے اس جال کی ڈور "کوئی بھی نہیں۔" جال محض قیاسی ہے، لیکن پھر بھی قطعی حقیقی ہے۔ اس کے دل و جان کیا روپہلے پردے کے عاشقوں سے کسی حالت میں کم ہیں؟ بالکل نہیں۔ بلکہ اس کے دل میں عشق کا مادہ ان عاشقوں سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ کون ہے اس کا محبوب؟ کوئی نہیں۔ محض

قیاسی' محبت کے سنہرے جال کی طرح۔ کرشن کنہیا کی طرح' جو انبالہ چھاؤنی میں اس سے بغل گیر ہو گیا تھا۔ کنہیا کی رادھا کی طرح' جس کی جھلک اس نے اپنی کھلی آنکھوں سے محسوس کی تھی۔ زمانے نے عاشقوں کے مقدر میں فقط تڑپ ہی کیوں لکھ دی؟ زمانہ محبت کا دشمن کیوں ہے؟ ذہن محبت کے سنہرے خواب کیوں بنتا رہتا ہے؟ کس کو چاہتا ہے؟ کس کو تسلیم کرتا ہے؟ کس کا دم بھرتا ہے؟ ان سوالوں کے جواب نامعلوم ہیں' لیکن جذبہ دل نہیں بدلتا۔ خیالی توسن اسی انداز سے' اسی رفتار سے اڑتے۔ ان کے پاؤں زمین کی خاک پر نہیں آسمان کے بادلوں پر ہوتے۔ اگر مطلع صاف ہوتا تو چاند اور سورج تک ان کے پاؤں کی گرد چاٹتے۔

کبھی اسے خیال آتا کہ یہ محض ایک وہم ہے۔ سیمیں طناب اسے روز بروز جکڑتے جا رہے ہیں۔ پردے پر جو بھی دکھایا جاتا ہے' محض قیاس ہے۔ حقیقت اس سے کہیں الگ ہے۔ اس نے بہت سے شوہر اور ان کی بیویاں دیکھی ہیں۔ کہاں ہے زندگی میں وہ محبت؟ ایک کھنچاؤ ہے' ایک تناؤ ہے۔ بظاہر کوئی خوش نظر نہیں آتا' روز مرہ کے جھمیلے ہیں' ضروریات ہیں' مقابلہ ہے' ضد ہے' تعصب ہے' حسد ہے' مار پیٹ ہے' یہاں تک کہ خون کی پیاسی نفرت ہے۔ کہاں ہے وہ سنہری جگمگاتی' کبھی نہ ڈگمگاتی محبت؟ کیا وہ فقط فرضی ہے؟ ایک کہانی ہے' ایک چھلاوہ ہے؟ ایک قیاس' ایک وہم' ایک قصہ ہے؟ لیلیٰ مجنوں کا زمانہ اگر ختم ہو چکا تو کچھ دن پہلے جو اس نے سنا وہ کیا تھا؟ یہ حقیقت تھی کہ ایک جوان لڑکا اور اس کی محبوبہ پہاڑی سے کود پڑے اور مر گئے' کیوں کہ ان کے والدین ان کی شادی کے خلاف تھے۔ جیسے ہیرا کم یاب ہوتا ہے مشکل سے' بہت خاک چھاننے کے بعد ملتا ہے' اسی طرح سچی محبت بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ بھی کم یاب ہے۔ ہیرا تو پھر بھی ڈھونڈنے سے مل سکتا ہے' لیکن محبت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی اور نہ خریدی جا سکتی ہے۔ یہ قدرت کا کرشمہ ہے کہ خود بخود کسی دل میں اس کی نمود ہوتی ہے۔

گورکھ ایسی ہی سچی محبت کی کہانیاں پڑھتا' ایسی ہی فلمیں دیکھتا۔ وہ درد جو عاشقوں کے دلوں میں' سینما کے پردے پر اسے محسوس ہوتا' وہ محبت' وہ ہجر اور وصال کیفیت' سب اس کو اپنے محسوس ہوتے۔ اگر محبت کا درد آنسو رلاتا تو وصل کے لمحات فلم کی ہیروئن کو اس کے سامنے لا کھڑا کرتے۔ اتنی نزدیک کہ وہ اس کے وصل کا لطف اٹھالیتا۔ اکثر وہ تصور اسے جلق یا احتلام میں مبتلا کر جاتا۔ اور یکایک اس کو اپنی تصوراتی جنت پر شک ہونے لگتا۔ شاید اس کی محبت کی بلند اڑان شہوت کے سوا اور کچھ نہیں۔ تاہم یہ اڑتا سا خیال کچھ دیر کے لئے ہی مہمان رہتا اور جلد ہی وہ اسے سنہرے خوابوں کی بلند خیالی میں سمو لیتا۔ دنیا میں کوئی چیز بغیر کوشش کے دست یاب نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ قربانی دینی ہوتی ہے۔ وہ فلم دیکھنے کے لئے کوئی بھی مصیبت سہنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن کرے تو کیا کرے؟ اگر وہ ذرا بھی والدین سے ذکر کرے اس کے لئے فلم دیکھنا ضروری ہے تو مار مار کے اسے حقیقت میں مجنوں بنا دیا جائے گا۔ وہ کہاں سے پیسہ لائے؟ جیب خرچ اسے

ملا نہیں۔ اس لئے بڑی مشکل آکھڑی ہوئی ہے۔

مکان میں جو بینک کے ملازم کا سامان پڑا تھا' وہ تیسرے کمرے کے ایک کونے میں فرش سے لے کر چھت تک بھر دیا گیا تھا۔ کئی صندوق' کئی سوٹ کیس' نفیس بستر بند تھے اور کچھ لکڑی کا سامان تھا۔ بڑے کے اوپر چھوٹا اور چھوٹے کے اوپر اور چھوٹا' اس طرح سوٹ کیس ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے تھے۔ گوپال داس کا حکم تھا کہ کوئی اس سامان کو ہاتھ نہ لگائے۔ ایک چمڑے کے سوٹ کیس کا اوپر کا حصہ کچھ اکھڑا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ سوٹ کیس پر دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے تالے لگے تھے۔ لیکن بیچ کے اکھڑے ہوئے حصے سے ہاتھ آسانی سے اندر جا سکتا تھا۔ کئی بار گورکھ کے دماغ میں خیال آیا کہ ہاتھ اندر ڈال کر دیکھا جائے کہ سوٹ کیس میں کیا ہے؟ ایک دن اس نے ہمت کر ہی ڈالی۔ اندازہ ہوا کہ سوٹ کیس میں کاغذ کتابیں اور کچھ فاونٹین پین بھرے ہوئے ہیں۔ اس نے دو فاونٹین پین باہر کھینچ لئے۔ بہت خوب صورت قلم تھے۔ وہ انہیں واپس سوٹ کیس میں رکھنے لگا تو یکایک دماغ میں خیال آیا کہ کیوں نہ انہیں بیچ کر پیسہ کمایا جائے۔ لیکن سامان مالک کے سپرد کرتے وقت اگر راز کھل گیا تو کیا ہوگا؟ اس نے دوبارہ سوٹ کیس میں ہاتھ ڈالا تو محسوس کیا کہ تقریباً" پندرہ قلم موجود ہیں۔ اگر دو لاپتہ بھی ہو جائیں تو شک کی گنجائش بہت کم ہے۔ چنانچہ اس سے وہ دونوں فاونٹین پین اسکول کے بستے میں چھپا لئے اور مال روڈ پر کسی سڑک پر پین ٹھیک کرنے والے کے ہاتھ ایک ایک روپے میں بیچ دیئے۔ پیسے ختم ہوئے تو دو پین اور نکالے اور انہیں بھی بیچ آیا۔ اس بار کافی بھاؤ تاؤ ہوا۔ گورکھ نے کہا "میں انہیں دو روپے فی پین کے حساب سے کم نہیں بیچوں گا۔ بہت عمدہ قسم کے ہیں۔

دکان دار سمجھ گیا تھا کہ چوری کا مال ہے' اس لئے گورکھ کو کم دام دینا چاہتا تھا۔ اسے ضد پر اڑا دیکھ اس نے دو روپے فی پین کے حساب سے ہی پین خرید لئے۔ اسی طرح تقریباً" ایک درجن پین سنیما کے سنہرے پردے پر قربان ہو گئے یا دھواں بن کر ہواؤں کو پیارے ہو گئے۔

ہوس بری بلا ہے۔ جتنی بجھاؤ' اتنی بڑھتی ہے۔ گورکھ کے لئے سب سے اہم کام فلم کے لئے پیسے جٹانا اور فلم دیکھنا تھا۔ باقی سب کچھ بے معنی' تھا۔ اسکول میں غیر حاضری پر مار کھا لینے میں اسے اب کوئی شرم نہ رہی تھی۔ چوری اور جھوٹ' دونوں اپنا عیب کھو بیٹھے تھے۔ گورکھ کے لئے یہی وہ سیڑھی تھی جس سے منزل پائی جا سکتی تھی۔ اور سارے راستے بند تھے۔

گھر سے تقریباً" بیس قدم کے فاصلے پر ایک ،اور رہائش کی عمارت تھی۔ وہ بھی بینک کی ملکیت میں شامل تھی اس عمارت میں رہنے والے چار چپراسیوں کے کنبے تھے۔ ان میں گورکھ کے ہم عمر یا قدرے بڑے تین لڑکے بھی شامل تھے ایک نے آٹھویں پاس کر کے اسکول چھوڑ دیا تھا' ایک نے چھٹی کلاس تک تعلیم حاصل کی

تھی اور ایک صرف چوتھی کلاس تک پڑھا تھا۔ دوستی کرتے وقت چھوٹے' بڑے یا رتبہ کا خیال گورکھ کے قریب تک نہ پھٹکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی تینوں لڑکوں سے جان پہچان ہو گئی۔ ان میں سے ایک کا نام لکھوا تھا۔ لکھوا ریوالی سنیما میں ملازم تھا اور بانسری بجاتا تھا۔ دوستی بڑھی تو گورکھ کو معلوم ہوا کہ لکھوا سنیما کا پروجیکٹر چلاتا ہے اور نئے نئے فلمی گانوں کی دھنیں بخوبی بانسری پر نکال لیتا ہے۔ بڑا درد تھا اس کی بانسری کی تان میں۔ سوز دل میں اتر جاتا تھا۔ کبھی کبھی جب لکھوا صبح یا شام کو بانسری کی تان چھیڑتا تو فضا میں دور تک پرسوز' دھن گونج اٹھتی۔ گورکھ کے دل میں انبالہ چھاؤنی کا بانسری سیکھنے کا شوق تازہ ہونے لگا۔ ایک دن وہ اسے کہنے لگا "مجھے بھی بانسری بجانا سکھادو۔"

لکھوا بولا : "سکھادوں گا۔ مگر عمدہ بانسری خریدنی پڑے گی۔ کم سے کم پانچ روپے خرچ ہوں گے۔"

کئی دن اس الجھن میں گزرا کہ بانسری پر پانچ روپے صرف کرے نہ کرے۔ جب ایک شوق بڑھ جاتا ہے تو دوسرا اس کے مقابل میں اپنے آپ ہی دم توڑ دیتا ہے یا پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اگر اس کے پاس پانچ روپے ہوں تو وہ کم سے کم ۱۵ بار روپہلے پردے کے سامنے بیٹھ سکتا ہے۔ ہال میں ٹکٹ کی در بھی کچھ بڑھ گئی ہے۔ کہاں پندرہ فلمیں اور کہاں بانسری؟ دونوں میں سے اسے فلموں کی اہمیت زیادہ محسوس ہوئی۔ پھر بھی خیال آیا کہ کتنی شان دار زندگی ہے لکھوا کی۔ ہر روز بغیر پیسے خرچ کئے نئی فلم دیکھو۔ گانے سنو اور بانسری بجاؤ۔ کیا ہوا اگر لکھوا نے پڑھائی چھوڑ دی۔ لکھوا جیسی نوکری اگر اسے ملے تو وہ بھی پڑھائی پر لعنت بھیجے۔ یہ خیال دماغ میں کوند تو گیا لیکن اسے بہت بے چین بھی کر گیا۔ لکھوا کہہ رہا تھا کہ اس نے شادی اس لئے نہیں کہ تنخواہ بہت کم ہے۔ گورکھ کو اپنے گھر کی حالت کا خیال آیا۔ زندگی میں تنگ دستی بہت بری بلا ہے۔ لیکن اگر وہ سنیما میں گیٹ کیپر کی نوکری کر لے اور اسکول بھی جاتا رہے تو کیا یہ مناسب رہے گا؟ گیٹ کیپر بھی تو ہر فلم کا لطف اٹھاتے ہیں۔ جیسے ہی لوگ ہال میں گھسے اور فلم شروع ہوئی تو وہ دروازے بند کر کے ہال کے اندر بیٹھ گئے۔ تنخواہ الگ اور ہر نئی فلم دیکھنے کو مفت میں نصیب۔ لیکن والد کیوں ماننے لگے' ماں کیوں ماننے لگی؟ اگر نوکری کرنی بھی ہو تو اسکول سے آکر رات کے شو کے لئے ہی کر سکتا ہے۔ یا صرف اتوار اور سنیچر کو کر سکتا ہے۔ والد کہیں گے؟ دماغ خراب ہو گیا ہے لڑکے کا! فلموں کا چسکا لگ گیا ہے! ابھی تک گھر میں کسی کو معلوم بھی نہیں کہ وہ فلموں کا غلام ہو چکا ہے۔ وہ تو بس یہی کہے گا کہ اس کی نوکری سے گھر میں پیسے کی تنگی کچھ کم ہو جائے گی۔ پیسے سے مدد کرنا اس کا بھی فرض ہے کیوں کہ وہ بھائی اور بہنوں میں عمر میں سب سے بڑا ہے۔ ان خیالات نے بہت زور مارا' لیکن اسے اپنے والد کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

گوپال داس کا تبادلہ لاہور ہو گیا۔ گورکھ کو عجیب سی مسرت ہوئی۔ سوچا' ادھر والد رخصت ہوئے اور ادھر اس نے کسی سنیما ہال میں گیٹ کیپر کی نوکری ڈھونڈی۔ سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ نہ چوری کرنے کی

ضرورت رہے گی' نہ جھوٹ بولنے کی۔ جو تنخواہ ملے گی' اس سے سگریٹ کا خرچ آسانی سے چل سکے گا۔ کچھ پیسے وہ ماں کو بھی لا کر دے دے گا۔

۱۹۴۷ کا زمانہ تھا۔ گورکھ نے سنا کہ والد لاہور نہیں جانا چاہتے' کیوں کہ وہاں ان کی جان کا خطرہ ہے۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہونے والا ہے۔ معلوم نہیں کہ لاہور ہندوستان میں رہے گا یا پاکستان میں۔ لوگ اس طرف سے اس طرف آ رہے ہیں۔ یہ بینک نے کیا غضب کیا کہ ایسے نازک وقت میں والد کا تبادلہ لاہور کر دیا۔ جب اس نے یہ سب باتیں سنیں تو دعائیں مانگنے لگا کہ کسی طرح تبادلہ رک جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ تبادلہ رک گیا۔ ۱۹۴۷ کا منظر گورکھ کو ابھی تک یاد ہے۔ شہر میں دنگے فساد کی وجہ سے کرفیو لگا ہوا تھا۔ کئی دنوں سے بازار بند تھے' اسکول بند تھے۔ ایک دن کچھ دیر کے لئے دن کے وقت کرفیو کھلا تو گورکھ ایک سینما ہال سے دوسرے سینما ہال کے چکر لگاتا پھرا۔ دو سینما ہال بند پڑے تھے۔ ریوالی میں ایک شو چل رہا تھا۔ فلم کا نام تھا "درد" گورکھ نے جان خطرے میں ڈال کر وہ فلم دیکھی اور یہ گانا :

افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا
آنکھوں میں رنگ بھر کے تیرے انتظار کا

گنگناتا گھر پہنچا تو والدین کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ڈانٹ کر پوچھنے لگے "کہاں گیا تھا؟"

گورکھ نے صفائی پیش کی۔ "میں ایک دوست کے گھر یہ پوچھنے گیا تھا کہ اسکول کب کھل رہا ہے؟"

فلموں نے ایسا اثر دکھایا کہ گورکھ ہر راہ چلتی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ کیا وہ اس پر جان دے سکتا ہے۔ اور دل سے ایک ہی آواز آتی : "یقیناً" پھر صدا اٹھتی کہ وہ بالکل بے وقوف ہے۔ کسی کی شکل سے عقل کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟ خوبصورتی میں ایک کشش ضرور ہے۔ پروانہ شمع پر جل مرتا ہے اور گل کی خوبصورتی رات بھر بھنورے کو زندانی بنا لیتی ہے۔ اس تجزیہ کے باوجود دل کی آواز میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ کیا وہ ہتھیلی پر دل لے کر بیچنے نکلا ہے؟ دیوانوں میں اور اس میں کیا فرق رہ گیا؟ حقیقت تو معلوم نہیں' لیکن تصور کو سہارا ابھی تو کسی حقیقت کی بنا پر ہی مل سکتا ہے' خواہ' وہ روبرو ہو کر فلم کے پردے کی طرح قیاسی ہو جائے' لیکن چند لمحوں کے لئے تخلیل میں نئے رنگ بھر جائے۔

جب بھی گورکھ برآمدے میں کھڑا ہوتا' اس کی نظریں اسی چہرے کی تلاش کرتی جیسے اس نے مکان میں قدم رکھتے ہی پہلے روز دیکھا تھا۔ بارہا وہ چہرہ دکھائی پڑ جاتا اور اسے وہ صورت بہت معصوم نظر آتی۔ اس چہرے کے بارے میں گورکھ بہت کچھ سن چکا تھا۔ البتہ اس نے کبھی نیچے کے مکان میں قدم نہ رکھا تھا۔ پڑوسی ہونے کے ناطے ساوتری ضرور ان لوگوں سے مل آئی تھی۔ مگر جان پہچان کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ اس چہرے کی کہانی تو وہ برآمدے میں کھڑا ہو کر بھی سن سکتا تھا۔ گوری کے باپ نے دوسری شادی کی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں

اور سوتیلا بھائی' دونوں اسے خوب پیٹتے۔ دن بھر وہ گھر کے کام میں مصروف رہتی' ڈانٹ سہتی' جس کی آواز گھر سے باہر بھی سنائی پڑ جاتی دور سے گوری کا چہرہ اکثر تمتمایا ہوا لگتا۔ چھت پر کپڑے سکھاتی' مسالے پیستی' یا صرف دھوپ سینکتی وہ اکثر نظر آتی۔ کتنی خوبصورت ہیں اس کے ہاتھوں کی انگلیاں جنہیں اسے ہمیشہ گھر کے کام میں مصروف رکھنا پڑتا ہے۔ عمر میں وہ اس سے ضرور بڑی ہوگی' کیوں کہ اس نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ سوتیلی ماں آگے پڑھانے کے حق میں نہ تھی۔ وہ اس کی جلد شادی کر دینا چاہتی تھی۔ گوری کا باپ گوری کی حالت سے بے خبر نہ تھا' لیکن ان کی ایک نہ چلتی تھی۔

گورکھ اکثر سوچتا رہتا کہ اگر گوری اسے کبھی سڑک پر اکیلی مل جائے تو وہ اس سے بہت ہمت سے بات کرے۔ تقریباً" دو سال سے وہ اسے چھت پر دیکھ کر قیاس کے تار جھنجھنا لیتا۔ بات تو ایک بار بھی نہیں ہوئی تھی۔ جیسے اسے گوری کا نام معلوم تھا' اس کی موجودگی کا احساس تھا اور وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا' شاید ایسا ہی گوری بھی چاہتی ہو۔ لیکن وہ کیا کرے؟ اس نے آج تک کسی لڑکی سے کبھی بات نہ کی تھی۔ اتنی جھجک اور شرم بھی مناسب نہیں۔ اگر وہ اکیلی ملے تو وہ ضرور پہل کرے گا۔ ضرور گوری کے دل میں بھی محبت کی چنگاری سلگ رہی ہوگی۔ پھر ملاقاتیں بڑھیں گی اور کبھی نہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب وہ دونوں ایک ساتھ گھومتے ہوئے دور نکل جائیں گے۔ سنسان وادیوں میں' اونچے پہاڑوں پر' کسی جھرنے کے کنارے' کہیں اندھیری گپھاؤں میں۔ اچانک گوری کا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں آجائے گا۔ اس کی خوبصورت انگلیاں اس کی انگلیوں میں پیوست ہو جائیں گی اور وہ اس کی نازک کلائی تھام کر اسے سینے سے لگا لے گا۔ گورکھ وقت بے وقت یہی خواب دیکھتا۔ لذت خواب اس قدر حقیقی ہو جاتی کہ وہ دیکھتا جیسے نیچے چھت سے اس کے برآمدے تک پل بنا ہوا ہے' جس سے ہو کر گوری اس کے برآمدے میں آکھڑی ہوئی ہے۔ یا نیچے چھت سے لے کر برآمدے تک زینہ لگا ہوا ہے۔ گوری آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی اس کے قریب آتو رہی ہے' لیکن بہت زیادہ تھک گئی ہے۔ وہ بے دم سی ہو گئی ہے' جس سے اس کا سینے کا اتار چڑھاؤ اور بھی دل کش ہو گیا ہے۔ وہ سیڑھی پر رکتی ہوئی اوپر کی طرف بڑھی آرہی ہے' لیکن زینہ دراز تریں ہو چلا ہے۔ نیچے کی طرف اور اوپر کی طرف' دور دور تک زینہ ہی زینہ۔ کبھی وہ نیچے منتظر ہے اور کبھی اوپر۔ دونوں صورتوں میں وہ گوری سے ملنا چاہتا ہے۔ اوپر سے زینے سے کود پڑتا ہے اور لڑکھڑاتا ہوا زینے سے گرتا ہے۔ نیچے سے ہانپتا ہوا اوپر کی طرف چلتا ہے تو کہیں پاؤں پھسل جاتا ہے۔ اس کے خواب ہزار منزلیں طے کر کے' ہزار رکاوٹیں پار کر کے' گوری کو اس کے قریب لا کھڑا کرتے ہیں اور وہ اسے گوکل کی طرح کھینچ کر آغوش میں بھر لیتا ہے۔

آخر ایک دن گوری سے اکیلے میں ملنے کی تمنا پوری ہو گئی۔ وہ بازار جا رہا تھا اور گوری بازار سے آرہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ گورکھ نے دور سے ہی گوری کو آتے دیکھ لیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا

کرے' کیا کہے' کیسے اسے اپنی جانب متوجہ کرے۔ وہ اسے صرف "نمستے" کہہ کر بھی مخاطب کر سکتا ہے۔ اگر اس نے کوئی جواب دیا یا سوال کیا تو گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ وہ اسے "ہیلو" کہہ کر بھی بلا سکتا ہے۔ وہ ایک سانس میں یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ اسے دو سال سے کنکھیوں سے دیکھتا آیا ہے۔ وہ اس سے یہ بھی کہہ سکتا ہے تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ لیکن اگر وہ برا مان گئی اور پاؤں سے جوتا نکال لیا؟

وہ ان ہی الجھنوں میں قدم بڑھا رہا تھا کہ فاصلہ کم ہو تا گیا' کم ہو تا گیا' یہاں تک کہ دو گز ہی رہ گیا۔ وہ سڑک کے درمیان سے ہٹ کر سڑک کے ایک کنارے کی طرف ہو لیا۔

یکایک اس نے گوری کی آواز سنی: "نمستے"

"نمستے" گورکھ نے ہڑبڑا کر کہا۔

"مجھے ایک چیز چاہیے۔ تکلیف نہ ہو تو کہوں؟"

"بتایئے۔"

"مجھے جگنو فلم کا گانا "یہاں بدلہ وفا کا بے وفا کے سوا کیا ہے۔" پورے کا پورا چاہیے۔ لکھ کر لا دیں۔"

ضرور لا دوں گا۔" گورکھ نے کہا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولا "اچھا چلتا ہوں۔"

گفتگو کے درمیان چند لمحوں کے لئے وہ گوری کے عین سامنے ساکن کھڑا تھا۔ اسے ایک تپش' ایک بدحواسی محسوس ہوئی۔ اچھا ہی ہوا کہ گوری جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ اگر ایک سوال اور کرتی تو وہ ضرور اکھڑ جاتا۔ ان چند لمحوں میں اس کی نظریں گوری کے چہرے سے پھسل کر اس کے بازوؤں اور انگلیوں پر جا ٹکیں۔ دور سے نازک اور سیڈول نظر آنے والی انگلیاں قریب سے موٹی اور کھردری دکھائی دے رہی تھیں۔ دور کی گول مچلتی بانہیں قریب سے چپٹی اور گھنا رواں لئے ہوئے تھیں۔ دور کے یاقوتی لبوں پر قریب سے ایک سیاہی مائل لکیر واضح تھی۔ پھر بھی گوری اسے خوب صورت لگی۔ گورکھ کو اپنی ہچکچاہٹ پر جھنجلاہٹ ہوئی۔ کھل کر کیوں نہ بات کی؟ کیوں دوستی بڑھانے کا ایک سبز موقع گنوا دیا؟

گورکھ نے ایک خوب صورت نیلے رنگ کے کاغذ پر وہ گانا لکھا جس کی گوری نے فرمائش کی تھی' اسے معلوم نہ تھا کہ گوری اردو پڑھ سکتی ہے کہ نہیں؟ اس لئے اس نے ایک طرف ہندی میں اور دوسری طرف اردو میں گانا لکھا۔ چار کاغذ خراب کئے۔ گانا بالکل صحیح اور خوب صورت لکھائی میں ہونا چاہیے۔ پانچ دن اسی کام میں مصروف رہا۔ لکھتا اور لکھ کر کاغذ پھاڑ ڈالتا۔ اپنی لکھائی سے تسلی نہ ہوتی۔ کسی طرح یہ مرحلہ سر ہوا تو وہ سوچنے لگا کہ دوبارہ کیسے گوری سے ملے' کس طرح اسے گانا پیش کرے۔ دو سال میں تو صرف ایک بار وہ تنہا ملی اور اب شاید دو سال اور لگیں گے کہ ویسا ہی موقع پھر ملے۔ گورکھ ہر روز شام کو نیلا کاغذ جیب میں رکھ کر سڑک پر نکل جاتا اور آوارہ گردی کے بعد لوٹ آتا۔ چار مہینے تک یہی دستور رہا۔ ایک روز جہاں پہلی ملاقات ہوئی تھی' اس کے

قریب ہی گوری اکیلی نظر آئی۔ جیسے ہی وہ پاس آئی۔ چار لب ایک ساتھ مسکرائے اور ان سے آواز ہم آہنگ ہو کر نکلی: "نمستے"۔

پھر نیلے کاغذ کے ٹکڑے کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ گوری بولی "یہ کیا ہے؟"

"بھول گئیں؟" گورکھ نے کہا۔ "فرمائش نہیں کی تھی کہ آپ کا من پسند گانا لکھ کر پیش کروں؟"

"ہاں، یاد آیا۔ میں نے ضرور کہا تھا۔ تکلیف کا شکریہ۔" گوری نے ہاتھ بڑھا کر پیچھے ہٹا لیا۔

گورکھ کاغذ ہاتھ میں تھامے بولا "اگر نہیں چاہئے تو نہ لیجئے۔"

"بہتر یہی رہے گا کہ آپ اسے اپنے پاس ہی رکھیں۔" گوری نے جھجکتے ہوئے کہا "اگر ماں یا بھائی کی نظر پڑ گیا تو مجھے بہت مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

گورکھ کاغذ جیب میں رکھتے ہوئے بولا "اچھا تو پھر چلتا ہوں۔"

"سنئے، آپ کو گانے کا شوق ہے؟ آپ گانا جانتے ہیں؟" گوری نے پوچھا۔

گورکھ نے سادگی سے جواب دیا : "مجھے گانا سننے کا شوق ضرور ہے۔ کبھی کبھی گنگنا بھی لیتا ہوں۔ لیکن میں نے باقاعدہ گانا نہیں سیکھا۔"

بات چیت کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا، لیکن نظروں کے بیان ضرور آگے بڑھے۔ جب بھی گورکھ برآمدے سے گوری کو چھت پر کھڑے دیکھتا اور نگاہیں چار ہوتیں، ایک مسکراہٹ دونوں کے لبوں پر کھیل جاتی۔

۱۹۴۸ کا زمانہ تھا۔ برصغیر کا بٹوارہ ہو گیا تھا اور پاکستان وجود میں آ چکا تھا۔ گورکھ نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ اگرچہ پڑھائی میں عام لڑکوں سے اچھا تھا، لیکن اب اس کی گنتی پہلے چند طالب علموں میں نہیں ہوتی تھی۔ لگاتار اسکول سے غیر حاضر رہ کر فلمیں دیکھنے کی وجہ سے پڑھائی کی کمی پوری ہونی ناممکن تھی۔ یہ بات خود اسے ناگوار لگتی کہ وہ پڑھائی میں پیچھے رہ گیا ہے، لیکن سیمیں پردے کی کشش پھر بھی کم نہ ہوئی۔ البتہ ڈرائینگ میں وہ پہلے سے زیادہ نمبر حاصل کر لیتا۔ ڈرائینگ کا ماسٹر کہتا : "تم بہت اچھے آرٹسٹ بن سکتے ہو۔ تمہارے ہاتھ میں ہنر ہے۔" گورکھ کو انبالہ چھاؤنی کی یاد آ جاتی۔ ماسٹر اسے نئی نئی تصویریں بنانے کو دیتا۔ اور مشق کے نتیجہ پر واہ واہ کر اٹھتا۔ اس نے گوپال داس کو ایک خط لکھا، جس میں گورکھ کی ڈرائینگ کی تعریف کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ اس خداداد نعمت کو برباد نہ ہونے دیا جائے اور گورکھ کو کسی آرٹ اسکول میں داخلہ دلوایا جائے۔ وہ ضرور آرٹ کی دنیا میں نام روشن کر سکتا ہے۔ گوپال داس نے وہ خط پڑھا تو جھنجلا کر گورکھ سے کہا "میں تمہیں سڑک کا بھیکاری نہیں بنانا چاہتا۔ خالی وقت میں جو چاہو کرو۔ مگر خبردار جو پڑھائی کی طرف سے توجہ ہٹا کر آرٹسٹ بننے کے سپنے بھی دیکھے۔"

ان ہی دنوں اسکول میں لڑکوں کو گانا سکھانے کا بندوبست کیا گیا۔ گورکھ بھی گانا سیکھنے کا شوقین تھا۔ اسکول

بند ہونے کے بعد ہفتہ میں تین دن گانا سکھایا جانے لگا۔ انتظام کوئی خاص نہ تھا۔ دو ہار مونیم' ایک طبلہ' ایک سکھانے والا اور تقریباً" دس لڑکے سیکھنے والے۔ گوری نے ایک بار گورکھ سے گانے کی فرمائش کی تھی' اس لئے گورکھ بھی گانا سیکھنے والوں میں شامل ہو گیا۔ پہلے دو ہفتوں میں دو لڑکے گانے کی کلاس چھوڑ کر چلے گئے۔ منگت گورکھ کا مذاق اڑانے لگا : "یہ لڑکیوں والا کام بہت کچھ تمہاری طبیعت کے مطابق ہے۔" اسکول میں صبح کو دعا کے وقت گانا سیکھنے والے لڑکوں کی ٹولی کو آگے کھڑا کر دیا جاتا۔ پہلے وہ دعا کے گیت کا ایک مصرع بولتے' بعد میں دوسرے سب لڑکے۔ اسکول میں کوئی جلسہ ہوتا تو قومی ترانہ گانے کے لئے گانا سیکھنے والے لڑکے آگے رہتے۔ چند مہینوں میں گانا سیکھنے والے لڑکے اسکول میں "سیکھیوں (عورتوں)" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ دو ایک لڑکوں کو یہ چھیڑ برداشت نہ ہوئی اور انہوں نے گانا سیکھنا بند کر دیا۔ جب صرف چار سیکھنے والے رہ گئے تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے گانا سکھانے والے گویئے کی چھٹی کر دی۔ ان چند مہینوں میں گورکھ کو گانے میں کوئی خاص مہارت حاصل نہ ہوئی' البتہ ایک دو گانے زبان پر چڑھ گئے' جنہیں گورکھ بہت حد تک بغیر بے سرا ہوئے گا سکتا تھا۔ ان میں سے ایک گانا گورکھ سہگل کی نقل میں گا لیتا۔ "غم دیئے مستقل' کتنا نازک ہے دل' یہ نہ جانا' ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ۔" اس نے گانا گوری کے لئے سیکھا تھا۔ دن بھر اسی گانے کے بول زباں پر رہتے۔ اسے وہ تصور میں گوری کو سامنے بٹھا کر بارہا سنا چکا تھا۔ لیکن یہ تصور فقط تصور ہی رہا۔

برصغیر کا بٹوارہ ہوئے تقریباً" ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔ انگریز حاکم ہندوستان چھوڑ کر واپس انگلینڈ جا رہے تھے۔ گوپال داس کا انگریز حاکم بھی واپس جا رہا تھا۔ وہ اپنا بہت سا ذاتی سامان بیچ رہا تھا یا مفت میں دوستوں کو بانٹ رہا تھا۔ اسی رو میں باہر کے ملکوں کی بہت سی تصویریں گوپال داس کے ہاتھ لگیں۔ وہ تصویریں واقعی بے حد دل کش تھیں۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کس ملک کا' کس جگہ کا منظر روبرو ہے۔ گوپال داس نے ساری تصویریں گورکھ کے حوالے کر دیں۔ انگلینڈ جرمنی' فرانس کی بہت سی عمارتیں' گرجے' نقاشی' بت تراشی' مصوری' قلعے' عجائب گھر' سڑکیں' ریل گاڑیاں' لوگوں کے پہناوے' آرام و آسائش کے سامان۔ بہت سے منظر ان تصویروں سے واضح ہوتے۔ گورکھ نے پہلے تو انہیں ملک کے مطابق ترتیب دی' پھر منظر کے مطابق۔ پھر ان تصویروں کو موٹے سفید کاغذ پر چسپاں کر لیا۔ چاروں طرف خوب صورت حاشیئے بنائے۔ جلد چڑھوانے کے لئے پیسہ خرچ کرنا ناممکن تھا' اسی لئے جس طرح گوجرے میں پتنگ سازوں کی دکانوں پر کھڑا ہو کر پتنگ سازی کے راز سیکھے تھے' اسی طرح جلد سازوں کی دکانوں پر چکر مار کر خوب صورت جلد باندھنے کے گر سیکھے۔ اگرچہ گورکھ کاغذوں کو بازار کی طرح مہارت سے نہ باندھ سکا' لیکن پھر بھی کافی صفائی سے انہیں ایک البم کی صورت دینے میں کام یاب ہو گیا۔ جلد پر اس نے چمک دار لال کاغذ اور جلد کی پیٹھ پر سیاہ کپڑا چسپاں کیا۔

البم تیار ہو گیا تو گورکھ نے والدین کو دکھایا۔ گوپال داس کہنے لگے "واقعی اس قدر خوب صورت بنایا ہے کہ کسی بھی مہمان کو فخر کے ساتھ دکھایا جا سکتا ہے۔" گورکھ کے دماغ میں تو ایک ہی مہمان سمایا تھا۔ کاش گوری ایک بار گھر آئے اس کا گانا سنے' اس کا البم دیکھے۔ اسی بہانے وہ گوری کو دیکھے 'گوری اسے دیکھے' نظروں کی خاموش داستانیں ملاقاتوں میں بدل جائیں۔۔۔ اور ملاقاتیں قربتوں میں۔

جذبہ ء دل اگر حد سے بڑھ جائے تو تصور مجسم ہو سکتا ہے۔ ایک دن ساوتری کہنے لگی "کل گوری اور اس کی ماں شام کو آئیں گی۔ کمرے میں جو سامان بے ترتیب پڑا ہے' اسے ترتیب سے رکھ دینا۔

ماں کی زبانی خوش خبری سن کر گورکھ کا دل ناچ اٹھا۔ ساری رات بے خوابی میں کٹی۔ انتظار میں ایک ایک لمحہ طویل محسوس ہو رہا تھا۔ اسکول پہنچا تو ایک خود فراموشی طاری تھی۔ معلوم نہیں استاد نے کلاس میں کیا کہا' دوستوں نے کیا کہا' کس کس نے مذاق اڑایا۔ اسکول کے گھنٹے ختم ہوئے تو وہ تیز رفتار سے گھر کی جانب روانہ ہوا۔ اسے یہ اندیشہ تڑپا رہا تھا کہ اگر گوری اور اس کی ماں آ کر چلی گئیں تو؟ اسے اسکول نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہ ایک دن کی چھٹی آسانی سے لے سکتا تھا۔ اس کی عقل پر کیا پتھر پڑے تھے کہ اسکول چلا آیا۔

گورکھ گھر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ ابھی تک گوری اور اس کی ماں نہیں آئے ہیں' بس آنے ہی والے ہیں۔ گورکھ کی جان میں جان آئی۔ بار بار برآمدے میں جا کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ انہیں گھر سے نکلنے اور اوپر کی جانب قدم بڑھاتے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ کیا مزہ آئے اگر دروازہ کھول کر وہ خوش آمدید کہے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ساوتری کہنے لگی : "میں دیکھتی ہوں۔ گوری اور اس کی ماں ہی ہوں گے۔"

گورکھ برابر کے کمرے میں بیٹھا گفتگو کی سرگوشیاں سنتا رہا۔ مہمانوں کے دیدار کا کوئی حیلہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بے وجہ وہ کیسے کمرے میں داخل ہو؟ یکایک ساوتری کی آواز آئی "گورکھ' اپنا البم لانا۔"

گورکھ البم لے کر کمرے میں پہنچا' گوری اور اس کی ماں کو پرنام کیا' البم ان کے سامنے رکھی اور تقریباً" ایک منٹ تک کھڑا رہا۔ جب اس سے کسی نے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا تو واپس دوسرے کمرے میں لوٹ آیا۔ یہی تھی وہ ملاقات جس کے لئے دو دن سے بے قرار تھا۔ مگر اسے بالکل رائیگاں بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گوری نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا' ان کی نظریں چار ہوئیں تھیں۔ یہ کچھ کم تھا؟

اسکول میں بہت سے لڑکے اسکاؤٹ کہلاتے تھے۔ گورکھ بھی ان کے گروپ میں شامل تھا۔ اسکاؤٹنگ کی ٹریننگ کا مرکز تارا دیوی میں تھا۔ تارا دیوی' شملہ سے کچھ ہی میل دور ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ ہے۔ ایک دن تارا دیوی سے ایک نوجوان اسکول میں لڑکوں کو جسمانی کرتب دکھانے آیا۔ ایک لوہے کے رنگ' سے کس طرح جسم کو سمیٹ کر نکالا جا سکتا ہے' کیسے چاروں طرف جلتی جنگل کی آگ سے جان بچائی جا سکتی ہے' جنگل میں لاپتہ ہو جانے پر دشمن کو خبردار کئے بغیر اپنے ساتھیوں کے لئے کیسے خفیہ نشان چھوڑے جا سکتے ہیں' اسکاؤٹ جنگل میں

بغیر کسی بیرونی امداد کے، بغیر کسی ساز و سامان کے، بغیر خوراک کے کیوں کر زندہ رہ سکتا ہے۔ سب اس نے مظاہرہ کر کے بتایا۔ پھر اس نوجوان نے تجویز پیش کی کہ تارا دیوی میں اسکاؤٹ لڑکوں کے لئے ایک کیمپ لگایا جائے، جس میں انہیں یہ سب کچھ عملاً سکھایا جائے۔ پڑاؤ ایک ہفتے کا ہوگا۔ آنے جانے کا ریل گاڑی کا کرایہ معاف۔ رہنا، کھانا پینا، سب مفت۔ گورکھ سوچنے لگا۔ "بہت اچھا رہے گا۔ جنگل میں گھومیں گے۔ ریل گاڑی میں سفر کریں گے مفت میں کھائیں گے۔" اس نے فوراً اپنا نام پیش کر دیا۔

تقریباً ۱۵ لڑکے شملہ سے ریل گاڑی میں سوار ہوئے۔ تارا دیوی چند ہی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ تارا دیوی اسٹیشن پہنچنے سے پہلے ریل گاڑی ایک لمبی سرنگ سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس روز ریل کی پٹڑی پر کچھ کام ہو رہا تھا، اس لئے ریل گاڑی سرنگ کے باہر ہی رک گئی۔ لڑکوں سے ہدایت کی گئی کہ وہ سب وہیں اتر جائیں، کیوں کہ کیمپ وہاں سے نزدیک پڑے گا۔ اگر اسٹیشن پر اتریں گے تو بھی اسی راہ سے واپس آنا ہوگا۔ سب لڑکے ریل گاڑی کے ڈبے سے اتر کر پٹڑی پر کھڑے ہو گئے۔ کافی وقت گزر گیا، لیکن ریل گاڑی روانہ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ گورکھ ٹہلتا ہوا آگے کی طرف بڑھا تو ریل گاڑی کے ایک ڈبے کی کھڑکی پر اس کی نظر جم کر رہ گئی۔ گوری ہاتھوں اور نگاہوں سے اسے الوداع کہہ رہی تھی۔ گورکھ ساتھیوں کو چھوڑ کر ڈبے کی کھڑکی کی طرف چل پڑا۔ اسے کچھ زیادہ فاصلہ طے نہ کرنا پڑا۔

گوری رندھے ہوئے لہجے میں بولی "ہم لوگ شملہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ پتا جی کا تبادلہ ہو گیا ہے۔"

گورکھ خاموش گوری کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ دو قدم اور گوری کی طرف بڑھائے تو وہ خاموشی کی زبان میں بولی "تم نے تو کبھی میری طرف آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ پھر بھی تم یاد آؤ گے۔"

گورکھ چپ چاپ گوری کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اتنے میں ریل گاڑی کی سیٹی کی آواز آئی اور گاڑی آہستہ آہستہ پٹڑی پر سرکنے لگی۔ گورکھ اچانک بولا "نمستے۔ خدا حافظ۔" پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ایک نے سوال کیا۔ "کون تھی یار، جس سے عشق بگھار آئے؟" گورکھ خاموش قدم ملا کر ان کے ساتھ چلتا رہا۔

پندرہ لڑکوں کو پانچ ٹولیوں میں بانٹ دیا گیا۔ اعلان ہوا کہ جو ٹولی اول رہے گی اسے تمغے اور انعامات دیے جائیں۔ سب ٹولیاں ایک دوسرے سے الگ پہاڑیوں پر ایک دو میل کے فاصلے پر خیموں میں قیام کریں گی۔

اور ساری ضروریات آپ مہیا کریں گی۔ شام اتر آئی تھی۔ گورکھ کی ٹولی زمین میں کھونٹیاں گاڑ کر اور رسیاں باندھ کر تمبو کھڑا کرنے لگی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اگرچہ تمبو چاروں طرف سے بند تھا، لیکن رات بہت سرد تھی۔ گورکھ گھر سے صرف دو کمبل لے کر چلا تھا۔ گوری سے آخری ملاقات کا منظر اس کی آنکھوں میں بسا ہوا تھا۔ سائیں سائیں کرتی ٹھنڈی ہوا، کہیں نہ کہیں سے تمبو کے اندر داخل ہو

رگوں میں خنکی بھرتی رہی۔ گورکھ سوچتا رہا "یوں اس کا تارادیوی آنا' گوری کا اسی ریل گاڑی میں سفر کرنا' گاڑی کا یکایک اسٹیشن کے باہر کھڑے ہو جانا' گوری کا اسے دیکھ کر مسکرانا اور جاتے جاتے اقرار محبت کرنا' غضب کے اتفاق ہیں۔ یہ ضرور سادق جذبات کا کرشمہ ہے۔ وہ گوری کو کبھی نہ بھولے گا۔ ابھی تو تمہید ہے۔ ممکن ہے کہ مقدر سے دوبارہ اس سے کہیں نہ کہیں سامنا ہو جائے۔ اسے صرف انتظار کرنا ہو گا۔"

صبح ہوئی' درختوں کے جھرمٹوں سے بلند ہوتا آفتاب سنہری کرنیں بکھیرنے لگا تو گورکھ کی کپکپی بند ہوئی۔ سب لڑکے جنگل سے لکڑی کاٹ کر لائے۔ چشمے سے پانی لائے۔ چولہا بنایا' آگ جلائی اور کھانا پکایا۔ صرف کچھ سبزیاں اور آٹا انہیں مہیا کیا گیا تھا۔ گورکھ کو اس دن معلوم ہوا کہ گیلی لکڑی کو سلگانا اور کھانا پکانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ہر ایک کے لئے تین' تین موٹی اور چوڑی روٹیاں پکائی گئیں' تاکہ وہ انہیں دن بھر کھا سکیں۔ صبح کی ڈور' ورزش' ڈرل' دوپہر کو رسیوں میں گرہ ڈال کر ان سے الجھنا' درخت سے رسی باندھنا' رسی کے سہارے پیڑ پر چڑھنا' جنگل میں اگی گھاس سے رسی کو تیار کرنا' شام کو پھر ورزش اور ڈرل اور رات کو ٹھنڈا تمبو۔ دوسرے ہی دن گورکھ واپس جانے کے خواب دیکھنے لگا۔

دو راتیں ٹھنڈے تمبو میں گزار کر گورکھ سردی' زکام اور کھانسی کے چنگل میں پھنس گیا۔ بخار تیز ہو گیا تو ڈاکٹر کو بلایا گیا' گورکھ کو دوا پلائی گئی اور پھر اسے گھر واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔

گورکھ برآمدے میں کھڑا ہو کر نیچے چھت پر نظر دوڑاتا تو ایک ویرانی سی ذہن میں پھیل جاتی۔ گوری چلی گئی۔ وہ خاموش نظریں جو اس سے مخاطب ہوا کرتی تھیں' کہیں خلا میں چھپ گئیں۔ گوری نہ تھی' لیکن گوری کی پرچھائی ابھی تک چھت پر بھٹک رہی تھی۔ وہ پرچھائیں اسی انداز سے چھت پر چلتی' کام کرتی' گیسو سکھاتی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ محض اس کا وہم ہے اور کوئی بھی وہم ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا' خواہ وہ کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو۔ گوری بھی کسی فلم کی ایکٹریس جیسی بن چکی تھی۔ اس کا وجود بھی محض سنہرے پردے تک محدود تھا۔ اس کے دماغ کے پردے تک۔ لیکن فلم کے پردے سے ہو کر کچھ نقش کتنے واضح ہو جاتے تھے۔ جب بھی وہ کوئی فلم دیکھتا' اس کی مختصر سی کہانی ایک کاغذ پر لکھ لیتا۔ اس فلم کے گانے کسی دوسرے کاغذ پر لکھ لیتا۔ پھر فلموں کے گانوں کے ساتھ غزلوں کے شعر بھی جڑنے لگے۔ فلموں کی داستانوں کے ساتھ ایکٹریسوں کی تصویریں بھی چپکنے لگیں۔ رادھا کی جگہ مدھوبالا اور ثریا نے لے لی۔ سنیما کے پوسٹر سے زیادہ خوب صورت ثریا وہ اپنی لکیروں کے جادو سے بنا لیتا۔ حقیقت تو ایک خاص سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے' لیکن لکیریں کسی بھی جانب کسی بھی رخ بدل سکتی ہیں۔ گورکھ کی لکیریں ثریا کو ثریا سے کہیں زیادہ خوب صورت بنا ڈالتی۔ وہ خوب صورتی جو پینسل کے ذریعہ انگلیوں سے بیان ہوتی' کہیں نہ کہیں تو ذہن کے پردوں پر کھنچی تھی۔ اس کے نقوش ضرور دل کی گہرائیوں

سے ابھرتے تھے۔ یہ شوق کافی مدت سے گورکھ کو گھیرے ہوئے تھا۔ اس لئے اس کے پاس فلموں کی کہانیوں' ایکٹریسوں کی تصویروں' فلمی گانوں اور شعروں کی دو اچھی خاصی جلدیں تیار ہو چکی تھیں۔ مصیبت تھی انہیں چھپا کر رکھنے کی۔

برآمدے کی چھت کے ایک حصے میں لکڑی کا ایک تختہ ڈھیلا پڑا تھا۔ گورکھ اس تختے کو نیچے کی طرف کھینچ کر دونوں جلدیں چھت کے اندر چھپا دیتا اور تختہ اسپرنگ کی طرح اپنی اصلی حالت پر آجاتا۔ گورکھ کو وہ تصویریں' وہ بیان' وہ گیت اور وہ غزلیں بہت عزیز تھے۔ کئی برس کے خوابوں کے سائے ان دو جلدوں میں محفوظ تھے۔ جب بھی وہ کسی ورق پر نگاہ جماتا' سنہرے اسکرین کے روشن نقوش ورق پر ابھر آتے۔ وہی سنگیت کی دھن فضا میں گونج جاتی۔ وہی حسین چہرے جھلک اٹھتے۔

ایک دن گوپال داس پوجا کر رہے تھے اور گورکھ برآمدے میں بیٹھا کسی ایکٹریس کی تصویر بنا رہا تھا۔ یادوں کی دونوں جلدیں گورکھ کے سامنے کھلی پڑی تھیں۔ یکایک آہٹ ہونے پر گورکھ نے گھوم کر دیکھا تو والد کو پیچھے کھڑا پایا۔ شاید وہ کافی دیر سے اس کی حرکتوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے دونوں جلدیں اٹھالیں کچھ دیر حیرت سے انہیں الٹتے پلٹتے رہے۔ پھر خفا ہو کر بولے "تو آج کل یہی پڑھائی ہوتی ہے!" اور پھر انہوں نے دونوں جلدیں اٹھا کر آتش دان کے سپرد کر دیں۔

گورکھ کی آنکھوں کے سامنے وہ دل فریب داستانیں دم توڑ رہی تھیں' وہ حسین نقوش دھواں ہو رہے تھے' وہ گیت خاموش ہو رہے تھے۔ گوکل اور گوری پہلے ہی رخصت ہو چکی تھیں؟ لیکن گورکھ کہاں تک ان کے کھونے کا ماتم کرتا؟ فلمیں وہ پہلے ہی کی طرح دیکھتا' مگر فلم کی کہانی نہ لکھتا۔ لبوں پر کوئی نہ کوئی فلمی دھن سوار رہتی' لیکن اسے ہمیشہ کے لئے یادداشت کے پنجرے میں بند کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ جس طرح ستو' شنکر' نہال' کانتا' کنہیا اور گوکل کچھ نقش چھوڑ گئے اسی طرح ان میں کچھ اور نقوش شامل ہو گئے۔ حالت کچھ ایسی ہی تھی جیسے کوئی کسی طاق میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے۔ پھر برسوں گرد و غبار اس کی ہیت بدل دے۔ لیکن جب بھی طاق کھول کر پھونک مارے تو گرد و غبار اڑ جائے اور چیز اصلی حالت میں درخشاں ہو اٹھے۔

گورکھ کے دادا شنکر دیال شملہ سے تقریباً "۳۰ میل دور دیو نگر میں رہتے تھے۔ سردی کی چھٹیاں تھیں۔ گورکھ نے سوچا' کیوں نہ دادا سے مل آؤں۔ ان دنوں گاؤں تک بس نہیں جاتی تھی۔ گورکھ ۱۰ میل پہاڑی راستہ پیدل طے کر دادا کے پاس پہنچا۔ کچے گھر' سرسوں کے تیل کے دیئے' چشمے کا پانی' زمیں قند اور آلو کی سبزی۔ گورکھ کے لئے نئے تجربے تھے۔ کسی زمانے میں اس کے دادا مزاج کے گرم ہوتے ہوں گے' لیکن وقت نے انہیں ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اب تو روز کا معمول تھا کہ سویرے اٹھے' حقہ گڑگڑایا' چائے پی' کھانا کھایا' کھیت کے چکر لگائے' پھر کھانا کھایا اور سو گئے۔ گورکھ کو تعجب ہوا کہ کوئی بھی انسان اس طرح کی زندگی کیسے جی سکتا ہے۔

دو ایک دن میں شنکر دیال گورکھ سے کھل گئے۔ پشت در پشت وہ اسی جگہ رہتے آئے تھے۔ وہیں سے شروع ہو کر ان کا کاروبار دور دور تک پھیلا تھا۔ لیکن چھوٹی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے اور کاروبار میں نقصان اٹھانے پر انہوں نے زمانے سے منہ موڑ کر فقیری لے لی تھی۔ جینے کی تمنا بھی نہ تھی اور جئے بھی جا رہے تھے کیوں کہ ہر حال میں جینا چاہئے۔ گورکھ نے شنکر دیال کی جمع کردہ کئی دھارمک کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں زمانے کی بے ثباتی کا ذکر تھا' ترک دنیا کی تلقین تھی۔ اسے سنیما اور فلم کی یاد نے ستایا' لیکن گاؤں میں سنیما ہال کہاں؟

دو ہفتے بعد گورکھ شملہ واپس آیا تو دماغ میں کسی حد تک انبالہ چھاؤنی والے سنیاس کا میلان تازہ ہو اٹھا تھا۔ جو جیسا نظر آتا ہے وہ ویسا نہیں ہے۔ "اگر یہی حقیقت ہے تو پھر ایک سراب قائم کر لینے میں اور اس میں چلتے رہنے میں کیا برائی ہے؟ جب سچائی کو دیکھنا ناممکن ہے تو آدمی خوابوں کے ساتھ کیوں نہ جئے؟"

اگر شنکر دیال زندگی میں کام یاب رہتے تو شاید ان کا فلسفہ بھی کچھ اور ہوتا۔

ہندوستان چھوڑنے سے پہلے گوپال داس کا انگریز افسران کی ترقی کی پرزور سفارش کر گیا تھا۔ اس لئے گوپال داس کے عہدے میں ترقی ہوئی اور ان کا تبادلہ جالندھر ہو گیا۔ رہائش کے لئے مکان ملنا بہت محال تھا کیوں کہ پاکستان سے آئے ہوئے بہت سے رفیوجی ٹھکانے کی تلاش میں تھے۔ شملہ میں بھی بینک کا مکان خالی کرنا تھا۔ گوپال داس نے شملہ میں جو دوسرا مکان تلاش کیا' وہاں بھی کرایہ دار سامان بند کر کے' بہت پہلے' کسی دوسرے شہر میں جا بسا تھا۔ مگر چونکہ رہنے کے لئے مکانوں کی قلت تھی' اس لئے بہت دن تک مکان بند کر کے لاپتہ ہو جانا غیر قانونی تھا۔ چنانچہ اس مکان کا بھی تالا توڑ کر قبضہ حاصل کیا گیا اور گوپال داس جالندھر روانہ ہو گئے۔

گورکھ اگر یادوں کی راکھ کریدے تو اس دور کی کئی اور چنگاریاں بھی سلگ اٹھیں گی۔ گوری کی چھت کا نظارہ بھی چھوٹ گیا اور اس کے ساتھ فلم دیکھنے کا شوق بھی سرد ہو گیا۔ سگریٹ کا دھواں اپنی چمک اور دائرے کھو بیٹھا۔ شاید وہ چھ مہینے کا دومو آگے آنے والے وقت کی تمہید تھا۔ چھ مہینے بعد گوپال داس جالندھر سے آئے تو ساوتری کے لئے تین نئی ساڑیاں لائے۔ خود بھی نئے سوٹ میں ملبوس تھے اور خوش نظر آ رہے تھے۔ ساوتری نے جلدی سے تین بلاؤز سلوائے اور پہلی بار "اصلی" ساڑی پہن کر شوہر کے ساتھ مال روڈ پر سیر کرنے کو نکلی۔

ریل گاڑی جیسے جیسے شملہ کی پہاڑیوں سے نیچے اتر رہی تھی' ویسے ویسے گورکھ کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

اے شملے کی خوب صورت بلند و پست وادیوں' الوداع! اے چیڑ اور دیودار کے بلند پیڑو' الوداع! اے سبک رو ٹھنڈی ہواؤ' الوداع! اے بل کھاتی راہو' الوداع! اے کہساروں کا موںہہ چومتے بادلو' الوداع! قسمت نے چاہا تو پھر ملیں گے۔ یہیں جوانی نے آنکھ کھولی۔ یہیں دل نے عشق کے خواب سجائے۔ یہیں محبوب ملے اور رخصت ہوئے۔ جالندھر کے ہموار میدان دیکھیں کیا گل کھلائیں۔

ٹرین پہاڑی علاقہ چھوڑ کر میدان کی طرف بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ گورکھ کی اداسی بھی بڑھتی گئی۔۔ شملہ کے اونچے نیچے پہاڑ اور ٹیلے آنکھوں میں گھومتے رہے۔

جالندھر میں بھی گوپال داس نے ایک گھر کا تالہ تڑوا کر قبضہ حاصل کیا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ تقریباً" سارے مکانوں پر تالے لگے رہتے تھے۔ مکان کم تھے اور طلب گار زیادہ۔ مالک مکان خالی مکانوں کو بند کر کے اعلان کروا دیتے کہ وہاں کرایہ دار بسا ہوا ہے اور پھر سب سے زیادہ کرایہ ادا کرنے والے کی تاک میں رہتے۔ گوپال داس کا مکان ریلوے اسٹیشن کے قریب' اناج منڈی پار کرتے ہی ایک چھوٹے سے محلے میں واقع تھا۔ اسی محلے کے پاس "سہگل کی گلی" تھی۔ سنا تھا کہ زندگی کے آخری دنوں میں شراب کی لت کے باعث سہگل کا معدہ اور جگر پھونک گئے تھے۔ وزن بڑھ گیا تھا۔ جب سہگل کی موت ہوئی تو لاش اتنی وزنی تھی کہ پانچ آدمی مل کر بھی اسے تین منزلہ سیڑھیوں سے نیچے نہ اتار سکے۔ اس لئے سہگل کی لاش تیسری منزل کی کھڑکی سے نیچے پھینک دی گئی۔ گورکھ سہگل کا فین تھا۔ اس کے خیال سے اگر کوئی گویا تھا تو وہ سہگل تھا۔ نہ اس کے مقابلے کا گویا پہلے کوئی تھا اور نہ ہو گا۔ گورکھ نے فلم "دیو داس" دیکھی تھی۔ سہگل اصل زندگی میں بلا نوش شرابی تھا۔ اسے جالندھر آنے پر ہی معلوم ہوا۔ "دیو داس" فلم کا گانا "دکھ کے اب دن بیتت ناہیں" شاید اسی لئے' سچے دل کی سرگم سے نکلا تھا۔

مکان کے درمیان کھلا آنگن تھا' جس کے چاروں جانب رہنے کے کمرے تھے۔ گوپال داس کے پاس تین کمرے اور ایک رسوئی تھی۔ دو کمرے مالک مکان کے قبضے میں تھے۔ بیٹھک واقعی بہت خوب صورت تھی۔ گورکھ کو ستو کے نانا کی بیٹھک یاد آنے لگی۔ دیواروں پر خوب صورت' نقاشی' چھت سے لٹکتا بجلی کا پنکھا۔ اس

زمانے میں بجلی کا پنکھا ہی بڑی نعمت سمجھا جاتا تھا۔ مالک مکان کی دکان اناج منڈی میں تھی۔ مشہور تھا کہ وہ بہت چال باز اور بدمعاش بیوپاری ہے۔ گوپال داس نے مکان کرائے پر زبردستی لے تو لیا' لیکن انہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مقدمہ بازی چھوٹی کورٹ سے بڑھ کر ہائی کورٹ تک پہنچی۔ اس جنجال میں کئی سال صرف ہو گئے! مقدمہ کی وجہ سے گوپال داس پریشان رہتے تھے۔ مالک مکان کی ضد تھی کہ وہ مکان خالی کروا کے چھوڑے گا اور گوپال داس کی ضد تھی کہ وہ مکان کسی صورت میں خالی نہیں کریں گے۔ جب مالک مکان کی ایک نہ چلی تو اس نے مکان کے دو کمرے کچھ بدمعاش لوگوں کو کرائے پر دے دئے۔ وہ لوگ تمباکو کی دکان کرتے تھے' شراب اور سگریٹ دھڑکے سے پیتے' گھر میں بکرا اور مرغی کاٹتے اور ہڈیاں آنگن میں پھینک دیتے۔ ان لوگوں سے تو تو میں میں ہو جاتی' لیکن ہاتھا پائی کی نوبت کبھی نہ آئی۔ جالندھر میں پانچ سال تک قیام کے دوران گوپال داس اپنی ضد پر اڑے رہے اور انہوں نے مکان خالی نہ کیا۔ تقریباً" چار سال کی مقدمہ بازی کے بعد ان کی مالک مکان سے صلح ہو گئی۔

جب گاندھی جی کا قتل ہوا تھا تو گورکھ شملہ میں تھا۔ اس وقت جگہ جگہ ایک ہی گانے کی دھن سنائی پڑتی تھی :

"آؤ بچو تمہیں سنائیں باپو کی یہ امر کہانی
وہ باپو جو پوجیہ ہے اتنا جتنا گنگا ماں کا پانی"

اب جالندھر میں نہرو کی آمد کی خبر گرم تھی۔ گوپال داس کہہ رہے تھے کہ لیکچر سننے جائیں گے۔ جب گورکھ سے صبر نہ ہوا تو باپ سے پوچھنے لگا : "آپ کو یاد ہو گا کہ ہم گاندھی جی سے ملنے انبالہ چھاؤنی سے انبالہ شہر گئے تھے اور ایک رات برباد کی تھی۔"

"وہ بات اور تھی۔" نہرو تو یہاں لیکچر دینے کے لئے آ رہے ہیں۔ اور گاندھی جی کے بعد نہرو ہی گاندھی جی کے اصل چیلے ہیں۔"

گورکھ بحث پر اتر آیا۔ "کل اخباروں میں چھپے گا تو پڑھ لیں گے۔ بھیڑ میں دھکے کھانے سے کیا فائدہ؟"

گوپال داس قدرے غصے سے بولے "تم کو نہیں جانا تو نہ جاؤ۔ جو لطف روبرو ہو کر لیکچر سننے میں ہے وہ اخبار میں پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اخبار تو ہر روز ہی پڑھتے ہیں۔"

گورکھ نے کہا "میں بھی چلوں گا۔ میں تو یوں ہی دریافت کر رہا تھا۔"

شہر سے باہر جی ٹی روڈ پار کر کے بڑے میدان میں نہرو کا لیکچر ہونے والا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سب لوگ گھروں کو تالے لگا کر' بسوں' تانگوں رکشاؤں اور موٹر گاڑیوں میں سوار' میدان کی طرف جا رہے تھے۔ جس

طرف سے گذرو، شہر خالی نظر آتا۔ گوپال داس اور گورکھ بھی میدان میں پہنچ گئے۔ اسٹیج کے چاروں طرف ایک دو فرلانگ تک بھیڑ پہلے ہی جمع ہو چکی تھی۔ ہر طرف پولیس کے سپاہی گشت لگا رہے تھے۔ ملٹری کے سپاہی بھی جابجا سنگینیں تانے کھڑے تھے۔ جو لوگ درختوں کی شاخوں پر چڑھ گئے، پولیس والے انہیں نیچے اتار رہے تھے۔ جن لوگوں کو اسٹیج کے قریب پہنچنے کی تمنا تھی، وہ آگے والوں کو دھکے مار مار کر راہ بنانے کی کوشش کرتے اور آگے والے انہیں پیچھے کی طرف دھکیل دیتے۔ بھیڑ میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ اگرچہ شام کا وقت تھا لیکن گرمی کے موسم کی وجہ سے سب پسینے کی وجہ سے شرابور تھے۔ بھیڑ اور گرمی سے گھبرا کر ماؤں کی گود میں جب بچے زور زور سے رونے لگتے تو مائیں سینے پر ساڑی کا پلو ڈال کر، بلاؤز کے بٹن کھول کر بچے کو دودھ پلانے لگتیں۔ بچے خاموش ہو جاتے اور وہ خود ہانپتی جاتیں۔ ایک جگہ بھیڑ بے قابو ہو چلی تو پولیس کے ڈنڈے برسنے لگے۔ کئی آدمیوں کے سر پھٹ گئے اور انہیں ہسپتال لے جانا بھی مشکل ہو گیا۔

تقریر کا مقررہ وقت کب کا نکل چکا تھا۔ میدان میں بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی، جیسے لوگوں کو پہلے سے معلوم تھا کہ لیکچر وقت پر کبھی نہیں ہوا کرتا۔ بڑے آدمیوں کا ایک گھنٹہ چھوٹے آدمیوں کے کروڑوں گھنٹوں سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ پھر بڑا آدمی کرے بھی تو کیا کرے؟ جگہ جگہ اسے بڑے بڑے کام سرانجام دینے پڑتے ہیں۔ دو قدم آرام سے چلنا اس کے لئے محال ہے۔ دو پل آرام سے بیٹھنا اس کے لئے ناممکن ہے۔ رات کو دو گھڑی آرام سے سونا اس کے لئے مشکل ہے۔ ہر وقت وہ اہم معاملوں میں مصروف رہتا ہے۔ سوتے ہوئے بھی ان ہی کے خواب دیکھتا ہے۔ گورکھ کی طرح کسی گوری کے خواب بڑے آدمی نہیں دیکھتے۔ بڑے آدمی کی زندگی بالکل مختلف ہوتی ہے۔ گورکھ اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔

گورکھ ان ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ بھیڑ میں ہل چل بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس والوں کے ڈنڈے ان کی کمر کی پیٹی سے باہر نکل آئے۔ نہرو جی پندرہ منٹ میں آنے والے تھے۔ خیالات کی ایک اور رو کے لئے پندرہ منٹ کافی تھے۔ گورکھ کھڑا کھڑا پھر کسی دوسری رو میں بہہ گیا۔

بھیڑ میں موجود یہ جاہل عورتیں، یہ بچے، یہ دکان دار، یہ بابو، یہ تانگے رکشا والے، کون سے امرت کا گھونٹ پینے کے لئے وہاں جمع تھے؟ کون سی ایسی خاص بات کہی جائے گی جو پہلے نہیں کہی گئی ہے۔ کیا چیز انہیں وہاں کھینچ لائی ہے۔ دراصل ان لوگوں کو تقریر سے کوئی مطلب نہیں۔ لوگ یہ مانتے ہیں کہ ہندوستان کو آزادی گاندھی اور نہرو نے دلائی ہے۔ ان کی نظروں میں نہرو بھگوان سے کم نہیں۔ اگر کل یہ منادی کروا دی جائے کہ بھگوان کہیں آسمان سے اترے گا تو کتنی بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو جائیں گے! بھگوان چاہے ایسی زبان میں بات کرے جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ اور دو منٹ بعد کسی غیبی جہاز پر بیٹھ کر آسماں میں روپوش ہو جائے۔ لیکن لوگ تو جیتے جی اس کی بات کریں گے۔ یہ لوگوں کا جذبہ ٔ محبت ہے جو اُمڈ رہا ہے۔ یہ لوگوں کا "شکریہ" کہنے کا

طریقہ ہے۔ اسے صرف عقل کی ترازو پر نہیں تولنا چاہئے۔

پندرہ منٹ کے انتظار کی بات کہی گئی تھی، مگر تقریباً" آدھا گھنٹہ اور گزر گیا اور یوں مقررہ وقت سے لگ بھگ دو گھنٹے بعد نہرو جی کی سواری آنے کی اطلاع ملی۔ بھیڑ اس قدر تھی کہ نہرو جی کو آتے اور اسٹیج پر چڑھتے ہوئے دیکھنا ناممکن تھا۔ دور دور تک لاؤڈ اسپیکر گونج رہے تھے۔ نہرو جی تو نظر نہ آئے، البتہ ان کی آواز گونج کے ساتھ سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے کیا کہا، گورکھ کو اس سے کوئی مطلب نہ تھا۔ پر اثر تھے "جے جے" کے نعرے اور وہ کھلبلی جو تقریر کے بعد مچی۔ لوگوں نے معلوم نہیں کیا سنا اور کیا سمجھا۔ بار ہا لاؤڈ اسپیکر پر تاکید کی جارہی تھی کہ عوام امن قائم رکھیں۔ لیکن لوگ جتنے بے چین آنے کے لئے تھے، اس سے زیادہ اتاؤلے واپس گھر لوٹ جانے کے لئے تھے۔

شہر میں اس روز گھروں میں خوب چوریاں ہوئیں۔ سب ہی لوگ شہر سے باہر تھے اور پولیس بھی شہر سے باہر تھی۔ اس سے اچھا موقع چوروں کو اور کون سا ملتا؟ جن کا زندگی بھر کا اثاثہ لٹ گیا، انہیں نہرو کی تقریر نے نہ معلوم کتنا معاوضہ دیا ہو گا۔ گھر لوٹتے وقت گوپال داس اتنے ہی خاموش تھے جتنے گاندھی جی سے ملنے کی تمنا میں وقت برباد ہونے پر انبالہ شہر ریلوے اسٹیشن سے لوٹتے وقت تھے۔

اگلے دن بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ نہرو جی کی تقریر اخباروں میں چھپی۔ گوپال داس نے غور سے تقریر پڑھ کر کہا "گورکھ تم ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میدان میں جاکر تقریر سننے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ تکلیف الگ اٹھانی پڑی۔"

گورکھ نے زندگی میں اس وقت تک بڑے لوگوں کی محدود سی جھلک دیکھی تھی۔ اسے یاد تھا، ایک بار شملہ میں جب والد نے اسے وہسکی کی بوتل اپنے انگریز افسر کو پیش کرنے کے لئے اسے بھیجا تھا تو وہ کیسا سہما سہما انگریز کی کوٹھی پر پہنچا تھا۔ پہلے اس کی مڈبھیڑ چوکی دار سے ہوئی تھی۔ اس نے اپنا تعارف کرایا تھا اور پھر کوٹھی کی سڑک پر قدم رکھا تھا۔ اس کے بعد کئی دوسرے ملازموں سے اسے اپنا تعارف کرانا پڑا تھا۔ جب وہ کوٹھی کے اندر پہنچا تھا تو انگریز کی بیوی اس کے سامنے آئی تھی۔ ایک چھوٹا سا انڈر ویر پہنے اور چھاتیوں کی رعنائیوں کی جھلک دکھاتے ہوئے وہ ہتک آمیز لہجے میں مخاطب ہوئی تھی : "اپنے فادر کا تھینک کرنے کو بولنا۔"

گورکھ سوچنے لگا، آخر بڑے آدمیوں کی عام آدمی کو کیا ضرورت ہوتی ہے؟ کیوں چھوٹے کو بڑے کے آگے گڑگڑانا چاہئے؟ کیوں اس کی عزت کرنی چاہئے؟ جب کسی عام اجنبی سے ملتے ہیں تو اس سے برابر کے درجے میں پیش آتے ہیں۔ جب کسی بڑے ادمی سے ملتے ہیں تو دل میں پہلے ہی طے کر لیتے ہیں کہ ہم چھوٹے ہیں، ہم حقیر ہیں۔ اپنی خودی کو ہم خود ہی کم کر لیتے ہیں۔ اس سے تو بہتر یہی کہ بڑے سے فاصلے پر رہا جائے۔ کوئی بڑا ہے تو ہو گا۔ کسی کے لئے کیا فرق پڑتا ہے؟ لیکن ایسی بات بھی نہیں ہے۔ سماج میں اگر آپ بہت بڑے آدمیوں کو

جانتے ہیں' ان سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں' تو آپ بھی ان میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ لیکن یہ سب ہوتا کیوں ہے؟ اس لئے کہ بڑوں کے ہاتھ میں طاقت ہے؟ وہ اگر مہربان ہو جائیں تو اچھی نوکری دلوا سکتے ہیں' عہدے میں ترقی کروا سکتے ہیں' بگڑے کام بنوا سکتے ہیں؟ پتاجی کی ہی مثال لے لو۔ مکان کے مقدمے کے سلسلے میں انہیں کتنے لوگوں کی منت اور خوشامد کرنی پڑی' لیکن مالک مکان کے سامنے سر اونچا رہا۔ گورکھ نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی شخص کی' اپنے کسی کام کے لئے' خوشامد نہیں کرے گا۔ جو بھی ہوگا' دیکھا جائے گا۔ جیسا بھی ہوگا' ہوگا۔ خوشامد تو ایک طرف' بڑے لوگ تحفے بھی قبول کر لیتے ہیں۔ تحفے اور رشوت میں کیا فرق ہوتا ہے؟ اگر تحفہ ایک حد کو پار کر جائے تو رشوت کو بھی مات کر دے "یہ آپ کے لئے مٹھائی کا ٹوکرا ہے۔" "یہ بچوں کے لئے تھوڑے سے کھلونے ہیں۔" "یہ ولایتی وہسکی کی بوتل بڑی مشکل سے ہاتھ لگی۔ سوچا' کیوں نہ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔" مانا کہ سب ہی بڑے لوگ رشوت نہیں لیتے' تحفے بھی قبول نہیں کرتے' لیکن اپنی بڑائی کا تذکرہ ضرور سننا چاہتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ لوگ ان سے ادب سے باتیں کریں' ان کی تعریف کریں' ان کے نام کے نعرے بلند کریں۔ اگر یہ سب نہ ہو تو بڑے کو کون پوچھے گا؟ بڑا پھر بڑا نہ رہے گا اور بڑے' چھوٹے کا فرق ختم ہو جائے گا۔ ابھی وہ دنیاوی امور میں ناتجربہ کار ہے' لیکن پھر بھی وہ بڑے چھوٹے کے دنیاوی رشتے سے ہمیشہ دور رہے گا۔ سوا اس کے کہ بڑوں کی قربت میں انسان اپنے آپ کو چھوٹا محسوس کرے' وہ بڑوں سے کچھ اور نہیں سیکھ سکتا۔ بڑا کسی ایک راستے پر چل کر بڑا ہو گیا اور چھوٹا اسی راستے پر چل کر چھوٹا رہ گیا۔ گورکھ کی ذہنی ادھیڑبن دیر تک چلتی رہی۔ وہ خود ہی سوال کرتا رہا اور خود ہی جواب دیتا رہا۔

"تمہیں بڑوں کی بڑائی پر شک کیوں ہے؟ کوئی بھی انسان محنت' عقل' مشقت اور قربانی کے بغیر بڑا نہیں بن سکتا۔ بڑوں کے ذہن میں بڑائی کی بو نہیں ہوتی۔ وہ تو صرف عوام کی بھلائی چاہتے ہیں۔ نہرو جی کو ہی لے لو۔ انہوں نے کتنی عمر جیل میں کاٹی۔ انگلینڈ سے ڈگری لے کر آئے' کتاب لکھی.....

"ٹھہرو! کون سا عام ہندوستانی باہر جا کر پڑھائی کا خرچ برداشت کر سکتا ہے؟ یہ مان جاؤ کہ یہ لوگ پہلے سے ہی بڑے تھے' روپیہ پیسے والے تھے۔ اسی لئے تو جا کر باہر سے ڈگریاں لے آئے۔ میرے پتاجی مجھے یہاں کسی پبلک اسکول میں بھی نہیں پڑھا سکتے تھے۔"

"بڑے لوگوں کی سوانح عمری پڑھو۔ کچھ بڑے لوگ تم سے زیادہ خستہ حال تھے اور پھر بھی وہ اوپر اٹھے۔"

"لیکن اس میں بھی قسمت کا ضرور ہاتھ رہا تھا۔ کتنے لوگ جیل گئے تھے' کتنے وطن پر قربان ہو گئے' جلیاں والا باغ میں کتنے لوگوں نے قربانی دی۔ ان کا خون کیا صرف پانی تھا؟ ایک سپاہی جو اپنا فرض ادا کرتے ہوئے جان پر کھیل جاتا ہے' وہ کسی صورت میں مہاتما گاندھی یا نہرو سے کم نہیں۔"

"نہرو نے کتنی خوب صورت کتاب لکھی ہے : "ڈسکوری آف انڈیا۔"

"اسے کیا ملک کی جنتا پڑھے گی؟ کتنے فی صد لوگ ان پڑھ ہیں۔ ہندوستان میں کتنے فی صد لوگوں کو انگریزی آتی ہے؟ وہ انہوں نے عوام کے لئے نہیں، خواص کے لئے لکھی تھی، شاید انگریز حکمرانوں کے لئے لکھی تھی۔ میں اسے سعادت حسن منٹو کی کہانی "گھاٹن" سے بھی کم اہمیت دیتا ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے نہرو کی کتاب اور سعادت حسن منٹو کی کہانی برابر ہیں؟"

"برابر نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سعادت حسن منٹو کی کہانیاں نہرو کی کتاب سے بہتر ہے۔ لیکن افسوس میری حیثیت ہی کیا؟ میں تو صرف تم سے یہ کہہ رہا ہوں۔"

"اگر کہہ رہے ہو تو اس کی وجہ بھی تو ہوگی؟"

"کوئی ادبی، تحقیقی، فلسفیانہ، تاریخی، کارنامہ جس میزان پر تل سکتا ہے، اسی پر تول لو۔ بس لکھنے والے کا نام ہٹا لو۔ پھر دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

دیر تک خود سے اس قسم کی گفتگو کے بعد بھی گورکھ فیصلہ نہ کر سکا کہ "بڑائی" کس "مرغی" کا نام ہے اور اس کے پروں کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔

سنیما اور سگریٹ کے شوق کے باوجود گورکھ نے دسویں کلاس اول درجے میں پاس کرلی اور اسے ڈگری کالج میں آسانی سے داخلہ مل گیا۔ کالج میں داخلہ لینے والے ہر نئے طالب علم کو کچھ روز سینیر لڑکے کافی رگیدتے تھے۔ تاہم شملہ کی طرح گورکھ کو ڈگری کالج میں ایک پہلوان سرپرست مل گیا۔ نام تھا جھگومل۔ وہ بھی کالج میں نیا داخل ہوا تھا لیکن اس کے بازوؤں کی چست مچھلیاں دیکھ کر کیا مجال کہ کوئی سینیر لڑکا اسے چھیڑ جائے۔

داخلے ختم ہوتے ہی کالج میں زبردست ہڑتال ہوئی۔ کالج کی عمارت میں لیڈر لڑکے اپنی اپنی ٹولیوں کے ساتھ گھومتے رہتے۔ جس جگہ بھی کلاس لگانے کی کوشش کی جاتی، وہ ہاکیاں اور ڈنڈے لے کر پہنچ جاتے، لیکچر ہال کی کھڑکیاں اور دروازے توڑ دیتے، کلاس برخاست ہو جاتی اور لیکچرر اپنی جان بچا کر بھاگ جاتے۔ کہاں اسکول کا ماحول اور ماسٹر کا ڈنڈا اور کہاں کالج کا ماحول اور لیکچرروں کے دلوں میں دہشت اور خوف۔ اسکول کا ڈنڈا ماسٹروں کے ہاتھ میں، کالج کا ڈنڈا طالب علموں کے ہاتھ میں۔ پرنسپل میں اتنی ہمت کہاں کہ کسی بھی لڑکے کو کالج سے نکال دے۔ جیسے تیسے ہڑتال ختم ہوئی اور کالج میں پڑھائی شروع ہوئی۔ لیکن طالب علموں کا پلڑا ہر معاملے میں بھاری رہتا۔ ایک نہایت شریف لیکچرر فزکس پڑھانے کے لئے تقرر ہوا۔ جیسے ہی وہ بلیک بورڈ کی طرف موہنہ پھیرتا، لڑکے زمین پر جوتے رگڑ رگڑ کر اور سیٹیاں بجا بجا کر طرح طرح کی آوازیں نکالتے۔ پرنسپل نے لڑکوں سے درخواست کی کہ نئے لیکچرر کو کچھ روز تو پڑھانے کا موقع دیا جائے، اگر پھر بھی کوئی شکایت باقی رہی تو اس پر غور کیا جائے گا۔ لیکن طالب علموں کو یہ بھی منظور نہ ہوا۔ اور بے چارہ لیکچرر ہفتہ بھر کے اندر نوکری چھوڑ

کر بھاگ گیا۔

"گورکھ کے گھر سے تقریباً دو میل کے دائرے کے اندر اندر چار سنیما ہال تھے۔ ہر دوسرے، تیسرے ہفتے نئی فلم بدلتی رہتی تھی۔ چھ مہینے کا عرصہ گزر چکا تھا، لیکن گورکھ نے ایک بھی فلم نہیں دیکھی تھی۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ اب پھر سے کوئی فلم نہ دیکھے گا۔ ان ہی دنوں اس تہیہ کی تصدیق کرتی ہوئی ایک کہانی اس نے پڑھی۔ عنوان تھا : "سچی محبت۔"

کہانی ایک ایسے خوب رو نوجوان کی تھی جو کسی گاؤں کا باشندہ تھا۔ فلم کے سنہرے پردے نے اسے الجھالیا۔ وہ اس قدر معصوم تھا کہ ایک سال تک فلم کے مرکزی کرداروں کو بہشت سے اترے ہوئے آدم اور حوا سمجھتا رہا۔ اس پر یہ بھید کھلا کہ اداکار بھی انسان ہوتے ہیں تو وہ ایک فلم ایکٹریس کی محبت میں گرفتار ہو گیا اور اس کے خوابوں میں جینے لگا۔ گاؤں کی خوب صورت سے خوب صورت لڑکی اس سے شادی کرنے پر رضا مند تھی، لیکن اس کے دل میں فلم ایکٹریس بسی تھی۔ کہیں سے اسے فلم ایکٹریس کا پتہ مل گیا۔ وہ ہر روز اسے ایک خط لکھتا اور اظہار محبت کرتا۔ ایک روز اس کے خط کا جواب آیا۔ فلم ایکٹریس نے اپنا فوٹو بھیجا تھا، جس پر اس نے اپنے ہاتھ سے اپنا نام لکھا تھا۔ ساتھ میں ایک چھوٹا سا گلابی کاغذ تھا، جس پر لکھا تھا : "میری فلمیں دیکھنے کا شکریہ۔ تمہاری اپنی فلم ایکٹریس گلاب بانو۔" وہ بار بار خط پڑھتا، بار بار تصویر کے بوسے لیتا اور اپنی قسمت پر ناز کرتا کہ آخر گلاب بانو بھی اس سے محبت کرنے لگی۔ اس نے گھر کا سارا سامان فرخت کر دیا۔ دھوتی کرتا اتار پھینکا اور کوٹ، پتلون پہن کر، سر پر ہیٹ لگا کر وہ بمبئی روانہ ہو گیا۔ وہ گلاب کے گھر پر ملنے گیا، لیکن اسے کسی نے اندر نہ گھسنے دیا۔ وہ دربان سے کہنے لگا "گلاب مجھے برسوں سے جانتی ہے۔ یہ دیکھو، اس کا خط اور فوٹو۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ تم کیوں دو دلوں کے درمیان دیوار بن رہے ہو؟"

دربان اس کا لباس دیکھ کر مسکرایا۔ "تمہارے جیسے دل پھینک روز یہاں آتے ہیں اور میں ہر روز دروازے سے انہیں دھکے مار مار کر باہر پھینکتا ہوں۔ جاؤ، اپنی راہ پکڑو۔"

ناامید ہو کر وہ فلم اسٹوڈیو پہنچا۔ فلم کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ گلاب ہیرو کے انتظار میں برآمدے میں اداس کھڑی تھی۔ پردے کے پیچھے گانا بج رہا تھا۔ گانا ختم ہوتے ہی ہیرو کو لڑکھڑاتے ہوئے زخمی حالت میں برآمدے کے نیچے نظر آنا تھا۔ ہیرو تو ابھی میک اپ روم میں تھا کہ وہ نوجوان یکا یک تماشائیوں کی بھیڑ کو چیرتا، برآمدے کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ اور چلا چلا کر کہنے لگا : "میری گلاب! مجھے پہچانو۔ میں ہوں تمہارا نادان عاشق، پاگل بھنورا۔"

چار سپاہی اس پر ٹوٹ پڑے۔ بھنورے کے پر توڑ دیے گئے۔ وہ زخمی ہو گیا۔ گلاب چلائے جا رہی تھی : "حرام زادے کو باہر پھینک دو!"

گورکھ کہانی پڑھ کر سوچنے لگا کہ اگر وہ فلمیں دیکھتا رہتا تو ایک دن اس کی بھی یہی حالت ہوتی۔ اچھا ہوا کہ سراب جلد ہی ختم ہوگیا۔ چوری اور جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ کسی خوب صورت حسینہ کی جانب دیکھنے سے ملن کی آرزو بڑھتی ہے' بات کرنے سے پروان چڑھتی ہے اور انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ اس لئے کسی بھی نوجوان عورت کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہئے' تا کہ دل میں کوئی بھی احساس ہی پیدا نہ ہو۔ حقیقی محبت کے قابل صرف خدا ہے۔ جس نے خدا سے لو نہیں لگائی اس نے زندگی بے کار گنوائی۔ خدا سے لو لگانے کے لئے دنیا کو چھوڑنا ضروری ہے۔ دنیا کے آرام کو چھوڑنا ضروری ہے' لالچ' غصہ' جھوٹ' چوری' مال وزر کے بوجھ کا دریا پار کرنا ضروری ہے۔ حقیقی سکون اور راحت' دنیاوی عیش و آرام چاہنے والوں کو کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک دنیا سے محبت نہیں چھوٹتی' انسان خدا کی جانب پہلی سیڑھی بھی نہیں چڑھتا۔ جو شخص دل میں خواہشوں کا انبار سجائے اور ہاتھ میں مالا تھامے لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے' وہ عام آدمیوں سے زیادہ پست ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دل سے ہی ساری برائیاں جڑ سے نکال پھینک دی جائیں' لیکن یہ بھی خیال رہے کہ دل ہی نہ باہر آجائے۔ سب برائیوں کی جڑ ہے تمنا' خواہ اچھی ہو یا بری۔ امتحان میں اچھے نمبر آئیں' صحت ٹھیک رہے' کوئی نقصان نہ ہو' فائدہ ہوتا رہے' بگڑے کام بنتے رہیں' یہ سب اگرچہ نیک تمناؤں میں شامل ہیں' لیکن پھر بھی سنہرے جال ہیں۔ اور جال تو جال ہے' چاہے لوہے کا ہو یا سونے کا۔ دراصل آزاد وہ ہے جس کے دل میں کوئی تمنا نہ ہو' جسے یہ احساس ہو کہ دنیا کی نعمتیں اسے اپنی طرف نہیں کھینچ سکتیں۔ جسے یہ یقین ہو کہ اس کے لئے دنیا میں کچھ کرنے کو باقی نہیں رہا ہے' لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہے' کیوں کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ جو بھی کرنا ہے' اس کے انجام سے بے خبر ہو کر۔ خود آگاہی کا لمس اس سے میلوں دور ہے۔ نتیجہ کچھ بھی نکلے' خوشی اور رنج ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ اسی طرح سیاہ اور سفید' اچھا اور برا بھی دو پہلو' دو رنگ ہیں۔ جب انسان ان دو پہلوؤں اور دو رنگوں میں شکیب دل یکساں رکھ سکے تو سمجھو کہ اس نے صحیح معنوں میں منزل کی جانب ایک قدم بڑھا لیا۔

گورکھ نے بہت سی کتابیں اور فلسفے ان دنوں پڑھ ڈالے۔ بجائے اس کے کہ آگہی اور خرد ایک جگہ قیام پا جاتیں' فلسفے نے ساکن کو بھی حرکت میں ڈال دیا۔ ایک فلسفہ دوسرے سے کتنا مختلف تھا۔ سچائی کو جس نے بھی دیکھا ہوگا' محض ایک جھلک بھر ہی دیکھا ہوگا۔ یا پھر کئی شکلوں میں دیکھا ہوگا۔ یا اسی طرح دیکھا ہوگا جیسے پانچ اندھے ہاتھی کو دیکھنے گئے اور ہر اندھا ہاتھی کا سراپا اپنے اپنے تجربے کے مطابق بیان کرنے لگا۔ یعنی اصلیت کو بے نقاب دیکھنا ناممکن ہے۔

گھر کے قریب ایک مہا مہوپادھیائے رہتے تھے۔ وہ ڈگری کالج میں ایم اے کے طالب علموں کو سنسکرت پڑھاتے تھے۔ فلسفے کے ہر باریک نکتے پر بہت عالمانہ طور سے روشنی ڈالتے تھے۔ ایک روز اپادھیائے گورکھ سے

کہنے لگے "کوئی طالب علم جب پہلی جماعت میں داخل ہوتا ہے اور ماسٹر اسے سکھاتا ہے : "ایک جمع ایک برابر دو تو طالب علم پلٹ کر نہیں پوچھتا کہ ایک میں ایک جمع کرنے سے دو کیوں ہوئے۔ اس طرح گورکھ 'تم بھی ابھی پہلی جماعت کے طالب علم ہو۔ اعتماد پیدا کرو۔ یقین پیدا کرو۔"

پھر بھی گورکھ کوئی نہ کوئی الجھن لے کر اپادھیائے کے پاس پہنچ جاتا۔ آخری بات اسی پر ٹوٹتی کہ یقین پیدا کرو' یعنی آنکھیں بند کرلو۔"

ایک دن اپادھیائے کہنے لگے : "صرف فلسفہ پڑھنے سے کوئی بھی شخص آج تک نہ کہیں پہنچا ہے' نہ پہنچے گا۔ جب تک عملی زندگی میں فرق نہیں پڑتا' سب فلسفہ بے کار ہے۔ اگر خدا کسی موٹی کتاب کی جلد میں چھپا ہوتا تو اسے علماء کب کا جلد سے باہر نکال کر پنجرے میں قید کر دیتے۔ زندگی بھر فلسفے پڑھتے رہو۔ زیادہ سے زیادہ کس کالج میں فلسفے کے پروفیسر ہو جاؤ گے' لیکن خدا اس اور حقیقت سے اتنے ہی دور رہو گے جتنے اب ہو۔ مطلب یہ کہ کچھ کرو' اپنے کو بدلو۔

"لیکن گورکھ یہ نہ سمجھ سکا کہ کرے۔ تو کیا کرے زندگی ایک ترازو پر نہیں تل سکتی۔ وہ ترازو نہ کبھی دیکھی تھی' نہ کبھی وجود میں آئے گی۔ اس لئے مختلف نظریوں پر یقین لازم نہ سہی' لیکن انہیں قطعی نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کی بہت سی منزلوں سے گزر کر ہی شاید یقین تک پہنچا جاسکتا ہوگا۔ اگرچہ یہ بھی ضروری نہیں۔ زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی کئی باتوں پر یقین کو ہلا دیتی ہیں' تاہم ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کئی شخص کسی ایک شے پر کامل یقین کر سکے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس نشے کی خاصیت تھی یا عقیدے کا کرشمہ کہ ان کا یقین پختہ ہوتا چلا گیا۔ کیا یقین صرف اس لئے پیدا کیا جائے کہ کوئی کرشمہ وجود میں آئے؟ کیا کوئی بھی یقین زندگی کے لئے ضروری ہے؟ یا وہ زندگی کی ناکامیوں اور اپنی خامیوں کو برداشت کرنے کے لئے صرف ایک قیاسی سہارا ہے۔ جب ذہن ہر سوال کا جواب چاہے اور الجھنوں میں پڑا رہے تو یقین کہاں ممکن ہو سکتا ہے؟

اپادھیائے گورکھ کو سمجھانے لگے "جس طرح کالج میں ڈگری حاصل کرنے کے لئے صبح سے شام تک محنت کرتے ہو' کتابیں پڑھتے ہو' اس طرح یقین کو بھی محنت سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ وہ مفت میں نہیں مل جاتا۔ اوتاروں اور پیغمبروں نے جو کام کئے ہیں انہیں صرف وہی کر سکتے تھے۔ عام آدمی کو ان کی نقل نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی انہیں شک کی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ ان پر ایمان لانا ہی لازم ہے۔"

گورکھ سوچنے لگا' اس کا مطلب ہے کہ عقل کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دینا چاہئے؟

ذہن میں اگر شک ہی شک بھرے ہوں تو یقین کہاں سے آئے؟ لیکن ہوا کا رخ بدل چکا تھا۔ کامل ایمان نہ سہی' لیکن گورکھ ایک خاص کشش کے زیر اثر ایک نئی راہ کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ کہ یہ راہ بھی چل کر دیکھوں' تھوڑی دور ہی سہی۔ روزانہ صبح کو پوجا پاٹھ کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا تو روز بروز زور پکڑتا چلا گیا۔ کسی دن

صبح کو چار بجے ہی اٹھ جاتا۔ چراغ جلا کر وہ گھنٹوں چراغ کی لو کو دیکھتا رہتا۔ تا کہ ذہن یک سوئی کا عادی بن جائے کسی بھی جوان لڑکی سے آنکھیں چار نہ کرتا۔ اگر چہ ان میں بھی دیئے جلتے رہتے۔ مالا 'مالا کے منکے اور منتر ہی اس کے دل کے مالک بن بیٹھے۔ شملہ کی گوری 'گوکل' فلمیں اور سنہرے پردے پر رقص کرتی پر شباب دو شیزائیں یادوں کے غار میں ایسی دفن ہوئیں کہ ان دنوں کبھی نہ ابھریں۔ سہگل 'ثریا' پنکج' شمشاد اور لتا کے گانے دماغ کے جن تاروں پر بجتے تھے' وہ تار ہی ٹوٹ گئے۔ ان کی جگہ نئے تار لگ گئے' جن پر 'میرا کے بھجن' کبیر کے دوہے بجنے لگے۔

گوپال داس نے ایک ریڈیو خریدا۔ گورکھ کو اگر پتہ چلتا کہ رات کے بارہ بجے کسی ریڈیو اسٹیشن سے بھجن براڈ کاسٹ کیئے جائیں گے تو وہ بارہ بجے تک ضرور جاگتا۔ ریڈیو کے قریب ہی اس نے ایک چھوٹی سی میز اور کرسی ڈال لی۔ پڑھتے وقت عموماً" ریڈیو پر کوئی نہ کوئی بھجن سن رہا ہوتا۔ سنتے سنتے بہت بھجن ذہن کے تاروں میں بھر گئے' دل میں سما گئے اور زبان سے بھی ادا ہونے لگے۔ سنیما کے گیتوں اور غزلوں کی جگہ بھجنوں نے سنبھال لی تو گورکھ نے بھجن لکھنے شروع کر دیئے۔ جو بھی بھجن اچھا لگتا' اسے ایک بہت موٹی جلد کی کاپی میں لکھ لیتا۔ رفتہ رفتہ رہن سہن اور لباس میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ کھانے پینے کا شوق تو پہلے ہی کم تھا' اب کھانے میں لذت ڈھونڈنا بھی ممنوع تھا' کھانے کا مقصد صرف پیٹ بھرنا رہ گیا' کیوں کہ کھانے میں لذت ڈھونڈنا انسانی خواہشات کو بھڑکاتا ہے۔ بہت سی لذیز کھانے کی چیزیں جیسے حلوا' مٹھائی گھی' ترشی' اور شکر اس نے چھوڑ دیئے۔ سر کے بال بڑھانے شروع کیئے تو وہ شانوں تک لہرانے لگے۔ اگر چہ کالج قمیض اور پتلون پہن کر جاتا' مگر قمیض کو پتلون کے باہر ہی لٹکتا چھوڑ دیتا۔ یعنی پتلون کا استعمال پاجامے کی طرح کرتا۔ کالج کے طالب علم' پروفیسر او ردوست اس کا حلیہ دیکھ کر پہلے تو اسے اس روش سے باز آنے کی تلقین کرتے رہے' مگر جب اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو تھک ہار کر خاموش ہو گئے۔ ایک دوست کہنے لگا "گورکھ تم نے تو پتلون کو پاجامہ بنا کر خود کو پاجامہ بنا رکھا ہے!" گورکھ ایسی کسی بات کا برا نہ مانتا بس ہنس دیا کرتا۔ یعنی زمانہ اس پر ہنستا اور وہ زمانے پر۔ گورکھ کی نظر میں ان دنوں زمانے کی اہمیت پاجامے سے زیادہ نہ تھی۔

اگر چہ گورکھ زمانے کی رنگینیوں سے دور ہٹتا جا رہا تھا' لیکن پڑھائی کا شوق بدستور باقی تھا۔ کالج میں اسے کیمسٹری اور حساب خاص طور سے دل چسپ لگتے تھے۔ کیمسٹری میں شوق اس قدر بڑھا کہ بہت سے ایلمینٹوں (عناصر) اور مرکبوں کی خاصیتیں اسے دماغ پر زور دیئے بغیر ذہن نشین ہونے لگیں۔ ایک مرکب سے دوسرے مرکب کا گہرا تعلق ہے' لوہے اور کوئلے میں کتنا کم فرق ہے' سب وہ آسانی سے سمجھ گیا۔ سب سے زیادہ دل چسپی اسے کیمسٹری کے تجربوں میں تھی۔ ایک مرکب میں دوسرا مرکب حل کرنے سے کیا نتیجہ اخذ ہو گا' اور کیوں ہو گا یہ سمجھنا اس کے لئے ولولہ خیز تھا۔ کیمسٹری کی تجربہ گاہ میں شیشیوں میں بے شمار عناصر اور مرکب

بھرے تھے، تجربہ کرنے کے آلات، اور کشید کرنے کا سامان، برنز، ترازوئیں جو ایک ملی گرام کا فرق بھی بتا سکتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اس کا جی چاہتا کہ کاش ایسی تجربہ گاہ اس کے گھر میں بھی ہو اور وہ سارے دن مرکبوں سے کھیلتا رہے۔ ان کی خوبیاں پرکھتا رہے۔ ہفتے میں دو دن شام کے وقت تجربہ گاہ میں کلاس لگتی تھی۔ گورکھ نے پیسے کی چوری چھوڑدی تھی، لیکن مرکب چرانے سے باز نہ آیا جس دن پہلا مرکب چرایا، اسے کاغذ کی تہوں میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مرکب کاغذ کی تہوں میں محفوظ رہے گا اور اس کی خوبیاں نہیں بدلیں گی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے وہ مرکب ایک خالی بوتل میں بھرلیا۔ جب بھی کیمسٹری کی تجربہ گاہ میں اسے موقع ملتا، کوئی نہ کوئی مرکب چرالیتا۔ لیکن کچھ مرکب۔ تیزاب کی سی تاثیر رکھتے تھے، کچھ اتنے تیز زہریلے تھے کہ اگر کسی وجہ سے زبان کی نوک تک پہنچ جائیں تو موت ہوجائے۔ پھر مرکبوں کی خصوصیات پر تجربہ کرنے کے لئے اور بھی بہت سا سامان درکار تھا۔ انہیں گرم کرنا، تیزاب ڈال کر دیکھنا، رنگ پرکھنا، جو بھی بخارات پیدا ہوں، ان کا مشاہدہ کرنا، اس کے لئے کہاں سے اتنا سامان آئے گا؟ پھر بھی چوری کرنے میں وہ کافی استاد ثابت ہوا۔ شملہ کا تجربہ یہاں بہت کام آیا۔ اس نے بہت سے آلات چوری کرکے جمع کرلئے۔ پھر بھی کئی بھاری اور زیادہ حجم کے آلات اسے کیمسٹ کی دکان سے خریدنے پڑے۔ کیمسٹری کا یہ شوق دیوانگی کی حد تک پہنچنے لگا۔ کیمسٹری میں ہڈیوں کی خاصیتیں پڑھ کر اس نے ہڈیاں اکھٹی کرنی شروع کردیں۔ اسے یاد ہے کہ ایک روز بوچڑ خانے سے بکرے کا تازہ خون اور ہڈیاں لے آیا تھا۔ انگیٹھی میں کوئلے کی آگ بھڑکا کر انگیٹھی چھت پر لے گیا۔ انگیٹھی پر ایک لوہے کی کڑاہی رکھ کر اس میں ریت بھرا، پھر خون، ہڈیاں اور خاص کیمیکلز کا مرکب شیشے کی صراحی میں ڈال کر ریت پر گرم کیا۔ کئی گھنٹے تک یہ تجربہ چلتا رہا۔ سارے محلے میں ایک خاص طرح کی بو پھیل گئی، جیسے کوئی مردہ جل رہا ہو۔ ایک پڑوسی خیریت دریافت کرنے کے لئے آگیا تو گورکھ کو اپنی کارروائی بند کرنی پڑی۔

اس شوق کا خاتمہ بارہویں کلاس کا نتیجہ نکلنے پر ہوا۔ گورکھ پہلے درجے میں اچھے نمبر لے کر پاس ہوا تھا۔ اب گورکھ کے سامنے تھا کہ بی ایس سی میں کون سے مضمون لئے جائیں۔ اگرچہ اسے حساب اور کیمسٹری، دونوں سے دلچسپی تھی، لیکن وہ آئندہ چاہتا تھا کہ وہ کسی کیمسٹری کی بہت بڑی لیبوریٹری میں ریسرچ کرے۔ والدین، دوست، پروفیسر سب اس منصوبے کے خلاف تھے۔ ایک دوست کہنے لگا "ہمت ہے تو حساب کے مضمون میں کچھ کرکے دیکھاؤ۔ کیمسٹری میں کیا رکھا ہے؟ کیوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو؟ اصلیت یہ ہے کہ حساب کے مشکل مضمون سے تم ڈرتے ہو، اسی لئے کیمسٹری کی بات کرتے ہو۔" کالج کے ہوشیار طالب علم حساب کا مضمون ہی لیتے تھے۔ بی ایس سی میں حساب کے چار پرچے ہوتے تھے اور ایک انگریزی کا۔ گورکھ نے بے دلی سے بی ایس سی میں داخلے کا فارم بھرتے وقت حساب کا مضمون بھردیا۔ پھر گھر آکر الماری کھول کر چار کیمیکلز نالی میں بہادیئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جیسے جیسے وہ کیمیکلز ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے، رنگ

چھوڑتے، نالی کے گندے پانی میں بہنے لگے، اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر اس محلول میں شامل ہو گئے۔

کالج میں تعطیلات تھیں۔ گورکھ تقریباً ہر روز الماری کھول کر دیر تک اپنا جمع کیا ہوا کیمسٹری کا سامان دیکھتا رہتا۔ اس نے تجربے کرنے چھوڑ دیئے تھے، صرف ایک حسرت کی نظر رہ گئی تھی، جیسے کوئی مرنے والے کو آخری نظر دیکھا کرتا ہے۔ جس دن کالج کھلا اور گورکھ کالج سے واپس آیا اس نے ایک ایک کیمیکل گھر کے دروازے کے باہر رواں نالی کے سپرد کر دیا۔ ایک ایک شیشی اور بوتل توڑ ڈالی اور باقی سامان ایک ٹوکری میں رکھ کر دور کھیت میں پھینک آیا۔ اس رات کا خواب اس کی یادوں میں تازہ ہے۔ اس نے دیکھا کہ شملہ کی اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان بوتلیں اور شیشیاں زندہ ہو اٹھی ہیں۔ چاندنی رات میں سنہری رنگ بھرے جگمگاتی بے شمار بوتلیں قریب سے لے کر دور دراز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک بوتل بڑھتی بڑھتی چاند کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بوتلیں مسکرا رہی ہیں، ناچ رہی ہیں اور حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی اشاروں سے اسے قریب بلا رہی ہیں۔ کاش وہ بھی ایک بوتل بن جائے اور ان میں شامل ہو جائے۔

گورکھ نے پہلی بار سرکس دیکھا تو ایک نئے شوق نے اسے آگھیرا۔ سرکس کے کرتب دکھاتے جوان لڑکے اور لڑکیاں' اونچائی پر جھولتے' بلندی سے کودتے' ہوا میں قلابازی کھاتے اسے بہت خوب صورت لگے۔ سرکس کے مسخرے' مونہہ سے آگ نکالنے کا جادو' جانوروں اور آدمیوں کے غیر معمولی کرتب' سب نے اس کے دل پر گہرا نقش چھوڑا۔ اسے خیال آیا' کیوں نہ وہ سرکس میں شامل ہو جائے؟ ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومنا اور کرتب دکھانا۔ کتنی مزے کی زندگی ہوگی! دو بار وہ سرکس دیکھ آیا۔ تیسری بار اور چوتھی بار بھی دیکھ آیا۔ اور اس قدر متاثر ہوا کہ سرکس والوں کی طرح قلابازیاں کھانے کی مشق کرنے لگا۔ سر کے بل کھڑے ہونا اس نے یوگ آسن کرتے وقت پہلے ہی سیکھ لیا تھا۔ لیکن ہاتھوں کے بل قلابازی کھانا پھر بھی اس کے لئے مشکل تھا۔

شہر میں سرکس کے آخری دو دن رہ گئے تو گورکھ سوچنے لگا کہ دو دن کے بعد سرکس والے کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔ کیا وہ سرکس میں بھرتی ہونے کے لئے گھر سے بھاگ سکتا ہے؟ کیا وہ ماں باپ' بھائی بہن سب کو چھوڑ کر' بغیر اطلاع دیئے چلا جائے؟ اس کے سرکس میں بھرتی ہو جانے سے والدین کے دل پر کیا گزرے گی؟ وہ چند روز بعد انہیں خط لکھ دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے والد اسے ڈھونڈ نکالیں اور گھر لے جانے کی کوشش کریں۔ کالج کی پڑھائی کا کیا ہوگا؟ حساب کا مضمون جو روز بروز دلچسپ ہوتا جا رہا ہے اس کا کیا ہوگا؟ کیا وہ سرکس میں جانے کے لئے زندگی کا رخ بدل دے؟ اِن خیالات سے گورکھ کا دل کانپ جاتا اور ایک اجنبی خوف اسے جکڑ لیتا۔ جو بھی ہوگا' دیکھا جائے گا۔ سب سے پہلے اسے دیکھنا چاہئے کہ سرکس والے اسے بھرتی کرنے کے لئے رضامند بھی ہیں یا نہیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ اس روز کا شو شروع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ گورکھ سرکس کے خیموں کے باہر چکر لگانے لگا۔ ایک طرف رہائش کے تمبو تنے تھے' دوسری طرف جانوروں کے' کافی وسیع جگہ گھیری ہوئی تھی۔ وہ اجازت کے بغیر اس طرف بڑھ چلا جہاں تختیوں پر صاف لکھا تھا : ”اندر جانا منع ہے۔ عام راستہ نہیں ہے۔“

ایک جوان' جو گھوڑے کو گھاس ڈال رہا تھا اس سے مخاطب ہوا۔ ”تم اندر کیسے چلے آئے؟ کس سے ملنا ہے؟“

"مجھے سرکس کے منیجر سے ملنا ہے۔" گورکھ نے کہا۔

"کیا کام ہے؟" جوان نے پوچھا۔

"میں سرکس میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔" گورکھ سیدھا مطلب کی بات پر آ گیا۔

جوان ہنس پڑا اور اس کی جانب تیز نظریں پھینکتے ہوئے بولا "چلو بھاگو یہاں سے، بہت آتے ہیں تمہارے جیسے سرکس میں بھرتی ہونے!"

گورکھ نے التجا کی : "مجھے ایک بار منیجر سے ملوا تو دو۔ اگر وہ نہیں مانیں گے تو میں چلا جاؤں گا۔"

جوان مسکراتا ہوا گورکھ کو منیجر کے پاس لے گیا۔ کچھ دیر گورکھ منیجر کے سامنے کھڑا رہا۔ جسمانی طور پر منیجر بہت شہ زور نظر آ رہا تھا۔ اس کی موٹی موٹی مونچھوں نے اس کے چہرے کو اور بھی رعب دار بنا دیا تھا۔ جوان نے ہنستے ہوئے گورکھ کی جانب اشارہ کیا اور کہا "یہ سرکس میں بھرتی ہونے آیا ہے۔ میں نے بہت منع کیا، لیکن آپ سے بات کئے بغیر لوٹنا نہیں چاہتا۔"

منیجر نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گورکھ سے پوچھا "تمہیں سرکس میں بھرتی ہونے کا شوق کیوں پیدا ہوا؟ اور تم سرکس میں کیا کام کرنا چاہتے ہو؟"

گورکھ نے سادگی سے کہا؟ "میں آپ کے سرکس میں کھلاڑیوں کے کرتب چار بار دیکھ چکا ہوں۔ مجھے بہت اچھے لگے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں بھی اپنے جسم کو اسی طرح قابو میں کر کے لوگوں کو کرتب دکھاؤں۔"

منیجر بولا "خوب! کیا اس وقت کرتب دکھا سکتے ہو؟"

گورکھ نے کہا "میں سر کے بل کھڑا ہو سکتا ہوں۔"

"اور کیا کر سکتے ہو؟"

"ابھی تو اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

منیجر مسکرایا۔ "کرتے کیا ہو؟ لمبے بالوں اور مرغ جیسے سینے سے تو مجنوں لگتے ہو!"

گورکھ نے فخریہ کہا۔ "بی۔ ایس سی۔ کے پہلے سال میں ہوں۔ ڈگری کالج میں پڑھتا ہوں۔"

منیجر پھر مسکرایا "ماں باپ سے سرکس میں بھرتی ہونے کی اجازت لے کر آئے ہو؟"

گورکھ نے جواب دیا "نہیں۔"

منیجر طنز پر اتر آیا۔ "گھر سے بھاگنا چاہتے ہو؟ کیوں؟ کیا تکلیف ہے؟"

گورکھ بولا "کوئی تکلیف نہیں۔ بس مجھے سرکس کے کھیل اچھے لگتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں بھی یہ کھیل کر سکتا ہوں۔"

منیجر نے اسے سمجھایا کہ وہ اسے سرکس میں نہیں رکھ سکتا، کیوں کہ ایک تو وہ گھر سے بھاگ کر آیا ہے۔

دوسرے یہ کہ کسی بھی فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے کڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ریڈیو پر طبلے کی آواز اچھی لگتی ہے، لیکن طبلچی برسوں تک دن رات کی ریاضت کے بعد کہیں ریڈیو اسٹیشن تک پہنچ پاتا ہے۔ وہ بی ایس سی کا طالب علم ہے، اسے چاہئے کہ دل لگا کر پڑھائی کرے اور دل کو جگہ جگہ نہ بھٹکائے۔

یہ سب منیجر نے شاید گورکھ کی بہتری کے لئے کہا تھا، مگر گورکھ مونہہ لٹکائے، منیجر کی باتوں کی چبھن کا احساس لئے لوٹ آیا۔

شہر سے سرکس والے رخصت ہوگئے، مگران کے کرتب گورکھ کے دل پر ایک مہر سی ثبت کر گئے۔

اگرچہ گورکھ بی ایس سی کا طالب علم تھا، لیکن گوپال داس اس سے عزت سے پیش نہیں آتے تھے۔ ڈانٹ ڈپٹ کسی حد تک تو کم ہو گئی تھی، لیکن بے وجہ خفگی جوں کی توں باقی تھی۔ کوئی بات اگر گوپال داس کے مزاج کے مطابق نہ ہوتی تو انہیں غصہ آجاتا اور وہ اس کا اظہار بھی ضرور کرتے۔ گھر کے کافی کام گورکھ کے سپرد تھے۔ ضروریات کی بہت سی چیزیں وہی خرید کر لاتا تھا۔ لیکن اس کے لئے سب سے مشکل کام تھا اپنے والد کی پسند کے آم خریدنا۔ گھر سے کچھ ہی دور سبزیوں اور پھلوں کی دکانیں تھیں۔ گورکھ کو تاکید کی گئی تھی کہ آم کا نیچے کا حصہ دبا کر دیکھنا چاہئے۔ اگر نرم ہو تو ہرگز وہ آم نہیں خریدنا چاہئے لیکن آم طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ کاٹنے والا، چوسنے والا، ہرا، پیلا، لال، دسہری، قلمی، بنارسی، طرح طرح کے ذائقے کے آم۔ اکثر گورکھ کو دکانداروں کی ڈانٹ کھانی پڑتی۔ بڑے دکان دار تو آموں کے ٹوکرے کو ہاتھ ہی نہ لگانے دیتے اور آم خود اٹھا کر ترازو پر چڑھاتے۔ ان سے صرف درخواست کی جا سکتی تھی کہ اچھے آم تولیں۔ تولنے کے بعد جب لفافے میں ڈال کر آم گورکھ کے حوالے کر دیئے جاتے اور وہ ان کی جانچ کرنے لگتا تو کسی بھی آم کو بدلنا مشکل ہوتا۔ اگر کوئی آم بظاہر خراب نظر آتا تو دکان دار اس کے عوض ایک چھوٹا سا آم لفافے میں ڈال دیتا۔ کبھی کبھی تکرار ہو جاتی اور دکان دار لفافہ گورکھ کے ہاتھ سے چھین کر آم واپس ٹوکرے میں ڈال دیتا اور نقدی یہ کہتے ہوئے لوٹا دیتا : ”کہیں اور جا کر آم خریدو۔ میری دکان پر مت آیا کرو۔“ چھوٹے دکان دار اسے ہر آم کا نچلا حصہ دباتے دیکھ خفا ہو جاتے۔ ”کیا کر رہے ہو؟ دبا دبا کر سارے آم خراب کرو گے؟ آم ہیں گوندھا ہوا آٹا نہیں! آدھا سیر آم خریدو گے اور دس سیر کا ٹوکرا برباد کرو گے۔“

اپنی طرف سے تو گورکھ بہترین آم خرید کر لاتا، لیکن آم نوش کرتے وقت گوپال داس ضرور نکتہ چینی کرتے : ”آج سارے آم کھٹے ہیں۔ آج بہت میٹھے ہیں۔ آج کسی درجہ نرم ہیں۔ آج سخت ہیں۔ آج بہت مہنگے ہیں، اگرچہ اچھے ہیں۔ تم سے کتنی بار کہا کہ چار دکانوں پر بھاؤ پوچھ کر خریدا کرو۔ آج تو تم نے پیسہ ہی برباد کر ڈالا۔ ایک بھی آم کھانے کے قابل نہیں ہے۔“ گورکھ سوچتا، کاش یہ آم خریدنے کا کام اس سے چھین لیا جائے! کاش والد خود اپنی پسند کے آم خرید لیا کریں اور اسے بازار نہ بھیجا کریں! کاش بازار میں آم ملنے ہی بند ہو جائیں!

کاش والد آم کھانے بند کر دیں! کاش پیڑوں پر آم لگنے بند ہو جائیں۔ اگر پیڑوں پر آم لگا ہی کریں تو بندر انہیں کھا لیا کریں! وہ بازار میں نہ بکا کریں!" اس کی کوئی دعا اثر نہ دکھا سکی۔ وہ آم خرید تا رہا اور ڈانٹ کھاتا رہا۔

گورکھ کے گھر کے سامنے ایک نوجوان لڑکی رہتی تھی۔ نام تھا چمپا۔ عمر کوئی بیس یا بائیس سال ہوگی۔ محلے کے لوگ سرگوشیاں کرتے رہتے: "جوان لڑکی گھر میں بٹھا رکھی ہے۔ معلوم نہیں اس کی شادی کیوں نہیں کرتے؟" کبھی کبھی چمپا گورکھ کے گھر آجایا کرتی' گورکھ کی ماں اور بہن سے باتیں کرتی اور چلی جاتی۔ ایک دن دوپہر کے وقت چمپا آئی تو تاش کھیلنے کی فرمائش کرنے لگی۔ گورکھ ریڈیو کے قریب بیٹھا حساب کے سوال کر رہا تھا۔ محلے کی عورتیں جمع ہو کر اکثر تاش کھیلتی تھیں۔ اس روز کوئی دوسری عورت تاش کھیلنے کو موجود نہ تھی۔ بس گورکھ کی ماں بہن اور چمپا تھیں۔ کم سے کم ایک ساتھی اور کی ضرورت تھی۔ چمپا گورکھ کی بہن شنو سے کہنے لگی "تمہارا بھائی سارے دن یا تو کتاب پڑھتا رہتا ہے یا پوجا کرتا رہتا ہے۔ کیا اس کا دماغ کچھ خراب ہے؟ اگر اسے سنیاس ہی لینا ہے تو حساب کے سوال حل کرنے کی کیا ضرورت؟ خیر' پوچھو تو اس سے' اگر وہ تاش کھیلنا چاہتا ہے تو آجائے۔" شنو نے گورکھ سے پوچھا تو گورکھ نے جواب دیا "مجھے تاش کھیلنا نہیں آتا۔"

چمپا قریب ہی کھڑی تھی۔ کہنے لگی "میں سکھادوں گی۔ اٹھو تو سہی۔"

گورکھ کو تاش کے کھیل میں کوئی دل چسپی نہ تھی' لیکن وہ چمپا کا کہنا نہ ٹال سکا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ محلے کی عورتیں جس تاش کے کھیل میں گھنٹوں وقت صرف کرتیں اور ہنستے ہنستے بے قابو ہو جاتیں' اس کا نام تھا : "بھابھی۔" چمپا اور ساوتری نے گورکھ کو تاش کے پتوں کی چال سے آگاہ کیا۔ جس کے ہاتھ میں آخر میں تاش رہ جائے وہ "بھابھی۔" کھیل کے قاعدے گورکھ نے سمجھ لئے' لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ جب وہ دوبار "بھابھی" بن چکا تو چمپا اسے چھیڑنے لگی : "بار بار بھابھی' بننے والے کو قرض چکانا پڑتا ہے' کچھ ہارنا پڑتا ہے بولو کیا ہاروگے؟"

گورکھ بولا "تم اگر پیسے کی شرط لگا کر کھیل رہی ہو تو میری ماں سے حساب برابر کرلو۔ میرے پاس ہارنے کے لئے یہ حساب کے سوالوں کی کاپی ہے' اور یہ سوال تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔" اتنا کہنے کے بعد گورکھ سوچنے لگا کہ اس کی زبان اتنی بے باک کیسے ہو گئی۔

چمپا ہنستے ہوئے بولی "ہارنے کو تو تم اور کچھ بھی ہار سکتے ہو' جیسے یہ اپنے لمبے' لڑکیوں جیسے بال۔"

گورکھ کھسیا گیا۔ "میں تمہارے تاش کے کھیل سے باز آیا۔ میرے بال تمہارے کس کام کے؟"

اس روز کچھ دیر یوں ہی چھیڑ چلتی رہی۔ چند دن بعد خبر پھیلی کہ چمپا اپنے عاشق کے ساتھ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔

گورکھ کے دماغ سے نسوانی حسن کے سائے تقریباً مٹ چلے تھے' لیکن خوابوں پر اس کا بس نہ چلتا۔ وہ

سوچتا کہ جب آنکھ کھول کر وہ کسی شوخ ادا پر نظریں تک نہیں اٹھاتا' تو آنکھ بند کرتے ہی کیوں کوئی پری رخ اس پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ وہ حسن کی اس ادا کو سمجھنے میں قطعی ناکام رہا۔ اسے خیال آتا : "شاید میرے دل میں ہی کوئی پری رہتی ہے۔ میرے ذہن میں اس کے سائے ہیں' ورنہ کیوں کوئی پری رخ اچانک حملہ کرے اور مینکا کی طرح رشی وشوامتر کا برہمچریہ بھرشٹ کر جائے۔ وشوامتر تو ایک بار گرا تھا' میرا تصور مجھے بار بار گرا رہا ہے۔" اس بات کا ذکر وہ کسی سے نہ کرتا' لیکن وہ پشیمان ضرور ہوتا۔ خیالات تھے جو آنکھ بند کرتے ہی ایک خوب صورت نازنین کی صورت اختیار کر لیتے۔

گورکھ نے برہمچریہ پر کئی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ سب کا خلاصہ یہی تھا کہ بوند کو اندر سمیٹنا ہی یوگ ہے؟ ہے' بلندی ہے' پاکیزگی ہے۔ اور بوند کو باہر پھینکنا ہی گراوٹ ہے' ناپاکیزگی ہے' بد چلنی ہے۔ لیکن اگر بوند خود بخود باہر نکل آئے تو وہ کیا کرے؟ اس نے تو آنکھ' دل اور دماغ کے سارے بیرونی راستے بند کر دیئے ہیں۔ وہ تو سنیاسی ہو چلا ہے۔ اسی کی دماغی حالت اس درجہ سدھری ہے کہ کوئی خوب صورت لڑکی نظر کے دروازے سے ہو کر ذہن میں ایک لہر تک نہیں پیدا کر سکتی۔ پھر نیند میں ہونے پر وہ وار کرنے سے کیوں نہیں چوکتی؟ اس کے دل و دماغ میں کیا بھرا ہے' اس کا اندازہ وہ کیوں کر لگائے؟ کس سے اس الجھن کا حال کہے؟

ایک دن گھومتے ہوئے جگ جگ سوامی جالندھر آ پہنچے۔ گورکھ کو خیال آیا کہ سوامی نے تو مہاتما بدھ کی طرح اپنی نئی شادی شدہ بیوی چھوڑ رکھی تھی۔ ضرور ان کی بوند ان کے سر تک پہنچ گئی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ سوامی کا چہرہ اس قدر روشن ہے۔

گورکھ نے اپنی بوند کی بات کہے بغیر مہاتما سے پوچھا "ہماری دھارمک کتابوں میں برہمچریہ کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے؟"

مہاتما بولے "بوند ہی اوج' ہے' طاقت ہے' کائینات ہے' زندگی ہے' یوگ ہے۔ اسے من سے قابو میں کرنا ہوتا ہے۔ کام یابی بہت مشکل ہے' لیکن کوشش کرنے سے ضرور ملتی ہے۔"

گورکھ نے پوچھا "پرانے زمانے میں طالب علم پچیس سال تک کس طرح برہمچاری رہتے تھے؟"

مہاتما نے جواب دیا "وہ یوگ کرتے تھے۔ اچھی کتابیں پڑھتے تھے' خیالات کو قابو میں رکھتے تھے۔ عورت کی شکل تک نہ دیکھتے تھے۔ آج کل سنیما' سگریٹ' چائے' ناول سب نے تباہی مچائی ہوئی ہے۔"

گورکھ نے سوچا : "لیکن آج کل تو میں نے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ کمی کس بات کی ہے؟" بظاہر پھر وہ مہاتما سے پوچھنے لگا "آپ کوئی آسان طریقہ بتا سکتے ہیں کہ برہمچریہ میں کام یابی حاصل ہو؟"

مہاتما بولے "بچہ' دماغ میں عورت کا کوئی خیال آنے ہی نہ دو۔ عورت صرف تمہاری ماں ہے' بہن ہے' بیٹی ہے' معشوقہ ہرگز نہیں ہے' لنگوٹ کس کر رکھ۔"

وہ لنگوٹ کی شروعات تھی۔ گورکھ نے لنگوٹ کو ضرور کس کر باندھا' لیکن خواب لنگوٹ ڈھیلا کر دیتے۔ دل و دماغ پر لگائی ساری بندشیں بے کار ثابت ہوئیں۔ کسی کے لب' کسی کا جسم اس کے قریب ہوتا اور ایسا لذت کا جھونکا بن جاتا کہ اس کی ترنشانی' لنگوٹ میں قید ہو جاتی۔

گورکھ کو اپنے بھائی نریش اور چاروں بہنوں سے بہت پیار تھا۔ مگر پیار کی عجیب علامت تھی کہ وہ بہنوں کو' خاص طور سے شنو کو کسی نہ کسی بات پر ستاتا ضرور۔ پھر جب بہن ناراض ہو جاتیں تو وہ انہیں منانے میں بھی کسر نہ چھوڑتا۔ ان سے کہتا "تم تو میری عزیز بہن ہو۔ بہن بھائی کی پیار کی عزت رکھ لو۔ ذرا مسکرا کر دکھاؤ۔ آئندہ نہیں ستاؤں گا۔" لیکن کچھ دن بعد پھر ستا بیٹھتا۔ اس نے بہنوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا' کھیل میں اس نے شنو کو زخمی کر دیا۔ اس نے پانی کا گلاس شنو کی جانب پھینکا' جو اس کی ناک پر وار کر گیا۔ چوٹ تو بھر گئی' لیکن ایک مستقل نشاں رہ گیا۔ یہ واقعہ انبالہ شہر کا تھا جب شرارتیں اس کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھیں۔ شنو ہمیشہ اسے چھیڑتی : "زندگی بھر یاد رہے گا کہ میرے بھائی نے میری خوب صورت ناک کا حلیہ بگاڑ دیا۔ تمہاری شرارت کی نشانی ہمیشہ میرے پاس رہے گی۔ اسے کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔" گورکھ کو بہت افسوس ہوتا اور بہن کے ان الفاظ میں چھپا ہوا بے حد محبت کا احساس بھی۔ وہ کہتا "بہن آؤ ہم آپس میں ناک بدل لیتے ہیں۔"

شرارت کے زیر اثر ایک حادثہ چھوٹے بھائی نریش کے ساتھ بھی ہو گیا۔

نریش کو سینما کی لت لگ چکی تھی والدین اس سے بے خبر تھے نریش۔ گورکھ کے ہی نقش قدم پر چل رہا تھا۔ ایک روز گورکھ نریش کو خود سینما ہال میں چھوڑ کر آیا۔ نریش جب دیر سے گھر لوٹا تو گوپال داس اس سے پوچھنے لگے "کہاں گیا تھا؟ کیوں اتنی دیر سے گھر لوٹا ہے؟"

نریش بولا "میں اپنے دوست کے گھر بیٹھا پڑھ رہا تھا۔" گورکھ کو چاہئے تھا کہ بھائی کے جھوٹ پر پردہ ڈالتا۔ وہ خود کتنی صفائی سے جھوٹ بولتا رہا تھا۔ مگر بغیر اپنے گریباں میں جھانکے؟ نریش کی شکایت کر بیٹھا "نریش جھوٹ بولتا ہے۔ یہ تو فلم دیکھنے گیا تھا۔ میں اسے خود سینما ہال چھوڑ کر آیا تھا۔"

نریش اپنی بات پر اڑا رہا۔ گوپال داس نے پوچھ گچھ شروع کی۔ "کون سے دوست کے گھر گیا تھا؟"

نریش نے کسی دوست کے گھر کا پتہ بتایا تو گوپال داس بولے "چل میرے ساتھ میں جا کر پوچھتا ہوں کہ تو واقعی وہاں موجود تھا کہ نہیں۔"

نریش کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ اسے کسی دوست کے گھر جانا پڑا۔ اتفاق سے دوست اس وقت گھر میں موجود نہ تھا۔ مگر گوپال داس بھی پیچھا چھوڑنے والے نہ تھے۔ انہوں نے دوست کے والدین سے معلوم کیا کہ وہ کہاں گیا ہوا ہے۔ پھر وہ دوست کے دوست کے گھر پہنچے۔ آخر قلعی کھل گئی اور جھوٹ ثابت ہو گیا۔ گوپال داس غصے میں لال پیلے ہو گئے۔ "ابھی سے تم جھوٹ بولنے لگے! ایک تو چوری' پھر چوری کو چھپانے کے لئے جھوٹ!

"اس دن نریش کی بری طرح پٹائی ہوئی۔ ساوتری بیچ میں آئی تو وہ بھی مار سے نہ بچ سکی۔ ماں اور بھائی کو پٹتا دیکھ کر گورکھ کے دل پر رنج اور ملامت کے بادل گھر آئے۔ ساری رات تکئے میں مونہہ چھپائے روتا رہا۔ وہ اس قدر خود غرض ہو سکتا ہے' اسے معلوم نہ تھا۔ شملہ میں اس نے کیا کچھ نہ کیا۔ کتنے جھوٹ بولے' کتنی فلمیں دیکھیں۔ وہ بھی گھر سے پیسے چرا چرا کر' سامان بیچ بیچ کر۔ لعنت ہے اس کے جینے پر! اسے ڈوب مرنا چاہئے۔ چلو بھر پانی میں۔ اس کے ساتھ ہی اسے گوپال داس پر بے حد غصہ آیا۔ وہ آدمی ہے کہ جانور؟ سب بچوں کو سنیما کا شوق ہوتا ہے' اسے اس راہ سے ہٹانے کا طریقہ زور زبردستی سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر ماں باپ محبت کا ماحول پیدا کریں تو اولاد شاید کبھی جھوٹ نہ بولے۔ کبھی چوری نہ کرے۔ وہ گوپال داس کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اس نے ساوتری پر بھی ہاتھ اٹھایا۔ وہ کیسا انسان ہے جو اپنی بیوی کو جسمانی چوٹ پہنچا سکتا ہے؟

گورکھ بہت دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ اسے سب سے زیادہ غصہ اپنے اوپر تھا۔ اس نے دیکھا کہ والد مزے سے خراٹے بھر رہے ہیں اور ماں بے چین پڑی ہے۔

صبح ہوئی۔ گورکھ بہت خاموش اور شرمندہ تھا۔ اس نے ناشتہ بھی نہ کیا۔ ماں نے اسے اپنی پیٹھ دکھائی۔ والد کی چھڑی ماں کی پیٹھ پر بھی تین یا تین لکیریں چھوڑ گئی تھی۔ گورکھ کچھ نہ بولا۔ اس نے کسی سے کچھ نہ کہا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ سب لوگ چھت پر بستر لگا کر سوتے تھے۔ گورکھ ہر روز سویرے چار' پانچ بجے اٹھتا' چھت سے نیچے اترتا' کمرے میں بند ہو کر چھڑی نکالتا اور اس سے خوب اپنے آپ کو پیٹتا۔ سوچتا کہ لکیریں اتنی ہی سرخ اور گہری ہونی چاہئیں جتنی اس کے گناہوں نے تعمیر کر ڈالی تھیں۔ ایک ہفتے تک وہ خود کو پیٹتا رہا' رانوں' ٹانگوں اور بازوؤں پر جلد لال اور کالی ہو اٹھی۔ البتہ چھڑی سے پیٹھ کی مرمت کرنا اس کے لئے مشکل تھا' کیوں کہ چھڑی صرف آگے کی طرف چلتی ہے' کسی آدم زاد کی طرح پیچھے سے وار کرنا چھڑی کی عادت میں شامل نہیں۔

بچپن کے کچھ شوق کسی نہ کسی شکل میں قائم رہتے ہیں اور کچھ وقت کی گرد میں لاپتہ ہو جاتے ہیں۔ گورکھ کا پینٹنگ اور ڈرائینگ کا شوق ایک ایسی۔ صورت اختیار کرنے لگا۔ مدھوبالا اور ثریا کی جگہ کنہیا' رادھا' شنکر اور پاروتی نے لے لی۔ ان صورتوں کے ساتھ' پہاڑ' میدان' جھرنے' جھونپڑے' دریا' سورج' چاند' ستارے اور دوسرے قدرتی نظارے بھی کاغذ پر اترنے لگے۔ سنیما کے سائن بورڈ نے اسے بہت متاثر کیا۔ ریلوے اسٹیشن سے کچھ ہی دور سائن بورڈ تیار ہوتے تھے۔ مصور دس منٹ میں مینا کماری کو کینوس پر اتار ڈالتا۔ گورکھ پہروں وہاں کھڑا مصوری کا کمال دیکھتا۔ ایک بار ہمت کر کے اس نے مصور سے پوچھا "کیا مجھے بھی یہ ہنر سکھا سکتے ہو؟ مجھے مصوری کا بڑا شوق ہے۔"

مصور بولا "ہم کسی کو بھی اپنے برش کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ یہ میرے منڈے' دیکھ رہے ہو۔ ان میں

سے کوئی کینوس کھینچتا ہے‘ کوئی اس پر گوند لگاتا ہے‘ کوئی اسے دھوتا ہے۔ تم میرا منڈا‘ بننا چاہتے ہو تو چلے آؤ۔ ہو سکتا ہے دو تین سال بعد میں تمہیں برش کو ہاتھ لگانے دوں۔‘‘

گورکھ نے کہا ’’میں بالکل اناڑی بھی نہیں ہوں۔ کاغذ پر اچھی خاصی تصویر بنا لیتا ہوں۔ میں بڑے پیمانے پر رنگوں سے تصویر بنانا چاہتا ہوں۔‘‘

مصور نے بے پروائی سے مشورہ دیا: ’’تو جاؤ۔ بازار سے بڑا سا کینوس خریدو‘ رنگ خریدو اور چلاؤ ہاتھ یا برش۔ میرا سر کیوں کھا رہے ہو؟‘‘

مصور کی باتیں سن کر گورکھ ٹھنڈا پڑ گیا۔

ان دنوں ’’دلاری‘‘ فلم چل رہی تھی۔ فلم کا ایک پوسٹر جگہ جگہ دیواروں پر چپکا ہوا تھا۔ ایک رقاصہ بال کھولے‘ ایک ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے‘ پازیب بجاتی بل کھا رہی تھی۔ گورکھ نے رات کے بارہ بجے وہ پوسٹر ایک دیوار سے اتارا اور ہو بہو اس کی نقل کی۔ وہ تصویر آج بھی اس کے پاس موجود ہے۔ دو آنے کے کاغذ پر بنی رقاصا کی کشش اور خوب صورتی کبھی کم نہ ہوئی۔

ایک چنچل سی عورت کبھی کبھی ساوتری سے ملنے آتی تھی۔ پڑوس میں رہنے کے ناطے سرسری سی جان پہچان تھی۔ اس کا ایک ہی لڑکا تھا‘ جو چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا۔ گورکھ اسے ’آنٹی‘ کہتا تھا۔ دوبار آنٹی نے گورکھ سے اصرار کیا کہ وہ اس کے بیٹے کی پڑھائی میں مدد کر دیا کرے۔ مگر گورکھ ہوں ہاں کر کے ٹال گیا۔ ساوتری کے ایک دوبار کہنے پر بھی اس نے آنٹی کے گھر کا رخ نہ کیا۔ ماں سے کہہ دیا ’’میرے پاس وقت ہی نہیں کہ میں کسی دوسرے کو پڑھاؤں۔ میں کالج کی پڑھائی اور گھر کے کاموں میں بہت مصروف رہتا ہوں۔‘‘

ایک دن محلے میں خبر پھیلی کہ آنٹی کے شوہر کی ایک حادثہ میں اچانک موت ہو گئی۔ وہ چلتی ریل گاڑی میں چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پٹڑی پر جا گرا اور فوراً مر گیا۔ بہت دردناک موت تھی۔ محلے کے تقریباً سب لوگ آنٹی کے پرسے کے لئے آنٹی کے گھر گئے‘ مگر گورکھ نہیں گیا۔ ایک خیال برق کی طرح اس کے دماغ میں کوند گیا۔

اگر اس کے والد کی یکایک موت ہو جائے تو کیا ہو؟ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ خاندان میں اور کوئی بھی نہیں جو ان کی مدد کر سکے۔ وہ ابھی بی ایس سی کے آخری سال میں ہے۔ کون اسے نوکری دے گا؟ کیسے وہ ماں‘ بھائی اور بہنوں کی پرورش کرے گا‘ کیسے انہیں پڑھائے گا؟ کون اس کی بہنوں سے شادی کرے گا؟ اگر یہ قیامت آ گئی تو ایک نہیں سات زندگیاں ایک ساتھ برباد ہو جائیں گی۔ جیسے جیسے یہ خیال زور پکڑتا گیا‘ وہ تصوراتی حادثے کا انجام سوچتا رہا۔ اس کی بے چینی بڑھنے لگی۔ صبح شام‘ سوتے‘ جاگتے یہی خیال اسے پریشان کئے رکھتا اور بہت کوشش کے بعد بھی پیچھا نہ چھوڑتا۔ شام کو دفتر سے لوٹتے وقت اگر گوپال داس کو

گھر پہنچنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی' تو گورکھ کی نظریں دروازے کے باہر سڑک تک بچھی رہتیں۔ ایک دن جب گوپال داس کسی وجہ سے گھر کافی دیر سے لوٹے تو گورکھ کی جان لبوں پر تھی۔ اس نے دل کا خوف کسی پر ظاہر نہ کیا' لیکن اندر ہی اندر وہ خوف زدہ رہنے لگا۔ اس نے سوچا' شاید کوئی دھارمک کتاب پڑھنے سے سکون حاصل ہو۔ کتابوں نے واقعی اسے دلاسا دیا۔ زندگی اور موت خدا کے قبضے میں ہے' کچھ لوگ جرمنی کی جنگ سے بھی بچ کر واپس آگئے اور دوسرے بستر پر لیٹے ہوئے بھی مر گئے۔ لیکن خدا کی مرضی کو کون جان سکتا ہے؟ کیا معلوم خدا کو کب' کہاں' اور کیوں' کیا منظور ہے۔ جب گورکھ کو سکون نصیب نہ ہوا تو وہ اور کتابیں پڑھتا چلا گیا۔ ٹالسٹائی کی ایک کہانی کا اس کے دل پر کافی اثر ہوا۔ خدا نے ایک فرشتے کو کسی عورت کی جان نکالنے کا حکم دیا۔ فرشتہ جب جان لینے کے لئے مقررہ مقام پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کچھ دیر پہلے اس عورت نے ایک لڑکی کو جنم دیا ہے۔ فرشتہ سوچنے لگا کہ خدائی طور طریقے بھی بڑے نرالے ہیں۔ اس عورت کا شوہر پہلے ہی مر چکا ہے۔ خدا کے فرمان کے مطابق اگر میں اس عورت کی جان نکال لوں تو اس لڑکی کا کیا ہوگا؟ بہتر تھا کہ خدا مجھے ماں اور لڑکی' دونوں کی جان نکالنے کا حکم دیتا۔ چنانچہ وہ ماں کی جان لئے بغیر واپس خدا کے حضور میں پہنچ گیا۔ خدا نے اسے زمین پر انسان بنا کر بھیجا۔ کسی دوسرے فرشتے نے اس عورت کی جان نکال لی' وہ لڑکی نہ صرف یہ کہ زندہ رہی' بلکہ جوان ہوئی' ایک شہزادہ اس پر فدا ہوا اور وہ ایک سلطنت کی شہزادی بن گئی۔ اس کہانی سے گورکھ کے دل کو کچھ تسلی تو ہوئی' لیکن خلش پھر بھی باقی رہی۔ اسے ایک تاریخی واقع یاد آیا۔ بابر نے ہمایوں کی چارپائی کے گرد چکر لگا کر اس کا لاعلاج مرض اپنے سر لے لیا تھا۔ ہمایوں بچ گیا اور بابر کی موت ہو گئی۔

گورکھ نے بھی ایک روز گوپال داس کی چارپائی کے گرد سات چکر لگائے اور دعا کرتا رہا : "یا خدا اگر میرے والد کی زندگی پر کوئی مصیبت گزرنی ہے تو وہ مجھ پر ہو جائے۔ یا خدا! میری زندگی میرے والد کو دے دے!"

دعا شاید اسی صورت میں کارگر ہوتی ہے اگر عقیدہ مستحکم ہو۔ اس دعا کے بعد بھی گورکھ کی بے قراری میں فرق نہیں آیا۔ غیبی طاقتیں اور اتفاقات زندگی کا رخ ہوتے ہیں۔ ان پر یقین کرنا لازمی ہے' لیکن غیبی طاقت سے قریبی رشتہ قائم کرنا بالکل الگ بات ہے۔ خدا رسیدہ ہونا پڑھنے اور سننے میں ضرور آتا ہے لیکن حقیقت کوئی نہیں جانتا۔ یکایک گورکھ کے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ آنٹی کے گھر جا کر اس کی حالت کا جائزہ لیا جائے۔ کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ محلے والے آنٹی کے شوہر کی موت تقریباً" بھول چکے ہیں۔ آنٹی بھی گھر کے باہر نظر نہیں آتی۔ ضرور بے چاری پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ معلوم نہیں گھر کا خرچ بھی کیسے چلاتی ہوگی۔ یہی سوچتا ہوا گورکھ ایک دن دوپہر کے وقت آنٹی کے گھر جا پہنچا۔

جیسے ہی گورکھ نے دروازے پر دستک دی' آنٹی نے خود آکر دروازہ کھولا اور اس سے اندر چلے آنے کو کہا۔

آنٹی نے جسم پر چادر لپیٹ رکھی تھی۔ چارپائی پر بیٹھتے ہی اس نے چادر اتار دی اور کہنے لگی "کتنی گرمی ہے! آج سویرے سے بجلی بھی غائب ہے۔ پنکھا بھی نہیں چل رہا ہے۔"

گورکھ نے دیکھا کہ آنٹی ایک ابگنیا نما بلاؤز پہنے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھولنے وہ چادر لپیٹ کر آئی تھی۔ چادر اترتے ہی اس کے چھوٹے سے بلاؤز سے سینے کے نصف دائرے باہر جھانکنے لگے۔ عریاں کمر' پیٹ اور بازو۔ گورکھ نے ایک نظر دیکھ کر گردن جھکالی۔

آنٹی بولی "آج پہلی بار آئے ہو۔ مٹھائی کھاؤ گے؟"

گورکھ نے ہڑبڑا کر کہا۔ "نہیں' نہیں۔ میں تو بس یوں ہی چلا آیا۔"

"آئے ہو تو ذرا بیٹھو' میں تمہارے لئے مٹھائی لاتی ہوں۔" جواب کا انتظار کئے بغیر آنٹی اٹھی اور رسوئی گھر میں چلی گئی۔ ایک طشتری میں مٹھائی بھر کر واپس لوٹی اور پلیٹ گورکھ کے سامنے رکھ کر کہنے لگی۔ "لو کھاؤ۔"

گورکھ نے ہچکچاتے ہوئے ایک برفی کا ٹکرا مونہہ میں رکھ لیا اور آنٹی سے پوچھنے لگا "آپ کا لڑکا کہاں ہے؟ کیا کہیں باہر گیا ہوا ہے؟"

آنٹی بار بار ایک ہاتھ پیچھے کی طرف لے جا کر کمر کھجانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی کبھی دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف لے جاتی تو اس کا ابھرا ہوا سینہ جیسے بلاؤز کی گرہ توڑنے کے لئے بے چین ہو اٹھتا۔ وہ بولی "وہ اپنے چاچا کے گھر گیا ہے۔ اسکول میں دو دن کی چھٹی ہے۔ سوموار کو آجائے گا۔ تم بھی تو میرے لڑکے کی طرح ہو۔ میں نے تو تمہیں کئی بار بلایا' لیکن آج پہلی بار آئے ہو۔ پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"

"پڑھائی تو ٹھیک ہی چل رہی ہے۔" گورکھ نے کہا۔

"بہت اچھی بات ہے' خوب دل لگا کر پڑھنا چاہئے۔ میں اپنے لڑکے کو تمہاری مثال دیتی رہتی ہوں۔ مگر اس کا پڑھنے میں دل ہی نہیں لگتا۔ کبھی کبھی آجایا کرو' اسے کچھ مدد مل جایا کرے گی۔" آنٹی نے اس کے قریب کھسکتے ہوئے کہا۔

"کوشش کروں گا۔" گورکھ نے کہا اور چپ ہو گیا۔

"اتنے شرمائے کیوں بیٹھے ہو۔ مجھے بہت گرمی لگ رہی ہے۔ ذرا میری کمر کھجا دو۔" آنٹی نے سیدھا حملہ کیا۔

گورکھ نے ابھی تک کسی جوان عورت کو اتنے کم لباس میں نہیں دیکھا تھا۔ مانا کہ آنٹی کی عمر تیس سال سے اوپر ہو گی' لیکن حسن کے شعلے ابھی تک سلگ رہے تھے۔ سلگ کہاں رہے تھے' بھڑک رہے تھے۔ عورت کے حسن میں اتنی کشش' اتنی خوب صورتی! یا خدا تو نے عورت بنائی ہی کیوں؟ اگر بنائی بھی تو مرد کے دل میں اس کے لئے اتنی کشش کیوں پیدا کی۔ جگ جگ سوامی ٹھیک کہتا ہے کہ عورت کے حسن میں شعلوں کی لپٹ

ہوتی ہے۔ گورکھ کچھ سوچتا ہوا کرسی سے اٹھا اور آنٹی کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا لیکن اس کا ہاتھ آنٹی کی کمر تک اٹھ کر واپس آگیا اور وہ مسکینی صورت بنا کر بولا "آنٹی جی، آپ ایک کام کریں۔ آپ جا کر غسل کر لیں۔ آپ کی خارش اور گرمی دونوں ہی مٹ جائیں گی۔ میں چلتا ہوں۔"

یکایک آنٹی نے گردن گھما کر گورکھ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ گورکھ اپنے کو چھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ آنٹی کہہ رہی تھی : "کیا کبھی پیار سے اپنی ماں کے گلے نہیں لگتے؟"

گورکھ نے دوبارہ آنٹی کے گھر کا رخ نہ کیا۔ لیکن سینے پر گداز لمس کا جھونکا اسے ضرور یاد رہا۔

گورکھ کا فائنل سال کا امتحان ہو چکا تھا۔ نتیجہ دو مہینے بعد نکلنا تھا۔ گورکھ سوچتا رہتا کہ دنیا ایک عجائب خانہ ہے۔ جو کچھ دیکھ لیا وہ کافی ہے۔ اب اور کیا دیکھنا ہے؟ دنیا کو جلد سے جلد چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ بہت پڑھائی ہو چکی باقی عمر فقیری میں گزر جائے تو اچھا ہے۔ شادی دراصل بربادی کا دوسرا نام ہے۔ کیا کرنا ہے شادی رچا کے؟ کیا کرنا ہے اولاد پیدا کر کے؟ دنیا میں پہلے ہی بہت بچے موجود ہیں۔ شادی کر کے عورت کے حسن کے مزے لوٹنا قطعی ناپاک ارادہ ہے۔ اسے ہرگز عملی جامہ نہیں پہنانا چاہئے۔ ایسے ہی خیالوں کی رو میں بہتا گورکھ کسی اسکول میں ماسٹر کی نوکری ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ والدین کو اس بات کی خبر نہ ہونی چاہئے۔ نوکری ملتے ہی وہ گھر سے چلا جائے گا۔ جیسے فقیروں کو زمانے سے کوئی غرض نہیں رہتی، نوکری میں جو بھی حاصل ہوگا، ضروریات اس سے پوری ہو جائیں گی، کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے گا، یعنی بھیک نہیں مانگنی پڑے گی۔ پھر اپنی ضروریات کو کم بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیا ضرورت ہے شان دار مکانوں کی، میز کرسی کی، بجلی کے پنکھے کی، ریڈیو کی، لذیز کھانے کی؟ کھانا صرف پیٹ بھرنے کے لئے کھانا چاہئے، نہ کہ زبان کی لذت کے لئے۔ پھر بچوں کو پڑھانے سے اچھا اور کوئی پیشہ نہیں ہو سکتا۔ یاد ہے انبالہ شہر کا اسکول۔ بدماش بچے اور بے پروا ماسٹر۔ انہیں فقط ایک ہی ہنر آتا تھا۔ بچوں کو ڈرانا، انہیں نئے نئے طریقوں سے پیٹنا۔ اگر بچوں کو محبت سے قابو میں کیا جائے، انہیں اپنا سمجھا جائے تو اسکول کا ماحول ہی بدل جائے۔ زمانہ چاہے کچھ بھی کہے، والدین چاہے کچھ بھی سوچیں، یہی راہ زندگی کی اصلی راہ ہے۔ اگرچہ اس پر چلنا مشکل ہے، لیکن اگر سچی لگن ہے تو باقی سب ہیچ ہے۔ جب تک انسان دنیا میں ہوس کی پرستش کرے گا اسے کبھی خدا نہیں ملے گا۔ آگے پڑھ کر بھی کیا ہو گا؟ وہ ماسٹر کی بجائے پروفیسر بن جائے گا۔ زیادہ روپیہ کمائے گا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس لئے راہ بدلنے کا وقت سامنے آگیا ہے۔

گورکھ نے اپادھیائے سے درخواست کی کہ اسے سنسکرت پڑھا دیا کریں۔ پہلے تو اپادھیائے رضامند نہ ہوئے، لیکن گورکھ کی بار بار کی ضد سے تنگ آ کر کہنے لگے "اچھا کل گھر پر آجانا۔ دیکھتا ہوں، پہلا سبق کیسے سیکھتے ہو۔"

اگلے دن اپادھیائے نے پڑھایا اور گورکھ نے دہرایا۔ اپادھیائے اس کی لگن دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہنے لگے "میں نے آج تک ہزاروں طالب علموں کو پڑھایا، لیکن کسی نے بھی میرا سکھایا پہلا سبق اس مستعدی سے نہیں دہرایا۔" اس طرح اپادھیائے کو پڑھانے کا شوق پیدا ہوا اور گورکھ کو پڑھنے کا۔

جب بھی وہ سنسکرت زبان کی تعریف کرتا اور اس کی خوبیاں بیان کرتا تو اپادھائے خوشی سے سرہلاتے۔ انہیں کوئی گورکھ جیسا طالب علم پہلے نہیں ملا تھا اور نہ گورکھ کو کوئی اپادھیائے جیسا استاد ہاتھ لگا تھا۔ چھ مہینے بعد جب وہ اپادھیائے سے رخصت ہونے لگا تو وہ بولے "میں نے چھ مہینے میں تمہیں سنسکرت کی گرامر اسی درجے تک پڑھا ڈالی ہے جتنی میں ایک ایم اے کے طالب علم کو ڈگری کالج میں پڑھاتا ہوں۔ اور سنسکرت کی بنیاد اس کی گرامر ہے۔"

ادھر گورکھ سنسکرت پڑھ کر زندگی بھر فقیری کے خواب دیکھ رہا تھا اور ماسٹری کی نوکری تلاش کر رہا تھا اور ادھر گوپال داس اس کی آگے کی پڑھائی کی فکر میں تھے۔ گورکھ نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر آگے پڑھنا ہی ہے تو وہ حساب کے مضمون میں ایم ایس سی کر سکتا ہے۔ کمیسٹری کی طرح وہ حساب کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ والد کہنے لگے "چلو، آج تمہاری ملاقات ایک اوورسیر سے کرواتے ہیں۔"

شام کا وقت تھا۔ دونوں اوورسیر کے گھر پہنچے۔ صدر دروازے پر چوکی دار نے نام اور ملاقات کا مقصد پوچھنے کے بعد بنگلے کے اندر گھسنے دیا۔ ہری مخملی گھاس، ترتیب سے بنی کیاریاں، رنگا رنگ پھول، سایہ دار درخت، جگہ جگہ پانی کے فوارے، قد آدم سنگ مرمر کے بت۔ گورکھ گھر کے باہر کا نقشہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اندر قدم رکھا تو سجے ہوئے کمرے، خوب صورت اور مہنگا ساز و سامان، دیوار پر کنہیا کی ایک نہایت ہی خوبصورت تصویر، زیورات اور ساڑیوں میں ملبوس عورتیں، شہر کے بارسوخ زردار لوگ۔ ہندوستان کا یہ کون سا نقشہ ہے جو اس کی نظر سے پہلی بار گزر رہا ہے؟ کہاں گھر کے باہر سڑک پر بیٹھا، چیتھڑوں میں لپٹا بھکاری اور کہاں یہ شان و شوکت۔

گوپال داس اوورسیر سے کہنے لگے "آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے۔"

اوورسیر کرشن کنہیا کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "سب مالک کی دیا ہے۔"

رفتہ رفتہ مہمان رخصت ہوئے۔ گوپال داس دیر تک بیٹھے رہے۔ اوورسیر اکیلا رہ گیا تو گوپال داس بولے "یہ میرا بڑا لڑکا گورکھ ہے۔ بہت ہونہار ہے۔ پڑھائی میں بہت اچھا ہے۔ ابھی بی ایس سی کا سالانہ امتحان دیا ہے۔ آپ بتائیے، اسے آگے کیا پڑھنا ہے؟"

اوورسیر نے کہا "بھئی، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اگر پڑھائی میں یہ اس قدر ذہین ہے تو اسے انجینئرنگ کالج میں داخل کروادیں۔ بہتر رہے گا کہ یہ سیول انجینئرنگ کرلے۔"

"اس شان و شوکت کی بنیاد ضرور ریتلی ہے۔ سیمنٹ میں ریت کا جز کچھ زیادہ ہی رنگ لایا ہے۔" گورکھ

سوچ رہا تھا۔

ایک طرف انجینئرنگ میں داخلے کی کشمکش، دوسری طرف چپکے چپکے ماسٹر کی نوکری کی تلاش۔ انجینئرنگ کالج میں داخلے کی عرضی بھیجنے کا وقت گزرا جارہا تھا۔ والد کے حکم کے مطابق عرضی بھیجنی ضروری تھی۔ انجینئرنگ کی صرف تین شاخیں تھیں۔ سیول، کیمیکل اور الیکٹریکل۔ گورکھ کو مٹی، یا ریت اور سیمنٹ سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اسے مشینری سے بھی کوئی لگاؤ نہ تھا۔ البتہ اڑتی ہوئی برق ضرور دل چسپ ہو سکتی تھی، جو کسی مغرور اور حسین نازنین کی طرح کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔ اڑتے ابر کے آشیانے میں بھی چین سے نہیں بیٹھتی۔ پہروں گرج گرج کر انہیں اشک بار کر دیتی ہے۔

گورکھ نے سوچا کہ داخلے کی عرضی میں کچھ نہ کچھ لکھنا تو ضروری ہے، اس لئے فی الحال الیکٹریکل لکھ دیا جائے۔ جب تک داخلے کا مرحلہ آئے گا، اسے کہیں نہ کہیں ماسٹر کی نوکری مل ہی جائے گا اور داخلہ خود بخود بے دخل ہو جائے گا۔

بی ایس سی کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو گورکھ یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر تھا۔ اول آنے والے طالب علم کے مقابلے میں گورکھ کے نمبر کچھ ہی کم تھے۔ ایک مہینے بعد انجینئرنگ کالج سے داخلے کی منظوری آگئی۔ گوپال داس بہت خوش تھے۔ مٹھائی لے کر آئے۔ وہ ہر صورت میں انجینئرنگ کالج کا خرچ اٹھانے کے لئے تیار تھے۔ پڑوسی مبارک باد دے رہے تھے۔ دوست آنے والے کل کی خوب صورت تصویریں کھینچ رہے تھے اور گورکھ ماسٹر کی نوکری کی تلاش میں تھا۔ کئی جگہ درخواستیں بھیج چکا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر کہیں سے کوئی جواب آیا اور گوپال داس کے ہاتھ وہ چٹھی پڑ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

حساب کی بہت سی کاپیاں اور کتابیں گورکھ کو اس طرح تک رہی تھیں جیسے دو سال پہلے کیمسٹری کے کیمیکلز اور آلات اس سے مخاطب ہوئے تھے۔ مگر ہر حال میں ان کتابوں اور کاپیوں سے رخصت ہونے کا وقت آگیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے حساب کی کاپیاں اور کتابیں ضائع کرنی شروع کیں۔ گوپال داس نے ایک بار کہا "انہیں برباد کرنے کے بجائے کسی طالب علم کو دے آؤ۔ کسی کے کام ہی آئیں گی۔" مگر گورکھ کہاں کسی طالب علم کو ڈھونڈنے جاتا اسے کاپیوں میں درج ایک ایک سوال کے جواب کو برباد کرنے میں جو درد بھری لذت محسوس ہو رہی تھی، وہ اس سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

گورکھ نے کئی جگہ اسکول ماسٹر کی نوکری کے لئے عرضیاں بھیجی تھیں، لیکن کہیں سے جواب حاصل نہ ہوا صرف ایک جگہ سے جواب آیا کہ ابھی جگہ خالی نہیں۔ وہ ڈاکئے کا بے صبری سے انتظار کرتا۔ سوچتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکیہ خط چھوڑ جائے اور وہ گوپال داس کے ہاتھ پڑے۔ انجینئرنگ کالج کے لئے رخصت ہونے کے دن قریب آرہے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ انجینئرنگ کالج کے لئے روانہ ہو اور پیچھے سے کوئی نوکری کی منظوری

آجائے۔ جہاں جہاں بھی اس نے عرضی بھیجی تھی' وہاں اس نے دوبارہ خط لکھا کہ اس نے ماسٹر کی نوکری کا ارادہ بدل دیا ہے۔ آخر بھنڈی انجینئرنگ کالج کے لئے روانہ ہونے کا دن بھی آپہنچا۔

گورکھ کو کبھی گھر سے دو دن کے لئے بھی دور رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ سرکس، فقیری اور اسکول کی ماسٹری کی دھن میں اس نے گھر چھوڑنے کے بہت سے خیالی پلاؤ پکائے تھے، لیکن کبھی اس نے اپنا ارادہ بدل دیا، کبھی وقت ہی بدل گیا۔ پھر جب وہ سب کی رضامندی سے انجینئرنگ کی پڑھائی کے لئے رخصت ہو رہا تھا تو اس کے چہرے پر اداسی کے آثار کیوں تھے؟ یہ نامعلوم سا خوف کیسا تھا؟ اگر واقعی اسے پہلے گھر چھوڑنے کا موقع مل جاتا تو شاید وہ راستے سے ہی واپس لوٹ آتا اور گھر والوں کی مرضی کے خلاف علیحدہ راہ اختیار نہ کرتا۔ گھر چھوڑتے وقت جیسے ہر چیز پکار پکار کر اس کے قدم روک رہی تھی۔ اس پر یہ حقیقت کھلی کہ گھر والوں کی محبت کا اس کے دل پر قبضہ ہے۔ وہ محبت کا جذبہ جسے وہ گھر میں رہ کر نہ پہچان سکا۔ اور آج جب وہ جدا ہونے لگا تو یکایک وہ زور شور سے ابھر آیا۔

گورکھ کا ساز و سامان ریل کے ڈبہ میں پہنچ گیا۔ بستر، کتابوں کا ٹرنک، گھر کی بنی مٹھائی، گھی کا کنستر۔ الوداعی نصیحتیں جاری رہیں۔

"صحت کا خیال رکھنا۔ دل لگا کر پڑھنا۔ خاندان کے تم چراغ ہو۔ ہمیں تم پر فخر ہے۔" ہرا سگنل ہوا۔ گارڈ کی سیٹی سنائی دی اور گورکھ والدین کو پرنام کر کے نم آنکھوں کے ساتھ ریل کے ڈبہ میں داخل ہوا۔ جب تک والدین، بھائی بہنیں نظر سے اوجھل نہ ہوئے، انہیں پلیٹ فارم پر کھڑے اور ہاتھ ہلاتے دیکھتا رہا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی پہلے جیب سے رومال نکال کر پیشانی پر چسپاں لال اور پیلے تلفے صاف کئے، سر کے بالوں میں پھنسے چاول کے دانے جھاڑے اور گم صم بیٹھ گیا۔

پاس بیٹھا ہوا ایک مسافر پوچھنے لگا "کہاں جا رہے ہو؟"

گورکھ نے جواب دیا "بھنڈی جا رہا ہوں انجینئرنگ کالج میں پڑھنے۔"

مسافر بولا "پھر اداس کیوں بیٹھے ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کسی خوش نصیب کو ہی انجینئرنگ کالج میں داخلہ ملتا ہے۔"

گورکھ نے مسکرا کر کہا "اداس کہاں ہوں؟ مگر گھر سے دور جاتے وقت کچھ تو جدائی کا دکھ ہوتا ہی ہے۔" تاہم وہ اپنی شدید اندرونی اداسی اور بے چینی کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ آخر گھر تو چھوڑنا ہی تھا۔ اب نہیں تو دو دن بعد۔

وہ تو خوش نصیب ہے کہ بی ایس سی تک کی پڑھائی گھر میں رہ کر ہو گئی' ورنہ پانچ سال پہلے ہی ہوسٹل کا مونہہ دیکھنا پڑتا۔ اب کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع مل رہا ہے' آزادی مل رہی ہے۔ پھر اداسی کیوں؟"

ریل گاڑی صبح بھنڈی اسٹیشن پر پہنچی۔ گورکھ قلی سے سامان اتروا کر سائیکل رکشا پر سوار ہو انجینئرنگ کالج کے ہوسٹل کی طرف روانہ ہوا۔ کچھ اور طالب علم بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ وہ بھی رکشاؤں پر سوار ہو کر انجینئرنگ کالج ہوسٹل کی طرف جا رہے تھے۔

ایک طالب علم نے گورکھ کو رکشا پر سوار ہوتے دیکھ کر پوچھا "یہ گھی کا کنستر کس کے لئے لے جا رہے ہو؟ اس گھی کا چکھنا بھی شاید تمہارے نصیب میں نہیں۔"

گورکھ حیرت سے پوچھنے لگا "آخر کیوں؟"

"کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ نئے داخل ہونے والوں کا بہت انوکھا استقبال ہوتا ہے؟ سینئر ان کے انتظار میں بھوکے بیٹھے رہتے ہیں۔ خیر' ہوسٹل کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔" طالب علم نے گورکھ کو آگاہ کیا۔

اتنے میں ہوسٹل کا گیٹ آگیا۔ گیٹ کے باہر ہی کچھ لڑکے نئے طالب علموں کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ اس سے پہلے کہ رکشا سے سامان اتارا جاتا' دو سینئر لڑکوں نے رکشا الٹ دیا۔ گورکھ اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ لاتیں اور گھونسے برساتے ہوئے وہ لڑکے اسے ہوسٹل کے میدان کی طرف لے چلے۔ حکم ہوا کہ میدان میں ایک طرف زمین پر لیٹ کر پلٹتے ہوئے بڑھتے چلو۔ جہاں رفتار کم ہوتی سینئر لڑکوں کے جوتے کمر' سینے اور سر پر پڑنے شروع ہو جاتے۔ کوئی ایک فرلانگ کے بعد حکم ہوا کہ گھٹنوں کے بل چلو' ہاتھ زمین پر لگے تو کسی کا جوتا پڑا۔ اس کے بعد ہدایت ہوئی کہ کمر کے بل رینگ کر چلو' پیٹ کے بل رینگ کر چلو۔

دو گھنٹے کی پریڈ کے بعد نئے طالب علم پسینے میں لت پت' باقاعدہ قطار باندھے دھوپ میں کھڑے تھے۔ کئی دوسرے لڑکوں کی طرح گورکھ کے بھی گھٹنے چھل گئے تھے۔ ایک نے پانی مانگنے کی جراءت کی تو کسی سینئر نے اس کے مونہہ پر تھوک دیا۔ گورکھ سوچنے لگا کہ کیوں سب نئے طالب علموں کا خون سرد ہو گیا ہے۔ کیوں نہ وہ سب مل کر ان سینئر لڑکوں پر ٹوٹ پڑیں؟ بعد میں چاہے ہڈی پسلی ٹوٹ جائے' کیوں نہ ان سے ڈٹ کر مقابلہ کریں؟

چار پانچ نئے طالب علموں کی ایک ٹولی بنا دی گئی۔ انہیں حکم ملا کہ سینئر لڑکوں کے کمرے صاف کریں' غسل خانے کا فرش دھوئیں' چیزیں قرینے سے لگا کر رکھیں' کمرے کا فرش گیلے کپڑے سے رگڑیں۔

گورکھ کمرہ صاف کر رہا تھا کہ کسی سینئر نے دانستہ پانی کی بالٹی گرا دی اور ڈپٹ کر کہا "حرام زادہ۔ آگیا انجینئر بننے! پہلے جھاڑو مارنا تو سیکھ!"

نئے لڑکوں کو کام کرتے کرتے دو بج گئے۔ سینئر لڑکے دوپہر کا کھانا کھا چکے تھے۔ نئے طالب علموں کو ابھی

کھانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ ہوسٹل میں کھانے کا کمرہ بہت خوب صورت طریقے سے سجا ہوا تھا۔ نوکر اور بیرے کھانا پروستے تھے۔ کالج کا قاعدہ تھا کہ کوئی بھی لڑکا کوٹ پہنے اور ٹائی لگائے بغیر کھانے کے کمرے میں نہیں گھس سکتا تھا۔

سارے سینئر لڑکے کھانا کھا چکے تو نولروں کو کھانے کے کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔ نئے لڑکوں سے کہا گیا کہ وہ سینئر لڑکوں کی جھوٹی پلیٹیں اٹھائیں' میز صاف کریں' فرش پونچھیں۔ کھانے کا کمرہ صاف ہوتے ہوتے دوپہر کے تین بجنے کو آئے۔ نئے لڑکوں کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ کسی بھی نئے طالب علم نے صبح سے پانی تک نہ پیا تھا۔ آخر انہیں کھانے کی اجازت ملی۔ سینئر لڑکے سر پر کھڑے ہو کر نوالے گنتے رہے۔

کھانے کے بعد گورکھ اپنے کمرے میں پہنچا۔ دو نئے طالب علموں کو ایک مشترکہ کمرہ الاٹ ہوا تھا۔ دوسرا لڑکا نارنگ پہلے سے کمرے میں موجود تھا۔ وہ دراصل "نہ رنگ" تھا۔ سر سے پاؤں تک سیاہ فام۔ گورکھ سے ہاتھ ملاتے ہی بولا۔ "یار' یہ تو بہت زیادتی ہے۔ سنا تو تھا کہ سینئر لڑکے تنگ کرتے ہیں' لیکن یہ تو قطعی بے عزت ہونے' گالیاں کھانے اور ذلت سہنے کے برابر ہے۔ اس طرح کا سلوک تو خونی قیدیوں سے بھی جیل میں نہیں ہوتا۔" گورکھ خاموشی سے نارنگ کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے اپنے سامان پر نظر ڈالی تو گھی کا کنستر اور مٹھائی غائب تھی۔ ٹرنک کا تالا ٹوٹا پڑا تھا۔ یہی حال نارنگ کے سامان کا بھی تھا۔ مگر سویرے سے جس سختی کے ساتھ ان سے کام لیا گیا تھا' اس نے گورکھ کو سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ بستر میں گرتے ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور اس کے بعد دروازہ دھڑاکے سے کھل گیا۔ گورکھ آنکھ ملتے ہوئے بستر سے اٹھا۔ زور آزمائی سے دروازے کا اندر سے بند کرنے والا قبضہ باہر نکل آیا تھا۔ دو سینئر لڑکے کمرے میں گھس آئے تھے۔ انہوں نے گورکھ کی چارپائی الٹ دی اور چلا کر کہا "حرام زادہ! خبردار جو آج کے بعد کبھی دروازہ اندر سے بند کر کے سویا۔ چل اٹھ' بہت آرام کر لیا۔"

گورکھ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بولو : تم الو کے پٹھے ہو۔" ایک سینئر نے حکم دیا۔

"میں الو کا پٹھا ہوں۔" گورکھ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"بولو تم حرام زادے ہو۔" سینئر نے دوسرا حکم دیا۔

گورکھ کچھ دیر کے لئے چپ ہو گیا تو چار گھونسے اس کے جبڑے پر پڑے۔ ایک نے گرج کر کہا۔ "زندگی چاہتے ہو تو بولو کہ تم حرام زادے ہو۔"

"میں حرام زادہ ہوں۔" گورکھ نے بے بسی سے کہا۔

"بولو : (ماں بہن کی گالی دیتے ہوئے)۔۔۔ ہوں۔"

"میں۔۔۔۔۔ ہوں۔"

"بولو میں نے بہت بڑی خطا کی کہ انجینئر بنے چلا آیا۔"

"بولو : اگر سب سینئر میری۔۔۔۔۔ تو مجھے منظور ہے۔"

"گورکھ دہراتا چلا گیا۔ اسے احساس ہی نہ تھا کہ وہ کیا دہرا رہا ہے۔

"ایک سینئر نے گورکھ کے لمبے بال کھینچنا شروع کئے۔ "یہاں شاعری کرنے آیا ہے یا انجینئر بننے؟"

دوسرے سینئر نے قینچی سے اس کے بال بے ترتیبی سے کاٹ ڈالے اور کہا "آج شام کو حجام سے بال کٹوا کر کالج پہنچنا، نہیں تو وہ حالت بنائیں گے کہ کالج چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔"

ایک سینئر نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور نوٹوں کی گڈی نکال لی۔ "جیب خرچ کے لئے اتنا روپیہ؟ سینئر لوگوں میں بانٹ کر کھانا سیکھو۔" پانچ روپے گورکھ کی جیب میں رکھ کر باقی پچیس روپے اس نے اپنی جیب میں رکھ لئے۔

شام کو میدان میں صبح کی طرح رینگ کر چلنے، گھٹنوں کے بل چلنے، میدان کے چار پانچ چکر لگانے، اور بار بار سینئر لڑکوں کے ہاتھوں بے عزت ہونے کا سلسلہ چلتا رہا۔ آخر شام ہوئی۔ شام کا کھانا بھی اسی طرح نصیب ہوا جیسے دوپہر کا ہوا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ سب نئے طالب علموں کو چار پانچ کی ٹولیوں میں بانٹ کر سینئر لڑکوں کے کمروں میں طلب کیا گیا۔

چار سینئر لڑکے کرسیوں پر یا چارپائی پر آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔ پانچ نئے طالب علم ان کے سامنے زمین پر بیٹھے تھے۔ جن میں گورکھ بھی شامل تھا۔ یکایک ایک سینئر نے نئے لڑکوں کو حکم دیا کہ غسل خانے میں جاکر تمام کپڑے اتار کر واپس آجائیں۔ سب نئے طالب علم ایک دوسرے کا مونہہ تکنے لگے، لیکن کسی کی حکم عدولی کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سب اپنے اپنے کپڑے غسل خانے میں چھوڑ کر بالکل عریاں، ہاتھوں سے اپنے ننگے پن کو چھپانے کی کوششیں کرتے ہوئے دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے۔

"سیدھے تن کر کھڑے ہو جاؤ، ورنہ ہاتھوں کے ساتھ کہیں اور بھی چوٹ آسکتی ہے۔"

سب سیدھے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ایک سینئر نے بارہ انچ لمبا پیمانہ ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا "پیمائش کر کے لمبائی کاغذ پر لکھو۔"

دوسرے سینئر نے مائکرو میٹر ایک نئے لڑکے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "پیمائش کر کے موٹائی کاغذ پر لکھو۔"

نئے لڑکے ایک دوسرے کا مونہہ تکتے ہوئے کام میں مشغول ہو گئے۔

"الو کے پٹھے! چلے آئے انجینئر بننے! لمبائی اور موٹائی ٹھیک طرح سے ناپو۔"
ایک سینئر گورکھ کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔
ذرا سب لوگ ادھر دیکھ کر بتاؤ کہ یہ لڑکا ہے کہ لڑکی؟" اس نے گورکھ کی طرف سب کی توجہ دلائی۔
سب لڑکے گورکھ کو دیکھ کر ہنسنے لگے' گورکھ کے ساتھی بھی' جو قطار میں عریاں کھڑے تھے' مسکرانے لگے۔

"حرام زادے کی چھاتی پر ایک بال نہیں۔ ٹانگیں دیکھو تو وہ بھی چکنی۔ اس سے زیادہ تو بال لڑکیوں کی ٹانگوں پر ہوتے ہیں۔ ڈاڑھی مونچھ فقط نام کے لئے۔" پھر گورکھ کے عضو مخصوص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ذرا اس جانور کی طرف بھی غور فرمائیں۔ میری انگلی سے دبلا اور انگوٹھے سے بھی چھوٹا! حرام زادہ ہیجڑا ہے۔ اولاد نہیں پیدا ہوگی۔ چلا آیا انجینئر بننے! کون اس کا رعب مانے گا؟"
سب گورکھ کی جانب دیکھ کر ہنس رہے تھے کہ ایک سینئر چلایا۔ "قیدیوں کے لئے ہنسنا منع ہے۔ اگر کسی نے دانت باہر نکالے تو باہر کے باہر ہی رہ جائیں گے۔ جو میں پوچھتا ہوں' اس کا جواب دو۔۔۔ کیا کسی عورت کی جائے مخصوص دیکھی ہے؟"
قیدیوں پر سناٹا چھا گیا۔
سینئر نے پہلے قیدی سے کہا "جواب دو ورنہ بہت برا حال ہوگا۔ سالے کو نامرد بنا دوں گا۔"
"جی ہاں دیکھی ہے۔ بہت بار چھوٹے بچوں کی جائے مخصوص پر نظر ڈالی ہے۔" ایک نئے لڑکے نے کہا
سینئر چیخا : "کان پکڑ اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔ کتنی گندی نظر ہے تیری! شرم نہیں آتی ایسی بات کرتے ہوئے بھی؟ خدا بھی تیرے گناہوں کو معاف نہیں کرے گا۔ جا غسل خانے میں اور ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح غسل کر کے باہر آ۔ جب تک میں نہیں کہتا' خبردار جو پانی بند کیا۔ میں یہیں بیٹھا پانی کے گرنے کی آواز سن رہا ہوں۔"
پہلا قیدی چلا گیا تو دوسرے کی باری آئی۔ وہ بولا "جی نہیں' میں نے کبھی نہیں دیکھی۔"
"حرام زادے! زندگی برباد کر دی! جو دیکھنے کی چیز تھی' وہ دیکھی نہیں' اور کیا دیکھتا رہا؟"
قیدی خاموش۔
"جا تو بھی پہلے قیدی کے ساتھ غسل کر۔ میں ابھی آکر معائنہ کرتا ہوں۔"
"رفتہ رفتہ پانچوں قیدی غسل خانے میں پہنچ گئے۔ جب سرد پانی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر دانت بجنے لگے تو انہیں باہر نکلنے کا حکم ملا۔ ان سب کے جسم سے ٹپ ٹپ پانی ٹپک رہا تھا۔ دوبارہ کمرے میں آئے تو قدرے جان میں جان آئی۔

"عورت ذات کی جائے مخصوص دیکھنے سے پہلے اسی طرح غسل کرنا پڑتا ہے۔ سمجھو تم گنگا نہا آئے ہو۔ اب تیار ہو درشن کرنے کے لئے؟"

قیدی چپ کھڑے تھے کہ سینئر دوبارہ چلایا: "انجینئرنگ کا یہی پہلا سبق ہے۔ زور سے بولو۔ دیوی کی جے۔۔۔! دیوی کے۔۔۔۔۔ کی جے! دیوی کی بار بار جے!"

قیدی ہاتھ باندھے، سر جھکائے جے جے کرنے لگے۔ سینئر انہیں ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں دیوار پر ایک عریاں جوان عورت کی قد آدم تصویر چپکی ہوئی تھی۔ سامنے بہت سی موم بتیاں روشن تھیں۔ خوشبو دار اگر بتیاں جل رہی تھی۔ پانچ عریاں قیدی زمین بوس ہو کر اس دیوی سے سینئر لڑکوں سے چھٹکارا پانے کی خاموش دعا مانگنے لگے۔ لیکن یہ سلسلہ وہیں ختم ہونے والا نہ تھا۔

"اگر یہ عورت سچ مچ زندہ ہو کر تم پانچوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو جائے تو کیا کرو گے؟" ان سے پوچھا گیا اور سب سے پہلے گورکھ سے جواب طلبی ہوئی۔

"میں فوراً سرپٹ بھاگ جاؤں گا۔" گورکھ بولا۔

یہ جواب سن کر سب سینئر ہنسنے لگے۔ "نامرد سے اور کیا امید ہو سکتی ہے!"

سیکس کی باتوں کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ رات کے بارہ بجے انہیں اپنے کمروں میں لوٹنے کی اجازت ملی۔ لیکن انہیں سونا کہاں نصیب ہوا۔ چار پانچ بجے کے لگ بھگ دو سینئر ان کے کمرے میں گھس آئے اور لان میں پانی دینے والے پائپ سے ان کے بستر پانی سے تر کر دئے۔

کالج میں پڑھائی کا پہلا دن تھا۔ پروفیسروں کا برتاؤ گورکھ کو بہت دوستانہ لگا۔ ایک پروفیسر نے ہوسٹل میں سینئر لڑکوں کے رویہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بیس دن بعد یہی سینئر لڑکے نئے لڑکوں کے جگری دوست ثابت ہوں گے اور پڑھائی میں بھی ان کی مدد کریں گے۔ کالج میں آخری کلاس ختم ہوئی تو ہوسٹل کی طرف جاتے جاتے گورکھ رک گیا اور نارنگ سے کہنے لگا "میرے خیال میں ہوسٹل جانا بے وقوفی ہے۔ کیوں نہ یہ بیس دن کہیں باہر گذارے جائیں۔"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑنے والا۔" نارنگ بولا "جو بھی اس وقت سینئر لڑکوں کے چنگل سے بھاگے گا، سینئر لڑکے اسے بعد میں اور زیادہ ستائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ سب کچھ سہ لیا جائے۔ صرف تین ہفتے کی تو بات ہے۔"

گورکھ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں تو آج ہرگز ہوسٹل میں نہیں جانے والا۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو بہتر ہے، ورنہ تمہاری مرضی۔"

شام کا کھانا کھاتے ہی گورکھ اور نارنگ کمرہ بند کر کے ہوسٹل کی دیوار پھاند کر باہر نکل گئے۔ سردی کا موسم تھا۔ انہوں نے ایک کمبل ہی ساتھ لیا تھا۔ رات کے دس بجے سے صبح کے چار بجے تک دونوں ایک درخت کے نیچے ایک کمبل اوڑھے سردی میں ٹھٹھرتے رہے۔ اس سردی کی رات میں نارنگ کا سیاہ فام جسم گورکھ کو شعلے اگلتی بھٹی جیسا لگا۔ اور گورکھ اس کے قریب سرکتا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے زمانے سے فرار، سہمے ہوئے، رات کی سیاہی اور خنکی میں سمٹتے چلے گئے تھے۔

اگلے روز گورکھ نے دوپہر کے وقت ہوسٹل میں کھانا نہ کھایا اور کسی دھرم شالہ یا سرائے کی تلاش میں نکل پڑا۔

گورکھ نے باقی انیس دن ایک دھرم شالہ میں گزارے۔ وہاں رات کو سونے کا فقط ڈیڑھ روپیہ لگتا تھا۔ چارپائی اور کمبل مل جاتے تھے۔ صبح کو وہ کالج چلا جاتا۔ دو تین بار ہوسٹل میں سینئر لڑکوں نے اسے پکڑ لیا۔ اور غیر حاضری کا اچھا صلہ وصول کیا۔ لیکن وہ ہر روز کی اذیت سے کہیں بہتر تھا۔

ان دنوں گورکھ کے ذہن میں ہر وقت کھلبلی مچی رہتی تھی۔ وہ ایک عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ جو بھی ہو رہا تھا، دل میں اس کے خلاف بغاوت کا جذبہ عجیب عجیب صورتیں اختیار کرتا۔ وہ سوچتا کہ کاش اس کے جسم میں یکایک ایک جن کی طاقت سما جائے اور وہ تمام سینئر لڑکوں کو مار مار کر چھٹی کا دودھ یاد دلادے۔ سینئر لڑکے ہاتھ باندھے اس کے سامنے روئیں، گڑگڑائیں۔ کاش وہ "مسٹر ایکس" بن جائے، یعنی اسے کوئی نہ دیکھ سکے اور وہ سینئر لڑکوں کو خوب پیٹے۔ انہیں یہ سمجھنے میں مشکل ہو کہ کون انہیں پیٹ رہا ہے اور کیوں پیٹ رہا ہے۔ اسی طرح کے خیالی گھوڑے دوڑاتے جب دماغ سیدھی راہ پر آتا تو وہ سمجھ جاتا کہ یہ خیالات اس کی مجبوری کی پیداوار ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ پروفیسر لوگ جانتے ہوئے بھی انجان بنے رہتے ہیں۔ جب سے کالج بنا ہے شاید یہی روایت چلتی آئی ہے۔ مصیبت سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک ہو سکے سینئر لڑکوں کے مونہہ نہ لگا جائے اور ہوسٹل میں اپنی صورت نہ دکھائی جائے۔

جب کبھی خیالات قدرے ٹھیراؤ پر آتے تو گورکھ سوچتا: "کیا انجینئرنگ کی پڑھائی کا یہی مقصد ہے کہ انسان ماتحت لوگوں پر ناجائز دباؤ ڈالے؟ انجینئر کیا ایسی شخصیت کا ہونا چاہئے کہ لوگ اس سے بات کرتے ہوئے ڈریں؟ گندی گالیاں زبان پر لانا، ہر وقت سیکس کی باتیں کرنا، دوسروں کو بے عزت کرنا، کھانے پینے کی چیزوں کی چوری کرنا، اور تو اور کسی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر روپیہ نکال لینا، کیا یہی طور طریقے سیکھنے کے لئے اونچے خاندان کے لڑکے، روپیہ پیسہ برباد کر کے انجینئرنگ کی پڑھائی کرنے آتے ہیں؟ لعنت ہے ایسے ماحول پر! تف ہے ایسے طور طریقوں پر! اگر تم صحیح راہ پر ہو تو کسی پر رعب جھاڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے دلیل اور منطق سے بھی سمجھایا جا سکتا ہے اور ہم خیال بنایا جا سکتا ہے۔ گندی گالیاں زبان پر لانے سے کیا سننے والے پر زیادہ رعب پڑے

گا؟ ماتحت افسر کو مجبوری سے یا ڈر سے کچھ نہ کہے' لیکن دل ہی دل میں ضرور اسے ہزار گالیاں دے گا۔ اس نے خود زندگی کی جو راہ اختیار کرنے کی ٹھانی تھی' وہ کتنی سیدھی ہے۔ نہ کوئی فریب' نہ کوئی مکر۔ دل لگا کر بھولے بھالے بچوں کو پڑھاؤ۔ انہیں اچھی باتیں سکھاؤ اور خود بھی اتنے اچھے بنو کہ بچے خود تمہاری نقل کرنے لگیں۔ کیا رکھا ہے انجینئرنگ میں؟ صرف یہی کہ اس کی مالی حالت اچھی ہو جائے گی اور روپیہ پیسہ زیادہ کما سکے گا۔ پھر روپیہ پیسہ چاہئے کس کے لئے؟ مال و زر کی آخری حد کسی کو نظر نہیں آتی۔ اگر لکھ پتی سے پوچھو تو وہ بھی یہی چاہے گا کہ کچھ اور مال و زر مل جائے۔ اگر کروڑ پتی سے پوچھو تو اس کا لالچ شاید اور بھی بڑھا ہوا ہو۔ جب اس کو شادی ہی نہیں کرنی اور ایک درویش' ایک فقیر کی طرح زندگی گزارنی ہے تو روپے پیسے کی کیا ضرورت؟ روپیہ تو فقط اتنا ہونا چاہئے کہ دو وقت کی روٹی نصیب ہو سکے۔ اس کے علاوہ روپیہ پیسے کا کوئی معنی نہیں۔ ضرورت کا کیا ہے؟ خواہ کم کر لو یا بڑھا لو۔ اس بھنور میں پھنس کر آج تک کسی کو چھٹکارا نہیں ملا۔ وہ زمانے سے جدا ہے سب سے الگ ہے۔" اس کے دل و دماغ میں ضرور کوئی خاص بات ہے۔ وہ زندگی بھر فقیر رہے گا۔ لیکن وہ اپنے دل کا بادشاہ ہے۔ اور بادشاہ وہی ہے جس کا عزم اس کے ساتھ ہے۔ نہیں تو کچھ بادشاہ بھی گڑگڑاتے ہوئے مرے۔"

رفتہ رفتہ تناؤ کے اکیس دن گذر گئے۔ جیسا کہ نارنگ نے گورکھ کو خبردار کیا تھا کہ جو بھی نیا طالب علم ڈر کر بھاگے گا' اسے سینئر لڑکے واپس آنے پر نہیں چھوڑیں گے' وہی گورکھ کے ساتھ ہوا۔ لیکن ستانے میں وہ پہلے جیسی شدت نہ رہی' کیوں کہ ماحول اب تک خاصا بدل چکا تھا۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ اب فضا کچھ اور ہی تھی۔ جن نئے طالب علموں نے سینئر لڑکوں کی زیادتیاں صبر سے برداشت کی تھیں' وہ ان سے خوب گھل مل گئے۔ اور ہر جگہ ساتھ ساتھ نظر آنے لگے۔ چونکہ گورکھ سینئر لڑکوں سے بھاگتا پھرا تھا' اس لئے اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ نئے طالب علموں پر بھی سینئر لڑکوں کا ایک مہینے میں کافی رنگ چڑھ گیا تھا۔ وہ بھی اسی طرح بات بات پر گالیاں بکتے اور سیکس کی باتیں کرتے۔ پڑھائی ضرور سخت تھی۔ شاید دماغ کو آرام دینے کا ایک یہی ذریعہ تھا کہ بغیر سوچے سمجھے جو زبان پر آیا' اگل دیا۔ یا سیکس کے متعلق بے جھجک باتیں کر لیں۔ بھنڈی کالج اور ہوسٹل کے آس پاس کوئی جوان لڑکی نظر نہیں آتی تھی' لیکن اگر کہیں دکھائی دے جاتی تو لڑکے پہروں اسی کا قصہ لے کر بیٹھے رہتے۔ اس کا چہرہ کیسا تھا؟ اس کے بال کیسے تھے؟ اس کا لباس کیسا تھا؟ اس کی صورت اور اس کے سراپا کے بارے میں یا تو ہائے' ہائے کر لی یا ہی' ہی' کر لی۔ گورکھ ان باتوں میں کبھی حصہ نہ لے سکا۔ وہ خاموش رہتا۔ لڑکوں کی باتیں سن کر سنجیدہ ہو جاتا۔ ہوتے ہوتے وہ لگ بھگ بالکل تنہا رہ گیا۔ کمرے میں ساتھ رہنے والے نارنگ کو چھوڑ کر اس کی کسی سے زیادہ بات نہ ہوتی۔ دو طالب علموں کا ایک ہی کمرے میں رہنا بھی گورکھ کو پسند نہ آیا۔ وہاں نہ تو یوگ آسن جما سکتا تھا اور نہ پوجا پاٹھ کر سکتا

تھا۔ جب گورکھ کے سونے کا وقت ہوتا تو نارنگ کے پڑھنے کا وقت ہوتا۔ جب اس کے جاگنے کا وقت ہوتا تو نارنگ کے سونے کا وقت ہوتا۔ بجلی کی روشنی گورکھ کی آنکھوں میں چبھتی۔ اس نے نارنگ سے کئی بار کہا کہ میز پر رکھا لیمپ جلا کر پڑھا کرے اور کمرے کی چھت سے لٹکتا لیمپ بجھا دیا کرے' لیکن نارنگ اکثر دونوں لیمپ جلا کر پڑھتا۔ پوجا ٹھیک طرح نہ ہونے کی وجہ سے گورکھ اور بھی اداس رہتا۔ وہ صبح' شام چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہی آنکھیں بند کر کے' دل ہی دل میں منتر جپ لیتا۔

ایک مہینہ اور گزرا تو گورکھ کا دل انجینئرنگ کے پیشے سے مزید بے زار ہو گیا۔ جن اسکولوں میں اس نے ماسٹر کی نوکری کی درخواستیں بھیجی تھیں' ان کے پتے اس کے پاس موجود تھے۔ اس نے ان سب اسکولوں میں دوبارہ عرضیاں بھیج دیں اور جواب ہوسٹل کے پتے پر مانگے۔ اس کے باوجود بھی وہ انجینئرنگ کی پڑھائی چھوڑنے کا پکا ارادہ نہ کر سکا۔ مشکل یہ تھی کہ اگرچہ انجینئرنگ کے پیشے سے اسے نفرت تھی' لیکن انجینئرنگ کی پڑھائی اسے دل چسپ معلوم ہونے لگی تھی۔ دو مہینوں میں ہی کافی شوق پیدا ہو چکا تھا۔ ریل گاڑی میں اس نے کئی بار سفر کیا ہو گا' لیکن ریل کے انجن کی طرف وہ کبھی متوجہ نہ ہوا تھا۔ انجن آخر اتنی لمبی ریل گاڑی کو کیسے کھینچ کر رفتار پکڑتا ہے' اب یہ سوچنے کا موقع اسے مل رہا تھا۔ صنعتی ترقی کے راز افشا ہو رہے تھے۔ اگرچہ انجینئرنگ کے پہلے سال میں کئی متفرق مضامین پڑھنے ہوتے تھے' لیکن الیکٹریکل سے متعلق موضوعات سے گورکھ کو خاص دل چسپی تھی۔ یہی وہ مضمون تھا جو گورکھ کی رائے میں خوابوں اور خیالوں سے ملتا جلتا تھا۔ الیکٹریکل ہر تھیوری اس لئے قیاسی تھی کہ اسے بظاہر دیکھنا ناممکن تھا۔ خاص آلات کی مدد سے تھیوری کی جانچ کی جا سکتی تھی' لیکن سب کچھ جیسے خلا میں بکھرا تھا' ہواؤں میں بسا تھا' آزاد تھا' پکڑ کے باہر تھا' جسمانی تعلق سے جدا تھا' ایک شعاع کی طرح' ایک کرن کی طرح' ایک جذبہ کی طرح' ایک خیال کی طرح۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اسکول ماسٹر بن گیا تو یہ سب راز کی باتیں کتابوں میں ہی محفوظ راز رہ جائیں گی۔ وہ ان کے انداز نہ سمجھ پائے گا۔ اسے اپنی گزری زندگی کی یاد آئی۔ وہ تمام چیزیں جنھوں نے راز بن کر اس کے تجسس کو ہوا دی' کیمسٹری کے مرکب' شیشیاں اور آلات' جو اس نے کوڑے کے ڈھیر کے حوالے کر دئے تھے۔ حساب کی کاپیاں' جو بی ایس سی کی ڈگری لینے کے بعد ردی میں بیچ دی گئی تھیں۔ کتنے راز تھے ان دونوں مضمونوں میں۔۔ اسے یاد آئی وہ تھیوری جو بہت طویل حساب کی الجھنوں سے گزر کر صرف اتنا ہی ثابت کرتی ہے کہ ایک اور ایک صرف دو ہوتے ہیں' تین نہیں۔ یا صفر ہر حال میں صفر ہے۔ دراصل راز ہر جگہ' ہر ذرے میں پنہاں ہیں۔ انہیں پہچاننے کے لئے آنکھ چاہئے۔ ضروری نہیں کہ کسی خاص مضمون کی ہی چھان بین کی جائے۔ دن رات کی ذہنی کشمکش کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ ماسٹر کی نوکری انجینئرنگ کی پڑھائی سے بہتر ہو گی۔

خدا بڑا کارساز ہے۔ کبھی کبھی اتنی جلد دل کی بات پوری ہو جاتی ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ خدا نے

گورکھ کی سن لی۔ اس کے دل کی مراد پوری ہو گئی۔ اسے جالندھر کے قریب گھوٹال نام کے ایک گاؤں میں انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔ خط سے گورکھ کو ایسا محسوس ہوا کہ انٹرویو تو محض ایک نام کے لئے ہے' نوکری یقینی طور پر اسی کو ملے گی۔ کالج کی فیس ادا کرنے کے لئے اسے ۱۲۰ روپے کا منی آرڈر ملا تھا۔ گورکھ نے فیس جمع نہ کروائی اور انٹرویو کے لئے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ انٹرویو کی تاریخ سے ایک دن پہلے وہ کالج میں درخواست دے آیا کہ اس کی ماں سخت بیمار ہے' تین دن کی چھٹی چاہئے۔

گورکھ سارا سامان لے کر ہوسٹل سے نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ اس سے شک کی گنجائش تھی کہ وہ کالج چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس نے ایک چھوٹا سا لوہے کا ٹرنک خریدا اور ایک چھوٹا سا بستر تیار کیا۔ کتابیں اور باقی سامان کمرے میں ہی چھوڑ دیا۔ سوچا کہ اگر نوکری پکی ہو گئی تو پرنسپل کو لکھ دے گا کہ اس کا نام کاٹ دیا جائے۔ سہ پہر کو تین بجے کے قریب وہ ہوسٹل سے نکلا اور ریل گاڑی پکڑ کر جالندھر پہنچا۔ اس روز زور کی سردی پڑ رہی تھی۔ ریل گاڑی ٹھیک وقت پر رات کے تین بجے جالندھر پہنچی۔ ریلوے اسٹیشن سے بس اڈا دو فرلانگ کی دوری پر تھا۔ بس اڈے پر دریافت کیا تو پتہ چلا کہ گھوٹال گاؤں کی طرف جانے والی بس صبح کے چھ بجے سے پہلے روانہ نہ ہو گی۔ بس اڈے پر مسافروں کے بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اور سرد ہوا بدن میں کپکپاہٹ بھر رہی تھی۔ گورکھ بار بار کوٹ کا کالر اوپر اٹھا کر گردن اور کان ڈھکنے کی کوشش کرتا۔ بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈتا وہ چائے کی دکان پر پہنچا۔ وہاں چائے پی اور واپس ریلوے اسٹیشن پر آگیا۔ تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ بھرا ہوا تھا۔ گورکھ کو بیٹھنے کو مشکل سے ہی جگہ ملی۔ لیکن تین گھنٹے باہر کھلی ہوا میں کھڑے رہنے سے مسافر خانہ بہتر تھا۔ اگر چہ وہ بھی چاروں طرف سے کھلا تھا' لیکن بہت سے مسافروں کی موجودگی کے باعث' پھر بھی قدرے گرم تھا۔ کچھ مسافر زمین پر بستر لگائے سوئے پڑے تھے' کچھ بینچوں پر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے' اور کچھ تاش کھیل رہے تھے۔ سردی کے مارے گورکھ کے ہاتھ پاؤں' موہنہ' ناک اکڑے جا رہے تھے۔ دراصل وہ جاڑوں کے کپڑے ہوسٹل میں ہی چھوڑ آیا تھا اور ایک سویٹر اور کوٹ ڈال کر نکل پڑا تھا۔ ٹھٹھرتے ٹھٹھرتے دو گھنٹے گزر گئے تو وہ دوبارہ بس اڈے کی طرف روانہ ہوا۔ بس میں اس وقت بہت کم مسافر تھے۔ بس کنڈکٹر کہنے لگا کہ اگر گھوٹال گاؤں ہی جانا تھا تو اس کے لئے جالندھر آنے کی ضرورت نہ تھی۔ لدھیانہ سے بس پکڑنا بہتر رہتا۔

بس کی ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ باہر صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ کہرا دور ہوتا گیا۔ سورج اونچا اٹھنے لگا۔ کنڈکٹر نے ایک بس سٹاپ پر گورکھ کو اترنے کے لئے کہا۔ گھوٹال گاؤں وہاں سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ یا تو وہ پیدل چلتا یا گاؤں کی جانب جانے والی دوسری بس کا انتظار کرتا۔ گورکھ نے معلوم کیا کہ گاؤں کی جانب جانے والی بس کا کوئی ٹھکانا نہیں' کبھی کبھی وہ تین چار گھنٹے دیر سے بھی پہنچتی ہے۔ اسی پوچھ گچھ کے دوران ایک بیل گاڑی والے سے ملاقات ہوئی جو گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ بیل گاڑی کے زیادہ حصے میں بھوسا بھرا ہوا تھا۔

گورکھ اپنا سوٹ کیس اور بستر لے کر بیل گاڑی میں سوار ہوگیا۔ اس کے ذہن میں دیوی کے سفر کی یاد تازہ ہوا ٹھی۔ انٹرویو کے وقت سے کچھ دیر پہلے وہ گاؤں کے اسکول پہنچ گیا۔

اسکول کے آنگن میں داخل ہوتے ہی اسکول کا ایک ماسٹر اس سے ملنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس کی نظریں جیسے دریافت کرر ہی ہوں : ''کیوں آئے ہو؟'' گورکھ نے اسکول کی عمارت کا جائزہ لیا۔ پہلی منزل پر تین' چار کچے کمرے اور اتنے ہی دوسری منزل پر۔ ایک چھوٹا سا ہال' جس میں کچھ آلات اور تجربے کا سامان۔ جیسے ہی گورکھ ایک کلاس کے کمرے کے سامنے سے گذرا' بچوں نے کھڑے ہو کر تعظیم سے کہا : ''گڈ مارننگ سر۔''

گورکھ کو حیرت ہوئی کہ وہ تو کلاس لے کمرے میں بھی نہ گھسا تھا' پھر لڑکوں کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ نوکری کے لئے آیا ہے؟ اس نے سوالیہ نظریں ساتھ چلتے ہوئے ماسٹر کی طرف اٹھائیں تو وہ بولا ''یہاں تو سب کو معلوم ہے کہ آپ انجینئرنگ کالج کی پڑھائی چھوڑ کر اسکول ماسٹر کی نوکری کرنے آرہے ہیں۔'' آپ تھوڑا سا آرام کرلیں۔ ہیڈ ماسٹر اور اسکول کا مالک پہلے سے ہی موجود ہیں اور آپ کا ہی انتظار کررہے ہیں۔ لیکن کیا میں آپ سے کچھ دریافت کرنے کی گستاخی کرسکتا ہوں؟''

گورکھ نے کہا'' آپ بھی کیا بات کرتے ہیں! آخر ہم ساتھی بننے والے ہیں۔ آپ کو جو بھی پوچھنا ہے' بے جھجک پوچھئے۔''

اسکول ماسٹر بولا '' آپ نے سارے پنجاب میں بی ایس سی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اور اب آپ انجینئرنگ کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ آپ یہاں ماسٹر کی نوکری کرنے چلے آئے؟ کیا کوئی مصیبت آپڑی ہے یا والدین کالج کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے؟''

گورکھ نے وضاحت کی : ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں دراصل گاؤں کے بچوں کی بھلائی کے لئے یہ پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔'' گورکھ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ماسٹر کو اپنی زندگی کا فلسفہ چند منٹوں میں کیسے بتائے' اس لئے مختصر سا جواب دے کر وہ چپ ہوگیا۔

اسکول ماسٹر نے کہا ''یہ تو آپ کی بات ٹھیک ہے' لیکن پہلے انسان کو اپنے بارے میں سوچنا چاہئے۔'' اگر آپ کسی قابل ہیں تو دوسروں کی ہر حال میں مدد کرسکتے ہیں۔ میں یہ بھی نہیں مانتا کہ اس گاؤں میں کوئی خاص بات ہے۔ اسکول کا مالک ایک کاروباری آدمی ہے۔ اسکول اس لئے چلاتا ہے کہ اسکول سے مالی فائدہ ہو۔ کسی نہ کسی بہانے کسانوں سے چندہ اکٹھا کرتا رہتا ہے۔ ملوگے تو پہچان جاؤگے۔''

اسکول ماسٹر کی آدھی باتیں ہی گورکھ نے سنیں۔ دراصل اسے وہ گاؤں کا ماحول اچھا لگ رہا تھا۔ مانا کہ بچوں کے کپڑے میلے ہیں' مانا کہ اچھی کرسیاں اور میزیں نہیں ہیں۔ لیکن بچے تو بہت معصوم لگ رہے ہیں۔

"اسکول صرف چھٹی کلاس تک ہے۔ امید ہے کہ ایک دو سال میں آٹھویں تک ہو جائے گا اور پھر گورنمنٹ سے منظوری ملنے پر دسویں کلاس تک پڑھائی ہونے لگے گی۔ اسکول کے پاس کافی زمین ہے۔ نئی کلاسوں کے لئے اسکول کی عمارت چاروں طرف سے بڑھائی جا سکتی ہے۔"

یہ سب باتیں دھیان دئے بغیر سنتا ہوا گورکھ ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی طرف بڑھا۔

ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر اسکول کا مالک بیٹھا تھا اور ہیڈ ماسٹر اس کے قریب ہی موجود تھا۔ سلام کے تبادلے کے بعد اسکول کے مالک نے اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے گھنشو مل کہتے ہیں۔ اور یہ ہیں ہمارے ہیڈ ماسٹر' چارو پرشاد۔"

گھنشو مل عمدہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹائی لگائے ہوئے تھا اور مہنگے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اسے بے دھڑک سگریٹ پیتے دیکھ گورکھ سوچنے لگا کہ کم سے کم اسکول کے احاطے میں تو سگریٹ نوشی سے گریز کرنا چاہئے تھا۔ ہیڈ ماسٹر پر اور بچوں پر کیا اثر پڑے گا؟ گھنشو مل اپنی کار میں آیا تھا' جو گورکھ نے اسکول کے باہر سڑک کے کنارے کھڑی دیکھی تھی۔ چارو پرشاد کچھ سہما اور گھبرایا سا بیٹھا تھا اور وہ ذرا سی بات کہنے کے بعد گھنشو مل کے چہرے کی طرف دیکھ لیتا۔ یہاں بھی سب سے اہم سوال یہی تھا کہ گورکھ کیوں انجینیئرنگ کالج کی پڑھائی چھوڑنا چاہتا ہے؟ کیا کوئی مشکل آپڑی ہے؟ جب گورکھ نے دیش سیوا "گاؤں سیوا" اور گاؤں کے بچوں کو پڑھانے کے کام کو اہم اور پرکشش بتایا تو گھنشو مل نے کچھ نہ کہا۔ گورکھ سوچ رہا تھا کہ کوئی سوال ان مضمونوں کے بارے میں پوچھا جائے گا جو بچوں کو پڑھانے ہوں گے لیکن ایسا کوئی سوال دریافت نہیں کیا گیا۔

چند منٹ کی سرسری گفتگو کے بعد گھنشو مل پوچھنے لگا "تنخواہ کتنی لیں گے آپ؟"

گورکھ نے جواب دیا "آپ نے اخبار میں ۲۰۰ روپے ماہوار بتائی ہے' وہی ٹھیک ہے۔"

"وہ تو میں نے اخبار کے لئے لکھوائی تھی۔" گھنشو مل بولا "میرا ارادہ ۲۰۰ روپے پر اسکول ماسٹر رکھنے کا نہیں ہے۔ یہاں اسکول کے بچوں کی فیس سے آمدنی ہی کتنی ہوتی ہے۔ پھر اسکول کی عمارت کی دیکھ بھال کا خرچ۔ آپ بتائیں کہ کم سے کم کتنی تنخواہ پر کام کرنے کے لئے رضامند ہیں؟"

گورکھ اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا "چلئے آپ ۲۵ روپیہ کم کرلیں۔"

"میں اتنی تنخواہ بھی نہیں دے سکتا۔" گھنشو مل بولا

"تو پھر آپ ہی بتا دیں کہ آپ زیادہ سے زیادہ مجھے کس تنخواہ پر نوکری دے سکتے ہیں؟"

"میں آپ کو صرف ۱۲۰ روپے ماہوار دے سکتا ہوں۔ دیکھا جائے تو گاؤں میں خرچ ہی کتنا ہے؟ دس روپے پر آپ کو ایک کمرے کا مکان مل جائے گا۔ البتہ اس میں بجلی کی روشنی نہیں ہوگی۔ یہاں بہت کم مکانوں میں بجلی کا کنکشن لگا ہے۔ رہا پانی' وہ آپ کو کوئیں سے منگوانا ہوگا۔ گاؤں میں اناج اور سبزیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ آپ اسکول کے بچوں کو شوق سے پڑھائیں گے تو ان کے والدین یہ چیزیں خود آپ کی نذر کرتے رہیں

گے۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ میں اس سے زیادہ تنخواہ نہیں دے سکتا۔"

گھنٹومل کی بات سن کر گورکھ قدرے مسکرایا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر چند لمحوں کے لئے گھنٹومل اور چارو پرشاد بھونچکے سے رہ گئے۔ گورکھ یہ سوچ کر مسکرایا تھا کہ انجینئرنگ کالج کی ایک مہینے کی فیس ۱۲۰ روپے تھی اور وہ نوکری کرنے چلا ہے تو ۱۲۰ روپے مہینے کی! جن جذبات کے زیر اثر وہ نوکری کرنے چلا ہے وہاں پیسے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ بلند خیالی جو دماغ میں سمائی ہوئی تھی' وہ دنیا سے الگ ایک دنیا بسانے کا خیال' وہ خود میں سے خدا کو ابھارنے کا جذبہ' وہ ہر مشکل کا سامنا کرنے کی ہمت اور حوصلہ' وہ زندگی کی ضروریات کو ہتھیلی پر رکھ پھونک مار کے ہوا میں اڑا دینے کی جرات' وہ زندگی بھر شادی نہ کرنے کا پکا ارادہ۔ ان کے آگے گورکھ اس وقت ۲۰۰ روپے۔ ۱۲۰ روپے یا ۲۰۰۰ روپے میں تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا : "مجھے منظور ہے۔"

گھنٹومل نے جیسے چین کی لمبی سانس لی۔ پل بھر کی خاموشی کے بعد وہ بولا "ایک بات اور ہے۔ آپ ہر مہینے ۲۰۰ روپے کی رسید پر دستخط کر کے مجھے دیں گے' یعنی یہ کہ آپ نے ۲۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ وصول پائی۔"

گورکھ حیران رہ گیا۔ "ایسا کیوں" "یہ تو سراسر غلط بات ہے کہ میں ۱۲۰ روپے لے کر ۲۰۰ روپے کی رسید پر دستخط کروں؟"

گھنٹومل سمجھانے لگا : "اس میں آپ کا کیا نقصان ہے؟ آپ اس بات کو ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں ضابطوں کی بھی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ بہرحال' اگر یہ بات منظور ہے تو نوکری آپ کی۔"

گورکھ کچھ سوچتے ہوئے بولا "میں آپ کو اس معاملے میں سوچ وچار کے بعد خط لکھ دوں گا۔ ابھی میں "ہاں" نہیں کر سکتا۔"

"جیسے آپ کی مرضی ہمارے لئے ماسٹروں کی کمی نہیں۔" گھنٹومل نے کہا۔

جیسے ہی گورکھ کرسی چھوڑ کر اٹھا گھنٹومل کہنے لگا کہ وہ اسے اپنی کار میں بس اڈے تک چھوڑ آئے گا' لیکن اسے چار پانچ گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا' کیوں کہ اسے کچھ کاغذات پر دستخط کرنے ہیں اور ہیڈ ماسٹر سے بھی کچھ کام ہے۔

"شکریہ۔ میں دیکھتا ہوں اگر کوئی بس اڈے تک پہنچانے والا مل جائے' ورنہ آپ کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے گورکھ کمرے سے نکل گیا۔

ٹرنک اور بستر اٹھا کر گورکھ اسکول سے نکلنے لگا تو اسے وہی ماسٹر دکھائی دیا۔ وہ کچھ بتائے بغیر ہی جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ گورکھ سے کہنے لگا "جو بھی تم فیصلہ کر رہے ہو' میں یقیناً" کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل صحیح ہے۔ اگر مجھے آگے بڑھنے کا موقع ملے تو میں کبھی یہاں نوکری نہ کروں۔ یہاں رکھا ہی کیا ہے؟"

گورکھ نے ماسٹر کی بات سنی اور الوداع کہہ کر رخصت ہوا۔

بغل میں بستر دبائے اور ایک ہاتھ میں ٹرنک لٹکائے گورکھ ابھی کچھ دور ہی چلا ہوگا کہ ایک نوجوان کسان اس کے ساتھ ہولیا۔ اس نے پوچھا "بابو گاؤں کس کام سے آئے تھے؟"

گورکھ نے مختصر طور پر بتایا کہ وہ اسکول میں نوکری کے لئے آیا تھا، لیکن بات نہیں بنی۔ نوجوان نے اس کا ٹرنک زبردستی چھین کر اپنے سر پر رکھ لیا اور کہنے لگا "بابو، یہ بستر بھی ٹرنک پر رکھ دو میں بھی بس اڈے کی طرف جارہا ہوں۔" گورکھ نے ہچکچاتے ہوئے بستر بھی ٹرنک پر رکھ دیا اور کسان کے ساتھ چلنے لگا۔ کسان اسے پگ ڈنڈی کے راستے لے چلا کہ راستہ چھوٹا پڑے گا۔ بس اڈے پر پہنچ کر گورکھ سوچنے لگا کہ جالندھر شہر تو نزدیک ہی ہے کیوں نہ ایک دن گھر جاکر سب سے ملاقات کرلوں۔ پھر سوچنے لگا کہ گھر جانے سے بھی کیا فائدہ! واپس ہوسٹل ہی چلے جانا چاہئے۔ اس ادھیڑبن میں بس چھوٹنے کا وقت معلوم کیا تو تقریباً ۲ گھنٹے تک جالندھر یا بھنڈی کی جانب کوئی بس جانے والی نہیں تھی۔

بس اڈے کے قریب ہی ریلوے اسٹیشن تھا۔ وہاں پتہ چلا کہ جالندھر شہر کے لئے ریل گاڑی تقریباً آدھے گھنٹے میں پلیٹ فارم پر آئے گی لیکن بھنڈی کے لئے شام کے سات بجے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ انتظار سے بچنے کے لئے گورکھ نے جالندھر کا ٹکٹ خرید لیا اور رات کے تقریباً آٹھ بجے گھر پہنچ گیا۔ ساوتری اسے بغیر اطلاع دئے گھر میں آتا دیکھ کر قدرے چونکی۔ گوپال داس اس وقت گھر پر موجود نہ تھے۔ تکان سے گورکھ کا جسم چور چور تھا۔ وہ کھانا کھاتے ہی بستر پر دراز ہوا اور سوگیا۔ اس نے گھر آنے کا سبب یہی بتایا تھا کہ ملنے کے لئے چلا آیا، صبح ہوتے ہی بھنڈی روانہ ہوجائے گا۔

آنکھ لگے کچھ دیر ہی ہوئی ہوگی کہ گوپال داس نے اسے کان پکڑ کر بستر سے اٹھا دیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا نیم بے خوابی میں اٹھا ہی تھا کہ کڑک کے ساتھ گوپال داس کی آواز سنائی دی : "گھر کیوں آئے ہو؟ ہوسٹل میں کیا دل نہیں لگا؟"

گورکھ نے عاجزی سے کہا۔ "دل بہت اداس ہورہا تھا اس لئے ملنے چلا آیا۔ کل صبح ہی واپس چلا جاؤں گا۔" گوپال داس گرجے "جھوٹ بول رہے ہو! ہوسٹل سے بھاگ کر آئے ہو۔ سچ بتاؤ، کہاں سے آرہے ہو؟ میرے پاس اتنا فالتو پیسہ نہیں کہ کالج کی فیس بھی ادا کروں اور ساتھ میں تمہارا آنے اور جانے کا خرچ بھی برداشت کروں۔"

"جی، سیدھا ہوسٹل سے آرہا ہوں۔" گورکھ نے مسکن لہجے میں کہا۔ گوپال داس بھنا کر بولے "تم قطعی جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ اسکول ماسٹر کی نوکری کے لئے انٹرویو کا خط کیسا ہے، جس کے لئے تمہیں آج گھوٹال گاؤں میں بلایا گیا تھا؟ مل گئی ماسٹر کی نوکری؟"

گورکھ کے جھوٹ کا پردہ فاش ہو چکا تھا۔ گھنٹومل نے دو خط بھیجے تھے' ایک گھر کے پتے پر اور ایک ہوسٹل کے پتے پر۔ خط گوپال داس کے ہاتھ میں تھا اور ان کا غصے کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ "تمہیں اس دن کے لئے اعلیٰ تعلیم دلائی گئی اور انجینئرنگ کالج میں داخل کرایا گیا کہ تم اسکول ماسٹر کی نوکری ڈھونڈتے پھرو؟" یہ فقرہ زبان سے نکلتے نکلتے دو زوردار تھپڑ گورکھ کے رخساروں کو چوم گئے۔

پھر گوپال داس ۲۱ برس کے جوان بیٹے کو پیٹتے ہی گئے۔ تھپڑوں' جوتوں' مکوں کی برسات بند ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ گورکھ خاموش پٹے جا رہا تھا اور وعدے بھی کئے جا رہا تھا کہ دل لگا کر پڑھے گا لیکن اس کا کوئی اثر باپ پر نہ تھا۔

شاید گوپال داس کے اپنے ہاتھ اور پاؤں تھکنے لگے' کیوں کہ مار کی شدت کم ہونے لگی۔ اتفاق سے اس وقت ان کے ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھڑی نہ تھی۔ پھر بھی وہ تھپڑ نہ تھے' ایک آندھی تھے' جس میں گورکھ کی بلند قیاسی اور اصول زخمی پرندوں کی طرح ڈگمگاتے زمین بوس ہوتے چلے جا رہے تھے۔ بغیر سوچے سمجھے گوپال داس نے اس پر الزام لگایا۔ کہ وہ انجینئرنگ کی سخت پڑھائی سے ڈرتا ہے' نکما ہے اس لئے بھاگتا پھر رہا ہے۔ اس تہمت کی ستم ظریفی یہی تھی کہ بی۔ ایس۔ سی۔ کے امتحان میں پنجاب میں گورکھ کے دوسری پوزیشن حاصل کرنے کے بعد لگائی گئی تھی۔ گورکھ کے دل و دماغ اس قدر خوں ریز ہوئے کہ وہ رات بھر آنکھیں کھولے چھت کی جانب تکتا رہا۔ وہ دل کی دھڑکن ضرور سنتا رہا' لیکن اس بات سے قطعی بے خبر کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ خیالات کی رو جیسے ساکن ہو گئی ہو۔ اس کا ضمیر' اس کا دل' اس کا ذہن جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خلا میں بکھر گیا ہو۔ رات بھر اس نے ان ٹکڑوں کو دور دور بھٹکتے رہنے دیا' انہیں سمیٹنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

صبح ہوتے ہی وہ اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر گھر سے چل دیا۔ چلتے چلتے وہ گوپال داس کو پرنام کرنا اور الوداع کہنا نہ بھولا۔

ریل گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ جیسے جیسے ٹرین رفتار پکڑتی گئی' گورکھ کے خیالات کی لہریں بھی رفتار پکڑتی گئیں۔ وہ ریل کے ڈبے کی کھڑکی کے باہر افق پر نظر جمائے بیٹھا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو اس کا ضمیر ہو بہو اس کی شکل اختیار کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور بڑے دوستانہ انداز میں اس سے مخاطب تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"خیالات کند ہو چکے ہیں۔ ان دو دنوں میں زندگی کی وہ شکل دیکھی کہ زندگی سے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"ابھی تو زندگی شروع بھی نہیں کی' ایک قدم چل کر ہی ڈگمگا گئے!"

"اس وقت جو تم کہہ رہے ہو ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔"

مین تم تو آہنی ارادے والے تھے۔ کہاں ہے تمہاری بلند خیالی؟ کہاں ہے تمہاری دیش بھگتی اور گاؤں میں بچوں کو شوق سے پڑھانے کا ارمان؟"

"اس وقت سب کافور ہو چکے ہیں۔"

"زمانے کے ایک ہی جھٹکے کے ساتھ؟"

"یہی کہہ لو۔"

"پہلے تم مصور بننا چاہتے تھے؟"

"ضرور چاہتا تھا۔ اگر مجھے موقع ملتا تو شاید میں اس فن میں بہت نام کماتا۔ لیکن میں باپ کا کہا مان کر اس شوق سے کنارہ کش ہو گیا۔"

"پھر تم سرکس میں بھرتی ہونا چاہتے تھے۔ وہ تو بھلا ہو اس سرکس کے مینیجر کا کہ اس نے تمہیں بچالیا۔"

"میں اس بات کو بھی نہیں مانتا۔ ہو سکتا ہے کہ میں سرکس کا بہت بڑا فن کار بن جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ میری اپنی سرکس کمپنی ہوتی۔"

"اور وہ کیمسٹ بننے کا شوق؟"

"مجھے پتا جی نے' دوستوں نے اور پروفیسروں نے دوسری راہ دکھائی۔"

"اس کے بعد وہ حساب داں بننے کا شوق؟"

"میں ہر بار اپنے سرپھرے باپ کی خاطر اپنے ارمان' اپنے شوق' اپنی زندگی کی راہ مٹاتا آیا۔"

"اور آخر میں تم ماسٹر بننے چلے تھے!"

"وہ بھی دنیا کو منظور نہ ہوا۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہیں طاق میں رکھ کر کیا غلط دستخط کر دیتا؟"

"مین تمہیں یہ جتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تم کیا چاہتے ہو؟ تم جانتے ہی نہیں زندگی کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہئے۔ جو ارادے کے پکے ہوتے ہیں وہ تمہاری طرح نہیں بھٹکتے۔ وہ جس کام کو کرنے کی ٹھان لیتے ہیں' اسی کو کرتے ہیں' چاہے زمانہ کتنا ہی پر خار ہو' چاہے کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ تم میں وہ لگن' وہ ارادہ' وہ ہمت ہے ہی نہیں جس کا تم دعویٰ پر دعویٰ کئے جا رہے ہو۔ اگر کوئی چڑیا تمہارے سر پر سے اڑتی ہوئی گزر جائے تو سوچتے ہو : "کاش میں چڑیا ہوتا!" تم تو بے جان چیزوں میں بھی زندگی ڈھونڈتے ہو۔ یاد ہے تم نے اپنی روح اڑتی پتنگوں کے حوالے کر دی تھی۔ تاریخ گواہ ہے ان لوگوں کی جنہوں نے کڑی سے کڑی مصیبت کے وقت بھی اپنا ایمان نہ بدلا اور ایک تم ہو کہ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ایمان بدلتے ہو۔ دراصل تمہارا کوئی ایمان ہے ہی نہیں۔"

"لیکن میں ایک بات واضح کر دوں۔ کل میں اسکول میں ماسٹر کی نوکری کے لئے مضبوط ارادے کے ساتھ

گیا تھا۔ میں ۲۰۰ روپے کے بجائے ۴۰ روپے تنخواہ تک قبول کرلی تھی۔ میں فقیر بن چکا تھا۔ میں تو زمانے سے بہت دور چلا گیا تھا۔ زمانے کے ٹھاٹ اور ساز و سامان میری نظروں میں ہیچ تھے۔ میں تو تمام عمر درویش کی زندگی جینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ ضرور چاہتا تھا کہ میں غیرت سے زندہ رہوں۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤں۔ کیا میرے جذبات کو کوئی سمجھ سکا؟ میرے اپنے باپ نے مجھے نالائق کا خطاب دے کر بیٹا۔ میں کیا کروں؟"

"تم کیا کرو' یہ تمہیں کوئی بھی نہیں بتا پائے گا۔ میں بھی نہیں بتا سکتا۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے کہ تم کیا کرو اور کیا نہ کرو۔ میں تو تمہارے دماغ سے دھند کے بادل ہٹانے اور تمہیں تمہاری صحیح شکل دکھانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

"لیکن تم مجھے الجھنوں میں ڈال رہے ہو۔ ہو سکے تو میری الجھنیں سلجھانے کی کوشش کرو۔"

"اگر تم پکے ارادے کے انسان ہو' تو جو تم کل کرنے جا رہے تھے' وہ کل بھی کر سکتے ہو۔ اگر تمہیں ایک اسکول کا مالک ایسا ملا جو کہ لالچی اور زر کا پجاری تھا' تو دنیا میں سب ہی ایسے تو نہیں ہوتے۔ اپنی راہ مت چھوڑو۔ سچے ہو تو اسی راہ پر چلو۔ کوئی نہ کوئی ایسا اسکول بھی تمہیں مل سکتا ہے جہاں تمہیں غلط کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ پیچھے کیوں ہٹ گئے؟" "اگر تم واقعی کل فقیر تھے تو آج بھی ہو۔ لیکن شاید یہ تمہارا وہم ہے کہ تم فقیری اختیار کرنے والے تھے۔ تم تو اس کی جانب دو قدم چل کر پلٹ آئے۔"

"اگر تم پر بھی اتنی ہی مار پڑتی جتنی مجھ پر پڑی ہے تو تمہارے بھی ہوش ٹھکانے آجاتے اور سارا فلسفہ بھول جاتے۔"

"تم میری سیدھی باتوں کو فلسفے کا نام مت دو۔ مان جاؤ کہ تم کم زور انسان ہو۔"

"میں مان گیا کہ میں کم زور ہوں۔ ہر انسان میں ساری خوبیاں موجود نہیں ہوتیں۔ انسان کو اپنے آپ کو پہچاننا پڑتا ہے۔ اس کے لئے اپنی کم زوریوں اور طاقتوں کا صحیح اندازہ ہونا ضروری ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ میرا دماغ بہت تیز ہے اور میں کسی بھی مضمون کو آسانی سے سمجھ لیتا ہوں۔"

"پھر رونی صورت بنائے باہر افق پر کیا دیکھ رہے ہو۔ خوش ہو کر گیت گاؤ۔ اگر یہی راہ اختیار کرنی ہے تو پھر اسی پر قائم رہو' لیکن زمانے کو قصوروار مت ٹھہراؤ۔ کسی کو بھی قصوروار مت ٹھہراؤ۔ تم اپنے اعمال کے لئے ذمہ دار ہو۔"

"میں یہ بات نہیں مان سکتا۔"

"کیوں؟"

"میں اپنی پچھلی زندگی پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اپنوں نے اور دنیا نے میرے ساتھ کیسا ناروا سلوک کیا۔ میں تو کہوں گا کہ میرے ساتھ بے انصافی کی۔ میں معصوم اور دل کا صاف انسان ہوں' اس زمانے

میں رہنے کے قابل ہی نہیں۔"
"وہ کیوں؟ تم نے زمانے کو گناہ گار ٹھہرایا' لیکن اپنے گریبان میں جھانک کر کبھی نہ دیکھا۔ بچپن کی حد سے بڑھی ہوئی شرارتیں' ستو اور شنکر کے ساتھ بدفعلی' گوجرے کا نہال سنگھ' چوری کر کے فلمیں دیکھنا' یہاں تک کہ کسی دوسرے شخص کا سامان جو گھر میں موجود تھا اور تمہارے والد کو بطور امانت سپرد کیا گیا تھا' اس کی بھی چوری کرنے سے باز نہ آنا' شملہ میں تین سال سگریٹ نوشی' برے لڑکوں کی صحبت۔ اس کے باوجود بھی اپنے کو دودھ کا دھلا سمجھتے ہو؟"
"تم ہی بتاؤ میں کیا کرتا؟ میں نے جو بھی کیا معصومیت میں کیا۔ خدا جانے میری شکل پر کیا لکھا ہے کہ انبالہ شہر میں مجھے بدمعاش لڑکوں نے بہت ستایا۔ گھر والوں نے مجھے بہت مارا۔ بنئے نے بچپن میں میری معصومیت چھین لی۔ بتاؤ اس میں میرا کیا قصور تھا؟ گوجرے میں میں نے نہال سنگھ سے دوستی کی۔ لیکن کیوں؟ اسکول کے لڑکوں سے بچنے کے لئے۔ وہ ہر وقت نعرے لگا لگا کر مجھے ستاتے تھے۔ میرا بھولپن دیکھ کر ایک لڑکے نے میرے پیتل کے پیپر ویٹ کا سونا بنانے کا چکمہ دے کر میرا پیپر ویٹ چرا لیا۔ اور نہال سنگھ نے بھی میری معصومیت سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے شملہ میں فلمیں ضرور دیکھیں۔ میں نے برے لڑکوں کی صحبت بھی اختیار کی' لیکن وہ سب روز مرہ کی مصیبتوں سے بچنے کے لئے تھا۔ سنیما کی ایک ایک فلم میرے دل میں درد بھرتی چلی گئی۔ تمہیں کیا معلوم نہیں کہ میں فلمیں دیکھ کر کس قدر اداس ہو جاتا تھا' کبھی کبھی اشک بار ہو جاتا تھا۔ زمانے کی رسموں اور روایتوں پر عشق کے افسانوں پر رونا آتا تھا۔ تم ہی بتاؤ کیا میں نے فلموں سے کوئی بری بات سیکھی؟۔ میں تو محبت کا پاک احساس ہی ڈھونڈتا رہا۔"
انسان میں یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے ہر غلط کام کو بھی کسی نہ کسی پردے میں ڈھک دیتا ہے۔ اگر تم پکے ارادے کے انسان تھے تو تمہیں وہ سب کرنے کی ضرورت نہیں تھی جو تم نے کیا۔ تم کسی بھی حالت میں اپنے افعال کو صحیح ثابت نہیں کر سکتے۔ مان جاؤ کہ کئی برے کام تمہارے دل میں گھروندا بنا چکے تھے۔"
"انسان کی فطرت ہے جذبات میں بہہ جانا۔ عقل اور آگہی اپنی جگہ' دل اور جذبات اپنی جگہ انسان اس سے انسان ہے کہ اسے خدا نے دل بھی دیا ہے' ورنہ وہ بھی ایک پتھر کا بت ہوتا۔ پھر بھی جذبات کو کسی حد تک قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ میں نے جو کیا' اس کی تلافی بھی کی۔ جالندھر پہنچ کر میں نے چوری کرنا اور سنیما دیکھنا بند کر دیا۔ آج پانچ سال ہو گئے میں نے ایک بھی فلم نہیں دیکھی۔ میں نے تو یہاں تک اپنے آپ کو بدل لیا کہ میں خود عہد گذشتہ کو نہیں پہچان سکتا۔ تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ میں نے ستو کی جان بچائی تھی؟"
"کچھ اچھے کام کرنے سے برے کام مٹ تو نہیں جاتے۔ جوں کے توں سلامت کھڑے رہتے ہیں۔ تم نے کچھ اچھا کیا اور کچھ برا کیا۔"

"مان لیتا ہوں۔ ہر انسان کو یہی مقدور ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ زمانے نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ ابھی تک جو دنیا کی جھلک میں نے دیکھی 'اس میں دھوکے بازی' چالاکی' جھوٹ' مکاری اور فریب کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ میں یہ ضرور مانتا ہوں کہ اچھائی کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے لیکن اسی طرح جس طرح اڑد پر سفیدی۔ جو بھی میرے ساتھ ہوا' مجھے ڈھونڈنے سے بھی اس کی وجہ نہیں ملتی۔ میں نے تو زحمت ہی زحمت اٹھائی ہے۔ خدا نے صرف ایک ہنر دیا۔ وہ یہ کہ میں پڑھائی میں بہت ذہین ہوں۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو میری حالت جانور سے بھی بدتر ہوتی۔"

"اگر تم سوچتے ہو کہ تمہارے پاس ہنر ہے تو اسی میں آگے بڑھو۔ خدا کسی کو ہر چیز عطا نہیں کرتا۔ تمہارا دل پڑھائی میں لگتا ہے' تو پڑھو۔ باقی سارے خیالات اور جذبات طاق میں بند کردو۔ زمانہ خود بخود راہ پر آجائے گا۔"

"مجھے تمہاری یہ بات اچھی لگی۔ میں دور افق پر یہی عبارت پڑھ رہا ہوں۔ پڑھ لکھ کر کچھ ایسا ہو جاؤں کہ نہ اپنے اور نہ پرائے مجھ پر انگلیاں اٹھائیں۔"

"یہ بھی کر دیکھو۔ ہوسٹل میں ایک سینئر نے تمہاری جیب سے روپے نکالے تو تم بھاگ کر اسکول ماسٹر بننے چلے گئے۔ ماسٹر بننے گئے تو اسکول کے مالک نے تم سے غلط دستخط کرانے چاہے۔ انجینئر بن کر بھی دیکھ لو۔ پڑھائی کر کے بھی دیکھ لو۔ لیکن ایک بات کہے دیتا ہوں۔"

"تمہاری طرح دو کشتیوں میں سوار انسان ہمیشہ ڈوبتا ہے۔ خود فریبی سے نکلو۔ جو راہ پکڑو ثابت قدمی سے چلو۔ ساری راہیں کہیں بھی باہم گلے ملتی نہیں۔"

"میرے سر میں درد ہونے لگا۔ تم اب دفع کیوں نہیں ہو جاتے؟ پھر کبھی بات کر لینا۔"

"اب میں کافی عرصے بعد تم سے مخاطب ہوں گا۔ جو میں نے کہا' اس پر غور کرنا۔ اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرنا۔ اپنے دل کو' اپنے دماغ کو' اپنی طاقت کو اور اپنی کمزوری کو پرکھنا۔"

گفتگو کا سلسلہ شاید اور چلتا رہتا کہ ایک چائے فروش کی آواز نے گورکھ کو چونکا دیا : "صاحب چائے۔"

تقریباً" ایک سال کا عرصہ گذر گیا۔ گورکھ انجینئرنگ کالج کے پہلے سال میں اپنی کلاس میں اول رہا۔ ادھر گوپال داس کی ترقی ہوئی اور وہ مینجر بن کر انبالہ چھاؤنی چلے آئے۔ اسی جگہ جہاں انہوں نے کبھی چھوٹی سی ملازمت کی تھی۔ بینک کی عمارت اس طرح تعمیر کی گئی تھی کہ رہنے کی کوٹھی اور بینک کا کاروباری حصہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ گوپال داس ایک دروازے سے پردہ اٹھا کر اپنے آفس کے کمرے میں پہنچ جاتے۔ دو ایکڑ زمین کے درمیان خوب صورت کوٹھی' گوپال داس کو برسوں کے محنت اور مشقت کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ مالی' بیرے' چپراسی' نوکر' غالیچے' صوفے' فرنیچر' سجاوٹ' شہر کے امیر اور بارسوخ لوگوں سے جان پہچان۔ کام یابی کا نشہ رفتہ رفتہ گوپال داس کے دماغ میں چڑھتا گیا۔ گورکھ جب بھی تعطیلات میں انبالہ چھاؤنی جاتا' گوپال داس کے بگڑے مزاج کا کوئی نہ کوئی افسانہ سن کر جاتا۔

ایک سال اور گذر گیا۔ گورکھ کلاس میں پھر اول آیا۔ گورکھ نے محسوس کیا کہ اب گوپال داس اس سے قدرے عزت سے پیش آنے لگے ہیں۔ گورکھ نے دوبارہ بال بڑھا لئے۔ گھنگھریالی لٹوں کو پیشانی پر گرنے سے روکنے کے لئے وہ بالوں میں لڑکیوں کی طرح ہیرپن استعمال کرتا۔ ناخن بڑھا کر باقاعدہ گلابی رنگ کی نیل پالش لگاتا پروفیسر اور طالب علم اس کے چہرے کی طرف دیکھتے' مسکراتے اور چپ رہتے۔ اسے کوئی نہ چھیڑتا' کوئی کچھ نہ کہتا بلکہ اس کے بالوں اور ناخنوں کو عجوبے کی طرح دیکھا جاتا۔ گورکھ نے کبھی نئے طالب علموں کو پریشان نہیں کیا۔ اس وجہ سے نئے طالب علم بھی اس کا بہت احترام کرتے تھے' اسے اچھا اور نیک انسان سمجھتے تھے۔ کلاس میں لیبوریٹری میں اس کی دھاک جم گئی تھی۔ مشکل سے مشکل سوال وہ آسانی سے حل کر لیتا۔ مشکل سے مشکل تجربہ وہ صفائی سے سرانجام دیتا۔ بجلی کے آلات اور ان پر تجربے اسے اس قدر دلچسپ لگے کہ غلطی کا

امکاں بہت کم رہتا۔ اس کے ہاتھوں انجینئرنگ ڈرائنگ بھی مصوری کی طرح چمک اٹھی۔ پروفیسر اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے اور طالب علم کچھ نہ کچھ سیکھنے کے لئے اس کے کمرے میں جمع رہتے۔ وہ دوسرے لڑکوں کی طرح کبھی کچھ چھپا کر نہ رکھتا۔ اس کی کاپیاں اور کاغذ کمرے میں کھلے پڑے ہوتے۔ جو بھی چاہتا' اس کے کالج کے کام کی نقل کر سکتا تھا۔ گورکھ سمجھ چکا تھا کہ نقل نقل ہوتی ہے اور اصل اصل۔ پروفیسر ضرور اس میں تمیز کر سکتے ہیں۔ انجینئرنگ کے سالانہ امتحان میں سال کے کام کے نمبروں کے علاوہ' زبانی امتحان کے بھی نمبر ہوتے تھے۔ اگر کسی کو مضمون میں مہارت حاصل نہ ہوتی تو وہ اس زبانی امتحان میں ضرور لڑکھڑا جاتا۔ سارے کالج میں گورکھ کے "سب سے ہوشیار طالب علم" ہونے کا سکہ جم گیا۔ سال کے آخر میں اسے انجینئرنگ کی ایک موٹی سی کتاب اسی سلسلہ میں انعام کے طور پر دی گئی۔

"کالج میں علمی شوق اور تجسس کو ہوا دینے کے لئے اور بھی وسیلے موجود تھے۔ گورکھ ریڈیو کلب کا ممبر بن گیا۔ ہوتے ہوتے اسے "ریڈیو" سے دلچسپی ہو گئی۔ اس نے ایک نئے ڈیزائن کا ریڈیو تیار کیا' جس کی پکڑ اور آواز باقی طالب علموں کے تیار کردہ ریڈیو سے کہیں بہتر تھی۔ کالج میں رات کے کھانے کے بعد کسی نہ کسی تیکنیکی یا سماجی مسئلے پر تذکرے ہوتے رہتے۔ طالب علموں کو تقریر کرنے کے لئے اکسایا جاتا' تاکہ انہیں عوام کے سامنے بولنے میں جھجک نہ ہو۔ گورکھ کا دل تقریروں میں حصہ لینے کو چاہتا' لیکن ہمت نہ ہوتی۔ جو طالب علم اچھی تقریر کرتے انہیں "اسپیکرز یونین" کا ممبر بنا لیا جاتا۔ ایک مرتبہ گورکھ نے پروفیسر سے درخواست کی کہ اسے بھی ایک بار تقریر کے مقابلے میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔ پہلے تو پروفیسر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ یہ بات اس کے لئے حیران کن تھی کہ گورکھ پڑھائی کے سوا اور کوئی کام بھی کر سکتا ہے۔ پھر وہ کہنے لگا : "میں تمہاری بات سن کر دراصل بہت خوش ہوا ہوں۔ پڑھائی کے علاوہ تمہیں دوسری چیزوں میں بھی حصہ لینا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ کھیل کے میدان سے تم ہمیشہ بھاگ جاتے ہو۔ تمہیں کسی بھی کھیل میں دلچسپی نہیں۔ میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔ ضرور تقریر لکھو اور ضرور حصہ لو۔ اگر میری مدد چاہئے تو میں تمہاری لکھی ہوئی تقریر پر اصلاح کر سکتا ہوں اور اسے درست کر سکتا ہوں۔"

گورکھ نے محنت سے تقریر لکھی' لیکن پروفیسر کو نہ دکھائی۔ کئی بار آئینے کے سامنے تقریر کو دہراتا رہا۔ تقریر کرنے کے بعد جس زور سے تالیوں کی گونج ہوئی' گورکھ کو اس کی امید نہ تھی۔ پہلی تقریر نے ہی دھاک جما دی۔ پروفیسر مبارک باد دینے آیا۔ کہنے لگا "آج تمہاری تقریر دوسرے نمبر پر ہے۔ کوشش کرو تو پہلے نمبر پر بھی پہنچ جاؤ گے۔" اس حوصلہ افزائی کے بعد اسٹیج پر جا کر عوام کا سامنا کرنے کی جھجک گورکھ کے دل سے دور ہوئی۔ ایک بار جب بغیر تیاری کے اس سے بولنے کے لئے کہا گیا تو اس مقابلے میں وہ اول نمبر پر آیا۔

ملازموں کے ساتھ سخت رویہ کی وجہ سے گوپال انبالہ چھاؤنی سے ہٹادئے گئے۔ اگرچہ تنخواہ میں کمی نہ ہوئی۔ لیکن انہیں چھوٹے چھوٹے شہروں میں رہنا پڑا۔ جب وہ ہاتھرس میں مقیم تھے اور گورکھ چھٹی پر تھا تو گورکھ کی ملاقات ایک مصور سے ہوئی۔ وہ مصور ہندوستان کے روایتی طریقے کے "پانی کے رنگ" استعمال کرتا تھا اور روانی کے نام سے مشہور تھا۔ پینٹنگ میں گورکھ کے شوق کی تعریف کرتے ہوئے روانی نے اسے ترتیب سے پینٹنگ کی تیکنیک سمجھائی، جس سے گورکھ کی مصوری میں نکھار آگیا۔ روانی نے بہت سی پینٹنگز ٹرنک کے سپرد کی ہوئی تھیں۔ ہر پینٹنگ کے پیچھے اس کی قیمت بھی لکھی تھی، جو کہ ۵ ہزار سے لے کر ۱۵ ہزار روپے تک تھی۔ اس کے گھر میں بیٹھنے کو کرسی نہ تھی، اور لاکھوں روپے کی مصوری ٹرنک میں بند تھی۔ ایک روز روانی، گورکھ سے کہنے لگا "میں لکھ پتی ہوں۔ مجھے تسلی تو ہے کہ میرے پاس نایاب تصویریں ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی انہیں میرے طے کئے ہوئے داموں پر نہیں خریدے گا، لیکن میں بھی انہیں کم داموں پر فروخت نہ کروں گا۔" کتنا درد تھا روانی کی بات میں! گورکھ آج تک روانی کا شکر گزار ہے کہ اس نے بہت سادگی سے مصوری کے راز اسے سمجھائے تھے۔ اور باقی گورکھ پر منحصر تھا کہ وہ کتنی محنت سے ان اصولوں کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے، تصویروں میں کتنا نکھار لا سکتا ہے۔

گورکھ کی پینٹنگز کا تو ایک ہی موضوع تھا، جو نازنینوں سے شروع ہو کر نازنینوں پر ختم ہوتا تھا۔ وہ حسینوں سے آنکھ نہیں ملا سکتا، لیکن ان کی تصویریں ضرور بنا ڈالتا تھا۔ چاند کی جانب دیکھتی، دیوار کے سہارے جھکی، دروازے پر منتظر، کھیت میں بھاگتی، پیڑ سے لپٹتی، بانسری بجاتی، سر جھکائے بیٹھی، پیر اٹھائے ناچتی۔۔۔ گورکھ کا دماغ یہیں تک پہنچ کر رک جاتا۔ جھرنے، پہاڑ، باغ، پیڑ، پھول، پتے سب کچھ تھے، مگر کسی نازنین کے ساتھ۔

کالج میں گورکھ نے کبھی کسی پر اپنی مصوری کے ہنر کو کھلنے نہیں دیا تھا، لیکن ایک روز یہ راز بھی کھل گیا۔ اتوار کا دن تھا اور وہ ڈرائنگ بورڈ پر کاغذ چپکائے، برقی تاروں کی بجائے، ایک بجلی کی سی ناچتی دوشیزہ کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔ ایسے وقت میں گورکھ ضرور دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھتا لیکن اس روز کھلا رہ گیا۔ اور دو کلاس فیلو اندر چلے آئے۔ ڈرائنگ بورڈ دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے اور الماری میں رکھی کئی دوسری تصویریں بھی ان کی نظروں سے نہ بچ سکیں۔ چند دنوں میں پروفیسروں اور کالج کے طالب علموں کو گورکھ کے اس فن کا پتہ چل گیا اور اس کی عزت میں چار چاند لگ گئے۔ ایک نے اس سے پوچھا "اتنی اچھی تصویریں بناتے ہو، تو انہیں چھپا چھپا کر کیوں رکھتے ہو؟" گورکھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس مسکرا کر رہ گیا۔

تعریفوں کی اس فضا میں گورکھ کو اسکول کا زمانہ یاد آگیا۔ اسکول کے لڑکوں نے اس کے دل اور دماغ پر کتنی چوٹیں لگائی تھیں۔ جس انجینئرنگ کالج سے وہ چند سال پہلے بھاگ کر اسکول ماسٹر کی نوکری کرنے چلا تھا، وہیں اس نے اتنی عزت کمائی، لیکن دوستی سے یہاں بھی محروم رہا۔ وہ آج بھی تنہا تھا۔ شام کو جب سب لڑکے اپنی

اپنی ٹولیوں کے ساتھ سڑک پر سیر کرنے نکلتے، تو وہ بالکل اکیلا ہوتا۔ سڑک پر اگر کسی ٹولی کا سامنا ہو جاتا اور کوئی پوچھتا "اکیلے ہی سیر کرنے کو نکلے ہو؟" تو وہ مسکرا کر قریب سے نکل جاتا۔ جب دوسرے طالب علم "برج" کھیلتے، تو وہ اس میں حصہ نہ لیتا۔ اس نے "برج" کے قاعدے ضرور سیکھے، لیکن تاش کھیلنے میں اسے کبھی لطف نہ آیا۔ سارے طالب علم جب کلب میں بیٹھ کر لڑکیوں کی باتیں کرتے، گپیں ہانکتے، کیرم بورڈ کھیلتے، تو وہ کچھ دیر ان کے قریب یوں ہی بیٹھ کر اپنے کمرے میں لوٹ آتا۔ اسے ان کی بے تکی باتوں اور ہاہاہی ہی میں کوئی مزہ نہ آتا۔ ایک خاص طرح کی سنجیدگی اس کے چہرے اور شخصیت سے ٹپکتی۔ وہ اگر کسی بات پر ہنستا بھی تو ذرا دب کر۔ کسی پر نکتہ چینی بھی کرتا تو ذرا سنبھل کر۔ اس نے کھل کر ہنسنا جیسے سیکھا ہی نہ تھا۔ ہنسی مذاق سے دور، ہمجولیوں کی گفتگو سے دور، ہر انسانی قربت سے دور، وہ کل بھی اکیلا تھا، آج بھی تنہا تھا۔ کسی نے ایک بار کہا "خود کو کبھی آزاد بھی چھوڑنا چاہیے۔ رات دن تھیوریاں سوچنے سے کیا فائدہ؟ ہر وقت تناؤ میں رہنے سے کیا حاصل؟ کبھی واہیات گفتگو میں بھی حصہ لے کر دیکھو۔ چہرے پر کبھی تو اتنی ہنسی لاؤ کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاؤ۔" گورکھ کو کسی حد تک کہنے والے کی بات معقول لگی، لیکن وہ خود کو بدل نہ سکا۔ کیا وہ عہد گذشتہ کا اثر تھا؟

ان دنوں بھی وہ یوگ آسن اور پوجا ضرور کرتا۔ ایک سال بعد ہر طالب علم کو علیحدہ کمرہ مل گیا تھا۔ سردی ہو کہ گرمی، گورکھ ہر روز سویرے چار بجے اٹھ کھڑا ہوتا۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کرتا، اپنے کپڑے خود دھولیتا، دھوبی سے بہت کم دھلواتا، یوگ آسن کرتا اور مالا پھیرتا۔ اس کے بعد کالج جانے سے پہلے تقریباً دو گھنٹے پڑھائی کے لئے مل جاتے۔ رات کو وہ دس بجے کے بعد کبھی نہ جاگتا۔ جب وہ برآمدے میں چارپائی نکال کر سونے کی تیاری کر رہا ہوتا، اکثر طالب علموں کا وہ پڑھنے کا وقت ہوتا۔ ہوسٹل میں یہ مشہور تھا کہ اگر کسی کی گھڑی بند ہو گئی ہو تو وہ گورکھ کے سونے کے وقت سے ملا کر اسے چلا سکتا ہے۔

انسان کوئی بھی کام، اچھا ہو یا برا، کتنا ہی زمانے کی نظروں سے بچا کر کرتا رہے، لیکن کبھی نہ کبھی اس کا بھید ضرور کھل جائے گا۔ ایک کلاس فیلو نے اس کی پوجا کا راز معلوم کر لیا۔ گورکھ دروازہ بند کر کے کھڑکی پر اچھی طرح پردہ سرکا کے، میز کے ایک کونے پر آسن لگا کر بیٹھتا تھا۔ دروازے کے تالے میں چابی گھمانے کے لئے آر پار سوراخ سے کسی نے اندر کا جائزہ لیا۔ اس روز وہ کلاس فیلو پوچھنے لگا "صبح کو میز کے کونے پر آسن جما کر ہاتھ میں تھیلی پکڑے کیا کر رہے تھے۔" گورکھ مالا کو تھیلی میں چھپا کر پھیرتا تھا۔ تھیلی سے صرف انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی باہر نکلی رہتی تھی۔ وہ کچھ جھینپ کر "کیا؟" کہہ کر رہ گیا۔ اگلے روز گورکھ نے چابی والے سوراخ میں کاغذ کے ٹکڑے بھر دئے، تا کہ کوئی آر پار نہ دیکھ سکے۔ کچھ دن بعد اس نے دیکھا کہ وہ کاغذ کے ٹکڑے کسی نوکیلی چیز سے باہر نکال دئے گئے ہیں۔ کمرے میں اور کوئی پوشیدہ جگہ نہ تھی۔ کپڑے ٹانگنے کے لئے اور کتابیں رکھنے کے لئے دیوار میں الماری لگی ہوئی تھی۔ گورکھ نے سوچا کہ اگر الماری کا دروازہ بند کر دیا جائے تو کھڑکی یا دروازے

سے کوئی بھی شخص الماری کے اندر بیٹھے انسان کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی مشکل اسی طریقے سے حل ہوئی۔ کپڑے ٹانگنے والی جگہ نیچے تک خالی تھی اور اس میں مشکل سے آسن جما کر سیدھے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ زمانے کی نظروں سے چھپنے کے لئے یہی جگہ موزوں ثابت ہوئی۔

آسن اور پوجا میں کچھ دیر کے لئے گورکھ کا دل ضرور لگ جاتا تھا' لیکن تنہائی عجیب احساس پیدا کرتی۔ فطرتاً" دماغ ایک لحہ کے لئے بھی خالی نہیں رہ سکتا۔ خیالات کی ترنگیں ہر وقت اٹھتی رہتی ہیں۔ مصروفیت وجود کو ان ترنگوں میں بہا لے جاتی ہے اور ہم ان ترنگوں کا ایک جز بن جاتے ہیں۔ ایسے میں ہمیں خود مرکزیت کا احساس نہیں ہوتا' یعنی ہم خود کو ان ترنگوں سے جدا تصور نہیں کرسکتے۔ اس لئے ان کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جب گورکھ کی کالج کی پڑھائی ختم ہو جاتی' امتحان کا وقت گزر جاتا تو اس کا ذہن کی خلا میں طرح طرح کے بے ترتیب خیال اٹھتے۔ جنہیں کسی طرح کی ترتیب دینا محال ہوتا۔ یہی خیالات بے چینی کا سبب بن جاتے۔ اس کے ساتھ اگر جسم کی حرکتیں بھی بند کرلی جائیں تو ایک عجیب طرح کی بے چینی کے علاوہ ایک خمار' ایک نشہ سا چڑھنے لگتا اور رفتہ رفتہ وہ بے چینی اس خمار یا نشے میں ڈوب جاتی۔ گورکھ کی تنہائی کے بس یہی دو ساتھی تھے۔ ایک بے چینی اور دوسرا خمار۔ اسے ان دونوں سے ہی کسی حد تک محبت ہو چکی تھی۔ وہ ان سے ڈرتا بھی تھا اور ان سے لطف اندوز بھی ہوتا تھا۔ چھٹی کے دن' صبح کا ناشتہ کرکے وہ چارپائی پر لیٹ جاتا۔ جسم دیر تک ساکن رہتا۔ آنکھیں بند ہو جاتیں۔۔ بے چینی ایک خمار میں بدل جاتی۔ دوپہر کا کھانا وہ کبھی کھاتا کبھی نہ کھاتا۔ بستر پر بے حس و حرکت پڑا رہتا۔ وہ نیند تھی یا خمار یا خواب و خیال کا سلسلہ کہ کسی دور دراز ملک کے منظر اور نقوش ابھرنے لگتے۔ گورکھ صبح سے شام تک بستر پر آنکھیں بند کئے ساکن پڑا رہتا۔ رفتہ رفتہ رات بھی آجاتی' لیکن وہ بستر سے نہ اٹھتا۔ کبھی کبھی جب بھوک بہت پریشان کرتی تو کچھ کھا کر پھر چارپائی کا سہارا لے لیتا۔ رات ہو جاتی اور وہ پڑا پڑا سو جاتا یا جاگتا رہتا۔ لیکن احساسات کہیں آدھے سوئے ہوئے اور کہیں آدھے جاگتے رہتے۔ جب ۴۸ گھنٹے پڑے پڑے چارپائی چبھنے لگتی تو وہ چارپائی سے اتر کر چارپائی کے نیچے فرش پر لیٹ جاتا۔ کیا وہ زمانے سے خوف زدہ تھا۔ کہ چارپائی کے نیچے فرش پر اسے راحت محسوس ہوتی تھی؟ جیسے وہ زمین کا کوئی حصہ ہو' جیسے اس کا بدن بھاری ہو تا زمین میں سمارہا ہو! کبھی کبھی دو تین دن تک لگاتار یہی عالم رہتا۔

کالج کے آخری سال میں سب طالب علموں کو کالج کی طرف سے بڑے بڑے کارخانوں عمارتوں اور شہروں کے دورے پر لے جایا گیا۔ جب طالب علموں کا گروپ کلکتہ پہنچا تو تین دن تک کوئی کارخانہ دیکھنے کا پروگرام نہ تھا۔ پروفیسر نے سب کو کھلی چھٹی دے دی کہ جہاں چاہو گھومو پھرو' کلکتہ کی سیر کرو' لیکن رات کو بارہ بجے سے پہلے لوٹ آؤ۔ اگر کوئی رات کو لوٹنا نہیں چاہتا تو وہ اطلاع دے کر غیر حاضر رہ سکتا ہے۔ گورکھ نہائے بغیر' ٹھیک طرح کھانا کھائے بغیر تین دن تک چارپائی پر ہی پڑا رہا۔ لڑکے آتے' کپڑے بدلتے' گپیں ہانکتے' کلکتہ شہر کی باتیں

کرتے رات کو سوتے اور صبح پھر کہیں غائب ہو جاتے۔ گورکھ کو تین دن تک لگاتار اسی چارپائی پر پڑا دیکھ کر ایک لڑکے نے گھبرا کر پروفیسر کو اطلاع دی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ گورکھ کا مرض بہ لطف' یہ خود فراموشی بڑھتی گئی۔ اس میں تازہ رخ پیدا ہوا کہ بے چینی خمار میں بدلنے کی بجائے اداسی میں بدلنے لگی۔ وہ پہروں دور خلا میں تکتا رہا۔ اگر ایسے میں کوئی اسے پکارتا تو چونک اٹھتا۔ وہ اداسی چند گھنٹوں سے لے کر چند دن تک قائم رہتی۔ دھیرے دھیرے اس پر غم کے دورے پڑنے لگے۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ کب اور کس وقت غم کا دورہ پڑے گا اور وہ ہنستے ہنستے اچانک' بے وجہ اداس ہو جائے گا۔

کالج کی پڑھائی کا آخری سال تھا۔ ہر روز کی طرح' شام کے کھانے کے بعد گورکھ اکیلا سڑک پر گھوم رہا تھا کہ تیز قدم چلتا ہو پیالال اس کے ساتھ ہولیا' پیالال گورکھ کا کلاس فیلو تھا۔ اور اس سے کسی حد تک بے تکلف بھی تھا۔

"تم ہمیشہ اکیلے ہی کیوں گھومتے ہو؟" پیالال پوچھنے لگا۔

"میں بہت بور ہوں۔ کوئی میرے ساتھ سیر کرنا پسند نہیں کرتا۔" گورکھ نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تم اپنے آپ کو بور کیوں کہتے ہو؟" پیالال بولا۔

"آج تم اپنی ٹولی کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟ کیا بات ہے کہ آج تم بھی اکیلے سیر کو نکلے ہو؟" گورکھ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو کچھ کالج کا کام ختم کرنا تھا' اس لئے میں آج پیچھے رہ گیا۔ میری ٹولی کے باقی سب لڑکے اور آگے نکل گئے۔ چلو' تمہیں اپنی ٹولی میں شامل کر لیتے ہیں۔"

"نہیں پیالال' میں تمہاری ٹولی میں شامل ہو کر تم لوگوں کے ہنسی مذاق کا مزہ خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

"تم ہر وقت اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہو؟ کبھی فلم تک نہیں دیکھتے!"

"کیا کروں؟ میری شکل پر ہی بارہ بجے ہیں۔ اگر میں کبھی خوش بھی ہوتا ہوں تو چہرے سے سنجیدہ لگتا ہوں۔"

"اچھا' یہ بتاؤ کہ اس وقت سیر کرتے ہوئے تم اداس ہو یا سنجیدہ یا خوش؟"

"میرے چہرے سے تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟"

"مجھے تو تمہاری صورت ایک جیسی ہی لگتی ہے۔ خوشی کی لہر کم ہی نظر آتی ہے۔ عام طور پر تم سنجیدہ یا بہت

سنجیدہ یا پھر کسی دوسری دنیا میں کھوئے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ لیکن آج کچھ ضرور خوش نظر آرہے ہو۔"

"ہاں' آج میں قدرے خوش ہوں۔ کوئی ساتھ چلنے کو دوست جو ملا' چاہے وہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی۔"

"خوش ہو تو کوئی خوشی کی بات کرو۔"

"مجھے لطیفے بازی نہیں آتی۔ میں دراصل سچ مچ بور ہوں۔ میں کبھی کسی کو خوش نہیں کر سکتا' یعنی ہنسا نہیں سکتا۔ تم لوگ اچھے ہو جو بات بات پر ہنس لیتے ہو۔"

"اچھا' جو بات اچھی لگتی ہے' وہی کہو۔ میں ضرور سنوں گا۔"

"میں تمہیں ایک غزل سناؤں؟ مجھے گانا تو نہیں آتا' لیکن شاعرانہ انداز میں ضرور سنا سکتا ہوں۔"

پیالال کے "ہاں" کرنے پر گورکھ نے ایک غزل سنائی۔ غزل سن کر پیالال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا "محبت کا درد تھا' اس غزل میں۔۔۔ بہت اچھے اشعار ہیں۔ تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا سچ سچ بتاؤ گے؟"

"ضرور پوچھو۔" گورکھ نے جواب دیا۔

"کیا تم کسی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو' یا ہوئے تھے؟ ہم سب یہی باتیں کیا کرتے ہیں۔"

"نہیں یار۔ عشق کا کوئی چکر نہیں ہے۔ تم سے کہا نا کہ صورت ہی ایسی ہے' ہر وقت بارہ بجے رہتے ہیں۔"

پیالال کو شاید یقین نہ آیا۔ وہ دیر تک اس بائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھامے رہا۔ دونوں اکھٹے واپس اپنے ٹھکانے پر لوٹے اور بائی بائی کہتے ہوئے اپنے اپنے کمروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

پیالال بہت خوب صورت نوجوان تھا۔ کشمیر کا رہنے والا تھا' پڑھائی میں اکثر گورکھ سے مدد مانگتا رہتا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا جب کسی نے گورکھ کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تھی' اسے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

کچھ دن بعد ایک شام کو گورکھ اپنی عادت کے مطابق ہوسٹل سے تنہا سیر کو نکلا ہی تھا کہ اسے پیالال دکھائی دیا۔ آج بھی وہ اکیلا تھا۔ گورکھ کو دیکھتے ہی وہ اس کے ساتھ ہولیا اور پوچھنے لگا "آج کس طرف چلنے کا ارادہ ہے؟"

"کہیں بھی چلے چلتے ہیں۔" گورکھ بولا : "کوئی خاص منزل نہیں ہے۔ بس ہوا خوری ہی کرنی ہے۔

"ویسے تم روزانہ کس طرف جاتے ہو؟" پیالال نے پوچھا۔

گورکھ ہنس پڑا۔ "میں تو کوئی بھی سنسان راہ پکڑ لیتا ہوں کہ خود فراموشی میں کسی سے ٹکرا نہ جاؤں۔"

"بے فکر رہو میں آج ساتھ ہوں۔ سنبھال لوں گا۔" پیالال بھی ہنس دیا۔

باتیں کرتے کرتے دونوں ایک بالکل سنسان راہ پر نکل گئے۔ جب گورکھ سڑک چھوڑ کر ایک میدان کی

طرف بڑھنے لگا تو پیالال ہنس کر بولا "ادھر کیا کرنے جا رہے ہو؟ کیا حاجت رفع کرنی ہے؟"

گورکھ نے جواب دیا : "نہیں یار، تم چلے بھی آؤ۔ میں اکثر اس درخت کے نیچے بیٹھا کرتا ہوں۔ ایک صاف ستھرا پتھر وہاں پڑا ہوا ہے۔ ہم دونوں کے بیٹھنے کے لئے اس پتھر پر کافی جگہ ہے۔ میں کہتا ہوں، چلے آؤ۔"

گورکھ دو قدم آگے تھا اور پیالال اس کے پیچھے۔ شام کے اندھیرے چھا رہے تھے۔ دونوں جا کر پتھر پر بیٹھ گئے۔ خاموشی توڑتے ہوئے پیالال بولا۔ "بھئی کچھ بات بھی کرو گے کہ گم صم ہی بیٹھے رہو گے۔"

گورکھ نے کہا "دیکھو، رات کس انداز سے آہستہ آہستہ اتر رہی ہے۔ رات کا اندھیرا کیسے ہر چیز کو اپنے دامن میں لپیٹے جا رہا ہے۔ اس میدان میں دور تک ابھی بجلی کے کھمبے نہیں لگے، اس لئے آسمان کتنا تاریک نظر آتا ہے۔ اور ستارے اتنے ہی زیادہ روشنی سے چمکتے نظر آتے ہیں۔ ذرا ماحول کا لطف اٹھاؤ۔"

"یار تم انجینئر کیوں بننے چلے ہو؟" پیالال ہنس پڑا۔ "میں کہتا ہوں شاعری کرو۔ مجھے بھی تمہارے ساتھ یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے، چلو، کوئی غزل ہی ہو جائے۔"

گورکھ بولا "آج تمہیں ایک غزل نہیں، ایک درد بھرا گیت سناتا ہوں۔ غور سے سننا اور مذاق مت اڑانا۔ دل سے سنو گے تو دیکھو گے کہ اس رات کی سیاہی میں شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔"

پیالال نے خاموشی سے گیت سنا، پھر قدرے درد بھری آواز میں کہنے لگا۔ "تم نے یہ درد، یہ غم کہاں سے خرید لیا؟ تم ضرور پرانے عاشق ہو

"نہیں یار، شاید یہ اداسی میری طبیعت میں شامل ہے۔ میں خود اس کی وجہ نہیں جانتا۔" گورکھ نے دھیرے سے کہا۔

پیالال نے ایک ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔ جواب میں گورکھ نے بھی ایک ہاتھ پیالال کی بغل میں ڈال دیا۔ کچھ دیر تک وہ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔

چلو بھئی، اٹھو۔ اداسی اور رات کے بادل ہٹاؤ۔ کالج کا کام کرنا ہے۔ آخری سال کی سخت پڑھائی ہے۔ تم تو اول نمبر پر ہو، مگر میں بہت پیچھے ہوں۔" پیالال نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

گورکھ بولا "جب بھی تمہیں میری کوئی مدد چاہئے، تو میں حاضر ہوں۔"

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پیالال نے دائیں ہاتھ کی انگلیاں گورکھ کی انگلیوں میں پرو رکھی تھیں اور دو ہتھیلیوں کے لمس نے رات کی خنکی میں ایک گوشہ راحت قائم کر لیا تھا۔ ہوسٹل کے سامنے آتے ہی دونوں کے ہاتھ الگ الگ جھولنے لگے اور وہ اپنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

اگلے دن شام کو سیر کرنے کے لئے پیالال کی ٹولی کے لڑکے اسے ہم راہ لے جانے کے لئے اصرار کرنے

لگے۔ تو پیا لال نے ان سے کہا کہ اس نے ابھی کالج کا کام ختم کرنا ہے۔ گورکھ کا کمرہ پیا لال کے کمرے سے تین کمرے چھوڑ کر تھا۔ گورکھ نے محسوس کیا کہ پیا لال اس کے کمرے سے باہر نکلنے کے انتظار میں ہے۔ وہ کمرے سے باہر نکل کر سڑک پر آیا اور مڑ مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ پیا لال اسے دیکھ کر دور سے ہی بولا "مڑ مڑ کر کیا دیکھ رہے ہو میں یہاں موجود ہوں۔"

گورکھ نے کہا "دیکھو پیا لال، مجھے تمہارے ساتھ سیر کرنا اچھا لگنے لگا ہے۔ تم ایک بور شخص کے دوست بن رہے ہو، جس سے کوئی دوستی کرنے کو آمادہ نہیں۔"

"تم بور نہیں ہو۔" پیا لال بولا "مت کہو اپنے کو بور۔ چلو اسی میدان کی طرف چلتے ہیں جہاں کل پتھر پر بیٹھے تھے۔"

"کیا اس ماحول کا اثر تمہیں بھی بے قرار کر گیا؟" گورکھ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

پیا لال نے کچھ جواب نہ دیا دونوں ہاتھوں میں ہاتھ تھامے، اسی میدان کی طرف چل پڑے۔ گورکھ نے پیا لال سے کہا "میں تمہیں سنانے کے لئے ہر روز نئی غزل کہاں سے لاؤں؟ تم اپنے بارے میں ہی کچھ کہا کرو۔ اپنے دل کے بارے میں کہا کرو۔ اور کچھ نہیں تو کالج کی پڑھائی کے بارے میں کہا کرو۔ کسی مشکل تھیوری کا ذکر کیا کرو۔ کچھ تو کہا کرو۔"

"چھوڑو یار، صبح سے شام تک یہ سوال اور تھیوریاں دماغ چاٹ جاتی ہیں۔ ہم ان کے بارے میں بالکل بات نہیں کریں گے۔ جب تمہارا گیتوں اور غزلوں کا خزانہ ختم ہو جائے گا تو پھر پہلے گیت پر آجانا۔" پیا لال سنجیدگی سے بولا۔

"کیا تمہیں واقعی میرے گیت اور غزلیں اچھی لگتی ہیں؟"

"کچھ کچھ۔"

اس روز بھی وہ دیر تک پتھر پر ساتھ ساتھ بیٹھے رہے۔ گورکھ نے اپنا سر پیا لال کے شانے پر رکھ دیا۔ پیا لال بھی اس کے اور قریب سرک آیا اور گورکھ کے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگا "میرے شانے پر سر رکھ کر کیا آنسو بہانے ہیں؟"

"نہیں یار بس یوں ہی اچھا لگ رہا ہے۔" گورکھ بولا۔

"پیا لال نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "صرف ایک سال اور، اس کے بعد یہ لمبے بال غائب۔ تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہیں کوئی نوکری نہیں دے گا۔ انٹرویو میں بھی کیا غزل سناؤ گے؟"

گورکھ کو ہنسی آ گئی۔ "تمہیں یاد ہے کہ جب ہم کالج میں پہلے دن داخل ہوئے تو ایک سینئر نے میرے بال کاٹ دیئے تھے۔ اور کہا تھا کہ لمبے بالوں والے انجینئر نہیں بن سکتے۔ میں نے پھر بال بڑھا لئے اور اب کوئی انہیں

کچھ نہیں کہتا۔ ایک سال رہ گیا ہے ڈگری ملنے میں۔"

"یہ تم سے کس نے کہا کہ کوئی کچھ نہیں کہتا؟ سب طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ یہ کہو کہ تمہیں ان باتوں کی کوئی پروا نہیں اور تمہیں یہ لٹیں بہت پیاری ہیں۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

پیا لال اپنے ہونٹ گورکھ کے کان تک لے آیا اور کہنے لگا "ناخن تو بڑھائے ہوئے ہیں اور ان پر نیل پالش بھی لگاتے ہو۔ دوپٹا سر پر اور ڈال لو اور نقلی برا پہن کر ایک دن ہوسٹل کے دروازے پر کھڑے ہو جاؤ پھر دیکھو کیا مزہ آتا ہے!"

گورکھ کو پیا لال کی بات بری نہ لگی "میں مانتا ہوں میرا دماغ کچھ خراب ہے، لیکن ابھی اتنا زیادہ خراب نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ بالکل ویسا ہی کرنے لگوں جیسا کہ تم نے مشورہ دیا ہے۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ گورکھ کو ہنستے دیکھ کر پیا لال بولا "تم ہنس بھی سکتے ہو، یہ آج معلوم ہوا! چلو، کسی بات پر تو ہنسے۔"

"خود پر ہنسنا ہنسنا نہیں ہوتا اس ہنسی میں رونا چھپا ہوتا ہے لیکن دوسروں پر ہنسنے سے بہتر ہے کہ خود پر ہنس لیا جائے۔"

"میں آج واقعی مان گیا کہ تمہارا دماغ کہیں نہ کہیں ضرور خراب ہے اسی لئے اس پر برقی دباؤ کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔" "میرا مطلب ہے، اسی لئے تمہارا دماغ بجلی کی تھیوریاں جلد سمجھ سکتا ہے۔"

"نہیں یار تم نے غالب کی غزل نہیں سنی : "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ نکلے دم۔" فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ میری خواہش کیا ہے۔"

"یہ تو بہت الجھا ہوا معاملہ ہے۔"

ان الجھنوں کا حل شاید یہی تھا کہ گورکھ اس رات پیا لال کے اور قریب ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک بازو پیا لال کی گردن میں حائل کر دیا۔ پیا لال نے بھی اس کی نقل کی۔ ان نزدیکیوں نے جیسے کوئی پیچیدہ مشکل حل کر دی ہو۔ گورکھ پیا لال کے کان میں کہنے لگا : "مجھے یہ نزدیکیاں اچھی لگتی ہیں۔ چند لمحوں کے لئے یہ اداسی، یہ غم، یہ رات، یہ رات کی سیاہی، یہ پیڑ اور اس پیڑ سے ابھی ابھی پر پھیلا کر اڑتا پرندہ۔ تمام احساس کند ہو جاتے ہیں۔ دل تمہاری قربت کا طلب گار ہو جاتا ہے۔"

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اور ایک دوسرے کو تھامے اسی طرح بیٹھے رہے۔

پیا لال کا روزانہ بہانہ نہیں چل سکتا تھا کہ وہ کس وجہ سے اپنی ٹولی کے ساتھ سیر کرنے نہیں جا سکتا۔ اس طرح شک پیدا ہو سکتا تھا۔ اس لئے پیا لال کو ہفتے میں تین، چار دن اپنی ٹولی میں شامل ہونا پڑتا اور باقی چار یا تین

دن پیالال اور گورکھ ایک ساتھ سیر کو نکلتے۔ لوگوں سے ڈر ڈر کر، بچ بچ کر ان کا ساتھ گھومنا ہوتا۔ پیالال انتظار میں رہتا کہ کب گورکھ نے کمرہ بند کیا اور کب وہ باہر نکلا۔ اسی طرح گورکھ بھی انتظار میں رہتا۔ دونوں ہوسٹل سے کبھی ایک ساتھ نہ نکلتے۔ یوں ایک ساتھ سیر کرنا کوئی جرم نہ تھا' لیکن گورکھ کی شہرت ایسی تھی کہ اگر کوئی اس کے ساتھ سیر کرنے چلا جاتا تو قیاس آرائی شروع ہو سکتی تھی۔ اس کی جانب انگلیاں اٹھ سکتی تھیں۔ لوگ پوچھ سکتے تھے : "تم گورکھ کے ساتھ سیر کرنے جاتے ہو' تم آپس میں باتیں کیا کرتے ہو؟ ہمیں تو یقین نہیں کہ گورکھ تھیوریوں کے سوا اور بھی کوئی بات کر سکتا ہے۔ وہ ہر عام سی چیز اور واقعہ پر بھی کوئی تھیوری جھاڑ دے گا۔ آج تمہاری صورت اس لئے بگڑی لگ رہی ہے کہ کل تم گورکھ کے ساتھ سیر کر رہے تھے۔"

لوگوں کی سرگوشیوں سے بچنے کے لئے یہی واجب تھا کہ وہ ایک دوسرے سے کھلے عام نہ ملیں اور ایک فاصلہ ایک دوری قائم رکھیں۔ اگر کسی کی نظر پڑ گئی کہ وہ دونوں بغل گیر ہوئے عاشقوں کی طرح اکھٹے بیٹھے تو ہوسٹل میں طوفان آجائے گا۔ دنوں اس قدر بدنام ہوں گے کہ موںہہ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ لیکن ہائے وہ نزدیکیاں! نہ جانے کیا کشش تھی کہ دونوں اس کے لئے خطرہ مول لینے کو تیار تھے' عزت داؤ پر لگانے کو آمادہ تھے۔ گورکھ پیالال سے بغل گیر ہو کر' اس کے شانے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کئے دیر تک بے حرکت بیٹھا رہتا۔ سڑک پر یا سونے میدان میں ان دونوں کا ساتھ چلنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اگر سڑک پر کوئی مل جائے؟ یا میدان کی طرف اچانک کوئی آدمی آنکلے اور انہیں دیکھ لے تو کیا حشر ہو گا؟

جب ملاقاتیں بڑھنے لگیں تو گورکھ نے ایک ترکیب نکالی۔ شام کے کھانے کے بعد جب تقریباً" سب لوگ سیر کو نکل جائیں تو وہ دونوں ہوسٹل ہی میں ٹکے رہیں۔ کیا ضرورت تھی سڑک پر نکلنے کی؟ گورکھ سیر کرنے جاتا ہے یا نہیں' اس کی کسی کو پروا نہ تھی۔ اگر وہ مہینہ بھر بھی سڑک پر نظر نہ آئے تو کسی کو کوئی شک نہ ہو گا۔ لیکن پیالال کا ہفتے میں چار دن باہر نکلنا ضروری تھا۔ بس باقی کے تین دن گورکھ اپنے کمرے میں روشنی جلا کر پیالال کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ اس کے دبے پاؤں پہنچتے ہی پیالال اپنے کمرے کی روشنی گل کر دیتا۔ پہلی بار جب اس نے پیالال کے رخساروں کا بوسہ لیا تو خود ہی شرم سے گردن جھکالی۔ پیالال نے کچھ کہے بغیر فوراً" قرض چکا دیا۔ وہ دیر تک ایک دوسرے سے بغل گیر رہے۔ پیالال اپنی طرف سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا۔ جب گورکھ اپنے کمرے میں واپس آیا تو اسے اپنی حرکت پر حیرت ہوئی کہ یہ شخصیت کا کون سا رخ ہے' جس سے وہ قطعی ناواقف ہے؟ وہ جس سختی سے خود کو زمانے کے سامنے قابو میں رکھے ہوئے ہے' کیا وہ صرف دکھاوا ہے؟ بہت سوچنے پر بھی گورکھ کو اس بات کا کوئی جواب نہ ملتا۔ لیکن پیالال کے ساتھ اپنے تعلقات پر اسے شرمندگی بھی نہ ہوتی۔ بیتے دنوں میں جو ہوا اور موجودہ وقت میں جو ہو رہا تھا' وہ کسی غلطی کا احساس قطعی نہ پیدا کرتا۔ جیسے پانی کا ایک ریلا آگے کی طرف بڑھ جاتا ہے اور پانی پر اس کے نشان تک باقی نہیں رہتے اسی طرح اس کا وجود

آگے بڑھ آیا ہے۔ جو پیچھے رہ گیا، وہ ایک نقش، ایک پانی کا ریلا، ایک یاد ہے۔ گذشتہ کا وجود ہے تو فقط اتنا کہ وہ دماغ کے کسی گوشے میں تازہ ہے۔ اسے بھلایا نہ جاسکا۔ کبھی اس دور سے گزر ہوا تھا، یہ احساس ضرور باقی رہ گیا۔ جیسے دیا بجھ چکا ہو اور اس کی روشنی کا حلقہ دیر تک تصور میں جگمگاتا رہا ہو۔ ان یادوں میں اگر کچھ ہے تو صرف ایک طرح کا درد، جیسے گورکھ بیان نہیں کرسکتا، بس محسوس کرسکتا ہے۔

پیالال سے ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور ہر ملاقات نزدیکیاں بڑھاتی رہی۔ وہ بے دھڑک پیالال کے لب چوم لیتا۔ بوسوں کا سلسلہ شروع ہوا تو دیوانگی کی حد تک جا پہنچا۔ جب تک زبانوں میں حرکت کی طاقت رہتی اور لبوں میں پھڑکنے کا دم وہ پاگل پن جاری رہتا۔ دیوانگی اس حد تک بڑھی کہ بارہا لبوں سے لہو جاری ہوا، جس کے نمکین ذائقے کا خمار ابھی تک گورکھ کی رگوں میں رواں ہے۔

امتحان کے دن قریب آرہے تھے۔ انجینئرنگ کا آخری سال تھا۔ طالب علموں نے شام کی سیر بہت کم کردی تھی۔ اکثر طالب علم شام کے کھانے کے بعد سیدھے کمرے میں آکر کتابوں پر گر پڑتے۔ پیالال اور گورکھ کی ملاقاتیں کم ہوگئیں۔ چند مہینے اور، پھر کالج میں چھٹیاں ہوجائیں گی اور اس کے بعد ڈگریاں لے کر سب طالب علم اپنی اپنی راہوں پر چلے جائیں گے۔ سب کے راستے جدا جدا ہوجائیں گے۔ گورکھ کو پیالال کی قربت کی بہت کمی محسوس ہوتی۔ امتحان سر پر آگیا، مگر دونوں تنہائی کی تاک میں لگے رہتے۔

آخر سالانہ امتحان ختم ہوا۔ اس کے بعد دو مہینے اور کالج کھلا رہا، جس میں کوئی نہ کوئی پروجیکٹ تیار کرنا تھا۔ پروجیکٹ کی ٹیم میں تین طالب علم مل کر کام کرتے تھے۔ اتفاق سے پیالال اور گورکھ ایک ہی ٹیم میں شامل ہوئے۔ انہیں پروجیکٹ یہ ملا کہ ایک شہر میں بجلی مہیا کرنی ہے، اس کا پورا منصوبہ تیار کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہیں دو دن کے لئے نزدیک کے قصبے جانا پڑا۔ گورکھ اور پیالال ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے۔ صبح کو اٹھے تو ناشتہ کرتے وقت تیسرا ساتھی پوچھنے لگا "تم دونوں کے چہرے اترے ہوئے کیوں ہیں؟"

پیالال نے جواب دیا تھا۔ "ہوٹل کے کھانوں کا اثر ہوگا۔"

وہ پیالال سے وصل کی آخری رات تھی۔ کچھ ہی دنوں میں پروجیکٹ تیار ہوگیا۔ کالج بند ہوئے اور پیالال کشمیر چلا گیا۔ گورکھ پیالال کی محبت کبھی نہ بھول سکا۔ وہ محبت خود غرضی سے الگ، ایک جگمگاتی دیوانگی سے کم نہ تھی۔ وہ دیوانگی پہلے آسمان کو چومتی اور جب زمین بوس ہوتی تو بادل بن کر برس پڑتی۔

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ گورکھ کالج میں اور پورے پنجاب میں اول نمبر پر پاس ہوا۔ اسے کالج نے میڈل عطا کیا اور بہت سے انعام دے کر حوصلہ افزائی کی۔ پیالال بھی ڈگری لینے پہنچا ہوا تھا۔ وہ مسکرا کر گورکھ سے پوچھنے لگا "شادی کب کر رہے ہو؟ انجینئر تو بن ہی گئے ہو۔ زبردست معرکہ مارا ہے۔"

گورکھ نے جواب دیا : ابھی سے شادی کہاں؟ میں تو شاید عمر بھر کنوارا ہی رہوں!"
"کیا کوئی اور پیالال مل گیا ہے؟"
"نہیں یار، کیسی بات کرتے ہو! وہ بات تم تک ہی تھی اور تم پر ہی ختم ہو گئی۔"
"میں نے تو اپنا انتظام کرلیا ہے۔ میں تو جلد ہی شادی کرنے والا ہوں۔"
"اتنی جلد تیر نشانے پر لگا آئے!"
"وقت کی بات ہے۔ ماں باپ نے ایک جگہ بات چلائی اور مجھے لڑکی پسند آگئی۔ بہت خوب صورت

"تم کیا کم خوب صورت ہو۔ کشمیر کی خوب صورتی تو مشہور ہے۔"
"خط و کتابت جاری رکھنا۔ کشمیر آؤ تو ضرور ملاقات کرنا۔"
"دیکھو وقت کیا رنگ دکھاتا ہے۔"
"ابھی تک آہیں بھرنی نہ چھوڑیں! اسی طرح لمبی سانس لے کر اور دور کہیں خلا میں دیکھ کر بات کرتے ہو! میرا کہا مانو اور اب یہ لمبے بال کٹوا ڈالو۔"

"زمانے نے بہت سے رخ بدل ڈالے' آج کے بعد پھر ملے تو شاید کچھ اور ہی صورت حال ہو۔"

انعامات تقسیم ہوئے۔ پرنسپل نے گورکھ کو اپنے کمرے میں بلایا۔ مبارک باد دینے کے بعد کہنے لگا "تم بہت ذہین ہو۔ دل سے پڑھنے میں اور امتحان کے لئے یا روزی کمانے کے لئے تعلیم حاصل کرنے میں یہی فرق ہے۔ تم نے کالج کا نام روشن کیا ہے۔ میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے۔ میں آپ کی بات غور سے سن رہا ہوں۔" گورکھ بولا۔

"میری رائے ہے کہ تم آگے پڑھو۔ ایم ای کرو۔ پی ایچ ڈی کرو۔ امریکہ جاؤ۔ اور جب وہاں سے ڈگریاں لے کر آؤ تو اسی کالج میں پڑھاؤ۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ میں نے ایک اسسٹنٹ پروفیسر کو وظیفہ دلوا کر امریکہ بھجوایا ہے۔ میں تمہارے لئے بھی کوشش کر سکتا ہوں۔ یہ مت سوچنا کہ امریکہ جانے میں تمہارا کوئی خرچہ ہو گا۔ اگر ہوا تو بھی بہت معمولی۔ ہوائی جہاز کے کرائے کا انتظام ہو جائے گا۔"

پرونسپل کی بات سن کر گورکھ قدرے سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ابھی چند سال پہلے وہ گاؤں میں اسکول ماسٹر کی نوکری کرنے کے لئے رضامند تھا۔ آج پرنسپل اسے امریکہ بھیج رہا ہے۔ انجینئرنگ کالج کے پروفیسروں کو رہائش کے لئے خوب صورت بنگلے ملے ہوئے ہیں۔ کالج کا ماحول اچھا ہے۔ وہ سوچ کیا رہا ہے؟ اسے فوراً اقرار کرلینا چاہئے۔ اس نے کہا "آپ کا شکریہ' آپ میرے خیر خواہ ہیں۔ لیکن اب میں آگے پڑھنا نہیں چاہتا۔ پی ایچ ڈی لے کر تو تمام عمر کتابوں میں ہی ڈوب کر رہ جاؤں گا۔ میں نے جو کچھ سیکھا

ہے' اسے عملی جامہ پہنانا چاہتا ہوں۔ انڈسٹری میں پی ایچ ڈی کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے جتنی تعلیم حاصل کرلی ہے' وہ کافی ہے۔ پھر بھی میں آپ کو دوبارہ غور کر کے جلد ہی جواب دوں گا۔"

پرنسپل کچھ ناامید ہو کر کہنے لگا "زمانہ بدل رہا ہے۔ آج انڈسٹری میں پی ایچ ڈی کی ضرورت نہیں' لیکن کل کچھ اور ہی ماحول ہو گا۔ میں سوچتا ہوں کہ اپنا ذہین دماغ تم انڈسٹری میں جاکر گنواؤ گے؟ تمہیں کوئی ریسرچ کرنی چاہئے خیر جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے جلد اطلاع دینا۔"

آج پینتیس سال انڈسٹری میں نوکری کرنے کے بعد بھی گورکھ پرنسپل کے وہ چند الفاظ نہ بھلا سکا۔ کاش اس نے پرنسپل کا کہا مانا ہوتا۔ کاش اس نے پی ایچ ڈی کرلی ہوتی۔ کاش اس نے کوئی نئی ایجاد کی ہوتی۔ لیکن آہیں بھرنے سے کیا فائدہ؟ ایک زندگی میں جو بھی ہوتا ہے اس پر انسان کا اختیار بہت کم ہوتا ہے۔ جب جو ہوتا ہے ہو کر ہی رہتا ہے۔ پانی کی ایک بوند جو آسمان سے پہاڑ کی چوٹی پر گرتی ہے' کسی طرف کا بھی رخ کر سکتی ہے۔ اپنی راہ پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ ایک بوند سمندر کے نمکین پانی میں سما جاتی ہے اور اس کی ہم جولی کسی منتظر صدف کے کھلے مونہہ میں جاگرتی ہے اور گوہر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بوند کی کوئی تدبیر اس کا مقدر نہیں بدل سکتی۔

انجینئرنگ کی پڑھائی ختم کرکے گورکھ اپنے گھر چلا آیا۔ گوپال داس ان دنوں کھڑاؤں نام کے ایک چھوٹے سے شہر میں مقیم تھے، جو دہلی سے تقریباً ۲۵ میل کی دوری پر تھا۔ کتابی پڑھائی کے بعد گورکھ کو ایک سال کی ٹریننگ درکار تھی یا پھر انتظار کرنا تھا کہ بغیر ٹریننگ کے ہی کوئی نوکری مل جائے۔ گورکھ نے سوچا کہ ٹریننگ کے لئے بجلی گھر سے بہتر جگہ کیا ہو سکتی ہے؟ اس کی فرمائش کے مطابق کالج نے دہلی کے راج گھاٹ بجلی گھر میں ٹریننگ کا انتظام کرا دیا۔ جب وہ راج گھاٹ پاور ہاؤس جانے کے لئے تیار ہوا تو ماں باپ نے ہزار دعائیں دیں اور کہا "دل لگا کر کام کرنا۔ جیسے پڑھائی میں اول رہے ہو، ویسے کام میں بھی ہوشیاری دکھانا۔"

اگرچہ ٹریننگ میں کوئی تنخواہ نہیں ملنی تھی، لیکن کسی اچھی نوکری پر لگنے کے لئے وہ پہلا قدم تھا۔ گھر سے رکشا پر سوار ہو کر گورکھ کھڑاؤں کے ریلوے اسٹیشن پہنچا اور وہاں سے ٹرین پکڑ کر دہلی ریلوے اسٹیشن پر اتر گیا۔ پھر بس پکڑ کر راج گھاٹ پاور ہاؤس گیا اور بس اسٹاپ سے کچھ دور پیدل چل کر پاور ہاؤس کے گیٹ پر پہنچا۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ سیکورٹی کے سپاہی نے اسے ایک دفتر کی طرف بھیج دیا، جو بند پڑا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد بابو لوگ آنے شروع ہوئے اور آتے ہی چائے پینے کے لئے رخصت ہو گئے۔ گورکھ آفس کی بینچ پر بیٹھا اونگھتا رہا تقریباً دس بجے ایک بابو نے اس کے ہاتھ سے خط لے کر کہا "سپرنٹینڈنگ انجینئر صاحب تو ابھی دفتر میں نہیں ہیں۔ آپ کی ٹریننگ کا بندوبست وہی کریں گے۔ آپ کو پاور ہاؤس کے صدر دروازے سے داخل ہونے دیا جائے اس کے لئے یہ ٹیمپریری پاس بنائے دیتا ہوں۔ آپ ذرا ہیڈ کلرک سے دستخط کروالیں۔ لیکن ابھی وہ سیٹ پر موجود نہیں ہیں۔"

آدھے گھنٹہ بعد تین دوستوں کے ہمراہ، قہقہے لگاتا۔ ہیڈ کلرک اپنی سیٹ کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ مزید آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد گورکھ کو پاور ہاؤس میں داخل ہونے کا پاس مل گیا، جسے گورکھ جیب میں رکھ سپرنٹینڈنگ انجینئر کی آمد کی راہ دیکھنے لگا۔ لنچ کا وقت قریب آ گیا، لیکن صاحب نہیں آئے۔ گورکھ دفتر سے اٹھا اور پاور ہاؤس کے باہر نکل آیا۔ قریب ہی راج گھاٹ تھا۔ گاندھی جی کی سمادھی دیکھ کر گورکھ واپس پاور ہاؤس آ گیا۔ دو بجے کے قریب سپرنٹینڈنگ انجینئر آیا۔ اس کے کمرے کے باہر کئی آدمی اس کی آمد کی راہ دیکھ رہے تھے، جن میں سے ایک گورکھ بھی تھا۔ آتے ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا، چپراسی اس کا بریف کیس اٹھائے پیچھے

پیچھے داخل ہوا۔ چند لمحوں بعد چپراسی باہر نکلا اور کہنے لگا" آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیے۔ صاحب کا حکم ہے کہ ابھی آدھے گھنٹہ تک کسی کو بھی اندر نہ بھیجا جائے۔ آپ لوگ اطمینان رکھیں۔ ایک ایک کر کے صاحب سب ہی سے ملیں گے۔ آپ اپنے نام اور کام پرچوں پر لکھ کر مجھے دے دیں۔"

گورکھ نے اپنا نام اور کام لکھ کر پرچی چپراسی کے حوالے کر دی۔ پہلا شخص جو اندر گیا؟ وہ ایک گھنٹہ تک باہر نہ نکلا۔ گورکھ چپراسی کے قریب جا کر پوچھنے لگا۔ "مجھے کوئی دفتری کام نہیں ہے۔ میں یہاں ٹریننگ لینے کے لئے آیا ہوں۔ مجھے پہلے اندر جانے دو۔"

چپراسی نے جواب دیا "تم ٹریننگ لینے آئے ہو یا جھاڑو مارنے' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ پرچیاں اندر بھیج دی ہیں۔ جس کو صاحب بلائیں گے' وہی اندر جائے گا۔"

گورکھ نے ایک اور کوشش کی۔ "میں بھنڈی انجینئرنگ کالج سے آرہا ہوں۔ صبح سے وقت برباد کر رہا ہوں۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"تم بھنڈی کھا کر آرہے ہو یا بھرتا' مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ابھی نمبر آیا جاتا ہے۔" چپراسی نے جواب دیا۔

گورکھ اداس چہرہ لٹکائے واپس بینچ کی جانب مڑا تو اس درمیان اس کی سیٹ پر کسی دوسرے شخص کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ناچارہ وہ ایک گھنٹہ اور کھڑا رہا۔ لیکن اس کا بلاوا نہ آیا۔ شام کے پانچ بجنے کو آئے۔ گورکھ کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو وہ سوچتا کہ اس کا نام پکارا جا رہا ہے' لیکن نہیں۔ یہ صرف اس کا وہم تھا۔ کمرے کے اندر سے سرگوشیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ گورکھ کے دماغ میں تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چپراسی کو دھکا دے کر' دروازہ کھول' اندر داخل ہو جائے اور سپرنٹینڈنگ انجینئر سے پوچھے کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ وہ فرسٹ کلاس ڈگری لے کر صبح سے بغیر تنخواہ کی ٹریننگ کے لئے کھڑا ہے' جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہے۔ انجینئرنگ کی ڈگری لینا جرم تھا یا اس پاور ہاؤس میں ٹریننگ کے لئے آنا گناہ ہے؟ گورکھ نے اپنے پیشے کے متعلق کتنے سہانے خواب سجائے تھے۔ وہ سب اسے یکایک چور چور ہوتے نظر آئے۔ اس دنیا میں دماغ کی کوئی قدر نہیں' جذبات کی کوئی قدر نہیں' ایمان داری کی کوئی قدر نہیں۔ ابھی جو شخص سپرنٹینڈنگ انجینئر کے کمرے میں گھس گیا وہ تو ابھی ابھی آکر کھڑا ہوا تھا۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا تو چپراسی نے کڑک دار آواز میں کہا "صاحب اب کسی سے نہیں مل سکتے۔ انہیں ضروری کام آپڑا ہے۔ باقی لوگ کل آکر مل لیں۔"

شام کے چھ بجے کے قریب گورکھ تھکا ماندہ' اداس اور پریشان' پاور ہاؤس کے گیٹ سے واپس نکلا اور ایک فرلانگ چل کر بس کے اڈے تک پہنچا۔ ایک بس آکر لگی تو منتظر مسافروں نے حملہ بول دیا۔ کنڈکٹر نے دھکے مار

مار کر دو مسافروں کو نیچے اتارا۔ دو مسافر بس کے پیچھے سیڑھی پر لٹک گئے۔ اور دو دروازے کے ہینڈل سے جھومتے رہے۔ دوسری بس آئی۔ اس میں بھی گورکھ کو قدم رکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ تیسری بس میں بھیڑ قدرے کم تھی۔ گورکھ دلی ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سے ٹرین پکڑ کر کھڑاؤں ریلوے اسٹیشن پہنچا اور رکشا پکڑ کر گھر پہنچتے پہنچتے رات کے گیارہ بج گئے۔

گھر میں سب لوگ پریشان نظر آرہے تھے۔ گورکھ کو بھوک ستا رہی تھی۔ ساوتری نے گرم کھانا اس کے سامنے رکھا اور پوچھنے لگی "بڑے اداس نظر آرہے ہو۔ کیا بہت کام تھا؟ بہت تھکے ہوئے لگتے ہو۔"

"ماں تم، ٹھیک کہہ رہی ہو۔" گورکھ مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو گیا۔ وہ سچ مچ بہت تھک گیا تھا۔ اسے زندگی ایک نئے رنگ ایک نئی شکل میں نظر آرہی تھی۔ اندر ہی اندر زمانے سے پہلے ہی خفا رہتا تھا۔ اس روز اس کا دل زمانے کو گالیوں پر گالیاں دے رہا تھا۔ وہ تمام گندی گالیاں جو اس کے ساتھی کالج میں جپتے تھے اور جنہیں وہ زبان پر لانا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ ساری رات سوچتا رہا کہ اگر اس سپرنٹینڈنگ انجینئر کا سامنا ہو جائے تو وہ اس کا مونہہ نوچ لے، اس کا سر پھوڑ دے، اس کی آنکھیں نکال لے۔

رات بھر اتنا سوچنے کے بعد بھی گورکھ صبح کو جلد اٹھا اور پاور ہاؤس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ آج وہ ذرا دیر سے پاور ہاؤس پہنچا۔ دفتر میں کلرک پہلے سے ہی موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگا "میں نے آج اخبار میں تمہارا فوٹو دیکھا ہے۔ تم یونیورسٹی میں اول آئے ہو۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے۔ چلو اس بات پر کچھ مٹھائی اور چائے ہو جائے۔"

"مٹھائی اور چائے کو مارو گولی" کل میں سارے دن سپرنٹینڈنگ انجینئر سے ملنے کے لئے اس کے دروازے پر کھڑا رہا، لیکن اس نے مجھے اندر طلب نہیں کیا۔ مجھے بہت برا لگا۔"

کلرک نے دلاسا دیا : "اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ تمہاری ٹریننگ تو شروع ہو گئی۔ جب تم پاور ہاؤس کے دروازے سے اندر آئے اور تم نے کارڈ پنچ کیا تو آنے کا وقت درج ہو گیا۔ جب تم دروازے سے شام کو باہر نکلے اور کارڈ پنچ کیا تو جانے کا وقت ریکارڈ ہو گیا۔ تمہاری حاضری لگ گئی۔ صاحب کل نہیں ملے تو آج مل جائیں گے۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

کلرک شاید انجانے میں ایک بڑی حقیقت کہہ گیا تھا۔ گورکھ اس کی بات پر غور کرنے لگا تو وہ حقیقت اسے بھی صاف نظر آنے لگی "بغیر تنخواہ کے ملازم ہو۔ آؤ، جاؤ۔ پاور ہاؤس میں گھومو پھرو۔ چائے پیو، مٹھائی کھاؤ۔ کوئی کام ہو گا تو دیکھا جائے گا۔ کسی سے میس کا بہانہ کر کے۔ گھنٹوں غائب رہو۔ گاندھی کی سمادھی قریب ہے۔ خوب صورت باغ ہے۔ فوارے ہیں، پھول ہیں، کیاریاں ہیں۔ ٹریننگ کا مزہ لو۔"

گورکھ نے کلرک سے پوچھا "تمہارے صاحب کا کیا نام ہے؟"

”کلرک بولا۔ ”انہیں بیجو پرشاد کہتے ہیں۔ مگر تم نام معلوم کر کے کیا کرو گے؟ کہیں رپورٹ کرو گے؟ (ہنستے ہوئے) اس پاور ہاؤس کے وہ سب سے بڑے افسر ہیں۔“

گورکھ نے (دل ہی دل میں کہا) ”ضرور ہوں گے۔ بیجو نہیں، بالکل بجو ہے۔ ہزار بار بجو ہے۔ بجو سے بھی بدتر ہے، کیکڑا ہے۔“

اس روز گورکھ بیجو کے دروازے پر زیادہ دیر نہ ٹکا؟ چپراسی سے پوچھ لیا کہ کب تک صاحب کے آنے کی امید ہے۔ چپراسی نے کہا کہ دوپہر کے دو بجے کے بعد کی امید کی جاسکتی ہے۔ گورکھ پاور ہاؤس کے گیٹ سے باہر نکل کر سبز گھاس پر بیٹھ گیا۔ باغ کی خوب صورتی اور لوگوں کی آمدورفت دیکھتا رہا، سڑک کی چہل پہل دیکھتا رہا، پیڑ کے نیچے بیٹھ کر گھر سے لایا ہوا کھانا کھایا اور وہیں دراز ہو گیا۔ کل کی تکان باقی تھی۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ نیند کھلی تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ وہ واپس پاور ہاؤس پہنچا۔ وہاں بیجو کے دروازے پر کل جیسی ہی کیفیت تھی۔ گورکھ نے آدھے گھنٹہ انتظار کیا۔ اسے احساس ہوا کہ اگر وہ چار گھنٹے اور بھی انتظار کرے گا تو اس کا نام نہیں پکارا جائے گا۔ وہ پاور ہاؤس سے باہر نکلا اور پاور ہاؤس کا پاس پھاڑ کر اس نے ہوا کے سپرد کیا۔ اس کی پاور ہاؤس کی ٹریننگ ختم ہو چکی تھی۔ جو کچھ اس نے دو دن میں سیکھا تھا وہ چار سال انجینئرنگ کی پڑھائی کے بعد ڈگری لے لینے سے کم نہ تھا۔ پانچ بجے تک گھر واپس پہنچ گیا۔

اسے اتنی جلد واپس موجود دیکھ کر ساوتری پوچھنے لگی ”کیا بات؟ آج اتنی جلد کیوں لوٹ آئے؟ یہ دیکھو دو اخباروں میں تمہارا نام اور فوٹو چھپا ہے۔

اس نے فوٹو کو ایک نظر دیکھ کر اخبار رکھ دیا۔ اسے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اسے خوشی ہوئی تھی پاور ہاؤس کے پاس کے پرزے ہوا میں بکھرتے دیکھ کر۔

گورکھ نے کئی جگہ نوکری کے لئے درخواستیں بھیج رکھی تھیں۔ مگر کہیں سے بھی جواب نہیں آیا تھا۔ وہ سوچتا رہتا کہ اس دوران گھر میں بے کار بیٹھ کر کیا کیا جائے؟ ایک دن بھی خالی بیٹھنا اسے محال لگتا تھا۔ اول آنے کے بعد بھی جیسے اس کا خود اعتماد غائب ہو گیا ہو۔

کھڑاؤں میں بھی ایک چھوٹا سا بجلی گھر تھا۔ آفس کا انچارج ایس ڈی او گوپال داس سے واقف تھا۔ گورکھ نے پلان بنایا کہ جب تک مناسب نوکری نہ ملے، کھڑاؤں میں ٹریننگ لے لی جائے۔ اس کے لئے کالج کی منظوری ضروری تھی۔ منظوری ملتے ہی وہ ایس ڈی او کے دفتر میں پہنچا۔ واقفیت کی وجہ سے دروازے پر اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔

ایس ڈی او کہنے لگا ”یہاں کوئی ایسا خاص کام نہیں چل رہا ہے جہاں تم ٹریننگ لے سکو۔ البتہ قریب ہی

ایک گاؤں میں بجلی مہیا کرنی ہے' وہاں کچھ بجلی کے کھمبے لگائے جا رہے ہیں اور تار کھینچے جا رہے ہیں۔ تم وہیں چلے جایا کرو۔"

اگلے دن وہ ایس ڈی او کے بتائے ہوئے گاؤں میں پہنچ گیا۔ گاؤں والوں سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ ابھی بجلی کی لائن تقریباً" ۲ میل پیچھے ہے اور جہاں بجلی کے کھمبے لگ رہے ہیں' اس جگہ تک کوئی بس نہیں جاتی۔ گورکھ پیدل ہی چل پڑا۔ راستے میں ایک بیل گاڑی دکھائی دی تو اس میں سوار ہو لیا۔ کچھ دیر میں ہی منزل سامنے نظر آئی تو وہ بیل گاڑی سے اترا۔ چند سیمنٹ کے پول راہ میں دراز تھے۔ کچھ مزدور زمین کھود رہے تھے۔ گورکھ نے ان سے فورمین کا پتہ معلوم کیا تو انہوں نے ایک درخت کی طرف اشارہ کر دیا اور کہا "صاحب وہاں بیٹھے ہیں۔"

جس جانب اشارہ کیا گیا تھا گورکھ اسی طرف چل پڑا۔ قریب جا کر دیکھا۔ فورمین آرام سے چارپائی پر دراز تھا۔ قریب ہی تین چار گاؤں والے زمین پر بیٹھے تھے اور کچھ اس طرح کی گفتگو چل رہی تھی:

"بجلی گاؤں میں پہنچنے ہی والی ہے سب گاؤں والوں کو مٹھائی کھلانی پڑے گی۔"

"ہجور' آپ بھی کیا بات کرتے ہیں! یہ گاؤں آپ ہی کا تو ہے۔ ہم سب گاؤں والے آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔"

گورکھ کو قریب کھڑا دیکھ کر فورمین قدرے رعب سے مخاطب ہوا: "مجھ سے بات کرنی ہے؟"

گورکھ نے بغیر کچھ کہے ایس ڈی او کا پیغام فورمین کے ہاتھ میں تھما دیا۔

فورمین بولا "اچھا تو نئے نئے کالج سے نکل کر آئے ہو۔ اچھی جگہ پہنچ گئے ہو۔ گاؤں میں بجلی پہنچانے کا کام بہت دن چلے گا۔ وہ ادھر پول لگ رہے ہیں۔ پیچھے تار بھی کھینچے جا رہے ہیں۔ دیکھ لو کیسے کام ہوتا ہے۔"

گورکھ واپس مزدوروں کے قریب پہنچا' جہاں وہ پول کے لئے زمین میں گڈھا کھود رہے تھے۔ گڈھا کافی گہرا ہو گیا تو ایک مزدور بھاگ کر فورمین کو بلانے کے لئے درخت کی طرف بھاگا۔ گورکھ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ گورکھ نے دور سے دیکھا' فورمین کچھ بوتل سے پی رہا تھا۔ گورکھ قریب پہنچا تو فورمین بولا "یہاں گاؤں میں تو یہ دیسی ہی نصیب ہوتی ہے۔ پیتے ہو تو پی لو۔ نہیں پیتے تو پینے لگو گے۔ شراب نہ سہی' تندوری مرغی تو کھا سکتے ہو؟"

"آپ نوش کریں۔ میں گوشت نہیں کھاتا۔" گورکھ نے کہا۔

"آہستہ آہستہ کھانے لگو گے۔ کھانے کا کیا بندوبست کر کے آئے ہو؟ گاؤں والے تمہارے لئے بھی کھانا مہیا کر دیں گے۔"

"میں گھر سے کھانا ساتھ لے کر آیا ہوں۔" گورکھ نے کہا اور وہ بھی چارپائی پر ایک جانب بیٹھ گیا اور

پراٹھے آچار کے ساتھ کھانے لگا۔

جو مزدور فورمین کو گڈھا دکھانے کے لئے آیا تھا' وہ چارپائی کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ کھانا ختم ہو گیا' لیکن فورمین چارپائی سے اٹھتا نظر نہ آیا۔ مزدور نے دوبارہ چلنے کی التجا کی تو فورمین کڑک کر بولا "دیکھتا نہیں؟ ابھی کھانا حلق سے نیچے نہیں اترا اور تو ہے کہ بار بار گڈھا گڈھا' چلائے جا رہا ہے۔ گڈھا کیا کہیں بھاگ جائے گا؟ دو منٹ آرام کر لوں۔ ابھی چلتا ہوں۔"

آدھے گھنٹہ بعد فورمین چارپائی سے اٹھا اور مست چال سے چلتا ہوا گڑھے کے قریب پہنچا۔ اس نے مزدوروں کے ہیڈ کو اشارہ کیا کہ گہرائی کی پیمائش کی جائے۔ ہیڈ نے زنگ خوردہ لوہے کا فیتہ گہرائی میں اتار دیا اور کہا "سات فٹ ہے صاحب۔"

فورمین دور کھڑا کھڑا بولا "ٹھیک ہے! پتھر ڈالو۔ کنکریٹ ڈالو۔"

کچھ مزدوروں نے کھدائی سے نکلے ہوئے چند پتھر گڈھے میں اتار دیئے۔ قریب ہی کچھ مزدور سیمنٹ بالو اور روڑی ملا رہے تھے۔ انہوں نے چند بالٹیاں بھر کر کنکریٹ گڑھے میں ڈال دیا۔ ۲۵ فٹ لمبا پول گڑھے سے تقریباً ۵۰ فٹ کے فاصلے پر لیٹا ہوا تھا۔ پول کے موٹے سرے پر رسے باندھ دئے گئے اور مزدور دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر رسے کے دونوں سروں کو کھینچنے لگے۔ مزدوروں کا ہیڈ جب اشارہ کرتا تو سب مزدور رسے کو ایک ساتھ جھٹکا دیتے اور زور سے پکارتے :

"مار کے ---- ہائی سا!"

"جور لگا کے ----- ہائی سا!"

"مل کے مارو ---- ہائی سا!"

"مل کے مارو ---- ہائے جوان!"

"کر دو اندر --- ہائے جوان!"

ہر نعرے پر جھٹکا اور ہر جھٹکے کے ساتھ پول گڑھے کی جانب کھسک رہا تھا۔ وہ نعرے کالج کے طالب علموں کی گندی گالیوں اور گفتگو سے ملتے جلتے تھے۔ گورکھ سوچ رہا تھا کہ مانا مزدور زور لگا رہے ہیں' لیکن اس طرح گندی گالیاں بکنے سے کیا بدن میں زیادہ طاقت آجاتی ہے؟ قریب کھڑا مزدور کا ہیڈ اور فورمین مسکرا رہے تھے۔ فورمین کبھی کبھی مزدوروں کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی نعرے لگانے لگتا۔

رفتہ رفتہ سرکتا ہوا پول گڑھے کے قریب پہنچ گیا۔ مزدور پسینہ پونچھتے ہوئے ستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ تازہ دم ہونے کے بعد پھر وہی گندے نعرے فضائیں گونجنے لگے۔ پول کا ایک سرا گڑھے کی دیوار تک پہنچ گیا۔ رسیاں پول کے دوسری جانب باندھ کر دو مزدور پول کے گڈھے والے سرے پر چڑھ گئے اور کچھ مزدور پول

کو اوپر کی جانب کھنچنے لگے۔ پول آہستہ آہستہ اونچائی پکڑتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی گندے نعروں کی گونج بڑھتی گئی۔ ایک خاص اونچائی تک پہنچ کر پول کا گڈھے والا سرا ڈھائیں کرتا ہوا گڈھے میں جا گرا۔ مزدور جو اس سرے پر سواری کر رہے تھے' چھلانگ لگا کر گڈھے کے پار ہو گئے۔ بجلی کی لائن سیدھی چل رہی تھی۔ اس لئے نیا پول پرانے پول کی سیدھ میں کھڑا' ہونا چاہئے تھا۔ گورکھ جانتا تھا کہ ایسا نہ ہونے سے بجلی کے تار پول پر نا مناسب دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ فورمین پول سے کچھ دور کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور ایک آنکھ بند کر کے اپنے پول کو پہلے والے پول کی سیدھ میں لانے کے لئے ہاتھ کے اشارے کرنے لگا۔ اس کے اشاروں کے مطابق مزدور پول کو کبھی دائیں' پھر تھوڑا سا بائیں اور پھر دائیں دھکیلتے رہے۔ اس کے بغیر فورمین نے ہاتھ گرا دیئے اور مزدور پول کے چاروں طرف کنکریٹ بھرنے لگے۔ آخر میں مٹی بھر کر زمین ہموار کر دی گئی۔ یہ سب ہونے کے بعد فورمین ہنستا ہوا گورکھ سے پوچھنے لگا "کیوں انجینئر صاحب' پول ٹھیک کھڑا ہو گیا؟"

گورکھ چپ رہا۔ اسے آلات کے بغیر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ پول ٹھیک جگہ پر نہیں ہے اور ایک جانب کچھ زیادہ جھکا ہوا ہے۔ فورمین نے صرف آنکھ سے کام کیا تھا اگرچہ آلات قریب ہی پڑے تھے۔ تھیوڈولائٹ اسٹینڈ پر لگا ہوا تھا۔ فورمین نے اس کا استعمال کیوں نہیں کیا؟ ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے آندھی اور طوفان میں بجلی کے تاروں کے کھنچاؤ سے پول گر بھی سکتا ہے۔ اس نے فورمین کے چہرہ کی جانب دیکھا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنس رہا تھا' جیسے اس کی ڈگری کا مذاق اڑا رہا ہو' جیسے اسے سمجھا رہا ہو کہ یہاں ڈگری نہیں 'ڈنڈے بازی چلتی ہے' حکومت چلتی ہے' افسری چلتی ہے' زور آزمائی چلتی ہے' گندی گالیوں کا اثر ہی پول کو دھکیل کر زمین پر کھڑا کرتا ہے۔

گورکھ آہستہ سے بولا "ٹھیک ہے۔"

فورمین کو جیسے اس کے جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ اسے چھیڑتے ہوئے دوبارہ کہنے لگا! "انجینئر صاحب' آپ دن میں ایسے کتنے پول کھڑے کروا سکتے ہو؟"

گورکھ سوچ رہا تھا کہ یہاں فورمین زمین میں غلط جگہ ایک ہی پول گاڑ کر چہک رہا ہے' جب کہ اس نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ کرینوں اور مشینوں کے ذریعہ ایک دن میں ایسے ۲۵ پول بھی کھڑے کئے جا سکتے ہیں۔ اس نے جواب دیا "میں تو ابھی پول گاڑنا سیکھ ہی رہا ہوں۔"

شام ہو چکی تھی۔ فورمین کی جیپ آ گئی۔ گورکھ بھی جیپ میں سوار ہو گیا اور کھڑاؤں اتر گیا۔ پول نے بالوں پر وہ اثر کیا کہ گورکھ نے پہلے حجام کی دکان پر جا کر بال کٹوا ڈالے۔ یعنی پول اوپر ہوا اور بال نیچے۔

اگلے دن گورکھ نے ایس ڈی او سے کہا کہ اسے کوئی دوسرا کام دیا جائے۔ وہ دوبارہ پول گاڑنے کا نظارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ایس ڈی او نے اسے بجلی کے اسٹیشن کی ڈرائینگز ٹھیک کرنے کا کام سونپا جو اس نے بخوبی سر انجام دیا۔ ڈرائنگز پہلے سے تیار تھیں' لیکن وہ سو فی صد درست نہ تھیں۔ تقریباً" ایک مہینے بعد اسے بمبئی سے

دادا کمپنی نے انٹرویو کے لئے بلایا۔ دادا کمپنی کی بڑی شہرت تھی۔ کمپنی کو سارے ہندوستان سے صرف تین آدمی انتخاب کرنے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ دادا کمپنی میں نوکری شروع کرنا مستقبل کو چار چاند لگانے کے برابر ہے۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد گورکھ کو ایک جوش تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا اور پیچیدہ کام کر دکھائے گا۔ دہلی اور کھڑاؤں کے بجلی گھروں نے وہ جوش قدرے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب اگر ایک موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ کمپنی کی شہرت اور لوگوں کی رائے سے متاثر ہو کر گورکھ بمبئی جا کر انٹرویو دے آیا۔

تقریباً" دو مہینے بعد دادا کمپنی کی طرف سے اقرار نامہ آگیا۔ گورکھ کا اعتماد جاگ اٹھا' لیکن گھر سے دور چلے جانے کا افسوس بھی اس کے دل میں تھا۔ ایک ٹرنک اور ایک بستر سنبھال کر وہ مشکل سے طوفان میل کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس سکا۔ گرمیوں کے دن' لمبا سفر اور چاروں طرف لوگوں کا جمگھٹ۔ گورکھ صبح کے وقت ٹرین میں سوار تھا۔ شام ہونے کو آئی' لیکن تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بھیڑ بڑھتی ہی گئی۔ اسے سانس لینے میں بھی دقت محسوس ہونے لگی اور بیٹھے بیٹھے جسم کی رگ رگ اکڑنے لگی۔ سیٹ چھوڑ کر حاجت رفع کرنے کے لئے جانا بھی محال تھا۔ جیسے ہی کوئی اپنی سیٹ چھوڑتا سیٹ گنوا بیٹھتا۔ وہ اگر واپس سیٹ پر لوٹنا چاہتا تو یہ ناممکن تھا۔ دو مسافروں میں تو مار پیٹ بھی ہو گئی۔ گورکھ سوچ رہا تھا کہ جب آغاز یہ ہے تو انجام کیا ہو گا؟ جیسے جیسے طوفان میل دھواں اڑاتی آگے کو دوڑتی گئی' گورکھ کا دماغ پیچھے کی طرف بھاگتا رہا۔ خوامخواہ گھر سے بے گھر ہوا۔ دادا کمپنی کی نوکری منظور کر کے غلطی کی۔ وہ گھر والوں کے دیدار کو ترسے گا۔ کیا ضرورت پڑی تھی اتنی دور نوکری تلاش کرنے کی؟ اس کے باقی کلاس فیلو پنجاب میں ہی ٹکے ہوئے ہیں۔ اسے ہی دور کے ڈھول سہانے لگتے ہیں۔

یکایک طوفان میل ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر کھڑی ہو گئی تو ریل کے ڈبے میں گرمی کچھ اور بڑھ گئی۔ گورکھ کو ایسی گھبراہٹ محسوس ہوئی کہ اس نے مسافروں سے کہا کہ اسے ڈبے سے نیچے اترنے میں مدد چاہئے۔ ایک مسافر کافی دیر سے اس کی سیٹ کی راہ تک رہا تھا' راحت کی سانس لیتا ہوا بولا "لیکن آپ تو بمبئی جا رہے تھے۔ یہاں اس چھوٹے سے اسٹیشن پر کیوں اتر رہے ہیں؟"

گورکھ نے جواب دیا "میں واپس دہلی جاؤں گا۔ میں نے بمبئی جانے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔"

اس کی بات سن کر مسافر اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھنے لگے۔ وہ صبح سے خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے کسی سے گفتگو نہ کی تھی۔ کسی نے کچھ پوچھا بھی تو مختصر سا جواب دے دیا۔ مسافروں نے سوچا ہو گا کہ وہ ضرور گھر سے بھاگ کر فلم ایکٹر بننے کے خواب دیکھتا ہوا بمبئی جا رہا ہو گا۔ اب اچانک ارادہ بدل گیا۔

کھڑکی کے راستے سے گورکھ کا ٹرنک اور بستر پلیٹ فارم پر اتر چکے تھے' لیکن گاڑی اسٹیشن سے سرکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ گورکھ نے دہلی کی جانب جانے والی گاڑیوں کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر کوئی بھی میل گاڑی نہیں رکتی۔ طوفان میل تو کسی خرابی کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ

رہی تھی۔ اگر اسے دہلی واپس ہی جانا ہے تو کسی بڑے اسٹیشن پر اترے اور واپسی کی گاڑی پکڑے۔ تھرڈ کلاس کے کسی بھی ڈبے میں واپس ہونا گورکھ کے لئے ناممکن تھا۔ ٹرنک اندر کی طرف دھکیلا جاتا تو مسافر اسے پلیٹ فارم کی طرف دھکیل دیتے۔ چارونا چار وہ انٹر کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ وہاں بھی بیٹھنے کی جگہ تو نہ ملی' لیکن ٹرنک اور بستر آرام سے ڈبے میں داخل ہو گئے اور وہ ٹرنک پر بستر رکھ کر بستر پر سوار ہو گیا۔ ٹکٹ کو تھرڈ کلاس سے انٹر کلاس کا بدلوانا ضروری تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے پوچھا "کہاں تک کا ٹکٹ بنادوں؟ آپ کا کہنا ہے کہ آپ اگلے اسٹیشن پر ہی اترنے والے ہیں۔"

گورکھ کچھ سوچ کر بولا "میں سوچتا ہوں' بمبئی ہو ہی آؤں۔ آپ بمبئی تک کا ٹکٹ بنادیں۔"

بمبئی میں گورکھ اپنے والد کے دوست کھرانہ کے یہاں ٹھیرا۔ سوچا کہ کچھ ہی دنوں میں کوئی فلیٹ ڈھونڈ لے گا اور ایک نئی زندگی کی شروعات کرے گا۔ بمبئی میں دادا کمپنی کے بہت سے بجلی گھر تھے۔ ایک بجلی گھر میں نیا ٹرانسفارمر لگ رہا تھا۔ گورکھ وہیں بھیج دیا گیا۔ زمین میں پول گاڑنے کے کام سے یہ کام زیادہ دلچسپ تھا' لیکن گورکھ کے دماغ میں ایک بے دلی کا دور دورہ تھا۔ اگرچہ سیکھنے کا ماحول ملا تھا' کام کرنے والے ماہر تھے' کچھ باریک نکتے سمجھ میں آرہے تھے' لیکن اسے زیادہ لطف حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا' وقت کے ساتھ شاید کام میں دلچسپی پیدا ہو جائے' لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ دل کو زبردستی اس راہ پر لایا جائے جس پر وہ چلنے سے کترا رہا ہو؟ چند گھنٹوں میں ہی گورکھ سمجھ گیا کہ یہ کام اس کے لئے مناسب ثابت نہ ہوگا' پھر بھی چند روز آزمالیا جائے۔

کام میں گورکھ کا دل نہ لگا تو دو گھنٹے کی چھٹی لے کر وہ اپنے رہنے کے ٹھکانے پر لوٹ آیا۔ مسز کھرانہ اسے دیکھ کر ذرا چونکی اور پوچھنے لگی "اتنی جلدی کیوں واپس آگئے؟"

گورکھ بولا "سوچتا ہوں کہ رہنے کے لئے جگہ ڈھونڈھ لوں' تاکہ آپ لوگوں کو بھی تکلیف نہ ہو۔ قریب ہی کئی فلیٹ نظر آرہے ہیں۔ کرایہ پوچھ کر آتا ہوں۔"

مسز کھرانہ ہنستے ہوئے بولی "پہلے چائے پی لو' پھر جانا۔ اتنے میں وہ بھی آتے ہوں گے۔ ان سے بھی بات کر لینا۔"

گورکھ نے کہا "میں ذرا قریب ہی جارہا ہوں۔ چائے آکر پی لوں گا۔ شام ہونے میں ابھی دیر ہے۔"

مسز کھرانہ نے بہت اصرار آمیز لہجے میں کہا "رک بھی جاؤ۔ وہ آپ کو اچھی صلاح دیں گے۔"

گورکھ سوچتا رہا کہ چھٹی لے کر آنا بے کار ہو گیا۔ وہ مسٹر کھرانہ کا انتظار کرنے لگا۔ وہ آگئے تو سب نے چائے ایک ساتھ پی۔ گورکھ نے رہنے کی جگہ ڈھونڈنے کی بات کی تو مسٹر کھرانہ کہنے لگے "اتنی بھی کیا جلدی

ہے؟ بمبئی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے۔ آہستہ آہستہ اس شہر کے طور طریقے سمجھ سکو گے۔ تھوڑے دن ہمارے پاس ہی ٹھیرے رہو۔ پھر کوئی جگہ ڈھونڈ لینا۔"

گورکھ کے بہت اصرار کرنے پر مسٹر کھرانہ کی باتوں سے یہ راز کھلا کہ بمبئی میں کرایہ پر فلیٹ ملنا ناممکن ہے۔ پگڑی کے لئے جب تک جیب میں لاکھ' دولاکھ' موجود نہ ہوں' فلیٹ کی بات کرنا فضول ہے۔ گورکھ کے لئے یہ تعجب کی بات تھی۔ وہ تو سوچتا تھا کہ چار سو روپے کی نوکری لے کر بادشاہ ہو گیا ہے۔ لیکن اگر رہنے کے لئے فلیٹ نہیں مل سکتا تو کیا کیا جائے؟ مسٹر کھرانہ نے اسے رائے دی کہ کسی گیسٹ ہاؤس میں جگہ ڈھونڈے۔

اگلے دن گورکھ نے اپنے افسر سے صلاح لی۔ اس نے ایک گیسٹ ہاؤس کا پتہ بتایا۔ جب گورکھ آفیسر کی سفارش لے کر وہاں پہنچا تو مالک مکان نے بے پروائی سے اسے ایک کمرے میں خالی جگہ دکھائی۔ کمرے میں تین چارپائیاں لگی ہوئی تھیں۔ اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر چارپائی کے قریب ایک بوسیدہ لکڑی کی الماری کھڑی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کا کرایہ دار کمرے میں موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا : "آجاؤ' تم بھی آجاؤ۔ معلوم نہیں سب بمبئی میں ہی کیوں چلے آتے ہیں۔ ہائے ری بمبئی نگری!

مالک مکان کہنے لگا "ابھی یہ تیسری چارپائی ہی خالی ہے۔ باقی گیسٹ ہاؤس میں اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمارے یہاں دو چارپائی والے کمرے بھی ہیں اور ایک چارپائی والے بھی ہیں۔ تین چارپائی والے کمرے کا کرایہ فی کس سو روپے' دو چارپائی والے کا دو سو روپے اور ایک چارپائی والے کمرے کا تین سو روپے ماہوار۔

گورکھ مالک مکان کا شکریہ ادا کر کے چل دیا۔ رہنے کے ٹھکانے تک پہنچتے پہنچتے بادل گھر آئے اور زور کی بارش ہونے لگی۔ شاید آسمان بھی اس کی نادانیوں پر آنسو بہا رہا تھا۔

اگلے دن گورکھ کو جسم میں قدرے حرارت محسوس ہوئی۔ رات بھر برسات ہوتی رہی تھی اور ابھی تک رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مسٹر کھرانہ مقررہ وقت پر آفس چلے گئے۔ گورکھ بستر میں پڑا رہا۔ برسات میں دوبارہ بھیگنے سے بخار تیز ہو جانے کا ڈر تھا۔ اس نے آفس میں غیر حاضری کے لئے فون بھی نہ کیا۔ تین دن تک بخار رخصت نہ ہوا اور تینوں دن بارش ہوتی رہی۔ مسٹر کھرانہ کا کہنا تھا کہ آج تک انہوں نے بمبئی میں ایسی بارش نہیں دیکھی تھی۔ بمبئی کی بارش کے بارے میں تو یہی مشہور ہے کہ اب آئی اور اب گئی۔ پل میں بارش اور پل میں دھوپ۔ مگر اس بار اچھی بارش ہوئی کہ بمبئی کا لوور پریل کا علاقہ جہاں گورکھ کام کرنے جاتا تھا' پانی میں ڈوب گیا؟ آمدورفت بند ہو گئی۔

چوتھے دن گورکھ کا بخار اترا اور بارش بھی بند ہو گئی۔ مسٹر کھرانہ کہنے لگے "کیا تم نے دعا مانگی تھی کہ جب تک تمہیں بخار آتا رہے' بارش ہوتی رہے؟ کیا تمہیں نوکری نہیں کرنی؟ آفس میں خبر تک نہیں دی۔"

گورکھ نے مختصر سا جواب دیا "مجھے بمبئی شہر اچھا نہیں لگا۔ میں واپس دہلی جا رہا ہوں۔"

مسٹر کھرانہ نے صلاح دی "تم اپنے والدین سے تو بات کرلو کہ نوکری چھوڑ کر آ رہے ہو۔ واداکمپنی میں کس کو نوکری ملتی ہے؟

گورکھ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ واپس جانے کا ارادہ پکا ہے۔ اور اسے کسی سے رائے لینے کی ضرورت نہیں۔

مسٹر کھرانہ کہنے لگے "کیسے ہو تم؟ بمبئی کی ایک چیز بھی نہیں دیکھی۔ ہفتے کے اندر ہی واپس جانے کی تیاری بھی کرلی۔ کچھ دن تو اور ٹھیرتے اور کچھ نہیں تو تمہیں بمبئی کی سیر کروادیتے۔۔" گورکھ سوچ رہا تھا کہ جتنا دیکھ لیا وہی بہت ہے اور دیکھ کر کیا کرنا ہے؟ عمدہ عالی شان عمارتوں کے ساتھ جھونپڑیاں۔ غریبی اور امیری کی دوستی۔ غلاظت اور صفائی کا ایک ساتھ گزر۔ جسم پر تو بھوک اور عیش ایک جیسا اثر کرتے ہیں۔ دونوں طرح طرح کی بیماریوں کی لپیٹ میں۔

گورکھ بمبئی سے واپس آگیا تو۔ ب کو حیرت ہوئی 'کیوں کہ وہ خود بڑے شوق سے گیا تھا۔ اپنی صفائی میں اس نے بتایا کے نوکری پسند نہیں آئی۔ اور بمبئی کی آب و ہوا بھی راس نہیں آئی۔ اسی لئے وہ بیمار پڑ گیا تھا۔ گورکھ کو حیرت ہوئی کہ گوپال داس نے اسے نوکری چھوڑ کر آنے پر ایک لفظ بھی نہ کہا۔ البتہ وہ اس کی صحت کے بارے میں فکر مند ہو گئے۔ پہلے ہی وہ شکل و صورت سے مجنوں لگتا تھا۔ بمبئی جا کر ایک ہفتے میں دس پونڈ وزن گنوا آیا تھا۔ چہرے پر جیسے ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ کھایا پیا کچھ ہضم نہ ہوتا تھا۔ کیا اسے مناسب نوکری نہ ملنے کا غم تھا یا نوکری چھوڑنے کا افسوس؟ کیا اس کی خود اعتمادی ختم ہو گئی تھی یا قائم تھی؟ بہت سوچنے پر بھی اسے ان باتوں کا جواب نہ ملتا۔ لیکن ایک جواب وہ جا بجا پڑھ رہا تھا" اس کی عبارت صاف نظر آرہی تھی "کہ وہ بے وقوف ہے۔ خر میں اور اس میں کچھ فرق نہیں ہے۔ گدھے کے کون سے سینگ ہوتے ہیں جو اس کے سر پر نہیں ہیں۔ زمانہ بہت چالاک ہے' بہت بے رحم ہے' یہاں ہر جگہ ٹکراؤ ہے۔ تضاد ہے' بھیڑ ہے' مقابلہ ہے' مکاری ہے' دھوکا ہے۔ اور اس بے ڈھب زمانے کا سامنا کرنے کے لئے وہ قطعی تیار نہیں۔ اس نے کسی دوسری طرح کی طبیعت پائی ہے۔ وہ کسی دوسرے دور کا باشندہ ہے۔ اسے بات بات پر ناامیدی ہوتی ہے۔ اس کے دل میں حوصلہ کہاں' ہمت کہاں' تحمل کہاں؟ زمانے کے دل لوہے کے ہیں' پتھر کے ہیں۔ اس کا دل موم کا ہے جو ہر وقت پگھلتا رہتا ہے۔ موم کے دل والا انسان اس جہاں میں کیوں کر زندہ رہ سکتا ہے؟ وہ جلد ہی موم بن کر پگھل جائے گا اور کسی نئی موم بتی میں ڈھل جائے گا۔

گورکھ نے پنجاب پبلک سروس کمیشن میں بھی ایک عرضی ایس ڈی او کی نوکری کے لئے بھیجی تھی۔ ایک دن اس کا جواب آیا کہ وہ پٹیالہ انٹرویو کے لئے آجائے۔ مقررہ تاریخ کو وہ انٹرویو کے لئے پہنچا۔ جیسے ہی بورڈ کے ممبروں کے کمرے میں داخل ہوا' اسے بورڈ کے ایک ممبر کی شکل جانی پہچانی لگی۔ سلام کے بعد جب کرسی پر بیٹھ

کر سوالات کا انتظار کرنے لگا تو جانی پہچانی شکل والا ممبر اس سے مخاطب ہوا۔

"تمہیں یاد ہے کہ میں نے انجینئرنگ کے سالانہ امتحان کے وقت تمہارا انٹرویو لیا تھا؟"

"جی ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" گورکھ نے جواب دیا۔

"میں تم سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اب تک کیا کرتے رہے ہو؟"

"میں بمبئی دادا کمپنی میں نوکری کرنے گیا تھا۔ اب وہ ہوا موافق نہ آئی اس لئے لوٹ آیا۔"

"تم امتحان میں اول رہے ہو۔ بہت اچھا درجہ حاصل کیا ہے۔ مجھے پہلے سے ہی معلوم تھا۔"

بورڈ کا چیرمین گورکھ کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا "تم جا سکتے ہو۔ تمہارا انٹرویو پہلے ہی ہو چکا ہے۔"

چند مہینے بعد اسے نوکری پر دہلی بلا لیا گیا۔ ان دنوں پنجاب میں بھاکڑا ڈیم تعمیر ہو رہا تھا۔ دہلی میں ڈیزائن کا بہت بڑا دفتر تھا۔ دفتر کے قریب ہی رہنے کے لئے فلیٹ تھے۔ گورکھ کو آدھا فلیٹ رہنے کے لئے مل گیا، جس کا کرایہ وہ صرف دس روپے ماہوار ادا کرتا تھا۔ آج دہلی میں اس جیسے فلیٹ کا کرایہ دس ہزار روپیہ ماہوار ہوگا۔ دفتر رہائش کے اس قدر قریب تھا کہ بس پانچ منٹ کا پیدل راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ امریکہ سے کئی انجینئر آئے ہوئے تھے۔ ان کی نگرانی میں کام ہوتا تھا۔ گورکھ کو وہ ماحول بہت اچھا لگا۔ صبح سے شام تک آفس میں بیٹھ کر ڈرائینگ بنائی، کوئی ڈیزائن تیار کر لیا۔ اور شام کو گھر آ گئے۔ دفتر میں سب کا برتاؤ دوستانہ تھا۔ افسری والی کوئی بات نہ تھی۔ اگر کہیں کوئی مشکل پڑتی تو بے جھجک صلاح مشورہ لیا جا سکتا تھا۔ گورکھ گزیٹڈ افسر تھا۔ جب تک گزٹ میں نام نہ چھپے، تنخواہ نہیں مل سکتی تھی۔ تقریباً" چھ مہینے بعد جب اسے اکٹھی تنخواہ ملی تو کل ملا کر تین ہزار روپے کے قریب ہاتھ لگے۔ گورکھ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے روپیوں کا کیا کرے؟

اس نے کچھ روپے اپنے والد کو بھیج دیئے، باقی بینک میں جمع کرا دیئے۔ یکایک وہ بہت زردار ہو گیا۔ اس قدر پیسہ کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتا۔

گورکھ پر دہلی کا رنگ آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔ اسے یاد ہے جب اس نے پہلی بار شراب پی۔ ان دنوں اس کا بھائی نریش بھی اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بھی نئی نئی نوکری لگی تھی۔ دونوں کو وہسکی، جن، بیئر، رم میں تمیز نہ تھی۔ بس یہی سمجھتے تھے کہ شراب شراب ہے۔ ایک ہی خاصیت انہیں معلوم تھی۔ دونوں بازار سے وہسکی لے آئے۔ اور اسے سیدھا گلاس میں ڈال کر پینے لگے۔

اف اس قدر کڑوی چیز کو لوگ کیوں مونہہ لگاتے ہیں۔ نریش نے مونہہ بنایا۔

گورکھ نے نریش کو صلاح دی "سرور کے لئے مونہہ کڑوا کرنا ہی پڑتا ہے۔ دیکھتا کیا ہے، اٹھا گلاس اور اتار گلے سے نیچے۔"

پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے شکایت کرنے لگے کہ سینہ جل رہا ہے' پیٹ جل رہا ہے۔ بدحواسی بڑھی تو دونوں بستروں میں گر پڑے۔ نشہ قدرے کم ہوا تو گلے کی خراش اور جلن مٹانے کے لئے گورکھ پانی پینے کے لئے چارپائی سے اٹھا۔ اس نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ سارا کمرہ الٹی سے گندا کر دیا۔

نریش بولا "سرور اتارنے کے لئے الٹی کرنی ہی پڑتی ہے۔ تم ہی زیادہ چڑھا گئے تھے۔ اب اتارو سرور۔"

اگلے دن نریش نے کسی پینے والے سے پینے کے راز معلوم کئے۔ جس نے شراب شراب' کا فرق سمجھایا اور بتایا کہ وہسکی کیسے پینی چاہئے اور بیئر کیسے پینی چاہئے۔ چند روز بعد نریش بیئر کی ایک بوتل لے آیا۔ بیئر کی ایک بوتل دو آدمی آسانی سی ختم کر سکتے ہیں۔ وہسکی کی ایک بوتل چڑھانا تو ہر روز پینے والوں کے بھی بس کی بات نہیں۔ پہلی بار بیئر پی کر جو ہلکا ہلکا سا سرور آیا اس کا لطف کچھ اور ہی تھا۔

رفتہ رفتہ گورکھ پوجا پاٹھ سے دور ہوتا گیا۔ مالا اٹھا کر اس نے ایک ٹرنک میں بند کر دی اور اس کے ساتھ ہی بھجنوں کی کاپی بھی۔ بارہ سال سے اس نے سینما ہال کا رخ نہیں کیا تھا۔ اب جو فلمیں دوبارہ دیکھنی شروع کیں تو شملہ والی کیفیت ہو گئی۔ فرق اتنا تھا کہ چوری کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جب چاہے فلم دیکھ سکتا تھا۔ اب وہ بالکونی میں بیٹھ کر فلم کا لطف حاصل کرتا۔ اسکرین کے قریب بیٹھنے سے اسے کوفت ہوتی تھی۔ وہاں سے فلم اتنی صاف نظر نہیں آتی تھی۔ ان ہی دنوں گورکھ نے انگریزی فلمیں بھی دیکھنی شروع کر دیں اور آہستہ آہستہ انگریزی فلمیں دیکھنے کا شوق بڑھتا ہی گیا۔ اگر سیکس کا پہلو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو بھی فوٹوگرافی' ڈائریکشن' ایکٹنگ اور کہانی کے اعتبار سے انگریزی فلمیں ہندی فلموں کو مات کرتی نظر آتیں۔

گورکھ ۵ فٹ ۱۰ انچ لمبا نوجوان تھا' مگر اس کا وزن صرف ۱۲۰ پونڈ تھا۔ کچھ دوستوں نے اسے سمجھایا کہ صبح کو ناشتے میں انڈے کا استعمال کیا کرے اور ہفتے میں دو بار بیئر پیا کرے تو وزن بڑھ جائے گا۔ پہلے دن جب اس نے انڈے کا آملیٹ زبان پر رکھا تو وہ اسے ذائقہ دار تو لگا' لیکن طبیعت اسے کھانے پر مائل نہ ہوئی۔ اس نے خود سے کہا کہ جو لوگ انڈے نہیں کھاتے' وہ کیا لازما" کم زور رہتے ہیں؟ کیا کبھی ہاتھی کو دیکھا ہے؟ وہ انڈے نہیں کھائے گا' چاہے وزن بڑھے یا نہ بڑھے۔

ایک دن گورکھ ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ چائے کے ساتھ کیک کھا رہا تھا تو ایک دوست بولا "آج تمہارا دھرم کیا ہوا؟ کیوں انڈا کھانے کا گناہ کر رہے ہو؟"

"کیوں مذاق کرتے ہو' یار؟ میں تو کیک کھا رہا ہوں۔" گورکھ نے جواب دیا۔

مجھے ایسا کیک دکھاؤ جس میں انڈا استعمال نہیں ہوتا۔" دوست نے کہا۔

پہلے تو گورکھ کو اس بات پر یقین نہ آیا کہ کیک میں انڈے کا استعمال ہوتا ہے' لیکن تحقیق کرنے پر معلوم

پڑا کہ دوست ٹھیک کہتا ہے۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ پاپ کر چکا ہے' کیوں کہ کیک تو وہ کئی بار شوق سے کھا چکا ہے۔

دوسری بار جب گورکھ نے آملیٹ کھایا تو واقعی اسے بہت مزہ دار لگا۔ انڈے کھانے کے حق میں اسے یہ دلیل سوجھی کہ بات زبان کے چٹخارے کی نہیں' اصول کی ہے۔ اصول یہ ہے کہ کسی جانور کو کیوں زبان کی لذت کی خاطر مارا جائے؟ لیکن اگر سب لوگ اس کی طرح انڈے کھانے چھوڑ دیں تو قیامت آجائے۔ مرغیوں کی تعداد اس قدر بڑھ جائے کہ سڑک پر چلنا مشکل ہو جائے۔ مرغ ہجوم در ہجوم بے روک ٹوک لوگوں کی چھتوں پر چڑھ کر بانگ دینے لگیں۔ رفتہ رفتہ تعداد اس قدر بھی بڑھ سکتی ہے کہ ملک کے سارے کام بند ہو جائیں اور سرکار کو مرغوں' مرغیوں کو تعداد میں قابو میں رکھنے کے لئے ایک خاص محکمہ بنانا پڑے' جو انہیں قید کرے اور آوارہ گھومنے کے جرم میں سزائے موت سنائے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ لذیذ آملیٹ کھا لینا چاہئے۔ جب انسان جائز یا ناجائز طریقے سے اپنے دل کو سمجھا کر کوئی بھی کام ایک بار کر گزرتا ہے تو دوسری بار وہی کام کرتے ہوئے اسے بہت کم جھجک ہوتی ہے۔ گورکھ انڈوں کی تعریف کے پل باندھنے لگا۔ انڈے غذائیت کے حساب سے مکمل خوراک ہیں۔ انہیں کئی طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جب انڈے پیٹ میں اترنے لگے تو مرغی کیوں پیچھے رہتی؟ پہلے گورکھ نے مرغی کا شوربہ پیا' پھر مرغی کا سالن کھایا اور رفتہ رفتہ تندوری مرغ پر آگیا۔ تندوری مرغ بھی کیا لذیذ ہوتا ہے! فلموں کی حسین پریاں' تندوری مرغ' بیئر کی بوتل' خوب صورت خوابوں کے خاکے' جن میں کناٹ پلیس کے ہوٹلوں کے نیم عریاں ناچ اور شو اور بھی چار چاند لگا دیتے۔ گورکھ کی زندگی کے رخ پلٹ گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ہیئت کا رخ بھی بدلنے لگا۔ چہرے کی ابھری ہڈیوں پر گوشت کی چکنی تہہ جمنے لگی۔ زمین پر قدم بھاری پڑنے لگے۔

دہلی میں رہنا گورکھ کے دوسرے شوق پورے کرنے میں بھی مددگار بنا۔ قریب ہی نیشنل آرٹ گیلری تھی۔ وہاں کوئی نہ کوئی آرٹ کا شو یا پروگرام ہوتا رہتا۔ گورکھ باقاعدہ ان میں شرکت کرتا۔ گورکھ کی اپنی پینٹنگز کے اسٹائل میں بھی فرق پڑنے لگا۔ اگرچہ ابھی تک اس کا محبوب فن کار چغتائی تھا' ماڈرن آرٹ نے بھی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ گورکھ کی پینٹنگز میں ایک نیا موڑ آگیا۔ اس کی حسیناؤں کے جسم قدرے بھاری ہونے لگے۔ چہرے پر شادمانی ابھرنے لگی اور مایوسیاں کم ہونے لگیں۔ نیلے اور پیلے رنگوں کی جگہ سرخ' نارنجی اور گلابی رنگ لئے گئے۔ اس کے علاوہ ناٹک' کھیل اور تماشوں میں گورکھ کا وقت آرام سے گزرنے لگا اس نے محسوس کیا کہ پہلے وہ خواہ نخواہ ہر وقت دماغ پر کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا تھا۔ یکایک وہ بوجھ اتر گیا تو دماغ اور جسم کو راحت ملنے لگی۔

ان دنوں بھی گورکھ کے تصور کی حسینائیں تصور تک ہی محدود تھیں۔ کسی نے بھی تو حقیقت کا جامہ نہیں

پہنا تھا' آرٹ گیلری میں' سنیما میں' راہ چلتے' اگر کسی سے آنکھیں چار ہو بھی جاتیں تو وہ گھبرا کر پلکیں نیچی کر لیتا کسی بھی عورت سے آنکھ ملا کر بات کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ تصور کے خاکے خوابوں میں ڈھل کر اترتے نشے کی طرح لاپتہ ہو جاتے۔ ان کے کچھ مبہم سے سائے ذرا دور ساتھ چلتے' پھر وہ بھی دھند میں کھو جاتے۔

کوئی بھی شے جب آسانی سے دست یاب ہونے لگتی ہے تو اپنی کشش کھو بیٹھتی ہے۔ جب گورکھ نے بہت سی فلمیں دیکھ ڈالیں تو کسی حد تک سنیما کے سیمیں پردے کا حسن دھندلا گیا۔ شملہ میں ایک فلم دیکھنے کے لئے اسے کتنے دن انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پیسے کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ جو پہلے دن فلم دیکھ آتا' اس کی زبان سے فلم کے تذکرے سن کر' فلم کے گیت گنگنا کر شوق تیز تر ہو جاتا تھا۔ شملہ میں جو فلمیں دیکھیں ان کا ایک ایک سین اس کے دماغ میں تازہ تھا۔ جب فلموں کی افراط ہوئی' انہیں دیکھنے کے لئے تردد ختم ہوا تو کسی بھی فلم کے نقوش دیرپا نہ رہے اور گڈمڈ ہوتے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد فلم کا پلاٹ اور کہانی اس کے دماغ سے قطعی اتر جاتے۔ ہر فلم کی کہانی کردار اور پلاٹ ایک دوسرے سے اس قدر ملتے جلتے لگتے کہ ذہن میں کوئی نئی لہر نہ پیدا ہوتی۔ نقوش بھڑکانے کے لئے اس لئے انگریزی فلمیں' جن میں مسٹری (اسرار) ہو' خون خرابا ہو' سیکس ہو' دیکھنی شروع کیں' کیوں کہ ہندی فلمیں اس کو ایک ہی محور پر گھومتی نظر آتیں۔ مگر آہستہ آہستہ انگریزی فلموں کا نیاپن بھی پھیکا پڑنے لگا۔ تاہم وہ پھر بھی فلمیں دیکھتا رہا۔

گورکھ کو کبھی پیسے کی قلت محسوس نہ ہوئی۔ نئے کپڑے' نئی سائیکل' گھر میں نوکر' دہلی میں آرام سے رہنے کی جگہ اور کیا درکار ہو سکتا تھا؟ جب ضروریات کم ہوتی ہیں' تو ان کو پورا کرنا بھی آسان ہوتا ہے۔ جیسے جیسے انسان ضروریات بڑھا لیتا ہے اسے پورا کرنے کے لئے اتنی ہی محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے۔ جس ماحول سے گزر کر گورکھ خود مختار ہوا تھا' اس کو مد نظر رکھتے ہوئے ضروریات ابھی کم تھیں۔ گھر میں کوئی فرنیچر نہ تھا' کوئی مہنگی چیز نہ تھی۔ ایک ریڈیو' ایک چارپائی' ایک میز' کچھ کرسیاں اور چند کتابیں۔ اس سے زیادہ کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ضروریات کی یہ خاصیت ہے کہ جب بڑھتی ہیں اور آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں تو احساس نہیں ہوتا کہ وہ کتنی زیادہ ہو گئی ہیں۔ رسوئی گھر میں برتن بڑھ رہے تھے۔ بجلی کا سامان بڑھ رہا تھا۔ بیئر ٹھنڈی کرنے کے لئے آئس باکس' کھڑکیوں کے پردے' مچھر دانیاں' چادریں' بستر رضائیاں' لباس' کاغذ' برش' کینوس۔ سب آخر سامان ہی تو تھا۔

تقریباً" دو سال اسی طرح گزر گئے۔ ڈیزائن کا کام کم ہوتا جا رہا تھا۔ پروجیکٹ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' کبھی نہ کبھی ڈیزائن کا کام ختم ہوتا ہی ہے۔ بھاکڑا ڈیم کے ڈیزائن کا کام بھی ختم ہو چلا۔ امریکن انجینئر واپس چلے گئے۔ بہت سے لوگوں کا تبادلہ ہو گیا۔ گورکھ کی باری بھی آ گئی۔ اسے ننگل ٹرانسفر کر دیا گیا' جو اسے قطعی پسند نہ تھا۔ ننگل میں رہنا تھا اور بھاکڑا میں کام کرنا تھا۔ گورکھ کے کالج کے کئی کلاس فیلو ننگل میں موجود تھے۔ گورکھ بھی ان

میں جاملا۔

ننگل میں غیر شادی شدہ انجینئروں کو رہنے کے لئے ایک کمرے کا فلیٹ الاٹ ہوتا تھا۔ رسوئی گھر ان سب کا مشترکہ تھا۔ سرکاری رسوئیے سب کا کھانا تیار کرتے۔ گورکھ رات کو دس بجے بھاکڑا جاتا اور صبح کے آٹھ بجے واپس آتا۔ چند ہفتے تک اسے کام پر نیند آتی رہی اور دن میں نیند آنکھوں سے دور ہی رہی۔ رفتہ رفتہ دن میں سونا اسے رات کو سونے سے بہتر لگنے لگا۔

ڈیم پر لگاتار کام ہوتا تھا' لیکن گورکھ کو اس میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ کام صرف نگرانی کا تھا کہ کسی بھی وجہ سے کوئی بھی بجلی سے چلنے والی مشین رکنے نہ پائے۔ دور دور کانوں سے پتھر اور روڑی میلوں لمبے کنوینئر پر لد کر بھاکڑا پہنچتی۔ پتھروں کو توڑا جاتا' باریک کیا جاتا' چھانا جاتا' سیمنٹ اور ریت ملایا جاتا' کنکریٹ کو ٹھنڈا کیا جاتا اور ڈیم میں اتار دیا جاتا۔ یہ سب کام بجلی کی پیچیدہ مشینری سرانجام دیتی۔ گورکھ نے یہی سیکھا تھا کہ کام چاہے کیسا بھی ہو' پسند ہو یا نہ ہو' لیکن اسے بخوبی سرانجام دینا چاہئے۔ کام کے معاملے میں اس نے کبھی کوتاہی نہ کی' لیکن اس کی ایمان داری اور نیک نیتی اس کے افسر کو خوش نہ رکھ سکی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے افسر کو تیکنیکی آگاہی بہت کم ہے۔ وہی زمین میں پول گاڑنے والا قصہ ہے۔ افسر عقل کی جگہ رعب اور زور کا ہتھیار بغیر سوچے سمجھے استعمال کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ رات کو کام کرنے والے دن میں بھی سوتے ہیں اور رات کو بھی سوتے ہیں اور تمام کام ماتحتوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ جب بھی گورکھ اپنے افسر کا ناجائز رویہ دیکھتا' اس کا دل چاہتا کہ اس کا مونہہ نوچ لے۔ مگر وہ خاموش رہتا۔

گورکھ کے بھنڈی کالج کے چند کلاس فیلو بھی ننگل میں ملازم تھے۔ ان میں سے ایک کلاس فیلو رام بھروسے اسے سمجھانے لگا "تم اوپر سے اول آ کر جس جگہ پہنچے' میں پیچھے سے اول آکر اسی جگہ پہنچ گیا۔ اب بھی تم کام میں اول رہنے کی کوشش ضرور کر رہے ہو' لیکن دیکھتے ہیں کون آگے نکلتا ہے۔ میں تو رات کو آرام سے سوتا ہوں۔ پروجیکٹ والوں نے اپنا سارا زور لگا لیا' لیکن میں نے اپنی وضع نہ بدلی۔ گورنمنٹ کی نوکری ہے۔ نوکری سے کون نکال سکتا ہے؟ ابھی کس کی ترقی ہونے والی ہے؟ جتنا چاہو کام کر لو' ترقی کا نمبر تو باری سے آئے گا۔ میں نے حساب لگا لیا ہے کہ ۵ سال تک ترقی کی کوئی امید نہیں۔ میں تو رات کو گھر سے دو کمبل لے کر جاتا ہوں' آفس کے کمرے میں بینچ یا کرسی پر سوتا ہوں۔ یہاں تک کہ اگر مجھے کوئی اور سونے کی جگہ نہ ملے تو لوہے کے پائپ میں گھس کر سو جاتا ہوں! کون اپنی نیند خراب کرے؟ گورکھ تم سے سچ کہتا ہوں کہ پروجیکٹ والوں نے میرے سونے سے تنگ آکر میرا تبادلہ پتھروں کے کینو۔ سنز پر کر دیا۔ وہاں کوئی عمارت موجود نہیں۔ مگر میں نے بھی قسم کھا رکھی ہے کہ گورنمنٹ سے تنخواہ لینی ہے اور کام نہیں کرنا۔ جہاں پتھر لوہے کی وسیع کپی میں گرتے ہیں وہاں زور کے دھماکے تو ہوتے ہیں' لیکن میں نے وہیں اپنا بستر لگا لیا۔ تم خوامخواہ ہلکان ہو رہے ہو۔ یہاں کا رواج

ہی الٹا ہے۔ کام کرنے والے کو سب ڈانٹتے ہیں اور مجھے کوئی کچھ نہیں کہتا' کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ مجھ پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

بھاکڑا میں بہت سے امریکن ورکر بھی کام کرتے تھے۔ بیئر کا ڈبا ہمیشہ ان کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ وہ پیٹھ پر مہر لگا کر چھوڑے ہوئے آزاد بیل تھے۔ یعنی کسی کے ماتحت نہ تھے۔ جہاں دیکھتے' سڑک پر گاڑی روک کر کھڑے کھڑے پیشاب کر دیتے۔ سرعام پینٹ کی زپ کھولنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے۔ ان کی آپس کی گفتگو کا ہندوستانی میں ترجمہ کرنا آسان نہ تھا' لیکن اس میں سیکس اور گالیوں کا جز اتنا ہی شامل ہوتا تھا جتنا گانوں میں پول کھڑا کرنے والے مزدور کی بات چیت میں تاہم کوئی بھی کام سرانجام دیتے وقت وہ جان لڑا دیتے تھے۔ چار ہندوستانی ایک طرف اور ایک امریکن ورکر ایک طرف۔ ایک چھ انچ چوڑی لوہے کی شہتیر پر' جو زمین سے ۲۰۰ گز اونچی پر لٹک رہی ہوتی' اس ادا سے چلتے جیسے ۲۰ فٹ چوڑی سڑک پر چہل قدمی کر رہے ہوں۔ کام کرنے کے کئی مقام بہت خطرناک تھے۔ ہاتھ ذرا پھسلا نہیں کہ کنکریٹ کے اندر قبر تیار۔ کئی انجینئر تک جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ گورکھ بھی ایک روز مرتے مرتے بچا۔ وہ ڈیم کے اوپر قیاس کے گھوڑے دوڑاتا تنگ پل سے گزر رہا تھا۔ پل کے عین درمیان ایک لوہے کی سلاخ لٹک رہی تھی اور پل کا راستہ بند تھا۔ جیسے ہی وہ سلاخ سے ٹکرا کر لڑکھڑایا' کسی نے دوڑ کر اسے سنبھال لیا۔

ننگل میں گورکھ کو ان ہی طالب علموں کا ساتھ حاصل ہو گیا جنہیں وہ تین سال پہلے بھنڈی میں الوداع کہہ آیا تھا۔ دوستوں نے اس کے حلیہ اور رویہ میں نمایاں تبدیلی پائی۔ اب وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینے' تاش کھیلنے اور سنیما دیکھنے سے نہ کتراتا۔ ننگل میں دو ہی پکچر ہال تھے' نگران کی کمی آفسرز کلب پوری کر دیتا تھا۔ کچھ دوست گورکھ کے اس بدلے ہوئے رخ کو دیکھ کر اسے شاباشی دیتے' کچھ مذاق اڑاتے : "کالج کے زمانے میں جو فقیری اختیار کی تھی' اس کا کیا ہوا؟ کہاں گیا تمہارا خدا؟ کہاں ہے تمہاری محبوب؟" گورکھ مسکرا کر رہ جاتا۔

گورکھ کام کے بوجھ کی وجہ سے ناخوش رہتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کہیں دور بھاگ جائے۔ اس نے بہت سی جگہ نوکری کے لئے درخواستیں بھیجنی شروع کیں۔ ایک دن اسے اٹامک انرجی' بمبئی سے انٹرویو کے لئے خط ملا۔ ایک بار تو وہ بمبئی جا کر واپس لوٹ آیا تھا۔ کیا وہ دوبارہ اس جگہ چلا جائے؟ پھر بھی وہ انٹرویو کے لئے چلا گیا۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ انٹرویو کے دوران اس نے کام کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ کام ڈیزائن سے تعلق رکھتا تھا۔ گزشتہ تجربے سے گورکھ سمجھ گیا تھا کہ وہ صرف ڈیزائن کے کام میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ تعمیر کا کام' ماتحتوں کی نگرانی کا کام اور تعمیر کے دوران بھاگ دوڑ کا کام اس کی طبیعت کے برعکس ہے۔ اسے یہ بھی خیال رہا کہ ڈیزائن آفس میں کام کرنے والے انجینئر زیادہ مذہب اور تہذیب یافتہ

ہوتے ہیں۔ دو مہینے بعد اسے اطلاع ملی کہ اسے نوکری کے لئے چن لیا گیا ہے۔ اس نے سوچا کہ اگرچہ رہن سہن مشکل ہوگا، گورنمنٹ کی طرف سے نہ فلیٹ ملے گا اور نہ کوئی نوکر، لیکن کام تو اپنی پسند کا ہوگا۔ اس لئے گورکھ نے ایس ڈی او کی نوکری سے استعفے دے دیا۔

بمبئی روانہ ہونے سے پہلے ہی گورکھ نے عارضی طور پر وہاں رہنے کا انتظام کرلیا تھا۔ اس کا پہلوان دوست جگو مل جالندھری ان دنوں بمبئی میں ہی رہ رہا تھا۔ ایک بستر اور ایک ٹرنک کا اثاثہ لے کر جب گورکھ جگو مل کے گھر پہنچا تو وہ گھر پر موجود نہ تھا۔ ایک اجنبی نے دروازہ کھولا۔ گورکھ نے اپنا تعارف کرایا تو وہ اسے اندر لے گیا اور بشاشت کے ساتھ کمرے میں موجود لوگوں کا تعارف کرانے لگا : ''آجاؤ تم بھی آجاؤ۔ مجھے چندو کہتے ہیں۔ اُسے سب پیار سے کدو بلاتے ہیں۔ یہ بھائی بمبئی کی پاؤ روٹی کھا کر ہی موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ رام ولاس ہے۔ باقی شام تک دوسرے لوگوں سے بھی تعارف ہو جائے گا۔''

شام کو جب تعارف کا سلسلہ مکمل ہوا تو پتہ چلا کہ ایک کمرے میں چھ نوجوان رہتے تھے۔ چارپائیاں صرف دو تھیں۔ ایک چھوٹا سا رسوئی گھر تھا اور ایک غسل خانہ۔ رات کے ۹ بجے سے ۱۱ بجے کے درمیان سب واپس لوٹ آتے۔ چارپائیوں کے نیچے پڑے بند بستر کھل جاتے۔ اگر رات کو کسی کو رفع حاجت کی ضرورت پڑتی تو سونے والوں کے سر، ٹانگیں یا جسم بچاتے بچاتے کبھی نہ کبھی پاؤں کسی کے جسم پر پڑ جانے کا امکان رہتا اور سونے والا چلا اٹھتا : ''یار، دیکھ کر قدم رکھ! کسی نازک جگہ پاؤں پڑ گیا تو سوتا ہی رہ جاؤں گا!''

گورکھ کا موٹا بستر اور ٹرنک دیکھ کر جگو مل کہنے لگا ''میں نے تمہیں لکھا تھا کہ کم سامان لے کر آنا۔ یہاں سردی تو پڑتی نہیں، کیا ضرورت تھی رضائی اور کمبل لانے کی؟''

گورکھ دبی زبان سے بولا ''یار، فکر نہ کر۔ کچھ ہی دن میں اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لوں گا۔ صرف چند روز کی تکلیف ہے۔''

گورکھ کی بات جگو کو شاید بری لگی۔ کہنے لگا ''دوستوں میں کیا دل کھول کر بات بھی نہیں ہو سکتی؟ تم تو برا مان گئے۔ یہاں بمبئی میں رہائش کا یہی حال ہے۔ بھول جاؤ کہ یہاں الگ ٹھکانا لے کر رہ سکو گے۔''

گورکھ سوچ رہا تھا کہ وہ کسی صورت میں وہاں نہیں رہ سکتا۔ رات کو کوئی خراٹے بھرتا ہے تو کوئی کروٹ بدلتا ہے۔ سوتے سوتے کسی کا ہاتھ اگر سینے پر آگرے تو لگتا ہے چٹان ٹوٹ پڑی۔ خوابوں کی کڑیاں وہ جب بھی ذرا جوڑتا ہے، کوئی نہ کوئی بم دھماکا انہیں توڑ دیتا ہے۔ کوئی سونے کی کوشش کر رہا ہے تو کوئی تاش کھیل رہا ہے اور ہر چال پر بحث ہو رہی ہے۔ ایسے میں کون چین کی نیند سو سکتا ہے؟ رات اگر گزر بھی جائے تو صبح کو غسل

خانے کے سامنے قطار لگ جاتی ہے اور مکالمے شروع ہو جاتے ہیں : "یار جلدی باہر نکل! باہر والوں کا بھی خیال کر! سڑک پر تو ہم جانے سے رہے۔ پولیس چوکی قریب ہی ہے۔ موقع کی نزاکت سمجھا کر۔" اندر والا جواب دیتا ہے : "یار، نہ جانے کل پنجابی کے ہوٹل میں کیسی مرغی کٹی تھی۔ ابھی تک پیٹ میں گشت لگا رہی ہے۔ باہر نکلنے کا نام نہیں لیتی۔"

گورکھ سوچتا : "یا خدا، کہاں پھنسادیا۔ جتنا جلد ہو سکے ان لوگوں سے چھٹکارا دلا دے" ہر روز کے کام کے بعد وہ رہنے کی جگہ تلاش کرتا اور ناکام لوٹتا۔ جگومل کی بات صحیح تھی۔ بمبئی میں کوئی ٹھکانا ملنا واقعی آسان نہ تھا۔ بمبئی کی مایا نگری میں چار سو روپے ماہوار کمانے والے کی کیا اوقات؟ یہ تو تاج محل ہوٹل کا دو رات کا کرایہ تھا۔ گورکھ کے دماغ میں کئی بار خیال آیا کہ ایک رات تاج میں گزار کر باقی مہینہ سڑک پر سوئے۔ ہنسی ہنسی میں اس نے یہ بات جگو سے کہہ ڈالی۔ جگو بولا "یہ غلطی کبھی نہ کرنا۔ سڑک کا ایک ایک انچ حصہ بٹا ہوا ہے۔ سڑک پر سونے کے لئے بھی کسی دلال کو پیسہ کھلانا پڑے گا۔" گورکھ سوچنے لگا کہ سڑک پر سونے کی بجائے کیوں نہ کمرے کے باہر سویا جائے؟ اس نے کمرے کے باہر جھانک کر دیکھا۔ ایک چھ فٹ اونچی دیوار دو عمارتوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ پیچھے کا دروازہ کھول کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ دیوار کی چوڑائی دس انچ سے زیادہ نہ تھی۔ گورکھ نے سوچا کہ وہ رات کو اس دیوار پر سو جائے گا۔ اگر سوتے سوتے کروٹ پلٹی اور دیوار سے نیچے گرا تو زیادہ چوٹ نہ آئے گی۔

اس رات کو وہ کمرے سے باہر نکل کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اگرچہ دس انچ چوڑی جگہ میں سونا مشکل تھا، لیکن وہ دس انچ جگہ صرف اس کی تھی۔ کسی کا ہاتھ یا پاؤں جسم پر گرنے کا خطرہ نہ تھا۔ البتہ وہ زمین بوس ضرور ہو سکتا تھا۔ جو بھی ہو گورکھ کو اکیلے سونے کا ٹھکانا تو مل گیا۔

ایک مہینہ گزرنے کو آیا، گورکھ کو کوئی مناسب رہنے کی جگہ نہ ملی۔ آہستہ آہستہ گورکھ نے ماحول سے دوستی کرلی۔ سوچا، آخر سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر نہ رکھیں تو سات کنواروں کا ایک کمرہ میں رہنا ناممکن ہے۔ ناشتہ سب گھر میں کرتے۔ جو بھی پہلے اٹھتا، چائے بنانے چلا جاتا اور سب کو چائے پلاتا۔ رات کو کبھی کبھی کھانا گھر میں پکا لیتے۔ کوئی مونگ کی دال پکا لیتا۔ کوئی سبزی کاٹ لیتا، کوئی مرغی کا سالن بنا لیتا۔ لیکن روٹی کوئی نہ پکاتا۔ بمبئی کی پاؤ روٹی چکن کری یا دال میں ڈبو کر کھانا گورکھ نے بمبئی میں ہی سیکھا۔ اور "ایک پلیٹ چاول مار کے" یعنی چاولوں کے اوپر دال ڈال کے کھانا بھی بمبئی میں سیکھا۔

رفتہ رفتہ گورکھ بمبئی کے طور طریقوں سے واقف ہو تا گیا۔ پیالے سے چائے پلیٹ میں انڈیل کر پینا گورکھ کی عادت میں شامل ہو گیا۔ دھکے مار کر اور دوڑ کر بس پکڑنا، ریل گاڑی کے ڈبے کے ہینڈل سے لٹک کر سفر کرنا، سمندر کے کنارے آوارہ گھومنا، سب اسے آگیا۔ گورکھ نے پہلی بار جب زمانے کی نظروں سے بے پروا اور بے

خبر، زر خرید محبت کا کھلا نظارہ، ہونٹوں پر ہونٹ اور جا بجا آغوشوں میں سمائے حسین بدن دیکھے تو اسے اپنی نظروں پر یقین نہ آیا۔ وہ سمندر کے کنارے کنارے دور تک یہی کھیل دیکھتا ہوا چلا جاتا۔ اس وقت تو احساس کند ہوتا، لیکن رات کو دیوار پر سوتے سوتے اس کا سارا وجود تپنے لگتا۔ حسین پرچھائیاں، زلفیں، لب، رخسار، خلا سے نکل کر دیوار کے قریب آجاتے اور اس کا جسم لطف اندوز ہو کر دیوار سے اوپر اٹھتا ہوا ان پرچھائیوں میں سما جاتا۔

کچھ دن بعد جگومل کے دو اور دوست اس کمرے میں رہنے کے لئے آدھمکے۔ عموماً" باہر سے آنے والے دوست چند روز بمبئی کی سیر کر کے واپس روانہ ہو جاتے تھے، مگر یہ دونوں دوست زیادہ دن تک ٹھہرنے کے لئے آئے تھے۔ گورکھ کو پہلے ہی یہ کمرہ کبوتر خانے سے بدتر معلوم ہوتا تھا، دو نئے آدمیوں کی آمد سے جگہ اور بھی تنگ ہو گئی۔ کمرے میں چاروں طرف ٹرنک سوٹ کیس اور بستر نظر آنے لگے۔ تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ بھی اس سے بہتر تھا۔ مالک مکان کو پتہ چلا تو اس نے جگومل کو خبردار کیا کہ وہ مکان خالی کر دے، ورنہ وہ پولیس میں رپورٹ درج کرائے گا۔ اس نے مکان صرف دو آدمیوں کے رہنے کے لئے کرائے پر دیا تھا اور جگومل اسے ہوٹل کی طرح استعمال کر رہا تھا۔

گورکھ نے اور بھی تن دہی سے رہنے کے لئے جگہ ڈھونڈنی شروع کی۔ کسی گیسٹ ہاؤس میں ہی جگہ ملنے کا امکان تھا، فلیٹ کرائے پر لینا تو ناممکن تھا۔ دو سال پہلے بھی وہ بمبئی آیا تھا، اور ان دو برسوں میں پگڑی کی رقم اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے ایک کرسچین گیسٹ ہاؤس میں جگہ پسند آئی۔ نچلی منزل پر دکانیں تھیں اور اوپری منزل پر صرف چھ کمرے اور ہر کمرے میں دو رہنے والے۔ کرایہ ۱۲۰ روپیہ ماہوار، جس میں ناشتہ بھی شامل تھا۔ ایک روز گورکھ اپنے دوست جگومل کو اطلاع دیئے بغیر اپنا سامان اٹھا کر گیسٹ ہاؤس میں آگیا۔ جگومل کے یہاں وہ اپنا پتہ بھی چھوڑ کر نہیں آیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ جگومل اسے کبھی نہ جانے دے گا۔ اور اگر پتہ چھوڑ دیا تو واپس لے جائے گا۔ لیکن کچھ روز بعد جگومل پتہ نہیں کہاں سے اور کیسے اس کا سراغ لگا کر آگیا اور شکایت بھرے لہجے میں گورکھ سے کہنے لگا : "خدا کی مار تم پر! یاروں سے ایسی بے وفائی! چوروں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے!"

"برا نہ ماننا، میں اس بھیڑ میں اور زیادہ دن تک نہیں رہ سکتا تھا۔ میرا وہاں دم گھٹتا ہے۔" گورکھ نے صاف صاف کہا۔

"دم اس لئے گھٹتا ہے کہ تم دوست کو دوست نہیں سمجھتے، اگر قدرے اپنا پن پیدا کرو تو وہی دوست اچھے لگنے لگیں، ان کی صحبت میں لطف محسوس ہو، لیکن تم تو تنہائی کے جزیرے کے باشندے ہو۔ اتنی عمر ہو گئی، ابھی تک نہیں بدلے!"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ میری دوستی صرف تم سے ہے، تمہارے کرایہ دار دوستوں سے نہیں۔

اب میں یہاں سے واپس نہ جاؤں گا۔" گورکھ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔
جگو مل چلا گیا۔ گورکھ سمجھ گیا کہ وہ دوستوں کو کرایہ دار رکھ کر منافع کماتا تھا۔ رسید کی ضرورت نہ تھی۔ کون دوست اس سے کرائے کی رسید مانگتا؟ چنانچہ وہ ایک کمرہ کرایہ پر لے کر دوستوں سے پیسہ بنا رہا تھا۔
گیسٹ ہاؤس کی رہائش' انجینئرنگ ہوسٹل سے ملتی جلتی تھی۔ سب کرایہ دار کنوارے تھے۔ اور زیادہ تر اٹامک انرجی میں کام کرتے تھے۔ ان سے گورکھ کی دوستی ہونے میں دیر نہ لگی۔ گورکھ کا مزاج بھی بدل رہا تھا۔ اور وہ دل کھول کر گپیں ہانکتا' حسیناؤں کی باتیں کرتا' سارے دوست ایک ساتھ ہوٹلوں میں کھانا کھاتے' فلمیں دیکھتے اور راتوں کو دیر سے واپس لوٹتے۔ گورکھ کے لئے سونے سے پہلے کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرنا ضروری تھا۔ کتاب کے اوراق پلٹے بغیر اسے نیند نہ آتی تھی۔ انجینئرنگ کالج کی کتابیں وہ پڑھ چکا تھا۔ اگر آفس میں کوئی مشکل پیش آتی تو ان کتابوں کی ضرورت پڑ جاتی' ورنہ نہیں۔ گورکھ کو کتابوں کی دکانوں کے چکر لگانے کا شوق تھا۔ ہر پھیرے میں وہ کوئی نہ کوئی افسانوں' ناول' فلسفہ یا عروس کی کتاب خرید ڈالتا۔ ایک روز اس کی نظر ایک سیکس میگزین پر پڑی جو امریکہ سے شائع ہوتا تھا اور نام ور ایم۔ ڈی ڈاکٹروں کی رائے اور عالمانہ مضامین چھاپا کرتا تھا۔ گورکھ شرماتے ہوئے میگزین خرید لایا۔ رات کو مطالعہ شروع کیا تو اس کے کمرے میں مقیم دوست کی نظر پڑ گئی۔ وہ گورکھ سے کہنے لگا "چھپا کر اور چوری سے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اب ہم بچے تو نہیں ہیں۔ زندگی کے اس اہم راز کو کوئی سمجھاتا نہیں۔ بتاتا نہیں۔ اور ہم نوجوان غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔" گورکھ کو دوست کی بات اچھی لگی۔ دراصل اس نے وہ رسالہ یہی جاننے کے لئے خریدا تھا کہ جدید سائنس کی رائے میں جلق کا جسمانی' دماغی' نفسانی تعلق کیا ہے۔ اور سماجی رویہ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے اور پرانی روایتوں' غلط فہمیوں اور نوجوانوں کی ناسمجھیوں کا مرکز بھی۔ گورکھ مضمون سے اس قدر متاثر ہوا کہ فرائڈ اور کنسے کی کتابیں بھی خرید لایا۔ پہلے اس کے ذہن میں کیا تھا اور نکلا کیا۔ اس نے تو یہی سن رکھا تھا کہ جلق میں مبتلا ہونے والوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے' عقل ٹھکانے نہیں رہتی' جسم ٹوٹ جاتا ہے' خدا روٹھ جاتا ہے' بیماریاں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ یہ پاپ ہے' گناہ ہے' اپنے ہاتھوں اپنی موت ہے۔ گورکھ نے سوچا کہ وہ تو بچپن سے یہ کام کرتا آیا ہے' لیکن ابھی تک نہ دماغ خراب ہوا اور نہ ہی کوئی تکلیف ہوئی۔ فرائڈ ٹھیک ہی کہتا ہے کہ اگر کوئی خرابی اس سے پیدا بھی ہوتی ہے تو وہ محض ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔ یعنی اگر کوئی بھی شخص یہ تصور کرتا رہے کہ کوئی چیز اس پر مضر اثر ڈال رہی ہے تو ضرور مضر اثر ہو کر رہے گا۔ کوئی بے ضرر اور تاثیر میں مفید چیز بھی مضر ہو سکتی ہے اگر استعمال کرنے والا محض اسی خیال سے پریشان رہے کہ اس پر کچھ برا اثر ہو رہا ہے۔ جو کچھ بچپن میں گورکھ نے پڑھا یا سنا تھا' وہ بلاشبہ غلط تھا۔ جیسے جیسے تحقیقات کا مطالعہ بڑھتا گیا گورکھ پر یہ حقیقت واضح ہوتی چلی گئی کہ وہ خواہ مخواہ ایک بے ضرر حرکت کو ناسمجھی کے باعث یا دھرم کے زیر اثر غلط سمجھتا چلا آیا ہے۔ اس کے دل سے

ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ رفتہ رفتہ سیکس کے متعلق اس کی جدید تحقیقات اور معلومات کی آگاہی بڑھتی چلی گئی۔

آفس کے لوگ گورکھ کے کام سے خوش تھے، لیکن کام بہت پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اسے مکمل کرنے کی جلدی مچی ہوئی تھی۔ کئی عمارتیں تیز رفتار سے تعمیر ہو رہی تھیں۔ لیکن بجلی مہیا کرنے کے ڈیزائن ابھی تیار نہ تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ الیکٹریکل محکمے میں گنے چنے لوگ تھے۔ کام زیادہ تھا اور کرنے والے کم۔ ایک روز گورکھ کو چیف انجینئر نے طلب کیا اور کہا "اگر تم اسی رفتار سے کام چلاتے رہے تو یہ کام چھ مہینے سے پہلے ختم نہیں ہو سکتا اور میں چاہتا ہوں کہ دو مہینے میں ختم ہو جائے۔"
"میں تو خوب محنت سے یہ کام سرانجام دینے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ دو مہینے میں یہ کام ختم ہونا ناممکن ہے۔" گورکھ نے جواب دیا۔
چیف انجینئر کو غصہ آ گیا۔ "میں ناممکن کا لفظ سننے کا عادی نہیں ہوں۔ ہر صورت میں کام دو مہینے کے اندر اندر مکمل ہونا چاہئے۔"
گورکھ نے نرمی سے کہا "میں نے کہہ دیا کہ یہ ناممکن ہے۔ اگر آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں تو کام کا ایک حصہ کسی دوسرے انجینئر کو سونپ کر دیکھیں۔"
گورکھ جواب دے کر چیف انجینئر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے چیف انجینئر کو کچھ اور کہنے کا موقع بھی نہ دیا۔ کچھ دیر بعد گورکھ کا افسر بھی چیف انجینئر کے کمرے سے باہر نکلا۔ اس نے گورکھ سے کہا "تمہیں چیف انجینئر سے ادب سے بات کرنی چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ کام زیادہ ہے، لیکن تمہیں بات کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔"

گورکھ خود حیران تھا کہ اس میں ایسا جواب دینے کی طاقت کہاں سے پیدا ہوئی۔ آج تک کسی کے سامنے اس نے زبان نہ کھولی تھی۔ کسی نے کچھ کہا تو سن لیا۔ اب تک زمانے سے ڈرنے والا انسان آج اتنا نڈر ہو کر کیسے بات کر گیا؟ تین سال پہلے کا ماجرا اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، جب وہ دہلی پاور ہاؤس میں ٹریننگ لینے گیا تھا اور سپرنٹنڈنگ انجینئر نے دو دن تک اسے اپنے کمرے میں بھی طلب نہ کیا تھا۔ اور آج وہ چیف انجینئر کو سختی سے جواب دے آیا تھا۔ اس کی نوکری خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ پھر گورکھ نے سوچا کہ بمبئی میں نوکریوں کی کیا کمی؟ وہ کہیں اور ڈھونڈ لے گا۔ لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ کام کا ایک چوتھائی حصہ کسی دوسرے انجینئر کو سونپ دیا گیا۔ گورکھ نے تین مہینے میں تین چوتھائی کام ختم کر دیا اور اس کا ساتھی ایک چوتھائی کام کو لے کر تین مہینے بیٹھا رہا۔ آخر گورکھ نے اس کا ہاتھ بٹایا اور کام ختم ہوا۔
اس واقعہ سے تمام ڈیپارٹمنٹ میں گورکھ کی دھاک بیٹھ گئی۔ چیف انجینئر اس کا دوست بن گیا۔ ایک روز

چیف انجینئر نے اسے اپنے گھر دعوت پر بلایا۔ گورکھ بمبئی میں اس کاشان دار رہن سہن دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے اتنا وسیع اور خوب صورت فلیٹ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ چیف انجینئر نے اپنے لڑکے دیپک سے گورکھ کا تعارف کرایا۔ دیپک انٹر کلاس کا طالب علم تھا۔ پڑھائی میں نالائق اور آوارہ گردی میں طاق۔ چیف انجینئر نے گورکھ سے کہا کہ وہ کبھی کبھی دیپک کی پڑھائی میں مدد کردیا کرے۔ چیف انجینئر کی بات گورکھ کیسے ٹھکرا سکتا تھا؟ آفس میں بھی یہ راز کھل گیا کہ گورکھ کے تعلقات چیف انجینئر سے بہت دوستانہ ہو چکے ہیں۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ گورکھ کو کوئی ناروا بات کہے۔ لیکن گورکھ نے چیف انجینئر کی دوستی سے کبھی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا۔ وہ اپنا کام اسی مستعدی اور تن دہی کے ساتھ سرانجام دیتا رہا۔

گورکھ کے دماغ میں بہت دن سے انگلینڈ کا انجینئرنگ کا امتحان پاس کرنے کا منصوبہ تھا۔ اسے پاس کرکے وہ انگلینڈ کی ایک علمی سوسائٹی کا ممبر بن سکتا تھا۔ اس کے لئے اسے دو امتحان پاس کرنے تھے جس کے لئے دو سال کا وقت درکار تھا۔ ان امتحانوں سے گزرنا ایسا ہی تھا جیسے ڈگری لینے کے لئے پڑھائی کرنا۔ امتحانوں کے علاوہ کچھ عملی تجربوں کی بھی ضرورت تھی۔ گورکھ نے بمبئی کے انجینئرنگ کالج میں تجربوں کا انتظا[illegible]، جو کچھ وقفے کے لئے ہی بند ہوئی تھیں، دوبارہ کھل گئیں۔

بمبئی میں کئی مشہور آرٹ کالج تھے، جن میں صبح یا شام کے وقت بھی آرٹ کلاسیں لگتی تھیں۔ گورکھ نے ایک آرٹ کالج میں بھی داخلہ لے لیا۔

آرٹ کالج، آفس کا کام اور امتحان کی تیاری۔۔ گورکھ کی زندگی صبح سے شام تک مصروفیت میں گذرنے لگی۔ وہ صبح کو پانچ بجے اٹھتا، دو گھنٹے آرٹ کالج میں صرف کرتا، پھر آفس پہنچتا، شام کو امتحان کی تیاری کرتا۔ صبح سے شام ہونے میں دیر نہ لگتی۔

ان ہی دنوں بینرجی سے گورکھ کی جان پہچان بڑھ گئی۔ بینرجی بھی گورکھ کی طرح الیکٹریکل کے محکمے میں ملازم تھا اور گورکھ اسے پہلے دن سے جانتا تھا۔ کافی دن بعد اسے معلوم ہوا کہ بینرجی اس کے گیسٹ ہاؤس کے قریب ہی رہتا تھا۔

ایک دن بینرجی نے گورکھ کو رات کے کھانے پر گھر بلایا۔ بینرجی کا فلیٹ اگرچہ چھوٹا تھا، مگر ہر چیز بہت قرینے سے سجی تھی۔ باتوں باتوں میں بینرجی کہنے لگا "میرا ریڈیو اسٹیشن دیکھو گے؟" یہ کہہ کر وہ گورکھ کو برابر کے کمرے میں لے گیا اور گورکھ کو اپنا ٹرانسمیٹر اور ریسیور دکھا کر کہنے لگا۔ "میں "ریڈیو ہیم" ہوں۔ مجھ جیسے شوقیہ ریڈیو اسٹیشن چلانے والوں کو "ہیم" کہتے ہیں۔ میرے پاس باقاعدہ لائسنس موجود ہے۔ اس کے لئے امتحان دینا پڑتا ہے۔ میں باہر کے ملکوں کے لوگوں سے اپنے ٹرانسمیٹر پر بات کرسکتا ہوں، لیکن صرف ان لوگوں سے۔ جو میری طرح "ہیم" ہیں۔ باہر کے ملکوں میں یہ ہابی بہت مقبول ہے۔ البتہ ہندوستانیوں میں بہت کم لوگ یہ شوق پالتے

ہیں۔"

گورکھ نے کہا "اگر امتحان پاس کر کے لائسنس۔ لے بھی لیا جائے تو ٹرانسمیٹر' رسیور' ایریل وغیرہ پر بہت خرچ ہو جاتا ہو گا؟"

بینرجی نے جواب دیا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر میرا یہ سامان بہت پرانا ہے۔ جب دوسری عالمی جنگ ختم ہوئی تھی تو اس قسم کا سامان افراط سے اور آسانی سے مل جاتا تھا۔ میں نے یہ سب سامان کباڑی کی دکان سے خریدا تھا۔"

بینرجی نے اپنے ریڈیو پر گورکھ کی بات انگلینڈ میں رہنے والے کسی "ہیم" سے کروائی۔ گورکھ بینرجی کے گھر سے واپس آیا تو اس پر "ہیم" بننے کا شوق سوار ہو چکا تھا۔ پہلے ہی وہ صبح سے شام تک مصروف رہتا تھا' اب ریڈیو کا شوق چڑھا تو مصروفیت اور بڑھ گئی۔ گورکھ نے بازار سے علیحدہ علیحدہ سامان خرید کر ایک چھ بینڈ کا ریڈیو بنایا' جس کی آواز تو سریلی تھی۔ لیکن وہ چلتے چلتے یکایک بند ہو جاتا تھا۔ بہر حال گورکھ کو ایک دل چسپ کھیل مل گیا۔ اکثر وہ ریڈیو کے تاروں اور پرزوں سے کھیلتا رہتا۔

"گورکھ نے آرٹ کالج چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا' اس لئے کہ اتنے شوق وہ ایک ساتھ پورے نہیں کر سکتا تھا۔ بمبئی میں آئے ہوئے اسے ایک سال گذر چکا تھا' آرٹ کالج میں داخل ہوئے بھی تقریباً" اتنا ہی عرصہ ہوا تھا۔ گورکھ سمجھ گیا کہ آرٹ سیکھا نہیں جا سکتا۔ اسٹائل سیکھ سکتے ہیں۔" رنگوں کے مرکبوں کی تھیوری پڑھ سکتے ہیں۔ کمپوزیشن کے راز جان سکتے ہیں۔ لیکن آرٹ نہیں سیکھ سکتے۔ آرٹ اتنی ہی ذاتی چیز ہے جتنی آپ کی آنکھ اور دل۔ ہر آنکھ کا انداز نظر الگ ہوتا ہے' ہر دل کی دھڑکن میں فرق ہوتا ہے' اگر چہ دل سب ہی کا دھڑکتا ہے۔

گورکھ نے آرٹ کالج چھوڑنے کا فیصلہ کر تو لیا' لیکن اس پر عمل کرتے وقت ایک چہرہ اس کے تصور میں جگمگانے لگا۔ آرٹ کالج میں ایک نوجوان لڑکی اس سے کبھی کبھی کچھ پوچھ لیتی تھی : "یہاں کون سا رنگ لگاؤں؟ ان رنگوں کو کیسے ملاؤں؟" گورکھ نظریں جھکائے اس کے رنگ ملا دیتا' یا تصویر میں بھر کر دکھا دیتا۔ گورکھ نے کبھی اس کا نام تک دریافت نہیں کیا تھا۔ صرف ایک بار کلاس کے بعد جھجکتے ہوئے کہا تھا "تم بمبئی کی رہنے والی لگتی ہو؟" اس نے جواب دیا تھا : "تم نے ٹھیک پہچانا۔ میں بمبئی کی ہی رہنے والی ہوں۔ یہیں پیدا ہوئی۔ کالج میں پڑھتی ہوں' مصوری کا شوق ہے۔ میرے والد کاروبار کرتے ہیں۔" گورکھ کو ضرورت سے زیادہ آگاہی مل گئی تھی۔ کبھی کبھی نظریں چار ہوتیں' مسکراہٹیں بکھیرتیں اور گورکھ کی نظریں جھک جاتیں۔ صرف اتنی سی جان پہچان جس کے لئے آرٹ کالج چھوڑنا اسے ناگوار معلوم ہو رہا تھا۔

گورکھ نے جس روز آرٹ کالج چھوڑا' اس لڑکی کا چہرہ رات بھر اس کے قریب منڈلاتا رہا۔ صبح اٹھتے ہی گورکھ کو اپنے احساسات اور خیالات پر بہت جھنجلاہٹ ہوئی۔

رام گپتا سے گورکھ کی سرسری جان پہچان تھی۔ رام گپتا سول انجینئر تھا۔ اگرچہ محکمے مختلف تھے، مگر آفس ایک ہی عمارت میں تھا۔ چند ماہ پہلے دونوں کا تعارف ایک تیسرے آدمی نے کرادیا تھا، لیکن چند مختصر کام کی باتوں کے علاوہ زیادہ واقفیت نہ بڑھی۔ ایک روز گپتا آفس میں بیٹھا لکھنؤ کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا تو گورکھ نے اس سے پوچھا "کیا آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں؟"

سوال سنتے ہی جیسے گپتا کے چہرے پر چمک آگئی۔ اس نے بڑے فخر سے جواب دیا : "جی ہاں، میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں۔ میں بدقسمتی سے یہاں بمبئی میں پھنس گیا۔ کہاں لکھنؤ کی نزاکت اور کہاں بمبئی کا پلیٹ میں چائے انڈیل کر پینے کا رواج!"

گورکھ نے کہا۔ "میرے والد بھی کچھ عرصہ لکھنؤ میں رہے تھے۔ میں اکثر ان کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں، لکھنؤ کی روایات اپنی جگہ۔۔ ان کا جواب نہیں۔"

گپتا گورکھ کے قریب کھسک آیا۔ "تم تو ہم وطن نکلے۔ میں تو تمہیں آج تک پردیسی سمجھتا رہا تھا۔ شام کو کیا کر رہے ہو؟ گھر چلو، بھابی سے مل لینا اور چائے بھی پی لینا۔"

گورکھ ہنس کر بولا "تم جب لکھنوی ادا سے بلا رہے ہو تو میں کیوں کر انکار کروں؟"

گپتا کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ گورکھ بس میں جانے کی بجائے گپتا کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گپتا کے گھر پہنچا۔ گپتا نے گورکھ سے اپنی بیوی کا تعارف کرایا : "یہ ہیں میری جان جاں، حسن پریشاں، رادھا گپتا۔"

رام گپتا کا چہرہ سیاہ فام تھا۔ ناک موٹی تھی۔ قد اوسط تھا۔ رادھا گپتا بدصورتی میں اس سے بھی دو قدم آگے تھی۔ اس کا جسم بھی قدرے بھاری تھا۔ ان کے ایک ہی اولاد تھی۔ لیک لڑکا، راجو گپتا، جو تقریباً تین سال کا ہوگا۔ ماں باپ کی ہوبہو نقل۔ ویسا ہی رنگ، ویسے ہی نقش۔ گورکھ سوچنے لگا "جسمانی خوب صورتی میں کیا رکھا ہے؟ خوب صورتی تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ جس انداز سے گپتا نے بیوی کا تعارف کرایا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضرور ان دونوں میں محبت ہوگی۔"

رادھا گپتا نے چائے کے ساتھ لکھنؤ کے ذائقہ والی مٹھائی بھی پیش کی جو اس نے گھر میں تیار کی تھی۔ گرما گرم پکوڑے بھی کھلائے۔ گورکھ نے تعریف کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کی مہمان نوازی کا کرشمہ ہے کہ میں اتنا زیادہ کھا گیا کہ اپنے پیٹ کا دائرہ بھی بھول گیا! چائے اور ڈنر ایک ساتھ ہوگیا۔"

گپتا کہنے لگا : "ابھی لکھنؤ کی نفاست والی ایک اور چیز باقی ہے۔ لیکن اس کے لئے باہر جانا پڑے گا۔"

گپتا اور رادھا، راجو کو بچہ گاڑی میں بٹھا کر، گھر کو تالا لگا کر باہر نکلے۔ گورکھ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ مارکیٹ میں ایک پنواڑی کی دکان پر پہنچ کر گپتا ہدایت دینے لگا : "لکھنؤ والا پان۔ آج میرا دوست بھی موجود

ہے۔ اسے پتہ نہ چلے کہ پان اس نے لکھنؤ میں کھایا ہے یا بمبئی میں کھایا ہے۔"

پان چباتے ہوئے تینوں گھر لوٹے تو گورکھ نے "الوداع" کہہ کر راجو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ گپتا نے کہا "چلو' میں تمہیں موٹر سائیکل پر چھوڑ آتا ہوں۔"

گورکھ بولا "آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں' میں بس میں چلا جاؤں گا۔"

گپتا نے مسکرا کر کہا "چھوٹی چھوٹی زحمتیں اٹھانے سے ہی دوستی کی شروعات ہوتی ہے۔ ہاں' اگر تمہیں موٹر سائیکل پر میرے پیچھے بیٹھنے میں کوئی اعتراض ہے تو وہ دوسری بات ہے۔"

"کیوں شرمندہ کر رہے ہو! چلو' چھوڑ آؤ۔" گورکھ بولا۔

گپتا سے گورکھ کی دوستی بڑھتی چلی گئی۔ گپتا گورکھ سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ لکھنؤ میں کئی سال کام کا تجربہ اسے حاصل تھا۔ جب بھی موقع ملتا دونوں دوست آفس میں اور آفس کے باہر مل بیٹھتے۔ جیسے جیسے ملاقاتیں بڑھتی گئیں' وہ آپس میں کھلتے گئے۔ ایک دن گپتا کہنے لگا "شادی کب کر رہے ہو؟"

گورکھ نے سادگی سے جواب دیا : "معلوم نہیں' لیکن میرے والدین جلد ہی میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"بمبئی میں لڑکیوں پر کبھی نظر گئی؟" گپتا نے پوچھا۔

گورکھ ہنس پڑا۔ "کیسی بات کرتے ہو گپتا؟ میں بھلا کیوں لڑکیوں کو تکنے لگا؟ میرے والد جو دیکھ رہے ہیں۔ میں تو بس محبت کے خواب سجائے پھرتا رہا' مگر محبوب نہ ملا۔"

گپتا نے کہا "تم نے کبھی سمندر کے کنارے' جوہو بیچ پر' گیٹ وے آف انڈیا پر' بوری بندر' باندرا پر کچھ نہیں دیکھا؟ کچھ نہیں سمجھا؟ وہ سب ہم آغوش ہوتے ہوئے جسم کیا شادی شدہ ہوتے ہیں؟"

"نہیں ہوتے' یہ میں جانتا ہوں۔ زیادہ تر زر خرید محبت ہوتی ہے۔ میں محبت کا نام کیوں بدنام کروں۔ یہ تو صرف شہوت ہوتی ہے۔" گورکھ نے کہا۔

گپتا ہنستے ہوئے بولا "خدا کرے تمہارا یہ اعتماد زندگی بھر قائم رہے۔ خدا کرے تم ہمیشہ اتنے ہی نادان رہو۔ خدا کرے میری طرح تمہیں حسن کی آنچ نہ لگے۔ حسن حسن ہوتا ہے خواہ کیسے ہی حاصل ہو۔"

"کیا بات کر رہے ہو؟ کیا شادی سے پہلے کسی اور کی محبت میں گرفتار تھے؟" گورکھ نے کریدا۔

"نہیں یار' میرے والدین نے جہاں چاہا' میری شادی کر دی' میری بیوی خاندانی لڑکی ہے۔"

"بات تو ایسے کر رہے ہو جیسے اپنی شادی سے خوش نہیں ہو۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ اگر میری بیوی حسین ہوتی' جیسا کہ میں اسے تصور میں دیکھتا رہتا ہوں' تو ان حسن والوں کی آنچ میرے جسم کو نہ پھونکتی۔"

"غلط بات ہے' یار۔ مجنوں کی لیلیٰ بھی تو کالی تھی۔ محبت صورت سے نہیں ہوا کرتی۔"
"مجنوں کی لیلیٰ کالی ہوگی۔ ضرور کالی ہوگی۔ میں بھی اپنی بیگم کو بہت خوب صورت تصور کرتا ہوں۔ لیکن تصور کبھی نہ کبھی دھوکا دے جاتا ہے اور حقیقت چلمن اٹھا کر روبرو آجاتی ہے۔"
"تصور کی بنیاد اگر نیک نیتی پر ہے تو کبھی ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس دن گفتگو کا سلسلہ اور آگے نہ بڑھا۔ یکا یک گپتا کہنے لگا "میں چلتا ہوں۔ لیکن یہ نہ پوچھنا کہ کہاں جا رہا ہوں۔"
گورکھ نے کہا "نہیں پوچھتا۔ اگر تم بتانا نہیں چاہتے تو میں بھی جاننا نہیں چاہتا۔"
"میں سوچتا تھا کہ کتنے خوش و خرم اور خوش نصیب میاں بیوی ہیں۔ آپس میں کس قدر محبت اور پیار ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہی نکلی۔ گپتا اپنی بیوی سے خوش نہیں۔ غیر عورتوں کا حسن اسے تڑپاتا رہتا ہے۔ ہر چیز جو چمکتی نظر آتی ہے' سونا نہیں ہوتی۔ کانچ کے ٹکڑے بھی روشنی کے کسی خاص زاویہ پر چمک اٹھتے ہیں۔" گورکھ سوچ رہا تھا۔
گورکھ کی اکثر شامیں گپتا کے گھر گزرنے لگیں۔ بظاہر رہن سہن اور آپس کے برتاؤ سے یہ سوچنا بھی ناممکن تھا کہ گپتا کو اپنی بیوی سے کوئی شکایت ہوگی۔ ایک روز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ گورکھ گپتا کے گھر پر موجود تھا۔ رات کے کھانے' چائے اور پان کا دور ختم ہو چکا تھا۔ گورکھ انتظار میں تھا کہ کب بارش تھمے اور وہ گھر سے نکلے۔ گپتا کہنے لگا "آج بارش رکنے والی نہیں۔ تم یہیں سو جاؤ۔ ایک کمرے میں تمہارا بستر لگائے دیتے ہیں۔"
گورکھ آمادہ ہو گیا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ گپتا نے اپنی بیوی سے التجا آمیز لہجے میں کہا "ایک پیالہ کافی اور ہو جائے۔ آج کی رات بہت سرد ہے۔"
رادھا کافی بنانے چلی گئی۔ اتنے میں راجو کی آنکھ کھل گئی اور وہ رونے لگا۔ گپتا نے اسے گود میں اٹھا لیا اور اسے چپ کرنے کی کوششیں کرتا رہا۔ لیکن راجو کا رونا

بند نہ ہوا۔ گپتا نے راجو کو کھلونوں سے بہلایا' گرائپ واٹر اس کے مونہہ میں ڈالا' گود میں اٹھا کر اس کی پیٹھ سہلائی' پیٹ پر پاؤڈر چھڑکا۔ لیکن راجو صرف کچھ دیر کے لئے چپ ہوتا اور پھر رونے لگتا۔ آخر گپتا نے اس کا عضو تناسل اپنے مونہہ میں رکھ لیا اور اسے چوسنے لگا۔ راجو یکایک چپ ہو گیا اور ہنسنے لگا۔

گورکھ حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا "یار گپتا' تم بھی کمال کرتے ہو! بچے کے ساتھ ایسا فعل؟"

گپتا بولا۔ "میں نے نہیں' میری بیگم نے راجو کی عادت خراب کی ہے۔"

اتنے میں رادھا گپتا' کافی کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے شاید اپنے شوہر کی بات سن لی تھی۔ لیکن وہ مسکراتی رہی۔ اس نے کسی گناہ یا شرم کے احساس کا اظہار نہ کیا۔ کافی ختم ہوئی اور رادھا ٹرے لے کر واپس گئی تو گورکھ پوچھنے لگا "تم لوگ آپس میں کیا کیا کرتے ہو گے؟"

گپتا نے ہنستے ہوئے جواب دیا "یہ راز کی باتیں 'کنواروں کے سننے کے لئے نہیں ہوتیں۔"

گپتا گورکھ کو اپنے بہت نزدیک سمجھنے لگا۔ اس نے اپنے خاندان کا سارا کچا چٹھا گورکھ کو سنایا۔ بچپن کی باتیں' کالج کا زمانہ' نوکری کی تلاش' پیسے کی قلت' سارے ذاتی معاملات وہ کھل کر گورکھ کے سامنے بیان کر دیتا۔ گورکھ ذرا کم کھلتا۔ گپتا کے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ ایک خاص قسم کی دوری محسوس کرتا۔ تاہم گپتا کی دوستی نے گورکھ کا بمبئی میں تنہا ہونے کا احساس کم کر دیا۔

ایک روز دونوں میرین ڈرائیو پر گھوم رہے تھے۔ سمندر کی لہریں بار بار کنارے کی چٹانوں سے ٹکرا کر جھاگ اگلتی ہوئی بکھر جاتیں۔ سڑک کے کنارے کنارے منڈیر پر سرعام جوان جسم ایک دوسرے میں سما رہے تھے۔ گورکھ نے بارہا یہ منظر دیکھا تھا۔ اسے یہ خیال نہ آتا کہ کیوں موجودہ تہذیب اس قدر ننگی اور بے شرم ہو چلی ہے؟ البتہ ایک ویرانی کا احساس ضرور دماغ میں بھر جاتا۔ شاید عاشقوں کے وصل کا منظر دیکھ کر اپنی طبیعت میں رچی ہوئی ہجر کی کیفیت یاد آ جاتی۔ اس روز اس سے گپتا نے سوال کیا : "تیرے دل پر ان نظاروں کا کچھ اثر ہوتا بھی ہے کہ نہیں؟"

"کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور ہوتا ہے۔" گورکھ نے جواب دیا۔

"بے جھجک بیان کرو تو میں بھی جانوں۔"

"جو بھی اثر ہے' محض تصوراتی ہے۔ دل میں ایک ہلچل سی اٹھتی ہے' حواس بہکتے ہیں' عقل روکتی ہے۔"

"تم عقل سے زیادہ کام نہ لیا کرو۔ جب آفس سے اٹھا کرو تو اسے ڈیزائنوں کے ساتھ ہی بند کر دیا کرو۔"

"نوکری کرنے کے لئے عقل درکار ہوتی ہے تو باقی زندگی گزارنے کے لئے بھی درکار ہوتی ہے۔ کوئی بھی

شخص کسی بھی حالت میں اپنے دماغ کو طاق میں بند نہیں کر سکتا۔ جیسے لہروں کا پتھروں پر سر پٹخنا قدرتی ہے' اسی طرح دماغ کا کچھ نہ کچھ سوچتے رہنا بھی قدرتی ہے۔"

"تمہارے فلسفے کی وجہ سے بھی میں تمہارا دوست بنا ہوں۔ لیکن دل اور دماغ میں کبھی کبھی کشمکش تو بھی ہو جاتی ہے۔ دماغ کچھ کہتا ہے اور دل کچھ۔ انسان ہمیشہ ایک سیدھی لکیر پر چل کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ لکیر کیا ہے؟ ہے بھی کہ نہیں؟"

"مانتا ہوں' لیکن واجب اور ناواجب کا فرق انسان ضرور جانتا ہے اور دل کو دماغ سے قابو میں کرنا پڑتا ہے۔"

"چلو' ہم تمہیں ایک چیز دکھاتے ہیں' تم اسے دیکھ لو' اور میں تمہیں دیکھوں گا کہ تمہارا دل اور دماغ بیک وقت تمہارا ساتھ دیتے ہیں کہ نہیں۔"

"یار' پہیلیاں مت بجھاؤ۔ بتاؤ کیا دکھانے جا رہے ہو؟"

"ایک طوائف ہے۔ بہت خوب صورت ہے۔ بڑی مشکل سے اس کا پتہ پایا ہے۔ اگر تم چاہو تو تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں' لیکن دلال کی طرح بیس روپے لوں گا۔"

گورکھ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ "کیوں مذاق کر رہے ہو' تم اور طوائف کے کوٹھے پر؟ اور پھر دوست سے دلالی؟"

"میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔" گپتا نے کہا۔ "میں جھوٹ بھی نہیں بول رہا ہوں۔ میں تو کافی عرصے سے طوائفوں کے پاس جاتا رہتا ہوں۔ میرا دل اور دماغ مجھے قطعی ملامت نہیں کرتے۔ مجھے کبھی احساس نہیں ہوتا کہ میں نے بیوی سے بے وفائی کی ہے۔ تم بہت اپنی شیخیاں بگھارتے رہتے ہو' بہت پارسا بنے پھرتے ہو اس لئے میں تمہیں چیلنج دے رہا ہوں۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کتنے اصولوں کے پکے ہو اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم میرا راز میری بیوی پر کبھی نہ کھولو گے۔"

"تمہاری طوائف کیا کوئی حور ہے کہ میں دیکھتے ہی بے قابو ہو کر اس سے لپٹ پڑوں گا؟ مجھے شرط منظور ہے۔ دیکھنے سے میرا کیا بگڑتا ہے؟" گورکھ نے چیلنج قبول کر لیا۔

"تو نکالو بیس روپے!" گپتا نے کہا۔

"کیا لکھنؤ کی یہی ادا ہے؟" گورکھ ہنس پڑا۔

"تم بالکل ٹھیک سمجھے۔ یہ اصول کی بات ہے۔ میں نے تمہیں ایک شام کو بیس روپے کا کھانا کھلا دیا ہو گا' لیکن دلال کے اصول اپنی جگہ' دوستی کے اپنی جگہ۔" گپتا نے کہا

"یہ لو بیس روپے۔ میں بھی ذرا پریوں کی شہزادی کو دیکھ آؤں۔"

گپتا ہنس دیا۔ "پہلی بازی تم ہار چکے۔ اگر تمہارا دل قطعی صاف ہوتا تو بیس روپے جیب کے جیب میں ہی پڑے رہتے۔ باہر نہ نکلتے۔"

گورکھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گپتا کی موٹر سائیکل پر بیٹھ لیا۔ گپتا نے ایک پولیس اسٹیشن کے قریب تنگ گلی میں موٹر سائیکل کھڑی کر کے گورکھ سے کہا کہ اس کے ساتھ چلے۔

"کیا کسی پولیس انسپکٹر کی شکل دکھانی ہے؟" گورکھ نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں، جو جگہ دکھانی ہے وہ اس پولیس اسٹیشن کے پاس ہی ہے۔ اب جھاڑو اس بات پر بھی فلسفہ۔ چراغ تلے اندھیرا' پاپ دن میں زیادہ ہوتا ہے کہ رات میں' پاپ کیوں ہے' کیا ہے' پاپی کون ہے' خدا کہاں ہے' زمیں پر کہ آسماں پر' ذرے ذرے میں کہ کہیں نہیں؟" گپتا کی زبان رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

پنواڑی کی دکان کے قریب سے گزر کر تنگ زینے پر چڑھتے ہوئے وہ دونوں طوائف کے کوٹھے پر پہنچے۔ دروازے پر لوہے کی سلاخوں والا بھاری جنگلہ لگا ہوا تھا۔ ایک شہ زور دربان جنگلے کے پیچھے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ گپتا کو دیکھتے ہی اس نے جنگلا سرکا کر اندر گھسنے کی جگہ بنا دی۔

دونوں اندر گھسے اور کمرے میں پہنچے تو گورکھ کمرے کا نقشہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چاروں طرف کرشن' رام' رحیم اور عیسیٰ کی تصویریں لگی ہوئیں تھیں۔ ایک طرف اگر بتی جل رہی تھی۔ اور دوسری طرف چراغ اور موم بتی۔ گورکھ سوچنے لگا کہ طوائف کے کوٹھے پر آیا تھا یا کسی عبادت گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ شام ہونے میں ابھی دیر تھی۔ اس لئے ان دونوں کے سوا کوئی اور خریدار موجود نہ تھا۔ وہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے اور گورکھ گپتا کی حور کا انتظار کرنے لگا۔

چند ہی لمحوں میں حور سامنے آئی۔ گپتا اٹھ کر اس سے یوں بغل گیر ہوا' جیسے مدت بعد اپنی معشوق سے ملا ہو۔ تعارف کراتے ہوئے اس نے کہا یہ میرا دوست ہے' گورکھ۔ اگر کبھی تمہارے پاس آئے تو اس کا خاص خیال رکھنا۔" پھر گورکھ سے مخاطب ہو کر بولا "شرما کیوں رہا ہے یار؟ اس کا نام ہے گلاب۔ اتنا تو یاد رکھ سکو گے؟"

گلاب اپنے آپ کو گپتا سے چھڑاتے ہوئے بولی "جو کل کرے وہ آج کر۔ میں تمہارے دوست کی ابھی خاطر کئے دیتی ہوں۔"

گورکھ ہڑبڑا کر بولا "میں پھر کبھی آپ کو تکلیف دوں گا۔ فی الحال تو چلنا چاہیے۔"

دونوں دوست باہر نکلے تو گپتا نے گورکھ سے کہا "مان جاؤ کہ کمال کی چیز دکھائی ہے۔ میں نے اسے بہت پیسہ کھلایا ہے۔ تمہارے پھنستے ہی مجھے پتہ چل جائے گا اور تم شرط ہار جاؤ گے۔"

گورکھ کے دماغ میں ہلچل مچی تھی۔ اف! آج کیا ہو گیا؟" جس راہ پر چلنا نہیں' اس کی طرف دیکھنے سے

بھی کیا فائدہ؟ جس پیڑ کے آم کھانے نہیں' اس کے آم گننے سے کیا حاصل؟ وہ کون سا فاسد مادہ اس کے ذہن میں پوشیدہ ہے جس نے اس کے قدم غلط جگہ رکھوا دیئے؟"

اگر ایک طرف گورکھ کے ذہن میں یہ خیال اٹھ رہے تھے تو دوسری طرف گلابی حسن بھی تصور میں جگمگا رہا تھا۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ اگر ایسی عورت کسی اچھے ماحول میں ہو' تو کیا مجال کہ اس کی طرف کوئی آنکھ بھی اٹھا سکے۔ اتنی خوب صورت عورت' اتنی گندی جگہ؟ صرف پچاس روپے میں کتنے خریداروں کے ہاتھ روزانہ فروخت ہوتی ہوگی؟ اگر پچاس روپے میں اس قدر حسن خریدا جا سکتا ہے تو پانچ سو روپیہ کیا نہیں خرید سکتا؟ پانچ ہزار روپیہ کیا نہیں خرید سکتا؟ سوچتے سوچتے گورکھ کے دماغ نے سوچنے سے جواب دے دیا۔ ایک عجیب سی الجھن' ایک عجیب سی تکان' ایک انوکھی بے چینی اسے رات بھر پریشان کرتی رہی۔

اگلے دن آفس میں گپتا نے گورکھ سے پوچھا: "مونہہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہو؟ بڑے سنجیدہ لگ رہے ہو۔ رات کو نیند آئی کہ نہیں؟"

واقعی گورکھ کو ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔ وہ خیالات کی بھٹکتی لہروں کو کوئی ترتیب نہ دے سکا تھا۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا "تمہاری چیز تمہیں مبارک۔ میرے دل کی ملکہ بھی کہیں نہ کہیں تو ہوگی۔"

گپتا بولا "پھر تم غلطی کر بیٹھے۔ وہ چیز نہ میری ہے نہ تمہاری۔ وہ تو سب کی مشترکہ ہے۔ اور مشترکہ چیز کو کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے۔"

ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز گپتا گورکھ سے کہنے لگا "مان گئے یار' ارادے کے پکے ہو' سچ مچ زمانے سے الگ ہو۔" گورکھ اتنا مضبوط نہ تھا جتنا کہ ظاہری طور پر وہ گپتا سے پیش آیا تھا۔ بارہا وہ گلاب کے بارے میں سوچتا کہ وہ غضب کی حسین ہے۔ اس کی کم سن خوب صورتی قیامت سے کم نہیں۔ وہ گلاب ہی کیوں' چنبیلی ہے۔ چنبیلی ہی کیوں نرگس' جوہی' چمپا' اور گلاب' سب ایک ساتھ ہے۔ کیوں نہ ایک بار اسے مل لیا جائے۔

لیکن طوائف سے ملنے کا مقصد؟ اسی ادھیڑبن میں کچھ وقت اور گزر گیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ایک دن گورکھ گلاب کے کوٹھے پر جا پہنچا۔ زینے پر چڑھتے ہوئے اسے ایسا لگا کہ اس کا دل سینے سے باہر نکل پڑے گا۔ گلاب نظر آئی تو اس نے اپنا تعارف کرایا' گلاب نے ذہن پر زور دے کر اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ اسے یاد آیا کہ یہ حضرت تقریباً" دو مہینے پہلے اپنے دوست گپتا کے ساتھ آئے تھے اور خالی ہاتھ چلے گئے تھے۔ شاید دوست کے سامنے شرم آ رہی تھی۔

گلاب نے گورکھ کا ہاتھ پکڑا اور اسے کمرے میں لے گئی۔ دروازہ بند کر کے بولی۔ "نکالو پچاس روپے۔ یہاں کا یہی رواج ہے۔ پیسے پہلے کام بعد میں۔"

گورکھ نے پچاس روپیہ نکال کر دے دئے۔

"اب نکالو پانچ روپے پان والے کے، پانچ روپے جمع دار کے، پانچ روپے دربان کے۔"

گورکھ نے پندرہ روپے اور دئے۔

"اب اتارو کپڑے۔" گورکھ کا انتظار کئے بغیر گلاب کپڑے اتار کر لیٹ گئی۔

گورکھ نے قمیض اتاری، پتلون اتاری اور جھجکتا ہوا گلاب کی چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔

چلو جلدی کرو۔ باہر اور بھی تو گاہک ہیں۔ باقی کپڑے بھی اتارو۔"

گورکھ بولا "گلاب، تم اپنے کپڑے واپس پہن لو۔ میں چلتا ہوں۔" گلاب نے تنک کر کہا۔ "اب کیا تمہیں سانپ سونگھ گیا؟ معلوم ہے، یہ طوائف کی توہین ہے؟"

"میں شرمندہ ہوں، مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا، غلطی سے آگیا۔ تم کپڑے پہن لو۔" گورکھ نے لجاجت کے ساتھ کہا" گلاب نے غصہ سے پاؤں پٹختے ہوئے کپڑے پہن لئے۔" یہ جگہ تم جیسے ہجڑوں اور نامردوں کے لئے نہیں ہے۔ یہ لو اپنے روپے اور دفع ہو جاؤ۔ ہم محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔"

گورکھ نے کہا "نہیں، یہ میں واپس نہیں لے سکتا۔ بس میرا ایک کام کرنا۔ وہ یہ کہ میرے دوست گپتا کو کبھی پتہ نہ چلے کہ میں یہاں آیا تھا۔"

گلاب بولی "میں تو نہیں بتاؤں گی، اگر دربان یا کوئی دوسرا بتا دے تو میں کہہ نہیں سکتی۔"

گورکھ واپس گیسٹ ہاؤس پہنچا۔ اور رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک پل کے لئے بھی نیند اس کی آنکھوں کے پاس نہ پھٹکی۔ خیالات ذہن پر یلغار کرتے رہے۔ اتنا جلال ہوتا ہے، حسن میں؟ اتنی روشنی، اتنا نور؟ کہاں وہ بھنڈی کالج کی مردہ عریاں تصویر اور کہاں گلاب کے عریاں حسن کے سلگتے شعلے، جو ابھی تک جیسے اس کے پاس ہی دہک رہے ہیں، جن کی آنچ نے اس کے دل و دماغ میں دور سے ہی لاکھ چنگاریاں بھر دیں۔ اگر وہ انہیں چھو لیتا تو کیا ہوتا؟ عورت کا حسن خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ آج اس کرشمے کو قریب سے دیکھ کر تمام گذشتہ تجربات، رنگ، تصویریں، مصوری، کتابیں، افسانے، کہانیاں، ڈیزائن اور ارمان اپنا نور کھو بیٹھے ہیں۔

ایک ناقابل بیان بے چینی گورکھ کی طبیعت میں شامل تھی۔ اگرچہ آفس میں اس کے کام کی تعریف ہوتی، بمبئی شہر میں رہنا اسے پسند آنے لگا تھا، پیسے کی کبھی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی، لیکن پھر بھی وہ جگہ جگہ نوکری کے لئے عرضیاں بھیجتا رہتا۔ ایک جگہ کا ہو کر رہنا اس کے مزاج میں شامل نہ تھا۔ بمبئی میں تقریباً دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران اس نے انگلینڈ کے دونوں امتحان پاس کر لئے تھے، مصوری کے لئے رموز سیکھ لئے تھے، کچھ پیشے کے متعلق بھی نئی آگاہی حاصل کر لی تھی، بمبئی اور بمبئی والے دیکھ لئے تھے اور گلاب کی خوشبو سونگھ لی تھی، چاہے دور سے ہی سہی۔ جب دہلی سے اس کے لئے رونق کیمیکل کمپنی سے انٹرویو کا بلاوا آیا تو وہ دل ہی دل میں بمبئی کو چھوڑنے کو تیار ہو گیا۔

گوپال داس گورکھ کی شادی کی فکر میں تھے۔ انہوں نے دو لڑکیوں کی تصویریں اور ان کے خاندان کی تفصیل بھی اسے بھیجی تھی۔ دہلی پہنچ کر گورکھ نے دو جگہ انٹرویو دیئے۔ ایک انٹرویو کیمیکل کمپنی میں اور دوسرا لڑکی والوں کے یہاں۔ لڑکی والوں کی طرف سے دو شخص اس سے ملنے آئے۔ ایک گورا' پگڑی والا' دوسرا گنجا اور کالا۔ گورا شخص تو اس سے گفتگو کرتا رہا اور کالا شخص صرف مسکراتا رہا۔ انہوں نے ایک ساتھ ایک ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ پھر دونوں لڑکی والے رخصت ہو گئے۔ گورکھ نے اپنے والد سے پوچھا : "آپ نے مجھے دو لڑکیوں کی تصویریں بھیجی تھیں۔ ان میں سے کس کے والدین سے بات چل رہی ہے؟"

"جو تصویریں بھیجی تھیں' ان میں سے کسی کے والدین سے بات نہیں چل رہی۔ یہ اور لوگ ہیں۔" گوپال داس نے جواب دیا۔

"آپ لڑکی کا فوٹو تو دکھا دیں۔"

"لڑکی والوں نے تصویر بھیجی نہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی بھیجنے لائق فوٹو موجود نہ تھا۔ کھنچوا کر بھیجیں گے۔"

"اگر وہ لڑکے کو دیکھنے آسکتے ہیں تو فوٹو بھی ساتھ لا سکتے ہیں۔"

گورکھ نے کہا۔ گوپال داس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

گورکھ آفس سے چھٹی لے کر آیا تھا۔ دوسرے انٹرویو کا نتیجہ جلد ہی نکل آیا۔ لڑکی والوں نے لڑکی دکھانے کے لئے رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی کے باپ کو لڑکا پسند تھا' لڑکی کی پسند باقی تھی۔

گورکھ اپنے والد سے پوچھنے لگا "مجھے لڑکی والوں کے بارے میں کچھ تو بتائیں۔ وہ گورا شخص' جس نے مجھے باتوں میں الجھا لیا تھا' کیا کام کرتا ہے؟ لڑکی کا نام کیا ہے؟ کتنی پڑھی ہے؟"

گوپال داس نے جواب دیا : "تم غلط سمجھے۔ وہ گورا شخص تو لڑکی کے والد کا دوست ہے' لڑکی کا باپ تو وہ کالا شخص تھا' جس نے تم سے زیادہ بات نہیں کی۔"

"میں تو گورے شخص کو ہی لڑکی کا باپ سمجھتا رہا۔" گورکھ نے کسی قدر مایوسی کے ساتھ کہا۔

گوپال داس نے خطوں کا پلندا گورکھ کو تھما دیا۔ ان سے گورکھ کو پتہ چلا کہ لڑکی کے باپ کا نام ہیرالال تھا' ماں کا نام پدما۔ لڑکی کا نام گوپی تھا' اس کے بھائی کا نام راجندر اور بہن کا بھولی۔ وہ ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور میرٹھ کی بہت بڑی ہستی سمجھے جاتے ہیں۔ ہیرالال کپڑے اور جوتے کے بیوپاری تھے۔ اس کے علاوہ کافی زمین اور جائداد کے مالک بھی تھے۔ گوپی ایم اے تک پڑھی تھی۔

اگلے دن ہی ہیرالال نے کار اور ڈرائیور کو دہلی بھیج دیا۔ دہلی سے میرٹھ کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں۔ گوپال داس' ساوتری' گورکھ اور گورکھ کی بہن شنو' میرٹھ پہنچے تو سہ پہر کا وقت ہو گیا تھا۔ چائے کا وقت تھا۔ سب نے چائے پی۔ لیکن چائے کے وقت گوپی پس پردہ ہی رہی۔ رات کے کھانے کے وقت گوپی کمرے میں داخل ہوئی۔

گورکھ نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کے سوالوں کا سنجیدگی سے جواب دے دیا۔ خود کچھ نہ پوچھا۔ گوپال داس ہی زیادہ گفتگو کرتے رہے۔

کھانا ختم ہوتے ہی گوپال داس، ساوتری، شنو اور گورکھ گھر سے باہر نکل گئے۔ شنو کہنے لگی "بھیا' اس کی باہنوں پر کالا رواں ہے۔ مجھے تو ہونٹوں پر بھی کچھ کالا پن نظر آتا ہے۔"

ساوتری بولی "لڑکی ویسے تو ٹھیک ہے' لیکن رنگ سانولا ہے۔"

گوپال داس کچھ نہ بولے۔ سب گورکھ کی طرف دیکھنے لگے۔ گورکھ نے مختصر طور پر کہا : "پتاجی آپ ہاں کر دیں۔ مجھے گولی پسند ہے۔"

رات کافی ہو چکی تھی، مہمانوں کے سونے کا بندوبست ہو گیا۔ صبح کو رخصت ہونے سے پہلے شادی کی رضامندی دے دی گئی۔

دہلی واپس پہنچے تو گورکھ کو پتہ چلا کہ پتلون کی بیلٹ' انڈرویر اور بنیان وہ گولی کے گھر بھول آیا ہے۔ اس نے سوچا' اچھی شروعات ہے۔

چھٹی ختم ہونے پر گورکھ واپس بمبئی لوٹ آیا۔ اس کے اب تک کے خوابوں کو ایک مرکز مل گیا۔ گولی۔ آہ! جب وہ پہلی بار گولی کو سینے سے لگائے گا تو پھر کبھی اسے جدا نہ ہونے دے گا۔ شادی کا مطلب ہے زندگی بھر کا ساتھ۔ وہ جب بھی چاہے گا گولی کے بوسے لے سکے گا' اس کے ساتھ محبت کا ازلی کھیل کھیل سکے گا۔ ہر روز ایک ساتھ ایک بستر پر سونے میں کتنا لطف ہو گا۔ ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے زندگی گزارنے میں کیا مزہ ہو گا۔ وہ گولی سے اس قدر محبت کرے گا' ایسی محبت کرے گا جیسی وہ سنیما اسکرین پر بچپن سے دیکھتا آیا ہے۔ خوابوں میں جب جذبہ محبت زیادہ بڑھ جاتا اور وہ خود کو گولی کے انتہائی قریب پاتا تو دل کی دھڑکنیں سلگ اٹھتیں اور انجام ہوتا جلق بازی۔ وہ آگ فقط اسی پانی سے ٹھنڈی ہوتی۔ گورکھ نے باہر کے سیکس کے رسالے کیا پڑھے کہ جلق سے متعلق کوئی برائی اس کے ذہن میں نہ رہی۔ یہ فعل اسی طرح اس کا معمول بن گیا جیسے بھوک لگنے پر کھانا کھا لینا۔ جب بھی گورکھ زمانے سے خفا ہوتا' کسی چیز کو نہ پانے پر ناامید ہوتا' کوئی اس سے زیادتی کرتا' زمانے کی رسومات اور روایات پر اسے افسوس ہوتا' تو اس فعل سے اس کے دل کو راحت ملتی۔ اور تو اور' جب کوئی خوشی کی بات ہوتی' دل بے وجہ مسرور ہوتا' موڈ اچھا ہوتا تو بھی وہ یہی فعل دہراتا۔

گیسٹ ہاؤس کے مالک کے ایک ہی اولاد تھی' اس کا بیٹا مائیک ڈی سوزا۔ مائیک اکثر صبح کے ناشتے کے وقت گیسٹ ہاؤس میں رہنے والوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرتا۔ گیسٹ ہاؤس کے ایک طرف' کرایہ داروں کے کمروں سے ذرا علیحدہ' دو کمرے مائیک کے پاس تھے۔ مائیک بمبئی میں پودوں کے لئے کھاد کی سپلائی کا کاروبار کرتا تھا۔ چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی' یعنی مونچھیں اور ٹھوڈی کے قدرے نیچے تک بال اور باقی چہرہ صفاچٹ۔ بھرا گورا

بدن۔ طاقت ور بازو۔ لمبا قد۔ وہ ایک خوب رو نوجوان تھا۔ گورکھ کو پتہ چلا کہ مائیک کی منگنی ہو چکی ہے اور ایک مہینے میں اس کی شادی ہونے والی ہے۔ گورکھ نے مائیک میں ایک خاص تبدیلی محسوس کی۔ مائیک صبح اور شام' دونوں وقت ڈنڈ پیلتا' رات میں دوڑ لگاتا اور پہلوانوں کی طرح ورزش کرتا۔ گورکھ سوچتا کہ مائیک پہلے سے ہی جسمانی طور پر بہت مضبوط ہے' پھر اسے اس قدر ورزش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرے مائیک نے اپنی خوراک بھی بہت بڑھالی تھی۔ وہ صبح کو دو کی بجائے چار انڈوں کا آملیٹ کھاتا' دودھ پیتا' چار مکھن لگے ٹوسٹ ہضم کر جاتا۔ گورکھ سوچتا کہ مائیک کی شادی ہو رہی ہے یا وہ کہیں اکھاڑے میں کشتی کے مقابلے کی تیاری کر رہا ہے؟

مائیک کی شادی کو دو ہفتے رہ گئے ہوں گے کہ مائیک نے داڑھی اور مونچھیں' دونوں صاف کرا ڈالے۔ گورکھ نے مائیک کی ہونے والی بیوی کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ شاید بوسہ لیتے ہوئے یا دیتے ہوئے پہلے داڑھی اور مونچھوں کو برابر کا حصہ دار بنانا پڑتا ہوگا۔ محبوب کے لبوں پر مکمل قبضہ جمانے کے لئے ہی' مائیک نے اس رکاوٹ کا خاتمہ کر دیا ہوگا۔ صبح کو مائیک ناشتے کے لئے بیٹھا تو کرایہ دار اس کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ایک نے آخر کہہ ہی دیا : "مائیک' شادی سے پہلے ہی ڈارھی' مونچھ کٹی' آگے دیکھو کیا کیا جاتا ہے۔" مائیک نے کوئی جواب نہ دیا۔

ایک رات گورکھ گولی کو خوابوں کے ہنڈولے میں جھلا رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو وہ خود جھول چکا تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر وہ غسل خانے کی طرف چلا۔ چار غسل خانے ایک ہی قطار میں تعمیر ہوئے تھے اور یہ سب کرایہ داروں اور مائیک کے لئے مشترکہ تھے۔ گورکھ نے ایک غسل خانے کا دروازہ کھول کر بجلی کے بلب کا سوئچ دبایا تو فوراً" دروازہ بند کر کے دوسرے غسل خانے کی طرف بھاگا۔ مائیک وہاں کھڑا' ٹانگیں پھیلائے' دیوار کا سہارا لئے' بالکل عریاں' جلق کے فعل میں مصروف تھا۔ سوئچ دبتے ہی اس کے ہاتھ کی حرکت رک گئی تھی۔ غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند کرنا بھول گیا تھا۔ اگلی صبح مائیک گورکھ سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔

گورکھ کو گولی سے محبت کے خوابوں کے علاوہ اپنی بڑھتی ہوئی ذمہ داری کا بھی احساس ہوتا۔ پانچ سال نوکری کرتے ہو گئے تھے اور ۲۸ سال کی عمر ہو گئی تھی۔ مگر ابھی تک اس کا اثاثہ فقط ایک چھوٹا سا بستر اور ایک چھوٹا سا ٹرنک تھا' جس کے تین چوتھائی حصے میں کتابیں' تصویریں' رنگ' برش' اور سیکس کے رسالے بھرے ہوئے تھے۔ باقی کے ایک چوتھائی حصے میں اس کے پہننے کے کپڑے تھے۔ وہ تقریباً" ساڑھے چار سو روپے ماہانہ تنخواہ لیتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ شادی ہو جانے پر وہ اگر اسی گیسٹ ہاؤس میں رہنا چاہے اور صرف ایک کمرہ بھی کرایہ پر لے تو آدھی سے زیادہ تنخواہ ختم۔ پھر کہاں گولی کھانا پکائے گی؟ کہاں اپنا سامان رکھے گی؟ وہ بمبئی میں کیسے رہ سکیں گے؟ گیسٹ ہاؤس میں کسی کرایہ دار کو ایک ٹرنک اور ایک بستر سے زیادہ سامان رکھنے کی اجازت نہ

تھی۔ اگر وہ فلیٹ کرایہ پر لے گا تو کیسے لے گا؟ کہاں سے پگڑی کے لئے پیسہ آئے گا؟ وہ شادی کے لئے رضامندی دے تو آیا تھا' لیکن بارہا سوچتا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کی۔ کچھ ہی دن میں اس کی گولی بمبئی سے بھاگ کر اپنے باپ کی عالی شان کوٹھی میں چلی جائے گی اور وہ صرف اس کے خواب دیکھتا رہ جائے گا۔

جب بھی گورکھ کو کسی بات پر مایوسی ہوتی تو اس کے دل اور دماغ میں ایک کڑواہٹ بھر جاتی' جو کسی طرح باہر نکلنے کا نام نہ لیتی۔ گورکھ دوستوں میں بیٹھ کر ہر چیز پر نکتہ چینی کرتا۔ گورکھ کے موڈ کے مطابق ہر چیز اپنا رنگ بدل لیتی۔ وہ کھڑکی پر لٹکتے پردوں کی پر سلوٹوں سے لے کر چارپائی پر بچھی چادر تک کو لے کر دیر تک نکتہ چینی کر سکتا تھا۔ علمی گفتگو اور نکتہ چینی کرتے کرتے وہ طنز پر اتر آتا اور طنز کی بڑھتی ہوئی شدت شریفانہ انداز سے شروع ہونے والی بات کو چوٹ کرتی تکرار میں بدل دیتی۔ گورکھ کا چہرہ تمتما جاتا' آواز' بلند ہو جاتی' ہاتھوں کی مٹھیاں کس جاتی۔ اس کے دوست اس کے ساتھ بحث میں الجھنے سے بچتے' لیکن گورکھ اکثر یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ناواجب طور پر بحث کر رہا ہے' کبھی اپنی ہار نہ مانتا اور اپنی بات پر اڑا رہتا۔ جب سے اس کی شخصیت میں یہ نیا موڑ آیا' اس نے زمانے کو اور بھی اپنے خلاف کر لیا۔ پہلے ہی اس کا کوئی گہرا دوست نہ تھا اور جب زبان بھی قابو میں نہ رہی تو رہے سہے دوست بھی کچھ اور پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ زندگی کی ناکامیاں ناامیدیاں اور زیادتیاں جو اس نے دل میں ابھی تک دبا کر رکھی تھیں' جن کا ناسور کہیں اندر ہی اندر زور پکڑتا گیا تھا' اس کی زبان سے رسنے لگا۔ اس کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا گیا۔ گورکھ زمانے کو دکھانا چاہتا تھا کہ اسے زمانے کی کوئی پروا نہیں۔ اگر زمانہ تلخ ہے تو وہ بھی تلخ ہے۔ کہاں تک ان تلخیوں کو دل ہی دل میں سڑنے دے۔ لیکن ہر تلخ اظہار کے بعد وہ افسوس میں ڈوب جاتا۔ کیا فائدہ کسی کو ناراض کرنے سے؟ اپنی ناامیدی کی وجہ اسے نظر نہ آتی۔ بار بار وہ اپنے آپ کو سمجھاتا کہ زندگی ہر حال میں جینے لائق ہے۔ جو بھی وقت گزرا' اچھا گزرا' زمانے سے کیا گلہ؟ زمانہ ہمیشہ کسی کی مرضی کے مطابق کہاں چلتا ہے؟ اس فانی جہاں میں کس کی مرضی چلی ہے؟ گورکھ جب بھی خود کو اندر سے ٹٹولتا' اسے کسی سے کوئی گلہ یا شکوہ نظر نہ آتا۔ جو کچھ زندگی نے دیا وہ مقدر ہے' مقدر تھا۔ اسے ہر حال میں خوش رہنا چاہئے۔ اس طرح خود کو سمجھانے سے اس کے دل میں ایک سکون کی لہر دوڑ جاتی۔ سارے غم' الجھنیں' ناامیدیاں مٹ جاتیں۔ بار بار کوئی دلاویز آواز اس کے کان میں کہتی: تمہیں کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے؟ کمی اگر ہے بھی تو عارضی ہے۔ کمی اس لئے کمی ہے کہ اسے محسوس کیا جاتا ہے' ورنہ کوئی کمی نہیں۔ تمہیں کس بات کا گلہ ہے؟ کیا اس بات کا کہ فرسٹ کلاس نمبر لے کر ابھی ساڑھے چار سو کی نوکری تک پہنچے ہو؟ اس میں تو کوئی گلے والی بات نہیں۔ کمائی وہی ہے جو اپنے قوت بازو سے' اپنی عقل سے' اپنی محنت سے کی جائے۔ اس پر صبر کرنا چاہئے' اس میں خوش رہنا چاہئے۔ اس کے پاس تو ایک ٹرنک اور ایک بستر ہے' جگ جگ سوامی کے پاس تو صرف ایک پوٹلی تھی۔ بمبئی میں جھگی جھونپڑی میں آباد دنیا کیا اس نے نہیں دیکھی؟ اگر اوپر کی طرف نظر اٹھا کر آسمان کو چومتی

اونچی عمارتیں ہیں تو کیا ان کے ساتھ زمین پر رینگتی' دم توڑتی بستیاں نہیں ہیں؟ کیوں اسے اپنی عقل پر ناجائز ناز ہے؟ کیوں اسے قسمت سے گلہ ہے؟ ان بستیوں میں کیا کوئی ایک روح بھی ایسی نہ ہوگی جس کو اس کی طرح ماحول اور موقع دیا جاتا تو وہ اس سے بھی زیادہ کام یاب ثابت ہوتی؟ تسلی' سکون' متانت انسان خود تعمیر کرتا ہے۔ اپنی خودی پر ہی ان کا دارومدار ہے نہ کہ بیرونی حالات پر۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی کا گلہ شکوہ کرے۔ یہ سوچتے سوچتے گورکھ یک بیک ایک اجالے میں نہا جاتا۔ جسم میں ایک ہلکا پن محسوس کرتا۔ اسے 'زمانے' سے زندگی سے کچھ اور نہیں چاہئے۔ پنجابی ہوٹل کی لزیذ مرغی تو وہ ہر روز کھا سکتا ہے' پلازہ کے بڑے اسکرین پر فلم بھی دیکھ سکتا ہے' رات کو بے روک ٹوک خواب کے مزے بھی لے سکتا ہے۔ کیا اتنا کچھ زندگی کے لئے کم ہے؟ اسی وقت گورکھ کو گولی کا خیال آجاتا۔ اس کے لئے تو یہ سب کافی ہے' لیکن اگر گولی کے لئے نہ ہوا؟ "یا خدا' میری فریاد سن۔ مجھے بمبئی سے نکال۔ رونق کیمیکل میں نوکری دلا دے۔" وہ سوچتا کہ اس کی فطرت بھی بڑی عجیب ہے کہ کچھ نہ چاہ کر بھی ہر وقت کچھ نہ کچھ مانگتی رہتی ہے۔

کچھ روز بعد گورکھ کو دہلی سے تار ملا کہ اسے رونق کمپنی میں نوکری کے لئے چن لیا گیا ہے۔ ایک ہفتے بعد باقاعدہ خط وصول ہوا' جس میں تمام تفصیل درج تھی۔ اس کی ماہانہ تنخواہ تقریباً" سات سو روپے ہوگی اور اس کا عہدہ بڑھ کر پلانٹ انجینئر کا ہو جائے گا۔

دہلی میں گورکھ کے نئی ملازمت شروع کرنے کے کچھ ہی دن بعد اس کی سگائی کی تقریب ہوئی۔ جلد ہی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ گورکھ کا خیال تھا کہ کئی رسمیں وقت کے مطابق بدل دینی چاہئیں، لیکن پھر بھی اس نے پرانے ریت و رواج کا احترام کیا۔ آخر شادی کا دن بھی آپہنچا۔ باراتی بس میں سوار تھے اور گورکھ اور اس کے والدین کار میں۔

گورکھ کے دماغ میں اپنی شادی کی ہلچل تو تھی ہی، وہ اپنی چھوٹی بہن گنو کی شادی کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ بچپن میں گورکھ اور گنو دونوں پر ہی کرشن بھگتی کا غلبہ رہا تھا۔ گورکھ آگے نکل گیا، گنو وہیں ٹھہر گئی، یعنی وہ کرشن کی میرا بن بیٹھی۔ گنو کی عمر ابھی ۱۸ سال بھی نہ ہوگی کہ گوپال داس پر اس کی شادی کی فکر سوار ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گوپال داس کی بوڑھی ماں جانکی ان دنوں زندہ تھی۔ عموماً" اہم فیصلے گوپال داس اپنی ماں جانکی کی صلاح سے ہی کرتے تھے۔ جانکی اکثر گوپال داس سے کہتی رہتی کہ گنو کی عمر بہت زیادہ ہو چکی ہے اور جلد ہی اس کی شادی ہو جانی چاہئے۔ گوپال داس ماں کی بات سن لیتے اور اس کو تسلی دیتے رہتے کہ گنو کے لئے وہ موزوں لڑکا تلاش کر رہے ہیں، شادی ہو ہی جائے گی، زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے، لڑکیاں پڑھنے لگی ہیں، گنو بی اے پاس ہے۔ شادی کی اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ جانکی اپنا راگ نہ بند کرتی : "ہمارے زمانے میں تو بارہ سال کی لڑکی کی شادی ہو جاتی تھی۔ جوان لڑکیوں کو گھر میں بٹھانا کہاں کی عقل مندی ہے؟ جیسا بھی لڑکا ملے، جلد شادی کردو۔ باقی لڑکیاں بھی تو جوان ہو رہی ہیں۔"

گنو کے لئے ایک سیاہ فام دین دیال تلاش کر لیا گیا۔ وہ اس لئے کہ دین دیال کے والدین نے اپنے لالچ پر پردہ ڈال کر جہیز کی بات نہ کی اور نہ ہی کوئی مانگ رکھی۔ گورکھ اکثر دین دیال سے ملتا رہتا۔ گورکھ کو اندازہ ہوا کہ دین دیال دراصل دین دیال ہے۔ مونہہ میں زبان تو ہے ہی نہیں۔ اس کی بے زبان بہن کے لئے اس سے اچھا رشتہ کیا ہو سکتا ہے؟ پھر گنو جس کی پوجا کرتی ہے وہ بھی تو کالا کنہیا ہے۔

گنو کی شادی ہو گئی۔ گنو اور گائے میں کم فرق ہوگا۔ صرف اتنا کہ گائے چارہ کھاتی ہے اور گنو کو دو روٹی صبح اور دو روٹی شام کو درکار تھی۔

جہیز کم ملا ہو گا یا کچھ اور شکایتیں رہی ہوں گی کہ دین دیال گنو کے لئے شاہین لال بن بیٹھے۔ چڑیا پنجرے میں

بند کردی گئی۔ دھمکی دی گئی کہ اگر زیادہ پر پھڑپھڑائے تو پر کاٹ دیے جائیں گے۔ عملی طور پر ایک آدھا پر نوچ کر بھی دکھا دیا۔ گنو نے اف تک نہ کی۔ گوپال داس کو گنو کی حالت کا پہلے تو پتہ نہ چلا، لیکن جب تعلقات یکایک ٹوٹ سے گئے تو شک پیدا ہوا کہ کہیں گنو پر کوئی مصیبت تو نہیں ٹوٹ پڑی؟ گورکھ گنو کے گھر گیا تو دین دیال نے شریفوں کے طور طریقے بھی نظر انداز کر دیے۔ گورکھ کو ماجرا سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ گنو ظالم شوہر کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔ گورکھ بہن کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ دین دیال سے اجازت بھی نہ لی۔

دو سال تک گنو دین دیال سے الگ رہی۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہتی، مگر خوش بھی نہ رہتی۔ ادھر دین دیال کے لئے گنو کی ہستی گویا مٹ گئی تھی۔ گوپال داس پر باقی لڑکیوں کی شادی کی فکر سوار تھی۔ انہوں نے برادری کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ بڑی لڑکی کو اس کے شوہر نے چھوڑ رکھا ہے تو وہ بغیر سوچے سمجھے انگلیاں اٹھائیں گے۔ چنانچہ سمجھوتے کی بات چلائی گئی اور گنو واپس پنجرے میں بند ہو گئی۔ گورکھ نے ایک بار گنو سے کہا "جس بھگوان کی تم پوجا کرتی ہو وہ ہمیشہ ظلم کے خلاف لڑتا رہا۔ ناجائز حرکتوں کو برداشت کرنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا "ناجائز کام کرنا۔"

گنو کچھ نہ بولی۔ گورکھ نے پھر کہا "تمہیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ آخر تم بی اے پاس ہو۔ بی ایڈ بھی کر لیا ہے۔ اسکول میں نوکری کر سکتی ہو۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہو۔ ابھی کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔"

گنو پھر بھی چپ رہی۔ گورکھ نے کہا "تمہاری خاموشی سے تو ایسا لگتا ہے کہ تم دین دیال کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔"

گنو نے ذرا سی زبان کھولی۔ "میں نے شادی کے پہلے دن ہی اسے بھگوان مان لیا۔ میرا بھگوان جس کی میں پوجا کرتی ہوں، جیتا جاگتا میرے سامنے آگیا۔ وہی جمنا ہے، وہی سنگم ہے، وہ جس حال میں رکھے اسی حال میں رہنا ہے۔"

گورکھ خاموش ہو گیا۔ مگر اس کے ذہن میں طوفان مچا رہا۔ کار میں میرٹھ جاتے ہوئے بھی وہ یہی سوچتا رہا کہ انسان اپنی کمزوری کو کیوں خدا کے سر لاد دیتا ہے۔ جب اپنا سامنا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو خدا کو سامنے کر لیتا ہے۔

گورکھ سوچ میں گم تھا کہ کار قدرے ناہموار چلنے لگی۔ ڈرائیور نے کار روک دی اور کہا "آپ لوگ کار سے اتر کر باہر آجائیں۔ ٹائر میں پنچر ہو گیا ہے۔ ٹائر بدلنا ہوگا۔"

براتیوں کی بس آگے نکل گئی۔ دہلی سے میرٹھ ہے بھی کتنی دور، صرف چند گھنٹے کا راستہ، لیکن ٹائر بدلنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ براتی پہلے پہنچے اور دولہا میاں بعد میں۔ ہیرا لال کی کوٹھی روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ اس قدر روشنی تھی کہ پھیلے ہوئے رات کے اندھیروں میں جگمگاہٹ کا ایک جزیرہ پیدا ہو گیا تھا۔ کوٹھی سے ملی ہوئی

ایک دوسری عمارت میں براتیوں کے رہنے کا انتظام تھا۔

پھول مالا پہنتے ہوئے اور پہناتے ہوئے گولی گورکھ کو بہت حسین لگ رہی تھی۔ سارے شہر کے بڑے بیوپاری اور اعلیٰ افسر موجود تھے۔ سب سے گورکھ کا تعارف کرایا گیا۔ مہمانوں کو لذیذ کھانا پیش کیا گیا۔ رات کو بارہ بجے کے بعد شادی کی رسم ادا ہوئی۔ براتی رخصت ہوئے' والدین بھی رخصت ہوئے۔ رہ گیا گورکھ "سالیوں کے قبضے میں۔" گولی کی چچیری بہنیں ایک نہیں سات' آٹھ تھیں۔ سب کی سب بے حد شوخ اور چنچل تھیں۔ دیر تک گورکھ سے سالیوں کی چھیڑ چھاڑ چلتی رہی۔ ایک سالی نے اسے خاص طور سے مذاق کا نشانہ بنایا۔ گورکھ کے لئے یہ ایک نیا ماحول تھا۔ اس نے پہلے کبھی کسی جوان لڑکی سے کھل کر بات نہ کی تھی۔ ایسے موقعوں پر ایک ہچکچاہٹ' ایک نا معلوم سی بے چینی اسے جکڑ لیتی تھی۔ اس روز پہلا موقع تھا کہ وہ جوان سالیوں کی باتوں کا جواب دینے پر مجبور تھا اور ان کی نزدیکیوں سے کسی قدر پریشان بھی تھا۔

رات کے لگ بھگ دو بجے گورکھ کو سالیوں سے چھٹکارا ملا تو وہ برات کے پڑاؤ پر پہنچا۔ سارے براتی لمبی تان کر سو رہے تھے۔ چارپائی کوئی خالی نہ تھی۔ گورکھ کے ماں باپ بھی سو گئے تھے۔ زمین پر بستر اس طرح بچھے ہوئے تھے جیسے بمبئی میں جگومل کے گھر میں لگتے تھے۔ طرح طرح کے خراٹوں کی آوازوں سے ہال گونج رہا تھا' جیسے کبوتر' مینڈک' سانپ' بھنورے' سب ایک ساتھ موجود ہوں۔

گورکھ ایک تنگ سی جگہ پر بستر پھیلا کر لیٹ گیا۔ اب اسے بمبئی کی ایک فٹ چوڑی دیوار پر سونے کی عادت نہ رہی تھی۔ شادی کے چکر اور سالیوں کی چھیڑ چھاڑ ابھی ذہن میں تازہ تھی۔ کہاں گولی کے حسن کی گرمی' کہاں بستر کو چیرتی فرش کی خنکی۔ سب کہہ رہے تھے کہ میرٹھ میں اتنی زور کی سردی پچھلے تم ؍برس میں نہ پڑی تھی۔ گورکھ کو ٹھیک طرح نیند نہ آئی۔ تاہم صبح ہونے میں بھی دیر نہ لگی۔

"ناشتے کے بعد کوچ کا وقت آگیا۔ گولی کے والدین غم سے نڈھال تھے۔ گورکھ نے سوچا ضرور گولی نازوں میں پلی ہوگی۔ وہ بھی گولی کو اس قدر پیار دے گا کہ اسے ماں باپ کی یاد پریشان نہ کرے گی۔

پچھلی رات کو سب دیر تک جاگے تھے۔ رخصتی کے وقت اگرچہ گولی کی آنکھوں میں آنسو تھے' مگر بس کے چلتے ہی اس نے اپنا سر گورکھ کے شانے پر ٹیک دیا اور اونگھنے لگی۔ مگر گورکھ کو کیسے نیند آسکتی تھی؟ یوں تو وہ بھی رات بھر جاگتا رہا تھا' مگر زندگی پڑی تھی سونے کو۔ ابھی تو احساسات کے طوفان نے دم بھی نہیں لیا تھا۔ ایک ہم سفر کا ساتھ' زندگی بھر کا بندھن' شادی کی رسمیں' اقرار نامے' قسمیں اور وعدے۔ وہ دل و جان سے گولی کو اپنے قریب محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اس کا وجود دو ٹکڑے ہو گیا ہو۔ اور ایک حصہ گولی میں سما گیا ہو۔ جیسے گولی اس کی بالکل اپنی ہستی ہو گئی ہو۔

گولی کی نزدیکی اس کے ذہن میں طرح طرح کی لہریں پیدا کر رہی تھیں۔ تصورات جگنوؤں کی طرح

ہزاروں' لاکھوں کی تعداد میں ہواؤں میں اڑتے' دھنک کی طرح روشن ہوتے اور نا معلوم فضاؤں میں سمٹ جاتے۔ ہواؤں میں ایک عطر سا گھلا تھا۔ گولی کے بدن سے اٹھتی خوشبو فضاؤں میں رچ کر گورکھ کے ہر سانس میں بس گئی۔ جیسے تپتی دوپہر میں پیاسی مٹی پر بارش کی پہلی بوند گرے اور مٹی سے اٹھتی ایک تیز' لپلپاتی' شرابی مہک سے سرشار ہو کر مٹی میں سما جائے۔ گورکھ کا جی چاہا کہ کاش دہلی کا راستہ اتنا طویل ہو جائے کہ بس چلتی رہے' کہیں بھی کسی وقت بھی نہ رکے اور زندگی اس نشے میں ہمیشہ کے لئے غرق ہوتی ہوتی دم توڑ دے۔

گورکھ کی آرزو کے برعکس دہلی پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ ساوتری نے گورکھ سے کہا "آج تمہیں گولی نہیں ملے گی۔ رسم کے مطابق ابھی تمہیں تین دن اور انتظار کرنا ہو گا۔" گورکھ اور گولی اگرچہ راتیں الگ الگ گزارتے' لیکن دن بھر ساتھ رہتے۔

گورکھ مسکرا کر رہ گیا۔ دہلی کی سیر کرتے' سنیما دیکھتے' باہر کھانا کھاتے اور شام کو گھر واپس آجاتے۔ گورکھ نے کتنی ہی فلمیں دیکھ ڈالی تھیں' لیکن زندگی کے ہم سفر کے ساتھ فلم دیکھنے کا لطف کچھ اور ہی تھا۔ پہلے دن فلم دیکھنے گئے تو گولی بولی "میرے پتاجی کو سنیما سے سخت نفرت تھی۔ مجھے پکچر دیکھنے کی اجازت نہ تھی' اس لئے فلمیں دیکھنے کے میرے ارمان پورے نہ ہو سکے۔"

گورکھ کہنے لگا "اتنی فلمیں ایک ساتھ دیکھیں گے کہ اگلی پچھلی ساری کسر پوری ہو جائے گی اور فلموں سے تمہارا دل بھی بھر جائے گا۔"

فلم شروع ہوئی' ہال میں اندھیرا ہوا تو گولی نے گورکھ کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھے اندھیرے میں ڈر لگتا ہے' ذرا سی روشنی ضرور چاہئے۔"

گورکھ نے اس کا ہاتھ دبایا۔ "اندھیروں سے کیا ڈرنا؟ اندھیرے تو اجالوں سے بھی روشن ہوتے ہیں۔ اور پھر میں جو ساتھ ہوں۔"

جہیز میں ملا سامان کھلنے لگا تو گورکھ ہر چیز غور سے دیکھتا رہا۔ ہر چیز بہت خوب صورت تھی اور شوق سے بنائی گئی یا خریدی گئی تھی۔ گورکھ نے تو گذشتہ زندگی بے سروسامانی میں بسر کی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس قدر خوب صورت سامان کو سجانے کے لئے اتنا ہی خوب صورت گھر بھی تو چاہئے۔ جو شان و شوکت سامان سے ظاہر ہو رہی تھی' کیا ویسا آرام وہ گولی کو مہیا کر سکے گا؟ پھر گورکھ نے خود کو دلاسا دیا کہ اگر ساز و سامان نہیں' تو دل تو ہے' جو وہ کبھی کا گولی کے نام لکھ چکا ہے۔

ساوتری نے کچھ سامان گھر کے استعمال کے لئے نکال لیا۔ گھر کی باقی چیزوں میں وہ نیا سامان شامل تو ہو گیا' لیکن خاموش شکایت کرنے لگا : "میں کہاں آپھنسا!" گولی کو اپنے سامان میں سے ساس کا کچھ اٹھا لینا ضرور برا

لگا ہوگا' لیکن اس وقت اس نے کچھ نہ کہا۔ گورکھ کو اپنی ماں کی حرکت نہ بری لگی نہ اچھی لگی۔ وہ بے نیاز رہا۔ گولی اور گورکھ کا ایک واقعہ دو مختلف انداز سے دیکھنا' اس وقت واضح نہ ہوا' لیکن بعد میں ضرور رنگ لایا۔

تین دن بعد سہاگ رات تھی۔ وہ گھڑیاں جس کے لئے ہر نوجوان سنہرے خواب سجاتا ہے۔ سگائی کی رسم کے بعد گورکھ سوچتا رہتا تھا کہ گولی کو خط لکھے۔ لیکن بار بار سوچنے پر بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ تین بار خط لکھ کر مضمون پڑھا اور پھاڑ کر پھینک دیا۔ جو دل میں بات تھی' اسے ظاہر کرنے کے لئے الفاظ نہ تھے۔ خیر وقت تو گزر گیا۔ اب محبوب کتنا قریب تھا۔ کیوں نہ کچھ اس طرح اظہار عشق کیا جائے جو لاجواب ہو' جس کا ثانی نہ ہو' جو گنگا جمنا کا سنگم ہو' جس میں عہد گذشتہ اور فردا دونوں ڈوب جائیں۔ رہ جائیں تو فقط حال کے چار پل۔

گورکھ ان ہی خیالات کی رو میں بہہ رہا تھا کہ گولی کہنے لگی "مجھے تم سے دو باتیں کرنی ہیں۔"

"دو کیا' ہزار باتیں کرو۔" گورکھ ہنس کر بولا

"پہلے وعدہ کرو کہ کسی کو نہیں بتاؤ گے۔"

"اچھا' وعدہ کیا۔"

"شادی کے وقت میری جو عمر بتائی گئی' اس سے میں ایک سال بڑی ہوں۔ جو جنم پتری میرے پتا جی نے شادی سے پہلے بھیجی تھی' وہ نقلی ہے۔ انہیں تم پسند آئے' اس لئے انہوں نے کسی برہمن سے تمہاری جنم پتری سے ملتی جلتی اچھی سی پتری بنوا کر بھیج دی۔"

"بہت اچھا ہوا۔ میری قسمت میں تم جو تھیں۔ کون تمہیں مجھ سے چھین سکتا تھا؟"

گورکھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ گنو کی کنڈلی ملا کر شادی کی تھی تو کیا حشر ہوا؟ شادیوں کے موقع پر کنڈلیاں ملانے کا سلسلہ ایک وہم ہے' ایک چھلاوہ ہے۔

"گولی نے سرگوشی کی : "دوسری بات یہ کہ جو چیک میرے پتا جی نے دیا ہے' اسے بینک میں نہ بھیجیں' کیوں کہ ان کے اکاؤنٹ میں پیسہ نہیں ہے' خیر وہ چیک تو میرے نام ہے۔ مجھے گھر کے ساماں کے لئے دیا گیا ہے۔"

گورکھ کو پیسے سے کیا سروکار تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ وصل کی پہلی رات کیا ان بکھیڑوں کے لئے ہے۔ ان باتوں کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔ شروعات کسی دوسرے طریقے سے ہونی چاہئے تھی۔ اس نے اپنے خیالوں کی حسینائیں جو اس نے مصوری کے فن سے کاغذ پر اتاری تھیں۔ گولی کے سامنے رکھ دیں۔ گولی ان تصویروں کو دیکھ کر کہنے لگی "بہت خوب صورت ہیں۔ مگر حقیقت سے بہت دور۔ صرف قیاسی۔"

گورکھ بولا۔ "میری ان تصور اور تخیل کی اڑانوں سے' جنہیں میں نے بہت محنت سے سالہا سال کاغذ پر اتارا' تم کہیں زیادہ حسین ہو۔"

"گولی نے گورکھ کا ہاتھ تھام لیا اور کہا "چھوڑو بھی۔ میں جانتی ہوں کہ میں کیا ہوں مجھے تم سے ایک اور بات کہنی ہے"

"کہو۔"گورکھ مسکرایا۔

مجھے ابھی بچہ نہیں چاہیے۔ کچھ دن زندگی کا لطف لے لیں۔ بچے کے ساتھ تو ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی اور آزادی ختم ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، جب تم کہوگی، تب ہم دونوں اولاد پیدا کریں گے۔"گورکھ نے کہا۔

روشنی گل کر کے دونوں بستر میں دراز ہوئے تو گورکھ گولی کے لبوں سے نیچے نہ اتر سکا۔ اس نے تو گولی کی انگیا کے ہک کو بھی ہاتھ نہ لگایا۔ کتنے شیریں تھے گولی کے لب! کس سے تشبیہ دے اس لذت کو؟ یکایک پیا لال اور گوکل کی یاد آئی اور ایک دستک دے کر رخصت ہو گئی۔ گورکھ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے جاگ رہا تھا کہ گولی کروٹ بدل کر سو گئی۔ گورکھ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ گولی کی کمر پر ٹکا دیا۔ وہ سوچتا رہا کہ گولی کو کھینچ کر بوسوں کا سلسلہ جاری رکھے، لیکن گولی گہری نیند میں تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ گولی کی کمر سے ہٹایا۔ اور سوچنے لگا کہ سہاگ رات کو عورت مرد کی ہوس کا زیادہ ہی شکار ہوتی ہوگی۔ فرق اتنا ہی ہے کہ یہ قانونا" جرم نہیں۔ وہ تحمل سے انتظار کرلے گا۔ اور گولی کا دل جیتنے کی کوشش کرے گا۔

نیند گورکھ کی آنکھوں سے غائب تھی۔ گولی کی موجودگی کا احساس قیاس میں جگمگا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ آنکھ لگی تو نرم بچھونا فضاؤں میں گشت کرتا گولی کے پر شباب جسم کی صورت اختیار کر گیا۔ وہ گورکھ سے لاکھ بچی، لیکن گورکھ نے اونچی اڑان بھر کر اسے آغوش میں سمیٹ لیا۔ دیر تک ہواؤں میں قلابازیاں کھاتا ہوا جب اڑتا ہوا غالیچہ بادلوں کے دامن میں پہنچا تو خود بخود نم ہو گیا۔

شادی کے بعد ہنی مون بھی ضروری ہے۔ اس زمانے میں بھی مغربی تہذیب کا یہ رخ ہندوستانیوں نے اختیار کر لیا تھا۔ دیکھا جائے تو اس کی خاصی اہمیت ہے، خاص طور سے ایسی صورت میں جب کہ شادی والدین نے طے کی ہو۔ دو نوجوان دلوں کے لئے ایک دوسرے کو سمجھنے اور پرکھنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ البتہ دل ودماغ اس دوران محبت کے نئے نئے نشے میں اس قدر شرابور ہو جاتے ہیں کہ باقی سب کچھ دھندلا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ زندگی کے نئے دور کی شروعات کا پہلا ورق ہے۔

گولی اور گورکھ جے پور، بیکانیر، جودھ پور اور راجستھان کے بہت سے تاریخی مقاموں کی سیر کر کے واپس دہلی لوٹ آئے۔ گورکھ نے پہلی بار ایر کنڈیشنڈ کلاس میں سفر کیا، پہلی بار شاندار ہوٹلوں میں قیام کیا، پہلی بار کسی جیتی جاگتی لیلیٰ کا ایک نظر بھر کے لئے نہیں عمر بھر کے لئے ساتھ ملا۔ اس کے پاؤں زمیں پر نہیں، آسماں پر تھے۔ دو

ہفتے وہ ہواؤں میں پرواز کرتا رہا' لیکن گولی ابھی تک اچھوتی تھی۔ گولی نے گورکھ کو اولاد جلد پیدا نہ کرنے کی تاکید ضرور کی تھی' بازار سے فرنچ لیدر لانے سے تو نہیں روکا تھا۔ ان چند دنوں میں گورکھ پر ایک بات بالکل واضح ہوگئی۔ وہ یہ کہ گولی کی محبت میں کم بے قراری ہوتی ہے۔ گورکھ کے لئے گولی کا ایک لمس ہی ہوش اڑانے کے لئے کافی تھا۔ لیکن گولی کو جیسے عشق کی بے تابیاں پسند نہیں۔ وہ بے قرار ہوتی ہی نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں کہ اسے گورکھ کی قربت پسند نہ تھی' لیکن یوں بھی نہ تھا کہ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔ برابر کی بات تو الگ' گورکھ تو جل کر راکھ ہو جاتا تھا۔ اور دوسری طرف آنچ تک نہیں پہنچتی تھیں۔ گولی نسیم سرد کے جھونکے کی طرح تھی اور گورکھ خاموش آتش فشاں کہسار کی طرح۔ لیکن گورکھ کو اپنی محبت پر پورا بھروسا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پتھر میں بھی چنگاری ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ گولی کے دل میں رفتہ رفتہ محبت کے شعلے ضرور بھڑکا دے گا۔ اسے صبر سے کام لینا ہوگا' جلد بازی سے نہیں۔

رفتہ رفتہ دعوتوں' پارٹیوں اور شادی کی شادمانی کی چہل پہل کم ہونے لگی۔ گورکھ کا تبادلہ دھن باد کے قریب دگواڑی ہوگیا۔ گورکھ کو دہلی کے دور جانا پسند نہ تھا' لیکن اس نے حال میں ہی نوکری بدلی تھی' اس لئے اسے دور جانا ہی تھا۔ گولی اور گورکھ' دونوں کچھ دن کے لئے میرٹھ چلے گئے۔ گولی کے سارے رشتہ دار گورکھ سے عزت سے پیش آئے۔ خوب خاطر تواضع ہوئی۔

ایک روز شام کے وقت سب ایک ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ گولی کی ماں پدما کہنے لگی "شادی کے بعد بہتر یہی ہے کہ لڑکی ساس اور سسر سے دور رہے۔ لڑکے اور لڑکی کو علیحدہ رہنا چاہئے۔ اچھا ہے تمہارا تبادلہ دور دگواڑی ہوگیا۔ لیکن دکھ اس کا ہے کہ گولی ہم سے بھی دور ہو جائے گی۔"

ساس کی یہ بات گورکھ دل کو لگا بیٹھا۔ یعنی پدما چاہتی ہے کہ لڑکی ساس سسر سے دور رہے اور ماں باپ کے قریب؟ وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔ کہنے لگا "شادی کی بنیاد سچائی پر ہونی چاہئے۔ آپ لوگوں نے جھوٹی کنڈلی بنوائی اور ظاہر داری کے لئے چیک دیا' جب کہ کھاتے میں روپیہ موجود نہ تھا۔"

پدما نے گورکھ کی بات کا جواب نہ دیا صرف حیرت سے گورکھ کے چہرے کی طرف تکتی رہی۔ گولی بھی خاموش رہی۔ لیکن گورکھ کی تیکھی بات گولی کو ضرور ناگوار گزری۔ اس کا علم گورکھ کو برسوں بعد ہوا۔

گورکھ اور گولی نے دو مہینے تک راتیں ایک ساتھ گزاریں' لیکن جسے سہاگ رات کہتے ہیں' وہ نہیں آئی۔ بارہا گولی کے ساتھ بستر میں دراز گورکھ سوچتا کہ کالج میں لڑکے صحیح مذاق اڑاتے تھے۔ وہ ہے ہی نامرد۔ اسے یاد آیا کہ بمبئی کی طوائف نے بھی اسے یہی خطاب بخشا تھا۔ اگر یوں ہی دن گزرتے گئے اور یکایک اس کا انتقال ہوگیا تو بیوی کنواری بیوہ بن کر رہ جائے گی۔ اگر تصور اور جلق سے ہی کام لینا تھا تو شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

گورکھ کو یقین ہو چکا تھا کہ گولی کبھی پہل نہ کرے گی۔ وہ تو سرد ہوا کا جھونکا ہے جو ہر عشق کی تپش کو ٹھنڈا کردے گا۔ پہل کرنا مرد کا کام ہے۔ اسے پہلا قدم ہی نہیں، کئی قدم ایک ساتھ اٹھانے پڑیں گے۔ ورنہ کیا ہو گا؟ تین دن اور۔۔۔۔ اس کے بعد وہ دگواڑی چلا جائے گا۔ پھر خدا جانے کتنے مہینے بعد وہ دوبارہ یک جا ہوں۔

صبح کو اٹھتے ہی گورکھ گولی سے کہنے لگا "چلو، مسوری چلتے ہیں۔ قریب ہی ہے۔ نہ جانے پھر کب ادھر آنا ہو۔"

گولی بولی "آج کل اتنی سردی میں مسوری؟ پھر کبھی چلیں گے۔ مسوری کون سی بھاگی جا رہی ہے۔"

تاہم گورکھ کے ضد کرنے پر گولی رضامند ہو گئی۔ اور دونوں مسوری پہنچ گئے۔ سردی کا موسم تھا۔ ہوٹل میں آرام سے جگہ مل گئی۔ گورکھ نے تو ابھی تک اپنی بیوی کو بے لباس بھی نہ دیکھا تھا۔ شام ہوئی تو دونوں سیر کو نکلے پھر کھانا کھایا، رات آئی تو ہوٹل کے کمرے میں گورکھ ایک ایک کر کے گولی کے کپڑے اتارنے لگا۔ گولی شرمائی، لجائی، جھجکتی، 'نہ' 'نہ' کرتی اس کا ساتھ دیتی رہی۔ جب گورکھ اس کے عریاں جسم سے لپٹ گیا تو اس نے سرگوشی کی: "میں آج تمہاری نیت پہچان گئی ہوں۔ مگر مجھے تکلیف مت پہنچانا۔"

مکمل ہم آغوشی کے وقت گولی کی چیخ تو گورکھ کی چیخ سے بھی کم زور تھی۔ وہ چیخ جو گوجرے کے نہال سنگھ نے نکلوائی تھی۔ اگر شب کی دلہن کی مانگ میں سیندور ہے، چہرے پر چاند ہے، بدن میں ستارے ہیں، زلفوں میں کہکشاں ہے، قدموں میں کنول ہیں، سینے میں سورج ہے، بانہوں میں فضائیں ہیں اور رانوں کے درمیان سنبل ہے تو اس بہشت کے دروازے پر ایک پھول گلاب کا کیوں نہیں؟ اس روزن میں ایک بوند سرخ شبنم کیوں نہیں؟ لیکن چند ہی لمحوں میں گورکھ نے اپنے خیالوں کی جڑیں شب کی دلہن کے ہاتھوں میں تھمے آتش کدے کے سپرد کر دیں۔ رنگین دھوئیں کے اڑتے مرغولوں میں اس نے دیکھا کہ گولی کی رگ رگ میں جنت کی نہریں رواں ہیں۔

گورکھ میرٹھ سے دہلی روانہ ہوا۔ گولی میرٹھ میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ تقریباً" دو ماہ کے وصال کے بعد ہجر کی گھڑی دستک دے رہی تھی۔ ہیرالال بس اڈے پر چھوڑنے آئے۔ گولی کو الوداع کہتے ہوئے ہجر کے ابر اور سیاہ ہو گئے۔ بس میں سوار ہوتے وقت گورکھ مشکل سے اپنے آنسوؤں پر قابو پا سکا۔

میرٹھ سے دہلی کا فاصلہ ہے بھی کتنا۔ یہی تین، چار گھنٹے کا سفر ہو گا۔ لیکن گورکھ کے لئے وہ سفر طویل ہوتا چلا گیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے بس میں سوار ہو اور منزل لاپتہ ہو۔ آخر وہ کیوں گولی کو چھوڑے جا رہا ہے؟ کمپنی کے کچھ اور لوگ بھی تو تبادلہ پر جا رہے ہیں اور بیوی بچوں کو بھی ہمراہ لے جا رہے ہیں۔ کیوں اسی کو فکر لگی ہے کہ نئی جگہ پہنچ کر پہلے رہنے کا مناسب انتظام کر لیا جائے؟ پھر رہنے کے لئے مکان تو کمپنی مہیا کر رہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ گولی کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ میرٹھ ہی گولی کی خوشی کا مرکز ہے۔ میرٹھ پہنچتے ہی وہ کیسے کھل اٹھتی ہے۔ اس کے چہرے پر ہنسی اور مسکراہٹ بکھر جاتی ہے مسرت کا یہ رنگ دہلی پہنچتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ شاید ہیرالال اور پدما اسے غلط تعلیم دے رہے ہیں کہ شادی کے بعد لڑکی کو ساس اور سسر سے دور رہنا چاہئے۔ ہیرالال اشاروں میں اس سے بس اڈے پر کیا کہہ رہے تھے؟ یہی کہ نوکری میں کیا رکھا ہے؟ صرف چار سو پانچ سو سے شروعات، پھر ہزار دو ہزار پر ختم۔ اسے دگواڑی جانے کی ضرورت نہیں۔ اسے نوکری کرنے کی ضرورت نہیں۔ کاروبار بہت پھیلا ہوا ہے۔ کتنے وسیع فارم ہیں، جن پر ہر کام مشینوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ ان مشینوں کی ٹھیک طرح دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ سالا راجیندر ابھی نابالغ ہے۔ اتنے بڑے کاروبار کو چلانے کے لئے کوئی اپنا چاہئے۔ کئی ماتحت انہیں دھوکا دے کر روپیہ پیسہ غائب کر کے رخصت ہو چکے ہیں۔ کیا انہوں نے گولی کی شادی اس نے یہی سوچ کر کی ہے کہ وہ کاروبار میں ان کی مدد کرے گا؟ شادی کی شادی، لڑکی گھر کی گھر میں اور کاروبار میں اضافہ۔ اسی لئے گولی کو غلط کنڈلی بنوا کر اس کے باپ کو بھیج دی گئی کہ کہیں جیوتشی ہی بیچ کی دیوار نہ ثابت ہو جائے۔ وہ لڑکی کی شادی کر رہے تھے یا تجارت کر رہے تھے؟

یکایک گورکھ کے ذہن میں گھنشو مل کی یاد تازہ ہو اٹھی۔ گھنشو مل اور ہیرالال میں کیا فرق ہے؟ دونوں کاروباری آدمی ہیں۔ ایک کے چنگل سے وہ بچ نکلا تو دوسرے کے چنگل میں جا پھنسا۔ گھنشو مل تو دو لمحوں میں ہی گورکھ کو پہچان گیا تھا، ہیرالال بھی آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا کہ گورکھ کس مٹی کا بنا ہے، اس کے لئے پیسے کی کیا

قیمت ہے' وہ کتنا آزاد طبع شخص ہے۔ کیا کسی نے مچلتی لہروں کو باندھا ہے جو ہیرالال اسے کوئی لالچ دے کر باندھ لے گا؟ کیا کسی نے ہواؤں پر پل قائم کیے ہیں؟" گورکھ آزاد ہے۔ پیدائشی فقیر۔ دنیا کی ہوس سے دور۔ غربت پسند۔ قوت بازو پر بھروسا رکھنے والا۔ جو اپنی محنت سے ملے' اس پر صبر کرنے والا۔ غیروں کے ماتحت وہ مزدوری کر سکتا ہے' اپنوں کے سائے تلے اسے بادشاہت بھی منظور نہیں۔ وہ گولی کو سمجھا دے گا کہ اس نے جس شخص کے ساتھ شادی کی ہے' اس کی آمدنی میں گزر بسر کرنا سیکھے اور میرٹھ سے جذباتی ناطہ توڑ لے۔ بھول جائے کہ وہ کسی رئیس کی بیٹی ہے' جس کا بلاؤز سلنے کے لئے خاص درزی' گہنے بنانے کے لئے خاص سنار' کھانا پکانے کے لئے خاص رسوئیے اس کی خدمت میں کھڑے رہتے ہیں۔

گورکھ ان ہی خیالوں میں ڈوبا بس کی سیٹ پر اونگھ رہا تھا کہ گولی کی یاد آتے ہی یکایک سب کچھ بھول گیا۔ ہائے وہ گولی کے ساتھ گزارے ہوئے دو ماہ! ابھی تک زندگی کتنی ادھوری تھی۔ گولی کی قربت میں تاریک فضاؤں میں بھی رنگ ہی رنگ نظر آتے ہیں۔ چائے وہی چائے ہوتی ہے اور سموسہ وہی سموسہ' لیکن جب گولی ساتھ ہوتی ہے تو اس کے پیالے سے چائے پینے میں جو نشہ ہوتا ہے' اس کا کھایا ہوا سموسہ کھانے سے جو لذت ملتی ہے' اس کی جھوٹی انگلیاں چوسنے سے دل جس طرح بے اختیار ہوتا ہے اور اس کے بوسوں سے جو سرور حاصل ہوتا ہے' اس کے لئے تو جان کا نذرانہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ دو مہینوں پر ساری زندگی قربان۔ ایک نہیں' ہزار زندگیاں قربان۔ اس پری رخ کے بغیر گھڑیاں کتنی طویل گزریں گی۔ اسی طرح جیسے یہ بس کا سفر۔ رات دن دل کی ایک فریاد رہے گی : "ہائے کیوں گولی کو میرٹھ چھوڑ آیا ہے۔" وہ اگر ضد پکڑ لیتا تو گولی ضرور اس کے ساتھ چل پڑتی۔ اس نے کہا بھی تو اصرار کے ساتھ نہ کہا۔ اگر وہ ایک نامانوس ماحول میں گزر بسر کر سکتا ہے تو اس کی بیوی بھی کر سکتی ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ اگر گولی کے دل میں بھی ہجر کی ویسی ہی آگ ہوتی' جیسے اس کے دل میں جل رہی ہے تو کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

یکایک گورکھ نے دیکھا کہ بس کی کھڑکی کے دھندلے شیشے پر گولی کی تصویر سی کھنچی چلی آئی ہے۔ پہلے تو نقوش مبہم سے لگے' غور سے دیکھا تو ہو بہو گولی کی شکل نکلی۔ جیسے گولی کہہ رہی ہو : "میں دور کہاں ہوں۔ میں تو ہر دم تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے دل میں ہوں' جب بھی مجھے یاد کرو گے' اپنے قریب ہی پاؤ گے۔ میں تم سے جدا ہو کر جاؤں گی تو آخر کہاں جاؤں گی؟"

گورکھ نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی تو گولی کا سایہ اس کے اور قریب سرک آیا۔ اچانک ڈرائیور نے بریک پر پاؤں مارا تو گورکھ کا سر کھڑکی سے ٹکرایا۔ دلی قریب آگئی تھی۔ گورکھ نے اسکوٹر رکشا پکڑا گھر پہنچا۔ ابھی وہ سامان اٹھا کر ٹھیک طرح گھر میں داخل بھی نہ ہوا تھا کہ گوپال داس پوچھنے لگے۔

"گولی کو پھر میرٹھ چھوڑ آئے؟"

گورکھ "وہ وہیں رہنا چاہتی تھی۔" گورکھ نے دبی آواز میں جواب دیا۔ میں تو تبادلے پر جا رہا ہوں۔ رہنے کا انتظام ہو جائے تو اسے وہاں بلا لوں گا۔"

گوپال داس بولے "گولی اس درمیان ہمارے پاس بھی تو رہ سکتی ہے۔ آخر وہ اس گھر کی بہو ہے۔ کیا یہاں اس کا دل نہیں لگتا؟"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شاید اس کا میرٹھ میں زیادہ جی لگتا ہے۔" گورکھ نے کہا۔

گوپال داس اسے سمجھانے لگے : "لیکن اب وہ تمہاری بیوی ہے۔ تمہیں اسے قابو میں رکھنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ وہ آئے دن میکے میں پڑی رہے۔"

گورکھ چپ چاپ سنتا رہا۔ اسے گولی کی جدائی بہت ستا رہی تھی۔ دل بھرا ہوا تھا۔ ڈر تھا کہ ماں باپ کے سامنے ہی آنسو آنکھوں سے رواں نہ ہو جائیں۔ دراصل وہ اس بات کے حق میں نہ تھا کہ کسی کو زور زبردستی سے اپنا بنایا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس کی محبت سچی ہے تو گولی خود بخود کھنچی چلی آئے گی' اپنے آپ میرٹھ کو بھول جائے گی۔ گورکھ نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے والدین اور وہ خود بھی احتیاط کے بغیر گفتگو کرتے رہے ہیں۔ اس کے برعکس گولی کے والدین اور رشتہ دار کتنے تہذیب یافتہ ہیں۔ کبھی کوئی ناگوار بات زبان پر نہیں لاتے۔ کسی کے دل میں کیا ہے' کون جان سکتا ہے؟ اس نے گولی کی ماں کو ایک ناگوار حقیقت جتا کر خواہ مخواہ ناراض کیا۔ جو کچھ بھی ہوا' اس کا علم تو سب ہی کو ہے۔ اسے دہرانے سے فائدہ؟

شام آئی' رات ہوئی۔ گورکھ خاموش اور اداس نظر آ رہا تھا۔ ساوتری اور گوپال داس اس سے پوچھنے لگے۔ "کیا بات ہے' تم اتنے چپ چاپ کیوں ہو؟ گورکھ زبردستی مسکرا کر بولا "کوئی خاص بات نہیں۔ بس یوں ہی۔"

ساوتری نے چھیڑا : "بیوی کی یاد آ رہی ہے؟ ابھی دو مہینے بھی نہیں ہوئے اور ابھی سے یہ حال۔ آگے کیا ہوگا؟"

گورکھ ماں کے اس مذاق کے لئے قطعی تیار نہ تھا۔ اسے ماں کی ایسی بے تکی باتیں کبھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔ لیکن وہ چپ رہا اور اس بے تکے مذاق پر اپنی برہمی کو پی گیا۔

گوپال داس بولے "کوئی بات تو ضرور ہے جو تم چھپا رہے ہو۔ میں نے ہیرالال کا دس ہزار کا چیک بینک میں بھیجا تھا' وہ تو واپس آ گیا۔ کتنی شرم کی بات ہے!"

گورکھ نے تحمل سے کہا "میں نے اس معاملے میں آپ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ گولی نے پہلے دن ہی سچائی مجھے بتا دی تھی۔ اور پھر چیک گولی کے نام ہے' وہ رقم اس کی ملکیت ہے' آپ کی نہیں۔"

گوپال داس بھڑک اٹھے۔ "واہ رے جورو کے غلام! کمال ہے تیری عقل پر۔ مانا کہ تیری شادی کرتے

وقت مجھے کوئی لالچ نہ تھا، لیکن جو کچھ بھی ہیرالال نے کیا، وہ غلط ہے۔ یہ شرافت کا تقاضا نہ تھا۔"

گورکھ کی خاموشی کی بدولت بات آگے نہ بڑھی۔ اس کا دل اور دماغ قابو میں نہ تھے۔ اسے رہ رہ کر گوپی کی یاد ستا رہی تھی۔ وہ لحہ بہ لحہ بدحواس ہو رہا تھا۔ جب سے وہ میرٹھ سے چلا تھا، اس کی بے چینی بڑھتی ہی گئی تھی۔ یہاں تک کہ اسے سانس لینے میں بھی تکلیف محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے چیک کی، ہیرالال کی، گوپال داس کی، ان کے جذبات کی، کسی کی فکر نہ تھی۔ وہ تو صرف گوپی سے نزدیکی چاہتا تھا اور اس کے ہجر میں اس کی بے کلی میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے چند لمحے بعد کہا جو میری قسمت میں تھا مجھے مل گیا۔ میرے دماغ میں چیک کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ گوپی سے زیادہ اچھی لڑکی مجھے مل ہی نہیں سکتی تھی۔ وہی میری قسمت ہے، مقدر ہے، نصیب ہے۔ اس کے باپ نے جو بھی ناروا حرکتیں اور باتیں کی ہیں، مجھے ان کا کوئی گلہ نہیں۔"

ساوتری نے پھر تازیانہ لگایا "تو اپنی گوپی پر ایسا فدا ہوا جیسے باقی سب کچھ تیرے دل سے نکل گیا ہو! کمال ہے!"

گورکھ سوچنے لگا کہ ماں اگر زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تو نہ سہی، لیکن اسے تو بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ اس کے برعکس گوپی کی ماں بھی کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں، مگر ہر بات کیسے شیریں انداز سے کہتی ہے۔

گوپال داس پوچھنے لگے : "پھر سے تو کہو، کیا کہا تم نے؟ ہیرالال نے اور کون سا ناروا کام کیا؟"

"کچھ نہیں۔" گورکھ بدبدایا۔

"تمہیں ابھی سے ماں باپ سے حقیقت چھپانے کی ضرورت پڑنے لگی؟" گوپال داس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

گورکھ نے بے دھیانی میں جنم کنڈلی والی بات باپ کے سامنے اگل دی۔ پھر ایک دم اسے گوپی سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ تمتماتے ہوئے اس کے احساس نے چانٹے ہی چانٹے اس کے رخسار پر رسید کیے۔ "یہ تو نے کیا کیا؟ گوپی نے کیا ہوا عہد توڑ ڈالا! لعنت ہے تیری عقل پر! اب گوپی کو کیا جواب دے گا؟ اس نے تجھ پر اعتماد کر کے تجھ پر ایک حقیقت ظاہر کی۔ اس کے لہجہ میں کتنی ایمان داری تھی۔ اسے کوئی جھجک، کوئی شرم نہ تھی۔ اسے کیا ضرورت تھی یہ راز ظاہر کرنے کی؟ تو نے والدین کے جھگڑے میں گوپی کے یقین کو مٹی میں ملا دیا۔ اب وہ خاک تجھے اپنا سمجھے گی؟ کبھی امید بھی نہ کرنا۔ تم رازداری کے قابل ہی نہیں۔ تم نے شادی شدہ زندگی کا پہلا زریں اصول خاک میں ملا دیا۔ سنبھل کے گفتگو کرنے کی بات سوچتے سوچتے الجھنوں کے شکار ہو گئے اور اس بات پر، جس کا تمہاری اپنی زندگی سے تعلق ہی نہ تھا، پردہ ڈالنے کی بجائے یوں پردہ فاش کر دیا۔ زبان سے تو کہتے ہو کہ گوپی جیسی نازنین تمہیں نہیں مل سکتی۔ یہ بھی کہتے ہو کہ وہ خدا کا بیش بہا عطیہ ہے۔ یہ بھی کہتے ہو کہ سارے جہاں میں اس جیسا کوئی نہیں۔ لیکن اپنی زبان قابو میں نہیں رکھ سکتے! اب گوپی کے نام کی تمام عمر مالا جپنے سے بھی یہ جرم نہ دھلے گا۔ تم نے اسے دھوکا دیا۔ تم گناہ گار ہو۔ محبت کی پہلی سیڑھی بھی نہ چڑھنے پائے کہ زینہ ہی

کھسک گیا!"

چند لمحوں کے لئے گوپال داس اور گورکھ دونوں خاموش رہے۔ گورکھ اپنے خیالوں میں گم گوپال داس اور ساوتری اپنے خیالوں میں یکایک گوپال داس بہت افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگے "یہ تو غضب ہو گیا! میرا یقین ہی خاک میں مل گیا۔"

گورکھ جھجکتے ہوئے بولا "میں جنم پتری پر یقین ہی نہیں کرتا۔ آپ نے گنو کی شادی جنم پتری ملا کر کی تھی' اس کا حشر دیکھ لیا۔ یہ پتری ملانا صرف دل بہلاوا ہے۔ میں گولی سے بہت خوش ہوں۔ میں نے آپ سے کہہ تو دیا کہ اس معاملے کو یہیں ختم کردیں۔"

"نہیں' میں ایسا نہیں کر سکتا" گوپال داس نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "میں ہیرالال کو ضرور بلاؤں گا اور اس سے بات کروں گا۔ سوال یہ نہیں کہ کنڈلی ملانا ٹھیک ہے یا نہیں' سوال یہ ہے کہ کسی کے یقین کو کیوں جھٹلایا جائے؟ شادی جیسی پاک رسم جھوٹ کی بنیاد پر کیوں رکھی جائے؟"

رات بھر گورکھ کو نیند نہ آئی۔ اس نے گولی کے ساتھ غداری کی تھی۔ اور غدار کی سزا یہی ہے کہ غدار کا دل اور دماغ نکال لئے جائیں۔ وہ بستر میں دراز دیکھتا رہا کہ کسی نے پستول سے گولی مار کر اس کے دل اور دماغ کا ایک حصہ باہر نکال لیا ہے۔ خون سے لت پت اس حصے پر جگہ جگہ "گولی گولی" لکھا ہے۔ نکالنے والے نے ایک تیز چاقو سے ایک حصہ کئی حصوں میں تقسیم کردیا' لیکن "گولی" کا لفظ ہر حصے پر موجود ہے۔ کاٹنے والا جتنے بھی مہین ٹکڑے کرتا جاتا ہے "گولی گولی" کے الفاظ بھی اتنے ہی مہین اور خوب صورت بناوٹ اختیار کر لیتے ہیں۔ ٹکڑے اس قدر نفیس ہوتے جاتے ہیں کہ سرخ ذرے رات کے اندھیرے میں فروزاں ہیں۔ کمرے کی ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک' فرش سے لے کر چھت تک' سرخ ذرے ناچتے' اچھلتے' تیز رفتار سے چلتے چلے جا رہے ہیں۔ یکایک تمام ذرے مل کر گولی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہ شکل گورکھ کے دل اور دماغ میں پیوست ہو جاتی ہے۔

رات کے خوابوں میں گم گورکھ اپنا مختصر سامان اٹھا کر دگواڑی کے لئے روانہ ہو گیا۔ ٹرین کے ڈبے میں ایک دوست مل گیا' جو اسی کمپنی میں ملازم تھا اور بیوی بچوں کے ساتھ دگواڑی جا رہا تھا۔ دگواڑی پہنچتے ہی دو دن میں کمپنی کی جانب سے رہنے کا مکان الاٹ ہو گیا۔ گورکھ کو پچھتاوا ہونے لگا کہ گولی کو کیوں ساتھ نہ لایا۔ ایک کمرے میں اس نے زمین پر اپنا بستر لگا لیا' جیسے وہ اب بھی ریل کے ڈبے میں سفر کر رہا ہو۔ کہاں دلی اور کہاں دگواڑی۔ چاروں طرف کوئلے کی کانیں اور دھواں دھواں ماحول۔ شام کو جھنڈ کے جھنڈ مچھر۔ گورکھ نے ایک مچھر دانی خریدی اور اسے دیواروں میں میخیں گاڑ کر بستر پر لٹکا دیا۔

آفس کا کام ختم ہوا تو کلب میں یا ہوٹل میں کھانا کھایا' رم پی' بیڈ منٹن کھیلی' دیر سے گھر پہنچے' مچھر دانی اٹھائی اور سو گئے۔ یہی گورکھ کا معمول ہو گیا۔ مچھر رات بھر راگ الاپتے رہتے اور کسی نہ کسی روزن سے مچھر دانی میں گھس جاتے۔ خوابوں میں مچھر کے ڈنک مارنے کی جگہ کوئی ایک نہ تھی اور نہ گہری نیند کے لئے ساز گار تھی۔ چنانچہ گورکھ رات میں دو تین بار اٹھ کر مچھر دانی کی دیوار سے چپکے مچھروں کا صفایا کرتا اور ان کی سرخ نشانی باقی رہ جاتی۔ گورکھ کو خیال آتا کہ جیسی بے سرو سامانی کی زندگی وہ جی رہا تھا گولی کے لئے اس طرح رہنا ممکن نہ ہو گا۔ اس لئے گولی کے آنے سے پہلے اس کو ضروری سامان کا بندوبست کر لینا چاہیے۔ اس نے بڑھئی کی دکان سے ایک لکڑی کی میز خریدی۔ ایک صوفہ چند کرسیاں اور آئینہ دار الماری ماہانہ کرائے پر لے آیا۔ اب اس کے نقطۂ نظر سے گھر رہنے کے لائق ہو گیا اور وہ چھٹی لے کر میرٹھ جانے کا پروگرام بنانے لگا۔ جلد ہی اس کی مراد پوری ہوئی۔ کمپنی کے کام کی وجہ سے کچھ روز کے لئے اسے دہلی جانا پڑا۔ گولی سازو سامان کے ساتھ میرٹھ سے دہلی آ گئی۔ نئی قمیض' ساڑیاں اور لباس۔ گھی کا کنستر' باسمتی چاول' پسے ہوئے مسالے' دار چینی' دھنیا' لونگ' زیرہ' ہلدی' چادریں' لحاف' تکئے' میز پوش۔ خاص قسم کی مٹھائی۔ پستے کی برفی' گاجر' کا حلوا بیسن کے لڈو' جو گولی کی ماں نے تیار کئے تھے۔ اتنا سامان دیکھ کر گورکھ گھبرا گیا۔ گولی کے پرس کی طرف نظر گئی تو وہ بھی نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ یکایک گورکھ کو اپنی حیثیت بہت کم زور اور حقیر محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا گولی کو اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی تمام خواہشیں اور ضرورتیں تو اس کے والدین پوری کرتے رہیں گے۔ اس نے جو قسم کھائی ہے کہ سسرال کی کوئی چیز قبول نہیں کرے گا' تو کیا وہ گولی سے کہے کہ سارا سامان واپس کر دے؟ اتنی لذیذ مٹھائی سے بھی محروم رہے؟ یہی سوچتے سوچتے' اس نے برفی کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لیا۔ واقعی بہت لذیذ تھا۔ دیکھتے دیکھتے ذائقہ کی ہوس برفی کے کافی ٹکڑے نگل گئی۔

اتنی مٹھائی ایک ہی وقت میں کھاتے دیکھ کر گولی نے کہا "صبر سے کھایئے۔ پیٹ خراب ہو جائے گا۔ یہ آپ کے لئے ہی خاص طور سے تیار کی گئی ہے۔"

بچپن کی وہ پابندیاں کہاں ہوا ہوئیں؟ پہلے تو یہ حال تھا کہ کیا مجال جو بے وقت خوراک کا ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے اترے۔ کہاں وہ ہری گھاس' پتوں سے آدھا پیٹ بھرنے کا تجربہ اور کہاں پستے کی برفی سیر ہو کر کھانے کے مزے؟ کیا یہ بچپن کی پابندیوں کا نتیجہ تھا کہ لذت کا چسکا باغی اور بے لگام ہو گیا۔ اب تو اسے جو پسند آتا' وہ دل کھول کر کھاتا' بے وقت کھاتا اور اتنی مقدار میں کھاتا کہ دیکھنے والا دانتوں تلے انگلی دبا لیتا۔ کہتے ہیں کہ اونٹ ایک بار میں اتنا زیادہ پانی پی لیتا ہے کہ پھر کئی دن تک اسے پانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کھانے کے معاملے میں گورکھ کا یہی حال ہو گیا تھا۔ ایک دن کھا لیا اور دو دن فاقہ۔ فاقوں کا تو دیکھنے والوں کو پتہ نہ چلتا' لیکن ایک نشست میں اسے چار بوتل بیئر اور دو مرغ مسلم ہضم کرتے دیکھ وہ ضرور حسد یا رشک یا تعجب کرتے۔ مقدار

کے علاوہ گلے سے نکلنے کی رفتار میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ کھا رہا ہے کہ پی رہا ہے۔ یعنی دانتوں کو تکلیف دینا اسے گوارا نہ تھا۔ گولی کے کھانے کی رفتار اور مقدار دونوں ہی کم تھیں۔ گورکھ نے خود بھی سوچا کہ گولے نے کچھ کہا تو نہیں لیکن وہ اس کے کھانے کا طور دیکھ کر اسے جاہل ضرور سمجھنے لگی ہوگی۔ کاش وہ گولی کی انگلیاں چوسنے کی بجائے کھانے کی رفتار کم کر دیتا!

جہیز میں ملا سامان ہوشیاری سے باندھ کر اور گولی کو ساتھ لے کر گورکھ دگواڑی روانہ ہوا۔ کہاں تنہا سفر اور کہاں گولی کی رفاقت۔ ریل کے ڈبے میں نہ چہل پہل تھی' نہ مسافر تھے' نہ گرمی تھی' نہ بھیڑ تھی' نہ صبح تھی' نہ شام تھی' صرف گولی تھی۔ پہلے بھی وہ اپنے اجڈ ہونے کے کئی نمونے پیش کر چکا تھا' سفر کے دوران کچھ اور کارنامے کر گزرا۔ چائے پینے لگا تو چائے کی پیالی پلیٹ میں الٹ دی۔ کچھ گرم چائے پتلون پر آگری تو اسے قمیض کے پلو سے سکھا کر چائے کی چسکیاں بھرنے لگا۔ گلے سے اس طرح کی آواز نکلنے لگی جیسے کوئی سور تالاب سے پانی پی رہا ہو۔

آخر گولی سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگی "آپ چائے پیالی میں پیا کریں۔ پلیٹ میں انڈیل کر پینا اچھا نہیں لگتا۔ اور چسکیاں لیتے ہوئے گلے سے طرح طرح کی آوازیں نکالنا بند کر دیں۔"

گورکھ نے صفائی پیش کی: "چائے پلیٹ میں ڈالنے سے جلد ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور جلد حلق سے نیچے اتر جاتی ہے۔ بمبئی میں تو سب لوگ پلیٹ میں چائے انڈیل کر پیتے ہیں۔ میں کچھ عرصہ بمبئی رہ آیا ہوں' اس کا اثر ہوگا۔ خیر' یہ عادت بدل لوں گا۔" دراصل گورکھ کو کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ کس بھونڈے انداز سے چائے پیتا آیا ہے۔

ابھی چائے کا حادثہ تازہ تھا کہ گورکھ پلیٹ فارم کے اسٹال سے چند رسالے اور ایک ناول خرید لایا۔ گولی رسالوں کے اوراق پلٹنے لگی اور گورکھ ناول پڑھنے لگا۔ چند ورق پڑھنے کے بعد وہ انہیں جلد سے پھاڑ کر کھڑکی کے باہر ہوا میں اڑا دیتا۔ گولی حیران نگاہوں سے خاموش دیکھتی رہی۔ آخر خاموشی توڑتے ہوئے بولی۔ "آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ میں بھی بعد میں یہ ناول پڑھ لیتی۔"

"یہ ناول پڑھنے لائق ہے ہی نہیں۔" گورکھ کہنے کو تو کہہ گیا' لیکن پھر سوچنے لگا کہ یہ فیصلہ گولی کو کرنا چاہئے کہ ناول اس کے لئے پڑھنے لائق ہے کہ نہیں۔ آج تک وہ اسی طریقے سے ناول پڑھتا آیا تھا۔ کوئی کوئی ناول ہی محفوظ رکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ باقی تو بس وقت گزاری کے لئے پڑھ لئے' خاص طور سے سفر کے دوران' اور پھر ہوا میں اڑا دیئے۔ پورا ناول پڑھنے کے بعد پھینکنے کی بجائے بیچ بیچ میں اوراق پھینک دیئے۔ لیکن کسی ہم سفر کے سامنے یہ حرکت کتنی بے ہودہ ہے' اس کا اندازہ گورکھ کو گولی کے توجہ دلانے پر ہوا۔

شام گزری۔ رات آئی۔ گورکھ اور گولی فرسٹ کلاس کے ڈبے میں تنہا رہ گئے۔ گورکھ اپنی سیٹ چھوڑ کر

گوپی کے ساتھ دراز ہو گیا۔ ریل گاڑی کا تنہا ڈبا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر سرکتے تیز رفتار عکس۔ لوہے کے پسلیوں کی گڑگراہٹ۔ تنگ سیٹ۔ دھیمے دھیمے ہچکولے' جیسے ریل کا انجن دو عاشقوں کو محبت کے پالنے میں جھلا رہا ہو۔ گورکھ رومانس میں کھو گیا۔ لیکن گوپی کا دل کہیں اور تھا۔ شاید میرٹھ میں' یا دہلی میں' یا گورکھ کے اجڈ رویہ کی جھلک میں یا پھر وہ صرف تھکن کا شکار تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو' گورکھ کو گوپی میں اسی پہلے رات کی خنکی کا سا احساس ہوا جس میں وہ محبت کی ایک چنگاری بھی نہ سلگا سکا۔ نہ وہ اقرار تھا' نہ انکار۔ گوپی نے اس کی محبت کا بے دلی سے ساتھ دیا۔ گورکھ سوچنے لگا کہ شادی کے بعد دو مہینے تک ضبط رکھنے والا دل آج کیوں بے قابو ہو گیا؟ اسے گوپی کی مکمل مرضی کے خلاف کبھی اس کے نزدیک نہیں آنا چاہئے۔ محبت کے شعلے ایک دائرے سے آگے نہیں بڑھنے چاہئیں۔ خواہ وہ شعلے اسے زندہ جلا دیں' ان کی آنچ گوپی کے خشک جسم کو نہ لگنی چاہئے۔ محبت کے طوفان دل کے کوزے میں سمیٹ لینا چاہئے۔ مگر چاہئے تو بہت کچھ' لیکن کیا وہ سب عمل میں آسکتا ہے؟ کیا محبت کو پوٹلی میں باندھ کر قید کیا جا سکتا ہے؟ راحت وصل کس مقام پر پہنچ کر وحشت وصل میں بدلتی ہے؟ کون سی لکیر' کون سی دیوار اس کی حد بندی کرتی ہے؟

دیر تک گورکھ خیالات کے ریلے میں بہتا رہا۔ کیا ستم ہے کہ محبوب سامنے ہو اور پھر بھی فقط تصوراتی محبت سے کام لیا جائے؟ محبت کیا محض ضبط کا دوسرا نام ہے؟ اگر ایک فریق گوپی کی طرح سرد ہو اور دوسرا اس کی طرح گرم ہو تو کیا دونوں طرف پیش قدمی واجب نہیں؟" اس نے تو ہجر کا ایک ایک پل ایک ایک برس کی طرح کاٹا ہے کتنی بار تصور سے کام لیا ہے کتنی مشکل سے حواس قابو میں رکھے ہیں۔ اور آج اس جذبہ صادق کو احساس گناہ ڈس رہا ہے۔ کیوں وہ محبت زبردستی گوپی کے سر تھوپ رہا ہے۔ کوئی چیز کتنی ہی خوب صورت کیوں نہ ہو۔ ضرورت مند کو ہی دی جاتی ہے۔ "دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر!"

دگواڑی پہنچ گھر میں داخل ہوتے ہی گورکھ نے گوپی سے کہا۔ "یہ تمہارا چھوٹا سا گھر ہے۔ اس میں وہ آرام تو نہیں جو میرٹھ میں ہے' لیکن کمی پوری کرنے کے لئے میں جو ہوں۔ میں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔"

گورکھ نے سارا سامان کھول کر قرینے سے لگا دیا۔ جہیز میں ملی ہوئی ہر چیز خوب صورت تھی۔ کچھ دن میں سامان میں مزید اضافہ کر لیا گیا۔ گھر سے آفس کی دوری زیادہ نہ تھی۔ گورکھ سائیکل پر سوار ہو کر آفس پہنچتا۔ روز مرہ کی ضرورت کا سامان خریدنے کے لئے بھی سائیکل کار آمد ثابت ہوئی۔ گھر کی سجاوٹ دیکھ کر گورکھ خوش بھی ہوتا اور بے چین بھی کہ اب وہ گرہستی والا بن گیا ہے' اس لئے سازو سامان سے نفرت نہیں کر سکتا' اس کی طرف سے مونہہ نہیں پھیر سکتا۔ کتنے خوب صورت ہیں جہیز میں ملے ہوئے لکڑی کے پلنگ۔ کتنے نرم اور آرام

وہ ہیں بستر، تکئے چادریں اور مخملی لحاف۔ ایک طرف گولی کا مخملی جسم، اوپر سے مخملی رضائی۔ نیچے آرام دہ گدے۔ اسے اور کیا چاہئے؟ پھر بھی گورکھ کو احساس رہتا کہ گولی کو ہمیشہ کچھ اور چاہئے۔ جیسے کھانا کھانے کے لئے میز تو ہے، لیکن کرسیاں نہیں۔ ایک لکڑی کی پٹی میز کے سامنے رکھ لی گئی ہے، جس پر بیٹھ کر کھانا بھی کھالیا جاتا ہے، گورکھ اسی پٹی پر بیٹھ کر دوستوں کے بگڑے ریڈیو اور بجلی کا سامان بھی درست کر دیتا ہے اور پڑھ بھی لیتا ہے۔ گولی کبھی زبان سے شکایت نہ کرتی، لیکن گورکھ کو احساس رہتا کہ گولی کو کمی محسوس ہو رہی ہے۔ تنخواہ ملتی تو وہ کبھی گولی کو ایک پیسہ بھی نہ دیتا۔ بیوی کی ہر ضرورت جہاں تک ممکن ہو، شوہر کو پوری کرنی چاہئے اور گورکھ دل و جان سے یہی کرتا۔ کبھی یہ نہ سوچتا کہ گھر کا انتظام بھی بیوی کے سپرد ہونا چاہئے۔ جس ڈھنگ سے گورکھ نے گولی کو میرٹھ میں روپیہ خرچ کرتے دیکھا تھا، اس حساب سے تو اس کی کمائی دو دن میں ہی اڑ جائے گی۔ اگرچہ گولی نے کبھی کسی چیز کی مانگ نہ کی، لیکن گورکھ اسی وہم میں مبتلا رہا کہ گولی گھر کا خرچ نہیں چلا سکتی۔ آخر گولی کو اس کی ضرورت کیوں محسوس ہو؟ اس کے والدین تو میرٹھ سے پارسل کے ذریعہ بھی ضروریات کی چیزیں بھیجتے رہتے ہیں۔ گورکھ کے دل میں گولی کے والدین کے خلاف ایک جنگ سی چھڑ گئی۔ کاش وہ اتنا ہی امیر ہوتا جتنا گولی کے والدین، تو گولی کو وہ سب چیزیں اور آرام مہیا کرتا جو اس کے والدین فراہم کرتے رہے ہیں۔ پھر گولی کا یہ حال نہ ہوتا جو اب ہے۔ اب تو وہ ہروقت میرٹھ میں ہی رہتی ہے۔ اس کا جسم صرف یہاں ہے، دل میرٹھ میں ہے۔ اسی لئے وہ اتنی سرد ہے۔

ایک دن گولی کہنے لگی "میرے پتاجی کو سارا شہر جانتا ہے۔ وہ شہر کے رئیس اور گنی چنی ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی عزت میں چار چاند اس لئے بھی لگے ہوئے ہیں کہ وہ سب کی مدد کرتے رہتے ہیں۔"

گورکھ بولا" ہر کاروباری انسان کو ایسا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ شہر کے چیدہ چیدہ لوگوں کو مٹھی میں نہ رکھیں تو کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں کسی کو مٹھائی، کسی کو گھی اور کسی کو اناج۔ بطور تحفہ بانٹنا پڑتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہ کیا جائے تو کاروبار میں مشکلات آسکتی ہیں۔ تم خود مانتی ہو کہ کئی بار انہیں لوگوں کی مانگیں مجبوراً" پوری کرنی پڑتی ہیں۔"

گورکھ نے محسوس کیا کہ گولی نے کبھی اس کی بلند خیالات اور اعلیٰ اصولوں کی تعریف نہیں کی۔ تعریف تو بہت دور کی بات ہے، کبھی کسی بات پر دو لفظ شاباشی کے بھی مونہہ سے نہ نکالے۔ گورکھ کی اجڈ حرکتیں اور ظاہری اکھڑپن اس کے دلی معصومیت پر ابر کی طرح طاری ہوگیا۔

گولی کے لئے سب سے بڑی بات تھی مونہہ سے نکلے ہوئے الفاظ۔ ان کا اس پر فوری اثر ہوتا اور گورکھ کی زبان تھی کہ کبھی قابو میں نہ رہتی۔ گولی کے ماں باپ کا ذکر آنے پر کچھ نہ کچھ جھگڑا ضرور کھڑا ہو جاتا۔ ایک مرتبہ بات زیادہ بڑھ گئی تو گولی نے سات دن تک اس سے ڈھنگ سے بات نہ کی۔ ایسے موقع پر گورکھ آنکھوں میں

آنسو بھر کر گولی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا' اس سے معافیاں مانگ لیتا۔ لیکن گولی کا دل کبھی نہ پسیجتا۔ نہ اس نے کبھی گورکھ کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ اس کے دل میں جھانکا۔ ہر جھگڑے کے بعد گورکھ خود کو ہی گناہ گار سمجھتا۔ کیا فائدہ اس تکرار سے؟ کیا فائدہ اس کھنچاؤ سے؟ جتنا وہ گولی کو اپنی طرف کھینچتا ہے' اتنی ہی وہ اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا دل ٹوٹتا۔ وہ محسوس کرتا کہ اس کا دماغی تناؤ اور بڑھتا جا رہا ہے۔ اور اس تناؤ میں وہ زبان سے پھر کوئی نہ کوئی ناگوار بات کہہ بیٹھتا۔ بار بار قسم کھاتا کہ وہ زبان کو قابو میں رکھے گا' لیکن گولی کے والدین کی بات شروع ہوتی اور اشکوں میں ڈوب جاتی۔

رفتہ رفتہ گورکھ کو گولی کے والدین سے ایک قسم کا حسد ہونے لگا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ان ہی کی وجہ سے گولی کبھی اس کی نہ ہو سکے گی۔ اس کا ایک اور رد عمل یہ ہوا کہ وہ اپنے والدین کی جائز اور ناجائز' دونوں طرح کی باتوں کو ٹھیک ثابت کرنے کے لئے بحث کرنے لگا۔ جب گولی اپنے والدین کو اس قدر سر پر اٹھاتی ہے تو وہ کیوں پیچھے رہے؟

ان دنوں گولی کا دل گورکھ سے اس قدر خفا ہوا ہو گا یا اس طرح ٹوٹا ہو گا کہ زندگی بھر نہ جڑ سکا۔ اس بات کا گورکھ کو نہ کوئی علم ہوا اور نہ ہی احساس۔ وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ گولی صرف اس کی ہے اور جو کچھ وہ کر رہا ہے' اسے پوری طرح اپنا بنانے کے لئے کر رہا ہے۔ بارہا وہ گولی سے کہتا : "تم یقین مانو' مجھے تمہارے ماں باپ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ دراصل مجھے تو کسی سے بھی شکایت نہیں۔" گورکھ یہ بات صرف کہنے کے لئے نہ کہتا' وہ دل سے محسوس کرتا کہ کسی سے بھی شکایت کرنا نادانی ہے۔ اپنے دل کو ٹٹولتا تو اسے گولی پر ناز ہوتا۔ محبوب کی اگر پرچھائیں بھی نصیب ہو تو اسی میں خوش رہنا چاہئے۔ کبھی نہ کبھی تو وہ اس کی مکمل محبت پا لے گا۔ کبھی نہ کبھی تو اس کا دل جیت لے گا۔ پھر گولی کے دل میں بھی ایسی ہی آگ سلگے گی جیسی اسے پل پل بے چین رکھتی ہے۔ وہ آفس میں سارے دن گولی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ بار بار گھڑی پر نظر جاتی کہ سوئیاں کتنی آہستہ چل رہی ہیں۔ کتنی ہی بار آفس سے کسی نہ کسی بہانے بھاگ کر وہ گھر جلد پہنچا۔ اسے گولی کے والدین سے کیا اور کیوں شکایت ہو؟ آخر وہ کچھ نہ کچھ دیتے ہی ہیں۔ اور دیتا وہی ہے جس کو محبت ہوتی ہے۔ ضرور انہیں گولی سے بے انتہا محبت ہے۔ لیکن وہ کیا کرے؟ گولی اس کی طرف بھی تو ایک بار دیکھے۔ وہ جتنا سلگتا جا رہا ہے' گولی اتنی ہی ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے۔ آگ تو اس میں پہلے دن سے ہی نہ تھی' لیکن اتنی خنکی بھی نہ تھی۔ اسے تو جیسے نزدیکیوں کے لطف کی ضرورت ہی نہیں۔ آج کل تو وہ مونہہ پھیر کر سونے لگی ہے اور وہ دیر تک جاگتا رہتا ہے۔ اندھیروں میں روشنی ڈھونڈتا ڈھونڈتا بارہا اندھیروں کا شکار ہو جاتا ہے۔

ابھی ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ گولی کو میرٹھ لے جانے کے لئے اس کا ایک رشتہ دار آ گیا۔ میرٹھ میں

کسی کی شادی تھی۔ شرکت ضروری تھی۔ گوپی کہنے لگی "تمہیں بھی چلنا چاہیے۔" گورکھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ پھر آفس سے وہ پہلے ہی کافی چھٹیاں لے چکا تھا۔ اس طرح تین ہفتے ہجر میں گزرے اور اس کے بعد پھر گوپی کا وصل نصیب ہوا۔ ایک مہینہ وصال کا بیتا کہ میرٹھ سے ایک دوسرا رشتہ دار آپہنچا۔ اس نے بتایا کہ گوپی کا چاچا' جس کو لقوہ مار گیا تھا اور جو مہینوں سے چارپائی پر پڑا تھا' اچانک چل بسا۔ گوپی یہ سنتے ہی ایسی روئی کہ اس کا برا حال ہو گیا۔ اتفاق سے اس روز کھانا بہت لذیذ بنا تھا۔ مگر کسی نے ایک لقمہ بھی مونہہ میں نہ ڈالا اور گورکھ اکیلا تین آدمیوں کے حصے کا خود کھا گیا۔ اس بداخلاقی کا احساس آج بھی گورکھ کے دل کو کریدتا ہے' مگر وجہ نامعلوم اور معدوم رہتی ہے۔ اگر وہ دکھاوے کے لئے کیا تھا' تو کیوں؟ کیا اس لئے کہ کل کو ہجر میں کھانا نصیب نہ ہو گا؟ یا کھانے کو دل نہ چاہے گا؟ کیوں اس نے دل سے اٹھتی ہوئی صدا کا گلا دبایا؟ وہ اسے سمجھا رہی تھی : "کچھ تو ظاہرداری سے کام لیا کرو۔ اگر اس قدر بھوک لگی بھی تھی تو صبر کرتے۔" مگر وہ دل سے اٹھتی صدا کو دبا کر کھاتا گیا' کھاتا گیا۔ وجہ جو بھی رہی ہوگی' وہ کھانا زندگی بھر کے لئے اسے بہت مہنگا پڑا۔ اس ایک واقعہ نے گوپی کو اس سے اور بھی دور کر دیا۔

گوپی چلی گئی۔ گورکھ پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

ایک سال میں گوپی نے پانچ بار میرٹھ کے چکر لگائے۔ گورکھ کے لئے کلب میں شراب تھی' کھیل تھے' سگریٹ تھی' دوست تھے' کباب تھے' لیکن گوپی نہ تھی۔ شراب نوشی کی لت اسے ان ہی دنوں پڑی۔ بوتل اور بوتل کی خاصیتیں بیان کرتے کرتے' بوتلوں کا نشہ لوٹتے لوٹتے وہ خود ایک خالی بوتل بن گیا' جسے ٹوٹنے کے لئے صرف ایک چوٹ درکار تھی۔ ایک دن شراب کے نشے میں اس نے گوپی کو خط لکھا : "تمہارے گھر میں کبھی کسی کی شادی ہوگی' کبھی موت ہوگی' اور بھی کچھ نہ کچھ ہنگامہ برپا ہوتا رہے گا' مگر مجھے منظور نہیں کہ تم مجھے اس طرح ہجر کی آگ میں جلاؤ۔"

الفاظ اور مضمون' دونوں تہذیب کے خلاف ضرور تھے' مگر بہر حال محبت کے جلے دل کی پکار تھے۔ گورکھ لاچار تھا۔ وہ گوپی کو دل چیر کر نہ دکھا سکا۔ جتنا اس نے گوپی کا مونہہ اپنی جانب پھیرنا چاہا' اتنا ہی وہ دوسری طرف پھرتا چلا گیا' یہاں تک کہ اس کے ہاتھ تو گوپی کی پیٹھ بھی نہ آئی۔ وہ بے بسی سے سوچتا کہ وہ کیا' اس کی اوقات کیا؟ جب بھی میرٹھ والے چاہیں گے' کسی رشتہ دار کو بھیج دیں گے اور گوپی خوشی خوشی ان کے ہمراہ چلی جائے گی۔ اسے تنہائی کی آگ میں جلتا چھوڑ کر۔ کیا گوپی اس کی ہے؟ وہ اس کا شوہر ہے تو اس سے تو گوپی کو کیا فرق پڑا؟ تاہم دیر تک دماغی تناؤ میں گرفتار رہنا گورکھ کی مزاج میں شامل نہ تھا۔ جلد ہی وہ تصور کی دنیا میں سکون تلاش کرتا۔ لیکن ان دنوں تناؤ مسلسل بڑھتا گیا۔ گوپی کے خط کے انتظار میں وہ صبح دس بجے پوسٹ آفس پہنچ جاتا۔ گھنٹوں خط کی انتظار کرتا۔ جب دو ہفتے گزر گئے اور وہ جواب سے محروم رہا تو ایک کے بعد ایک اس نے دو ٹیلی گرام بھیج

دیئے۔ جب ان کا کوئی جواب نہ آیا تو اس نے ایک تیس صفحے کا خط لکھ ڈالا۔ جتنا بھی عشق کے نام پر اشک باری کر سکتا تھا' وہ سب درج کر دی۔ چند روز بعد اس کے خط کا جواب آیا۔ گولی نے تیس کے جواب میں ۶۰ اوراق لکھے تھے' یعنی ایک ورق کے جواب میں دو۔ ان میں محبت یا عشق کا کوئی افسانہ نہ تھا۔ وہ ساٹھ صفحات تو ہیرا لال کی عظمت کی داستان بیان کر رہے تھے' گورکھ کے ناواجب رویہ اور بے ہودہ خط لکھنے کی شکایت کر رہے تھے۔ اگر گورکھ خدا کی تعریف میں کچھ لکھنا چاہتا تو قلم جلد ہی جواب دے جاتا۔ مگر گولی کے عشق میں وہ بے تکان تیس اوراق لکھ گیا تھا۔ اور اب گولی نے ساٹھ اوراق لکھ ڈالے تھے۔ اس سے اسے اندازہ ہوا کہ گولی کس قدر اپنے والد کو چاہتی ہے۔ سنا ہے' عورت زندگی میں صرف ایک بار ایک مرد کو دل دیتی ہے۔ وہ چاہے اس کا شوہر ہو' عاشق ہو' والد ہو' بھائی ہو یا کوئی اور ہو۔ اگر وہ گولی کو پانا چاہتا ہے تو اسے ہیرا لال سے سمجھوتا کرنا پڑے گا' میرٹھ سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔

یکایک گورکھ میرٹھ پہنچ گیا۔ اس نے کوٹھی کے دروازے پر دستک دی تو گولی کی ماں نے دروازہ کھولا۔ گولی اندر کمرے میں بیٹھی رہی۔ باہر خوش آمدید کہنے کو بھی نہ آئی۔ گورکھ نے التجا آمیز لہجے میں ساس سے کہا "گولی کو مرے ساتھ بھیج دو۔ گولی کے چاچا کی موت پر میں نے خط میں جو اول جلول لکھ دیا تھا' اسے نظرانداز کر دو۔ گولی کے ہجر سے زیادہ سزا میرے لئے کوئی نہ تھی۔ مجھے مرنے والے سے کوئی شکوہ' کوئی گلہ' کوئی شکایت نہیں۔ میں تو گولی کے ہجر کی وجہ سے ہوش گنوا بیٹھا تھا۔ خدا مرنے والے کی روح کو سکوں بخشے۔"

پدما نے سرد لہجے میں کہا "میں کچھ فیصلہ نہیں کر سکتی۔ دو دن یہیں رہو۔ وہ آئیں گے تو فیصلہ کریں گے۔"

گورکھ سوچنے لگا کہ فیصلہ کا ہے کا؟ وہ اپنی بیوی کو واپس لینے آیا ہے' کوئی بھیک تو نہیں مانگ رہا ہے۔ آفس سے صرف دو دن کی چھٹی لے کر' دو دن کا سفر طے کر آیا ہے۔ جب بھی میرٹھ سے کوئی رشتہ دار دگواڑی پہنچا' اسی دن اس نے گولی کے جانے کا انتظام کر دیا۔ بلیک میں ریل ٹکٹ خریدے۔ آج وہ اس قدر پرایا ہو گیا؟ نہ تو پدما گولی کو بھیجنے پر رضامند ہوئی اور مزید تعجب کی بات یہ کہ گولی بھی چلنے کو تیار نہیں ہوئی۔ آہ! وہ کس غلط فہمی میں مبتلا ہے! یہاں اس کا کوئی نہیں۔ سارا ماجرا کچھ بچپن میں پڑھی "سچی محبت" کی داستاں کی طرح ہی ہے۔ وہ گاؤں کا الھڑ نوجوان جو بمبئی کی حسین گلوکارہ کی محبت میں گرفتار ہوا۔ جس طرح عہد گزشتہ کے واقعات ایک حسین تصورات بن کر رہ گئے' اسی طرح گولی کے ساتھ گزارے ہوئے یہ چند ماہ بھی تصور کے سنہرے پردے پر جھلک کر لاپتہ ہو جائیں گے۔ وہ گولی کو اپنی جانب کھینچتا کھینچتا طلاق کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ گولی نہ کبھی اسے سمجھ سکی' نہ وہ سمجھے گی۔ شادی کی ابتدا میں ہی کچھ بگڑ گیا۔ جو بگڑتا چلا گیا۔ لاکھ چاہ کر بھی وہ اسے سنبھال نہ سکا۔ اگر وہ خود کو اندر سے ٹٹولے کہ کیا اس کی خطا تھی اور کیا خمیازہ بھگتنا پڑا؟ مانا کہ وہ اجڈ ہے' گنوار ہے' زبان کا تیز ہے' لیکن عشق کے معاملے میں مجنوں سے کم نہیں۔ اگر گولی کبھی اس کی محبت کا امتحان لیتی تو وہ اسے قطب مینار سے

کود کر دکھا سکتا تھا' اس کی خاطر زہر پی سکتا تھا۔ خود کشی کر سکتا تھا۔ لیکن اب نہیں۔ ایک بے وفا کے لئے وہ زندگی کیوں برباد کرے؟ آج کے بعد وہ گولی کو یاد کرنا بالکل بند کر دے گا۔ چند ماہ پہلے جب وہ کنوارا تھا' تو کس کے ہجر میں جلتا تھا؟ کس کی کمی محسوس کرتا تھا؟ کس سے عشق کرتا تھا؟ چند دن میں کیا ہو گیا جو اسے جنگل میں لگی آگ کی طرح چاروں طرف سے لپیٹتا چلا گیا؟ وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔ پدما نے ایک بار پھر اپنی پیش کش دہرائی' لیکن رکنے کے لئے کوئی اصرار بھی نہ کیا۔ جاتے جاتے وہ تعلق کو ختم سمجھ کر بد اخلاقی کا ایک اور نامہ لیٹر بکس کے سپرد کر گیا۔ اس نے لکھا تھا : "جیسے میرا دل ٹوٹ کر آج ٹکرے ٹکرے ہو گیا' اے ہیرالال ویسے ہی تمہارے دل پر بھی کوئی وار کرے۔ تمہارے اپنے بیٹے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ کسی بے وفا کی محبت میں ایسا گرفتار ہو کہ پھر کبھی نہ ابھرے۔"

گورکھ واپس دگواڑی پہنچا تو چند روز بظاہر بے فکری سے اینٹھتا' پھرا۔ لیکن پھر گولی کی یاد نے اسے آ دبوچا۔ آہ وہ گولی کے ساتھ گزارے ہوئے وصل کے دن! کہاں تصور اور کہاں حقیقت۔ روز بروز یہ احساس کہ گولی کے بغیر جینا ناممکن ہے زور پکڑتا چلا گیا۔ لیکن وہ تو خود قطع تعلق کر آیا تھا۔ ایک طرف گولی کی بے وفائی کی یاد آتی' دوسری طرف اپنی بد تہذیبی' تیسری طرف وصل کی راتیں۔
بے قراریاں' بے چینیاں' اداسیاں اور انا کی لن ترانیاں' سب نے خوب ساتھ دیا۔ شراب کی بوتلیں نشہ لٹانے لگیں' سگریٹ کے دھوئیں پیچ و تاب کھانے لگے' خوابوں کی پرچھائیاں رلانے لگیں۔ غلط تھا تمام شکیب دل کا دعوی۔ غلط تھا میرٹھ سے یوں چلے آنا۔ فضول تھی ساری خودداری اور اپنی تعظیم۔ وہی تھا محبوب کا آستاں۔ اسی در پر پھوڑتا تھا سر۔ اس کے در پر کرنے ہیں سجدے۔ خواہ وہ سنگ دل ہے کہ نرم دل' بے وفا ہے کہ باوفا' ہیرالال کی ہے یا کسی اور کی' اس سے جو بھی نسبت ہے' جو بھی محبت ہے' جو بھی وحشت ہے' وہ واحد ہے۔
ایک روز خوابوں کے دریچوں میں گورکھ نے پائل کی آواز سنی۔ اتنی سریلی' اتنی مدھر۔ یہ گولی نے رقص کب سے سیکھ لیا؟ پائل جھنکاتی وہ اس کے قریب آتی چلی گئی۔ اس قدر قریب کہ خواب اور حقیقت میں کوئی فرق نہ رہا۔ "کیوں میری محبت کو سمجھنے سے ناچار رہے؟" آج گولی سج دھج کر اسے سمجھانے آئی ہے۔ وہ سیاہ ساڑھی میں ملبوس ہے۔ اس کی ساڑی کے پلو پر خوب صورت نقرہ کے مہین تاروں سے کڑھے گلاب کے پھول مسکرا رہے ہیں۔ نہیں نہیں یہ نقرہ نہیں' سیم نہیں' معلوم نہیں کس چیز کے تار ہیں۔ کیا گلاب کے پھول اتنے تاباں بھی ہو سکتے ہیں' جیسے یہ گلاب ساڑی کی تیرہ فضاؤں میں گردش کر رہے ہیں؟ کہیں یہ کہکشاں کے ستارے تو نہیں۔ رقص کی گردشیں سینے سے ساڑی کا پلو لے اڑیں تو سیاہ بلاؤز سے مرمریں سینے کے درخشاں چاند

مسکرانے لگے۔ پس پردہ ان کی روشنی میں وہ تنویر پیدا ہوئی کہ سیاہی مائل بادلوں کے گھیرے سمیں ہو اٹھے۔ گولی اس کے قریب ہے۔ اس قدر قریب کہ وہ اس کے سانس کی تپش پیشانی پر محسوس کر سکتا ہے۔ گولی اس سے مخاطب ہے اور اقرار کر رہی ہے : "میں بھی تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ کیوں مجھے اپنی جانب زیادہ کھینچنے کی کوشش کرتے ہو۔ میں تو سدا سے تمہاری ہوں۔"

ابھی اس نے گولی کے مہکتے سانس کے چند بوسے بھی نہ لئے تھے کہ گولی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "لو میرا رقص دیکھو۔ یہ محبت کا رقص۔ یہ دو دلوں کے سنگم کا رقص۔" اور وہ پازیب چھنکاتی رقص کی گردشوں میں گھومنے لگی۔

رقص کے دوران جیسے ہی اس کے لب گورکھ کے لبوں کے قریب پہنچے گورکھ کی آنکھ کھل گئی۔ ایک کالی بلی اس کے سینے پر سوار اس کی سانسیں چرا رہی تھی۔ گورکھ گھبرا کر اٹھا تو بلی کھلی کھڑکی سے باہر کود پڑی اور گھنگھرو بجاتی تیرہ فضاؤں میں کھو گئی۔ "لعنت ہے! کسی نے پالتو بلی کے پاؤں میں گھنگرو باندھ کر رات کو کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ آج بلی نے گھنگرو پہنے تو خواب کی یہ صورت نکلی۔ اگر کل مینا گھنگھرو پہن کر آگئی تو کیا صورت حال ہو گی؟"

گرمیوں کے دن تھے، لیکن گورکھ کھڑکیاں بند کر کے سونے لگا۔

احساسات اور تصور سے جدا ہو کر کسی بھی ذاتی معاملے میں سوچنا گورکھ کے لئے مشکل تھا۔ اس نے بارہا گولی کے بارے میں سوچا، اپنی شادی شدہ زندگی کے چند ماہ کے واقعات کا جائزہ لیا۔ کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ کتنے سہانے خواب سجائے تھے کہ بیوی فقط بیوی نہ ہو گی، وہ محبوب اور معشوقہ بھی ہو گی، ہم سفر، دوست اور خیر خواہ بھی ہو گی۔ کیا اس کی محبت خود غرض تھی؟ کیا وہ خود غرض تھا؟ محبت قربانی چاہتی ہے۔ اس نے کیا قربان کیا؟ قربانی کی بجائے کہیں وہ زور آزمائی پر تو نہیں اتر آیا؟ کیا اس نے گولی کو کبھی تکلیف پہنچائی یا وہ ایک دوسرے کی طبیعت کو سمجھنے میں ناکام یاب رہے۔ کہیں نہ کہیں کچھ تو غلط ہوا ہو گا؟

اول تو یہ کہ گولی کی محبت اس کے وجود میں کسی روگ کی طرح پھیل گئی ہے۔ ملتے ہی ایسا ہوا کہ وہ اس کے بغیر ایک پل بھی زندگی ادھوری سمجھنے لگا۔ جو کچھ بھی ہوا اس جذبے کے تحت ہوا۔ اگر گولی ہمیشہ اس کے پاس رہتی، بار بار میرٹھ نہ جاتی تو وہ دماغی تناؤ سے نجات پا لیتا۔ ادھر شادی ہوئی، ادھر تبادلہ ہوا۔ ادھر وصل ہوا، ادھر ہجر۔ وہ اپنا دماغی توازن قائم نہ رکھ سکا۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ گولی کو اس کی محبت کی ضرورت نہیں۔ وہ جتنا اس پر مرتا ہے وہ اتنی ہی اس کی محبت سے بے خبر ہے۔ محبت کا جذبہ اس کے نہ دل میں ہے، نہ لبوں پر۔ آج تک محبت کے اقرار کا ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ادا نہ ہوا۔ لیکن اگر محبت نہیں ہے تو زور زبردستی سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ جتنا اس نے

گولی کو اپنی طرف زور سے کھینچا اتنے ہی طناب شکستہ ہوتے چلے گئے۔ وہ اس کا دل نہ جیت سکے گا۔ گولی کا محبوب' اس کا بھگوان' اس کا فرشتہ' اس کا باپ ہیرالال ہے۔ اس کا رقیب' جس کو اسے رفیق بنانا ہو گا۔

وہ تو قطع تعلق کر کے آیا تھا لیکن اس کے باوجود اسے احساس ہوا کہ وہ گولی کے بغیر زندہ نہ بچے گا۔ اسے ہر صورت میں گولی چاہئے۔ جب یہی حال دل ہے تو جو ہوتا ہے ہوا کرے۔ تمام خیالات اور احساسات کو یہی گوشہ سکوں مل جانا چاہئے۔

وقت نے گورکھ کو کتنا بدل دیا۔ بچپن کی ظاہر خوش اخلاقی اور اندر کی کڑھن ایک نئی صورت لے کے شخصیت میں شامل ہو گئی۔ کیوں وہ بارہا لوگوں سے الجھ پڑتا ہے؟ پہلے بھی وہ چوٹ کھا لیتا تھا اور سر جھکا دیتا تھا۔ لیکن اب سر اٹھایا ہے تو سرفروش ہو بیٹھا ہے۔ کوئی اس سے بات کرے تو یہی سمجھے گا کہ یا تو وہ خود سے خفا ہے یا زمانے سے خفا ہے۔ ظاہری خفگی اور اندرونی خوف' دونوں اس پر سوار رہتے ہیں' شادی ہو گئی' ایک محبوب ملا' وہ بھی اس کا نہ ہو سکا۔ اور اس کے پاس کیا ہے؟ ایک بستر' چند لباس' کچھ تصویریں اور کتابیں' دو تین کالج کی ڈگریاں۔ کیا سرمایہ لے کر زمانے کا مقابلہ کرے؟ اگر آج نوکری سے برخاست کر دیا جائے تو گھر میں اتنا اثاثہ بھی نہیں کہ دو مہینے گولی کو ساتھ رکھ سکے۔ کتنا فرق ہے دونوں کی طبیعت میں۔ گولی کبھی اس کے خوف' اس کے ارادے' اس کے ارمان' اس کی محبت نہ سمجھ سکے گی۔ اسے کوئی خبر' کوئی بات' کوئی جذبہ' جب تک کہ وہ میرٹھ سے تعلق نہ رکھتا ہو' گرماتا ہی نہیں۔ صرف میرٹھ کی بات سن کر اس کی آنکھ میں چمک اور لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن کیا اس نے گولی کو کبھی تکلیف دی؟ گورکھ کے جہاں تک خیالات پہنچتے اسے ایک خلا نظر آتا۔ اس نے تو گولی کے کہنے سے اپنی تلوار نما مونچھیں صاف کر دیں' رنگا رنگ دھاری دار قمیضیں پہننی چھوڑ دیں' صرف انڈرویر ڈال کر گھر میں ننگا گھومنا چھوڑ دیا۔ گولی کی موجودگی میں زیادہ شراب پینی چھوڑ دی' گھر میں گوشت پکانا بند کر دیا۔ کاش گولی کبھی دو گھونٹ پی کر اس کے ساتھ بہکتی تو وہ کتنی بے تکی گفتگو کرتے۔ لیکن بے تکی گفتگو اور گولی! گولی کے لبوں سے مجال ہے' جو ایک لفظ بھی غلط ادا ہو جائے۔ اس نے بہکنا سیکھا ہی نہیں۔ اور ادھر گورکھ ہے' جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ رخ بدل لیتا ہے۔ خاموشی کے غار سے نکل کر زبان درازی کے مینار تک پہنچنے میں اسے کچھ ہی دیر لگتی ہے۔ جو بھی ہو' ماجرا واضح ہے۔ گولی اور وہ دو علیحدہ شخصیتیں ہیں۔ دونوں اپنی جگہ مضبوط۔ نہ وہ اپنا انداز بدلے گا اور نہ گولی اپنی وضع بدلے گی۔ لیکن اسے خود کسی حد تک تو بدلنا ہو گا۔ صرف اتنا کہ گولی جب چاہے میرٹھ چلی جائے۔ میرٹھ سے کوئی بھی رشتہ دار آئے تو وہ اسے سر آنکھوں پر بیٹھا لے۔ رشتہ دار گولی کو ساتھ میرٹھ لے جانا چاہے تو لے جائے۔ گولی کے ماں باپ کی صرف تعریف کی جائے۔ "اے گورکھ! اگر تو محبت کا دم بھرتا ہے تو اتنا تو کر گزر۔ یہی ضروری ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ تو نے گولی کی گھر کے کام میں مدد کرنی چاہی' لیکن اسے منظور نہ ہوئی۔ شاید اس نے اپنے گھر میں کبھی آدمی کو برتن

صاف کرتے یا جھاڑو دیتے اور سبزی کاٹتے نہیں دیکھا۔ وہ مجھے بھی یہ کام نہیں کرنے نہیں دے گی۔ میرٹھ سے نوکر ساتھ لے آئے گی۔ ویسے بھی تیرا کام اسے پسند نہیں۔ اب تو نے آلو کا چھلکا اتارا' اگر کہیں ذرا سا لگا رہ گیا تو گولی اسے دوبارہ صاف کرے گی۔ تیرے خیال سے آلو چھل گیا۔ کھانے کی چیز ہے۔ اس پر کوئی آنکھ' ناک اور بوں کی نقاشی تو کرنی نہیں۔ اسی طرح تو چاہے کتنی ہی صفائی سے جھاڑو لگا لے' گولی کو کوئی نہ کوئی خرابی کسی نہ کسی کونے میں نظر آجائے گی اور وہ تیرے ہاتھ سے جھاڑو چھین کر تجھے فیل کردے گی۔"

خود سے عہد و پیماں باندھتا گورکھ دوبارہ میرٹھ پہنچا۔ ہیرا لال تپاک سے ملے۔ انہوں نے بھی شاید گورکھ سا دیوانہ اپنی کاروباری زندگی میں کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ گورکھ نے وعدے پر دعوے کئے' قسمیں کھائیں کہ گولی کو ہمیشہ خوش رکھے گا۔ لیکن یہ احساس اسے کرید تا رہا کہ اس نے تو کبھی خواب و خیال میں بھی گولی کو رنج پہنچانے کی کوشش نہ کی تھی۔ عجب ماجرا ہے کہ اس کے باوجود بھی وہ طلاق کے دروازے پر آکر کھڑے ہوگئے۔ اس کا کوئی قصور ہے تو وہ ہے اس کا دیوانہ پن۔ اگر یہ دیوانہ پن ہی گولی کی ناراضگی کا سبب ہے تو اسی دیوانگی نے ہی آج اس کے قریب بھی لا کھڑا کیا ہے' ورنہ وقت کی ایک اور ٹھوکر اسے ہجر کے گہرے غار میں دھکیل سکتی تھی۔

جس دن گولی واپس دگواڑی آئی' اسی دن گورکھ اپنے سارے عہد و پیمان بھول گیا۔ مدت کے بعد وصل کی ایک رات حاصل ہوئی تھی' وہ بھی تکرار اور بدمزگی میں گزری۔ یہ کس بددعا کا اثر تھا کہ وہ اپنی زبان تالو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ دل آئینے کی طرح صاف و شفاف ہوتے ہوئے بھی کیوں وہ فقط الجھنے کے لئے الجھ پڑتا تھا۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ چاقو سے اپنی زبان کاٹ کر پھینک دے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ لیکن تکرار کا حقیقی سبب کیا تھا؟ یہی کہ گولی کی محبت میں گورکھ دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا اور گولی سے اسے کبھی اس محبت کی تصدیق بھی نہیں ملتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ محبت صرف جسمانی رہ گئی۔ روح کہیں مرگئی۔ گورکھ سوچتا کہ وہ بھی ان مردوں کی قطار میں شامل ہوگیا ہے جس کے لئے بیوی کے ساتھ جماع کرنا محض پیٹ بھرنے کی طرح ایک بھوک' ایک ضرورت کا درجہ اختیار کرلیتا ہے۔ گولی اسے قربت سے نہ روکتی' لیکن بارہا گورکھ نے محسوس کیا کہ گولی کا دل کسی دوسری جگہ پرسکون اور مسرور ہے اور وہ اس کی بلندی تک تو کیا اس کے قدموں تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ احساس اسے ہر لمحہ خون کے آنسوں رلاتا' جو گولی کی نظر سے ہمیشہ پوشیدہ شب کے دامن پر سرخ دانوں کی طرح بکھر جاتے۔

ابھی میرٹھ سے واپس آئے ہوئے ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ گولی کو حمل ٹھہر گیا۔ اس طرح گولی کے ساتھ پہلی رات کا دوسرا قول بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گورکھ کا مذاق اڑانے لگا۔ گولی سردرد' بدہضمی' اپھارا' میں

جتلا ہو گئی۔ وہ کھریا مٹی تو نہ کھاتی' لیکن آم کے اچار کی پھانکیں اٹھیوں کی تعداد پر بے اثر ثابت ہوئیں۔ گورکھ آفس سے آ کر گولی کی دل جوئی کرتا' حوصلہ بڑھاتا' پیار جتاتا' گھر صاف کرتا' الٹیاں تک صاف کر دیتا' لیکن اس نے محسوس کیا کہ گولی کو تو دن بھر مدد چاہیے۔ وہ بخوشی' پہلی بار گولی کو میرٹھ چھوڑ آیا۔ گولی کے میرٹھ پہنچتے ہی اس کے چہرے پر سے جو ابر سیاہ چھٹے' وہ احساس ابھی تک گورکھ کے ذہن میں محفوظ ہے۔

تین مہینے کے عرصے میں گولی کی صحت کافی بہتر ہو گئی اور گورکھ اسے واپس دگواڑی لے آیا۔ ہجر میں بیتے ہوئے سنہرے خوابوں کے تار' وصل کی راتوں میں صورت زنداں بن جاتے۔ ہر جذبۂ صادق' ہر خیال عشق پر اسرار ہوتا ہوا گولی کے روبرو بے بیاں ہو جاتا اور اپنی ساری نکہت اور نزاکت کھو بیٹھتا۔ گورکھ نے محسوس کیا کہ گولی کے روبرو خاموشی ہی زریں ہے' نہ کہ دل پکڑ کر رونا۔

گورکھ نئے سپنے سجانے لگا۔ یہ خیال اس کے لئے بہار کا پیامی تھا کہ جلد ہی ایک نئی زندگی کی آمد سے زندگی بدل جائے گی۔ اولاد کی محبت رہے سہے آپس کے تفرقات کو ختم کردے گی۔ گورکھ کو باپ بننے کی بے حد خوشی تھی۔ گولی کے ساتھ کیا ہوا یہ عہد کہ جلد ہی اولاد پیدا نہ کریں گے' خوشی کی لہر میں کہیں ڈوب چکا تھا۔ گولی نے بھی شاید اس کی یہ حسین وعدہ شکنی قبول کرلی تھی۔ گورکھ پڑوسیوں کے بچوں کے ساتھ بالکل بچہ بن جاتا۔ ان ہی کی طرح ہنستا' شرارتیں کرتا' اور کبھی کبھی اس کے ساتھ چھوٹے' بڑے بچے مل کر اس قدر شوروغل مچاتے اور چیزیں خراب کرتے کہ گولی کہتی : "گھر میں ہر وقت طوفان مچائے رکھتے ہو۔ کوئی چیز ٹھکانے نہیں رہتی۔" بڑوں کی نسبت بچوں میں ہی گورکھ کا دل زیادہ لگتا۔ وہ سوچتا کہ اپنی اولاد ہوگی تو کس قدر لطف آئے گا۔ کچھ دن بعد گورکھ کی خوشی میں میرٹھ پھر خلل انداز ہو اٹھا۔ گولی زچگی کے لئے میرٹھ جانا چاہتی تھی۔ گوپال داس ان دنوں سری نگر میں رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ گولی کے پہلے بچے کی پیدائش سسرال میں ہو۔ گورکھ سوچتا کہ کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ کمپنی کے ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر کو کافی تجربہ ہے۔ دگواڑی میں کیا بچے پیدا نہیں ہوتے؟ کافی دن تک یہی کشمکش چلتی رہی۔ آخر گورکھ کے ضد کرنے پر گولی سری نگر روانہ ہوگئی اور گورکھ سوچتا رہا کہ اس نے گولی کے دل کی بات نہ مان کر' یعنی اسے میرٹھ نہ بھیج کر اس کے قریب آنے کا ایک اور موقع گنوا دیا۔ جہاں بھی گولی سہولت محسوس کرے' وہیں بھیجنا چاہئے تھا۔ ایک بار اس نے گولی سے کہا "تم نہ سری نگر جاؤ' نہ میرٹھ۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہاں ہسپتال میں بھی نہ جاؤ۔ بہت عرصہ ہوا میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔ دو محبت کرنے والے کسی کی مدد کے بغیر اپنی پہلی اولاد کو دنیا میں لے آتے ہیں۔ کہنے کو تو وہ کہہ گیا' لیکن جلد ہی اس نے اپنے الفاظ واپس لے لئے۔ "میرا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ خیالی گھوڑے دوڑانے کی عادت ہے نا۔ اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں جیتے جی مرجاؤں گا۔"

گولی سری نگر روانہ ہوگئی لیکن جاتے جاتے کہنے لگی "میں چاہتی ہوں کہ پیدائش کے وقت تم میرے پاس رہو۔ وعدہ کرو۔"

گورکھ نے جواب دیا : "میں وعدہ کرتا ہوں کہ ضرور سری نگر پہنچ جاؤں گا۔ زچگی کے وقت تمہارے قریب ہی رہوں گا۔"

وعدے کے مطابق گورکھ سری نگر پہنچ گیا۔ گوپال داس اب بڑے صاحب کہلاتے تھے۔ ان کی شان و شوکت کچھ ایسی ہی تھی جیسی گورکھ نے شملہ میں ان کے انگریز افسر کی دیکھی تھی۔ گوپال داس کی طویل جدوجہد کا مناسب صلہ مل رہا تھا۔

ابھی گورکھ کو سری نگر پہنچے ہوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ ایک دن صبح سے گولی کو رہ رہ کر درد شروع ہوگیا۔ اتفاق کہ اسی دوپہر کو گورکھ کے نام ٹیلی گرام آیا۔ کمپنی نے اسے فوراً" دہلی طلب کیا تھا۔ ہدایت تھی کہ جلد سے جلد دہلی پہنچے۔ سری نگر سے جموں پہنچنے میں ہی ایک دن صرف ہوجاتا ہے۔ گولی کہنے لگی "یہ تار ایک دن بعد بھی مل سکتا تھا۔ صرف آج کی رات میرے پاس ٹھہر جاؤ۔"

گورکھ کا دل قطعی نہیں چاہ رہا تھا کہ دہلی واپس جائے۔ وہ گولی کی حالت دیکھ کر خوف زدہ بھی تھا۔ بار بار گولی کی آنکھوں میں جھانک کر سر جھکا لیتا۔ ایک طرف گولی کا خیال اور دوسری طرف آفس سے آیا ہوا ٹیلی گرام۔ اگر وہ جلد دہلی نہ پہنچا تو افسر اسے بے پروا بھی سمجھ سکتا تھا۔ اس کی نوکری خطرے میں بھی پڑ سکتی تھی۔ پھر وہ کیا کرے گا؟ بچے کی پیدائش کے وقت جو ہونا ہے' وہ تو ہونا ہی ہے۔ وہ ہسپتال میں دروازے کے باہر کھڑے رہ کر کیا کر سکتا ہے؟ پھر اس کے باپ کا کتنا رسوخ ہے۔ اچھے سے اچھا ڈاکٹر موجود ہے۔ اسے نوکری کی طرف سے بے پروائی نہیں برتنی چاہئے۔

صبح کے وقت گولی ہسپتال کی جانب روانہ ہوئی اور گورکھ بس اڈے کی طرف۔ گولی نم آنکھوں سے اس کو دیکھ رہی تھی' جیسے پوچھ رہی ہو : "یہی ہے وہ لیلیٰ مجنوں کی محبت؟ میری جان نکل سکتی ہے اور تم بھاگے جارہے ہو؟ میری طرف دیکھو' مجھ سے آنکھ ملاؤ۔ کوئی وعدہ تو سلامت رکھو۔ تمہاری نوکری کو کچھ نہیں ہوگا۔ صرف ایک دن بعد چلے جانا۔"

گورکھ نے گولی کی آنکھوں میں یہ عبارت پڑھی بھی اور نہیں بھی پڑھی۔ تاہم سفر کے دوران گورکھ رہ رہ کر اپنے فیصلے پر جھنجھلاتا رہا۔ سوچتا رہا کہ نہ جانے گولی پر کیا گزر رہی ہوگی۔ لعنت ہے اس کی نوکری پر اور اس کی زندگی پر۔ کیا پہاڑ ٹوٹ پڑتا اگر ایک روز دیر سے پہنچ جاتا؟ جموں تک کا سفر اس کے لئے بہت لمبا ہوگیا۔ دل سے آواز اٹھتی کہ کاش بس واپس سری نگر پہنچ جائے۔ وہ جموں کے اڈے پر اترے اور دیکھے کہ سری نگر آگیا ہے۔ اگر وہ بس میں سفر کرنے کے بجائے ہوائی جہاز سے سفر کرتا تو آدھے گھنٹے میں جموں پہنچ جاتا۔ پورا دن بچ جاتا۔ ہوائی جہاز کا کرایہ ہے بھی کتنا؟ صرف پچاس روپے۔ کیا وہ اتنا پیسہ بھی نہیں خرچ سکتا؟ اس طرح دونوں کام ہوجاتے۔

اس ادھیڑبن میں بے چینی کا شکار گورکھ جموں کے بس اڈے پر اترا۔ دھڑکتے دل سے اس نے سری نگر فون ملایا۔ خبر ملی کہ وہ باپ بن گیا ہے' لڑکا پیدا ہوا ہے اور گولی اور بچہ' دونوں خیریت سے ہیں۔ یکایک اس کی بے

چینی خوشی میں بدل گئی اور اس نے دونوں ہاتھ بلند کر کے زور سے ہوا میں چھلانگ لگائی' جیسے آسماں سے ایک ستارہ چن لیا ہو۔
دہلی پہنچنے پر گورکھ کو پتہ چلا کہ جس کام کے لئے اسے طلب کیا گیا تھا' اسے ایک ہفتے کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس نے اپنے افسر سے ذکر تک نہ کیا کہ وہ بیوی کو زچگی کے وقت تنہا چھوڑ کر اس کے حکم کے مطابق چلا آیا ہے۔ اس طرح سے گولی سے کیا ہوا اس کا تازہ ترین وعدہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

گولی لگ بھگ ایک مہینے سسرال میں رہی' پھر وہ میرٹھ چلی گئی۔ اس دوران گورکھ کو اپنے بیٹے کی کئی تصویریں ملیں' جنہوں نے اس کے دل میں تازہ ارمان جگائے۔ گولی دگواڑی واپس آئی تو میرٹھ سے ایک نوکر کو بھی ساتھ لے آئی' جس سے چھوٹے بچے کی دیکھ بھال کرنے میں کافی سہولت ہو گئی۔
دبی دبی زبان میں کبھی کبھی گولی سری نگر میں بیتی آپ بیتی سنانے لگتی :
"سری نگر ہسپتال میں انتظام درست نہ تھا۔ ہسپتال میں سب نوسیکھے اور خبطی ڈاکٹر بھرے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف گندگی ہے۔ مریض کی ٹھیک طرح دیکھ بھال ہو ہی نہیں سکتی۔"
"نرس نے مجھے غلط انجکشن لگا دیا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ جان بچ گئی۔"
"تمہاری ماں کی بات میں نے اپنے کانوں سے سنی۔ میری نرس سے کہہ رہی تھی : یہ پڑی ہے میری سیاہ فام بہو۔ بڑے لڑکے نے تو میری ایک نہ سنی' لیکن میں اپنے دوسرے لڑکے کی شادی کسی اجلے رنگ کی لڑکی سے ہی کروں گی۔ اس کا رنگ اتنا ہی صاف ہو گا جتنا کشمیری لڑکیوں کا۔"
"تمہارے پتا جی مجھ سے کہتے : "کھڑی کھڑی کیا مونہہ دیکھ رہی ہے؟ جا میرے لئے ایک گلاس پانی لے کر آ۔" اب مجھے کیا خواب آیا تھا کہ انہیں پانی کا گلاس چاہئے؟ پھر کہتے ہیں کہ جا' وہ سامنے پڑی کرسی اٹھا لا۔ میں نو مہینے کی حاملہ۔ کوئی دشمن بھی ایسے موقع پر وزن اٹھانے کو کہے گا۔"
گورکھ کو یقین تھا کہ گولی جھوٹ نہیں بولتی۔ وہ اپنے والدین کے رویہ سے بھی واقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گولی کبھی بزرگوں کی حکم عدولی نہیں کرتی' چاہے کتنی ہی ناگوار بات کیوں نہ ہو جائے۔ اگر کوئی بدتمیزی کی بات کرے تو بھی اس کے چہرے پر شکن نہیں پڑتی۔ لیکن اس کے دل پر کیا اثر ہوتا ہے' اسے کوئی نہیں جانتا۔ بہتر ہوتا کہ وہ گولی کو زچگی کے لئے میرٹھ بھیج دیتا۔ اب گولی کی شکایتوں پر کچھ کہنا اور صفائی پیش کرنا بے کار تھا۔ تاہم وہ اتنا ضرور سمجھ گیا کہ اس کے والدین نے ہمیشہ کے لئے گولی کے دل میں عزت کا مقام کھو دیا ہے۔
بچے کے لئے گولی کو پرانے اور لمبے نام پسند نہ تھے' چنانچہ اس کا نام امر رکھ دیا گیا۔ گولی اور گورکھ سری نگر میں سیر کے لطف سے محروم رہے تھے۔ سوچا کہ کیوں نہ دوبارہ سری نگر جا کر سیر سپاٹے کئے جائیں۔ اگرچہ چند ماہ

پہلے گولی سری نگر سے ساس اور سسر کے برتاؤ سے دل شکستہ لوٹی تھی، مگر وہ دوبارہ وہاں چلنے کو رضامند ہو گئی۔ ایک ہزار میل سے زیادہ لمبا سفر تھا۔ ڈیڑھ دن کے ریل کے سفر کے بعد وہ سہارن پور پہنچے تو گولی کے والدین ہیرا لال اور پدما اسٹیشن پر موجود تھے۔ دونوں صرف کچھ دیر ان سے ملنے کے لئے میرٹھ سے سہارن پور آئے تھے۔ گاڑی بیس منٹ کے لئے اسٹیشن پر ٹھہرتی تھی۔ گولی بڑی محبت سے، والدین سے بغل گیر ہوئی۔ گورکھ نے بیٹھے بیٹھے نمسکار کیا۔ پدما نے پیار سے امر کو گود میں بٹھالیا۔

"یہ روز بروز کتنا خوب صورت نکلتا جا رہا ہے! بھگوان کرے، اسے میری نظر نہ لگے۔ لیکن اس کے گلے میں کیا ڈال رکھا ہے؟" پدما نے کہا۔

"یہ کنٹھا گورکھ کے والدین اور گورکھ کے اصرار پر ڈالا گیا ہے۔ میں بھی اسے ڈالنے کے حق میں نہ تھی۔" گولی دھیرے سے بولی۔

دگواڑی میں بھی کنٹھے کو لے کر گولی اور گورکھ کے درمیان کافی بحث ہو چکی تھی۔ امر کبھی کبھی غیر معمولی طور پر بے چین ہو جاتا۔ رونے لگتا تو روتا ہی رہتا، جیسے رونے کا دورہ سا پڑتا ہو۔ شاید اس نے وہ بے چینی گورکھ سے ورثے میں پائی ہو۔ گورکھ امر کو گود میں لے کر گھنٹوں سڑک پر گھومتا رہا۔ شام ہو جاتی، رات اتر آتی، لیکن امر روتا رہتا۔ امر کھلونے لے کر روتا، دودھ پی کر روتا، پیار کرنے سے روتا، گرائپ واٹر پی کر روتا، کوئی جسمانی تکلیف سمجھ میں نہ آتی۔ گورکھ امر کے ساتھ وہ حرکت تو نہیں کر سکتا تھا جو اس کا بمبئی کا دوست گپتا اپنے بیٹے کے رونے پر کرتا تھا۔ لہٰذا گورکھ کے ماں باپ کے کہنے پر ایک خاص کنٹھا امر کے لئے تیار کیا گیا۔ اس میں چاندی کا چھلا، شیر کا ناخن، پیتل، سونا، چاندی اور تانبے کے ٹکڑے، اصلی موتی اور مونگا اور بیچ میں ایک تعویذ، سب کچھ موجود تھا۔ گورکھ کا دماغ سائنٹفک میلان رکھتا تھا۔ اسے غیبی طاقتوں پر یقین تو تھا، لیکن وہ طاقتیں کیوں، کہاں اور کس لئے نازل ہو جاتی ہیں، اس کا کوئی تسلی بخش جواب اس کے پاس نہ تھا۔ وہ سوچتا کہ یہ سب اپنے اپنے اعتقاد کی بات ہے۔ بہت سے تاریخی، مذہبی اور افسانوی واقعات اس قسم کے سننے میں آتے ہیں کہ کسی خاص شخص نے ان غیبی طاقتوں کو ہم راز بنالیا، ان پر کسی حد تک قابو پالیا۔ لیکن یہ بیان اور یہ واقعات دنیا کے سارے انسانوں کی روز مرہ زندگی کا رخ تو نہیں پلٹ سکتے! یہی سبب تھا کہ امر کے گلے میں کنٹھا ڈالنے سے اس کے رونے میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔

"یکایک پدما کہنے لگی : "یہ کیسی جاہلوں جیسی حرکت ہے! گنوار بھی بہتر ہوتے ہوں گے۔ اگر امر کے گلے میں شیر کا ناخن گڑ جائے؟" اور یہ کہتے ہوئے پدما نے امر کے گلے سے کنٹھا اتار دیا۔

شاید پدما ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اسی خیال سے رات کو سوتے وقت عموماً" امر کے گلے سے کنٹھا اتار دیا جاتا تھا۔ لیکن گورکھ کو پدما سے اس قسم کی بات چیت کی امید نہ تھی۔ وہ تو اسے بہت تہذیب یافتہ سمجھتا تھا۔ وہ اس کی

ماں ساوتری کی طرح کیوں بات کرنے لگی؟ اس نے پدما سے کہا "آپ اگر کسی چیز پر یقین نہیں کرتے تو نہ کریں۔ لیکن اگر کوئی دوسرا یقین کرتا ہو تو اس کا یقین نہ توڑیں۔ آپ کنٹھا امر کے گلے میں واپس پہنوا دیں۔"

ضرور گورکھ کی آواز بلند ہو گئی ہو گی۔ اس نے جو بھی کہا پر زور لہجے سے کہا ہو گا۔ شاید اسی لئے ہیرا لال گولی سے مخاطب ہوئے : "چلو اٹھو۔ اپنا سامان ڈبے سے نیچے اتار دو۔"

اتنا کہتے ہی ہیرا لال اور پدما اٹھ کھڑے ہوئے۔ گولی نے امر کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو قلی سامان اتارنے لگے۔ گورکھ نے دیکھا کہ گولی نے پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہوئے اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ پلیٹ فارم چھوڑ کر رخصت ہو جانے کی تیاری میں تیز قدم اٹھاتے چل رہے تھے۔ ڈبے کی کھڑکی کی سلاخوں سے جھانکتا گورکھ بے حس و حرکت گولی کو والدین کے ساتھ ہم قدم نظر سے اوجھل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اس کا جسم بت کی طرح ساکن ہو گیا۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اتنی عمر ہو گئی ' ایک بھی محبوب نہ ملا۔ وہ خوابوں کے قصر زمین پر نہ اتر سکے۔ اگر کوئی ملا بھی تو اسے مسلسل وعدہ شکنی ' فضول کی ضد اور تکرار میں کھو دیا۔ اب زندگی میں اور کوئی پھول نہ کھل سکے گا۔

گورکھ یکا یک ایک بوتل کے ہم شکل غار میں اتر گیا۔ جیسے وہ بوتل کے پیندے میں ہو اور کسی نے بوتل کا کارک بند کر دیا ہو۔ سالہا سال گذر گئے وصل کے انتظار میں ' لیکن اس زنداں سے کسی نے چھٹکارا نہ دلایا۔ کس پر دل لٹائے؟ کس سے محبت کرے؟ بوتل کی دیواروں سے ' سیاہی سے ' پیندے سے یا بلند کارک سے جس تک رسائی ناممکن ہے؟ یا خدا اس زندگی سے تو موت بھلی۔ وہ سجدہ کرنے ہی والا تھا کہ کسی آنکھ نے بوتل میں جھانکا ' کسی نازک انگلیوں کے ناخن کارک کھولنے لگے۔ کون ہے وہ نازنین؟

ایک مسافر گورکھ کے پاس کھڑا ہمدردی سے کہہ رہا تھا : "جاؤ ' جلدی کرو۔ یہاں کیا بت بنے بیٹھے ہو! گاڑی چلنے میں تھوڑی دیر ہی باقی رہ گئی ہے۔"

سراب ٹوٹا تو گورکھ چھلانگ لگا کر پلیٹ فارم پر کود پڑا اور بھاگتا ہوا ہیرا لال کا ہم قدم ہو گیا۔ گڑگڑا کر عاجزی سے بولا "خطا ہوئی۔ معاف کر دیجئے میں آپ کی حکم عدولی اور بے عزتی نہیں کر رہا تھا۔ گولی کو میرے ساتھ بھیج دیجئے۔"

گورکھ نے بچپن سے زندگی میں یہی سیکھا تھا کہ عاجزی سے بگڑا کام بنے تو بنا لو۔ غلطی کی ہو یا نہ کی ہو ' مان لو کہ غلطی کی ہے۔ آج تک وہ زمانے کے سامنے گڑگڑاتا ہی رہا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ گڑگڑانے سے کام بن سکتا ہے۔ بچپن میں جب کسی شرارت کی وجہ سے اسے پہروں کالی گھپا کا مونہہ دیکھنا پڑتا اور کھانا نصیب نہ ہوتا تو گڑگڑانا اور قدم بوسی ہی کام آتی تھی۔ زمانے کو دل کھول کر گالیاں دو ' اگر سب کے روبرو نہ دے سکو تو دل ہی دل میں کوستے چلے جاؤ ' زمانے کو آنکھ دکھاؤ ' لیکن اگر زمانہ خلاف ہو جائے تو اس کے سامنے خوب گڑگڑاؤ۔

اس وقت بھی اس کے دل نے یہی صدا دی کہ وہ گولی کے بغیر زندہ نہیں بچے گا۔ اسے گولی چاہئے' ہر صورت میں چاہئے۔ موقع شناسی کا تقاضا ہے کہ قدم بوسی کرو' مگر گولی کو نہ جانے دو۔

گولی دوبارہ آکر ڈبے میں بیٹھ گئی۔ پٹھان کوٹ تک کچھ نہ کچھ بدمزگی کی گفتگو چلتی رہی اور مسافروں کے لئے بغیر ٹکٹ کا تماشا فراہم ہوتا رہا۔ سری نگر پہنچنے تک دونوں کا موڈ بدل چکا تھا۔ شاید یہ دل کش نظاروں اور لطیف ہواؤں کا اثر تھا۔

کشمیر کی حسین وادیوں میں گولی اور گورکھ سیر اور تفریح کے مزے لوٹتے رہے۔ کچھ عرصہ پہلے گولی نے گورکھ کو ایک امپورٹیڈ کیمرہ لا کر دیا تھا۔ گورکھ کے لئے وہ بیش قیمت کھلونا ثابت ہوا۔ کیمرہ کا استعمال زیادہ تر گولی پر ہی ہوتا۔ ندی' پہاڑ' جھرنے' شجر' پھول' پتے' سب گولی کے بغیر بے نور تھے۔ دیوار پر سوار گولی۔ بادلوں کے کاروانوں میں جھلکتی گولی۔ پانی کی جھلملاتی لہروں میں گولی۔ سر راہ گولی۔ پگ ڈنڈی کے بیچوں بیچ گولی۔ پہاڑ کی چوٹی پر گولی۔ گھوڑے پر سوار گولی۔ گھوڑے کی نکیل میں لگام تھامے گولی۔ ویرانے میں گولی۔ آبادی میں گولی۔ یعنی ہر طرف گولی ہی گولی۔ شاید یہ گولی کی سینکڑوں تصویریں کھینچنے کا اثر ہو گا کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔

گورکھ اور گولی ایک شو مندر دیکھنے پہاڑی پر چڑھتے چلے گئے۔ مندر کافی بلندی پر تھا۔ چڑھائی کے آخری دور میں بہت سی اونچی نیچی سیڑھیوں پر ستاتے جب وہ مندر کے آنگن میں پہنچے تو تقریباً" شام ہو چلی تھی۔ گورکھ نے گولی کی چند تصویریں اتاریں اور کچھ وقفے کے بعد دونوں واپس ہوئے۔ چڑھائی اترتے ہوئے گولی نے گورکھ کا ہاتھ تھام لیا اور سہارا لے کر اترنے لگی۔ یکایک سہارا لیتے لیتے وہ سر راہ گورکھ سے بغل گیر ہوتی رہی۔ دونوں نیچے اترے تو گولی کہنے لگی "چلو' ڈل لیک پر شکارے میں سیر کر آتے ہیں۔ لیکن شکارے میں اور کوئی مسافر نہ ہو۔"

شکارہ جیسے ہی جھیل کے درمیان پہنچا' گولی نے گورکھ پر بوسوں کی برسات شروع کر دی اور بے قرار ہو کر گورکھ کی پینٹ کی زپ کھولنے لگی۔ گورکھ نے دبی زبان سے کہا "کچھ تو خیال کرو۔ پیچھے شکارہ چلانے والا دیکھ رہا ہے۔ گھر تو پہنچنے دو۔"

گولی آنکھیں بند کئے مستی میں بولی "سمجھ لو گھر آگیا' ہم دونوں اپنے بستر میں دراز ہیں اور ہم دونوں کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔"

شکارہ چلانے والا بھی ماجرا سمجھ گیا تھا۔ وہ شکارہ چنار سے موڑ کر پانی کے سنسان بہاؤ کی طرف لے چلا اور ایک کشمیری گیت کی دھن گنگنانے لگا۔ اس روز کے بعد تمام عمر گورکھ کو گولی کا وہ پہلو دیکھنے کو نہ ملا۔

دونوں دگواڑی پہنچے تو معلوم ہوا کہ گولی کو پھر حمل ٹھہر گیا ہے۔ کمپنی کی لیڈی ڈاکٹر نے صلاح دی کہ اگر امر چھوٹا ہے تو کیا ہوا' حمل گرانے کا خیال چھوڑ دیں۔ اسے خدا کا عطیہ سمجھیں۔

گولی کی طبیعت پھر خراب رہنے لگی۔ بہت دوا اور علاج کے باوجود بھی اس کی حالت کچھ ویسی ہی ہو چلی جیسی ان دنوں تھی، جب امر کوکھ میں تھا۔ چنانچہ گورکھ گولی کو میرٹھ چھوڑ آیا۔ کچھ دن بعد گورکھ کا تبادلہ گورکھ پور ہو گیا عہدے میں ترقی ہوئی اور تنخواہ بڑھی۔ گورکھ پور میں کمپنی کا کارخانہ اور رہنے کے مکان تعمیر ہو رہے تھے' اس لئے گورکھ کو شہر میں مکان ڈھونڈنا پڑا۔ اچھے گھروں کی قلت تھی۔ شہر میں پرانے مکان آسانی سے کرائے پر مل سکتے تھے' لیکن وہ موجودہ زمانے کی سہولتوں سے محروم تھے۔ گورکھ کے ساتھ کئی دوسرے ملازم بھی تبادلے پر گورکھ پور آئے تھے اور وہ بھی رہنے کا ٹھکانا تلاش کر رہے تھے۔

گورکھ کو ایک نیا تعمیر شدہ گھر پسند آیا۔ مکان اچھا تھا۔ نیا محلّہ تھا' لیکن بجلی کی سپلائی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ جب گورکھ نے گھر کرائے پر لیا تو اسی بھروسے پر لیا کہ ایک مہینے کے اندر اندر بجلی کا کنکشن لگ جائے گا۔ پھر ایک دن میرٹھ سے ٹیلی گرام آیا کہ دوسری اولاد بھی لڑکا پیدا ہوا ہے۔ چند روز بعد گولی کا خط آیا۔ تفصیل سے لکھا تھا کہ وقت سے ایک ماہ پہلے پیدائش ہو جانے کی وجہ سے بچہ بہت کمزور ہے پیدائش کے وقت وزن صرف پانچ پونڈ تھا۔

گولی کے خطوں کا سلسلہ جاری رہا۔ "چھوٹے کا وزن آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ اس کے لئے خاص نرس کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ خوراک ٹھیک طرح دی جاتی ہے۔ چھوٹا اب تندرست نظر آنے لگا ہے۔ گورکھ پور میں اتنی دیکھ بھال ناممکن ہو جاتی۔"

تقریباً" نو مہینے گزر گئے' نہ گورکھ میرٹھ گیا اور نہ گولی گورکھ پور آئی۔ ان نو مہینوں میں گھر میں بجلی کا کنکشن بھی نہ لگا۔ گورکھ کو انبالہ شہر کی یاد آتی رہتی' جہاں روشنی کا ذریعہ مٹی کے تیل کی لالٹین تھی۔ وہی بچپن کی ہم جولی یہاں بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی' لیکن اسے روشنی کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ صبح کو گھر سے نکل جاتا' شام کو آفس سے نکل کر سڑکوں پر آوارہ گھومتا' شام کا کھانا کھا کر کسی سینما حال میں جا بیٹھتا۔ اس بات سے اسے سروکار نہ تھا کہ فلم کیسی ہے' کتنی بار دیکھی ہے' نئی ہے کہ پرانی' ہندی ہے کہ انگریزی۔ مطلب صرف ہر روز شام کو فلم دیکھنے سے تھا۔ رات کو گھر لوٹتا۔ دو بوتل بیئر پی' مچھر دانی اٹھائی اور سو گیا۔ نو مہینے سے اس نے گھر کی صفائی نہ کی تھی۔ بیئر کی بوتلیں' وہسکی کی بوتلیں' رم کی بوتلیں آنگن میں ٹوٹی پڑی تھیں۔ ان کے لیبل جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھے اور ان کے پرزے کمروں تک چلے آئے تھے۔ گرد و غبار نے رنگا رنگ کانچ کے ٹکڑوں پر مرہم رکھنے کی کوشش تو ضرور کی تھی' لیکن برسات بارہا ان کے زخم تازہ کر دیتی۔ نہ کبھی چارپائی پر لٹکتی مچھر دانی دھلی تھی اور نہ چارپائی پر بچھی چادر۔ جو بھولا بھٹکا مچھر خون چوسنے مچھر دان میں چلا آتا' بری موت مرتا اور اپنی ایک سرخ نشان مچھر دانی کی جالی پر چھوڑ جاتا۔ وہ داغ اندر سے باہر کی طرف حرکت کرتے ہوئے وقت کی گرد کے ساتھ دھندلا جاتے اور تازہ داغوں کی جانب حسرت سے تکتے۔ اسی طرح چادر پر رات کے

خوابوں کی نمی کے نشان کینوس پر ابسٹریکٹ آرٹ کے نمونے پیش کرتے، تخیل کی اڑانوں کی تصدیق کرتے، ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے، مغرور آنکھوں سے جھانکتے۔

گورکھ نے ایک دن بھی گھر میں کھانا نہ پکایا اور شراب کے سوا گھر میں پینے کی کوئی چیز نہ لایا۔ جہاں بھی زبان کی لذت محسوس ہوئی، وہیں کھانے بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ کسی خاص ریستوراں میں تلی مچھلی اچھی ملتی ہے تو وہ کھالی۔ کہیں گوشت اچھا پکتا ہے تو وہاں پہنچ گیا۔ کہیں مٹھائی لذیذ بنتی ہے تو چار میل کا سفر طے کر کے وہاں جا دھمکے۔ جو اچھا لگا، کھالیا۔ جتنی مقدار میں چاہا، کھالیا۔ رات کو شراب کی دو اسب کچھ ہضم کرا دیتی۔ کینوس اور برش، بکسوں میں قید، آزاد ہونے کی راہ تکتے۔ کتابیں گورکھ کی نظروں کا لمس پانے کو بیتاب رہتیں۔ گھر کا دیگر ساماں کمرے کی چھت تک بکسوں میں بند سسکتا رہتا کہ کب رہائی ہو۔ اور گورکھ گھر کی ویرانیوں میں پناہ ڈھونڈتا۔ اگر گھر میں اندھیرا ہے تو کیا ہوا؟ اچھا ہی ہے کہ بجلی کا کنکشن ابھی تک نہ لگا۔ گھر میں گھستے ہی وہ کسی ویران خانقاہ میں پہنچ جاتا، جہاں کسی نے مدت سے چراغ روشن نہ کیا ہو۔

ایک دن گولی کا خط آیا۔ ”چھوٹا اب صحت مند ہو گیا ہے۔ پانچ مہینے ہونے کو آئے تم نے اس کا مونہہ بھی نہیں دیکھا۔ اسے دیکھنے کب آرہے ہو؟“

گورکھ ایسے ہی خط کے انتظار میں تھا۔ اس نے میرٹھ جانے کی تیاری کرنے سے پہلے گھر کا حلیہ ٹھیک کیا۔ سارا سامان کھول کر سجا دیا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر چپکائے ہوئے اخبار کے کاغذ اتار کر پردے لٹکا دئے۔ آنگن سے کانچ کے ٹکڑے اٹھاتے وقت اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ بوتل کی بھی کیا زندگی؟ نشہ ختم، زندگی ختم۔ انسان کی حالت بھی بوتل سے بہتر تو نہیں۔ سانس ختم، احساس ختم۔ ان ہی بوتلوں میں کبھی متوالی شراب پلتی تھی اور آج انہیں قبر بھی نصیب نہیں۔ آخر یہ وہ جسم ہیں جن کے نشے نے اسے تصورات کے ہنڈولے میں جھلایا تھا۔ یہ وہ پیکر ہے جن کا حسن اس نے اس نے دانستہ سینے میں اتارا تھا۔

میرٹھ روانہ ہونے سے چند روز قبل گھر میں بجلی کا کنکشن لگ گیا۔

گولی اور دو معصوم، خوب صورت، پیارے پیارے بچے۔ چھوٹے کا نام سمر رکھ دیا گیا تھا۔ روز بروز بچوں سے گورکھ کا پیار بڑھتا گیا۔ جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے، اور بھی نکھرتے گئے۔

ایک روز گولی نے تشویش ناک لہجے میں کہا : ”امر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ہماری کوٹھی کے قریب جو ڈاکٹر گھوگھا رام رہتے ہیں، اس رات وہ گھر پر موجود تھے۔ امر سو رہا تھا کہ سوتے ہوئے اس کے مونہہ سے جھاگ نکالنے لگا اور وہ ہاتھ پاؤں پٹخنے لگا۔ گھوگھا رام کو شک ہوا کہ لڑکے کو کہیں مرگی نہ ہو۔“

گورکھ، گھوگھا رام سے بخوبی واقف تھا۔ کسی زمانے میں وہ آنکھوں کی بیماریوں کا علاج کرتے تھے، لیکن کسی بھی مرض کے بارے میں اپنی رائے دینے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ ہیرالال کے پڑوسی ہونے کے ناطے

انہیں اکثر بلا کر صلاح و مشورہ کر لیا جاتا۔ ہیرالال اور گولی کو گھوگھا رام کی تشخیص پر بورا اعتماد تھا۔

گورکھ نے گولی کی تشویش دور کرنے کے لئے کہا "سوتے سوتے عموماً" بچے مونہہ سے رطوبت اور دودھ خارج کرتے رہتے ہیں۔ امر قدرتی طور پر بے چین رہتا ہے۔ یہ کوئی ایسی پریشان کن بات نہیں ہے۔"

گولی کو اس کے جواب سے اطمینان نہ ہوا۔ "کبھی تو میری بات پر دھیان دیا کرو۔ ہمیں اس معاملے میں بے پرواہی نہیں برتنی چاہئے۔"

امر کو گھوگھا رام کے ایک اسپیشلسٹ دوست کو دکھا دیا گیا۔ کافی جانچ کے بعد اس نے کوئی خاص دوا تجویز کر دی۔ امر کو دوا شروع تو کروا دی گئی لیکن ڈاکٹر کی تشخیص سے گورکھ کا دل مطمئن نہ ہوا۔ اس نے بچپن میں اپنے والد کی چارپائی کے گرد چکر لگائے تھے' تا کہ ان کی بیماری دور ہو جائے' چاہے وہ خود بیمار ہو جائے ویسے ہی چکر اس نے امر کی چارپائی کے گرد لگائے اور بھگوان سے پرارتھنا کی : "میرا دماغ تو پہلے سے ہی صحیح راہ نہیں چلتا۔ اگر اور بہک جائے تو شاید بہتر ہو۔ اے ایشور' جو بھی امر کے سر میں وبا یا بلا پوشیدہ ہے وہ رات کی رات اس کی پیشانی سے ہو کر میرے سر میں اتر آئے۔"

گورکھ نے سچے دل سے منت مانگی تھی۔ صبح اٹھتے ہی گولی کہنے لگی : "سری نگر ہسپتال کی جاہل لیڈی ڈاکٹر نے پیدائش کے وقت امر کا سر قینچی سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا تھا۔ ایسے موقع پر تو آپریشن کر کے بچہ نکالنا چاہئے۔ ضرور بچے کا نازک سر کہیں نہ کہیں سے دب گیا ہے۔"

امر کو جیسے اپنی منت قبول ہونے پر کامل یقین تھا۔ کہنے لگا "تم دیکھنا کہ چند روز میں امر بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"وہ کیسے؟" گولی نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں کہ میرا دل صدا دے رہا ہے۔" گورکھ نے سادگی سے جواب دیا۔

تمہارا دل تو ہر وقت کچھ نہ کچھ شور شرابا کرتا رہتا ہے!" گولی نے اس کی ہنسی اڑائی۔

گورکھ نے محسوس کیا کہ امر نہایت ذہن ہے اور دوا کھلانے سے وہ کچھ ست ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر سے گورکھ کی دوبارہ ملاقات ہوئی تو گورکھ کو ایسا لگا کہ ڈاکٹر لالچی ہے۔ ممکن ہے خواہ مخواہ دوا کھلا رہا ہو۔ لہٰذا گولی کی رضامندی کے بغیر گورکھ نے امر کی دوا بند کر دی۔

گورکھ کے پتاجی نے کار خرید لی اور اپنا اسکوٹر گورکھ کو بھیج دیا۔ سائیکل سے رشتہ توڑ کر گورکھ نے اسکوٹر سنبھال لیا۔ دونوں بچوں اور گولی کو اسکوٹر پر بیٹھا کر وہ دور دور تک سیر کو نکل جاتا۔ امر آگے کھڑا ہو جاتا اور سمر گولی کی گود میں بیٹھ جاتا۔ فوٹو لینے کے لئے کیمرہ ضرور ساتھ ہوتا۔ گولی کے ہمراہ امر اور سمر کی بھی تصویریں اتارنے میں گورکھ کو خاص لطف آتا۔

آفس میں گورکھ کی لیاقت کی دھاک جمی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ کمپنی کے ملازم اور اس کے افسر ٹیکنیکی معاملوں میں اس کی رائے لینے لگے۔ کوئی مشکل کام پڑتا تو اسے یاد کیا جاتا۔ کمپنی نے چار کمروں کا خوب صورت بنگلا رہنے کے لئے دے دیا۔ رفتہ رفتہ گھر میں خوب صورت ساز و سامان کا اضافہ ہو تا گیا۔ گولی ضرورت سے زیادہ صفائی پسند تھی۔ اس لئے باقی ملازموں کے گھروں کی نسبت ان کے بنگلے کی گھر کی آرائش اور بھی دل کش لگتی۔

وقت کے ساتھ ساتھ گولی اور گورکھ ساری کالونی میں مشہور ہو گئے۔ قابلیت کا غرور رفتہ رفتہ گورکھ کے روز مرہ کے برتاؤ سے جھلکنے لگا۔ گولی سب سے اچھا سلوک کرتی۔ محلے کی عورتیں اس سے دوستانہ تعلق رکھتیں۔ لیکن گورکھ ہمیشہ کی طرح تنہا رہتا۔ وہ سب کے ساتھ ایک فاصلہ قائم رکھتا۔ کچھ لوگ ضرور اس کے قریب آئے، لیکن وہ کسی سے بھی کھل نہ سکا۔ دوستی کے نام پر ایک ساتھ کھانا کھالیا، سیر کرلی آفس کی سیاست پر گفتگو کرلی اور بس۔ دوستوں کی رفاقت میں لٹکتے ہوئے خلا کے احساس کو گورکھ کبھی نہ بھول سکا۔

زندگی اسی طور کٹ رہی تھی کہ ایک روز گورکھ کے پیٹ میں زور کا درد اٹھا۔ وہ حاملہ عورت کی طرح پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے پیٹ میں کوئی پتھر بھر کر بلا رہا ہے۔ بارہ گھنٹے درد کی شدت اور اسہال سہنے کے بعد بھی کمپنی کے ڈاکٹر کی دوا بے اثر ثابت ہوئی۔ دو دن تک وہ بستر سے لگا رہا، پھر طبیعت اپنے آپ سنبھلنے لگی۔

ابھی ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ دوبارہ ایسا ہی دورہ پڑا۔ کافی ٹیسٹوں کے بعد بھی بیماری کا کچھ علم نہ ہو سکا۔ گورکھ نے سوچا کہ جو بد پرہیزیاں وہ برسوں سے کرتا آیا ہے، یہ ان ہی کا نتیجہ ہے۔ آخر بے میل غذائیں کب تک شراب کے نشے میں حل ہو سکتی ہیں؟ ضرور شور مچائیں گی، خاص طور سے جب انہیں بے وقت، بے وجہ پیٹ میں نظر بند کیا گیا ہو۔ اس نے رفتہ رفتہ پیٹ کو ان سب غذاؤں سے آزاد کر دیا۔ گوپال داس ان دنوں کان پور میں تھے۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے بہت سے معائنوں کے بعد گورکھ کو صلاح دی کہ دودھ، گھی، مکھن بھی بند کر دیا جائے۔ چھ مہینے گزر گئے اور گورکھ کا وزن پندرہ پونڈ کم ہو گیا، لیکن درد کا شجر اپنی جڑیں پھیلاتا گیا۔ بے وقت، بے وجہ، بغیر اطلاع دئے حملہ بول دیتا اور بے دم کر جاتا۔

گورکھ سوچنے لگا کہ ضرور اس کے پیٹ میں ایسی کوئی خرابی پیدا ہو چکی ہے جو کہ بہت پیچیدہ ہے، اس لئے ڈاکٹر لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ جس کو دکھاؤ وہ کوئی نئی ہی بات کرتا ہے۔ کوئی بھی ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر سے متفق نہیں۔ یعنی سب صرف اندازے لگا رہے ہیں۔ اتنی ترقی کے باوجود بھی موجودہ میڈیکل سائنس کئی معاملات میں اندھیرے میں بھٹک رہی ہے۔ یوں ڈاکٹر بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ گورکھ نے وید، حکیم، ہومیو پیتھ اور قدرتی علاج کرنے والے بھی آزما ڈالے، لیکن درد کی جڑ تو دور رہی، پتوں تک پر اثر نہ ہوا۔

ایک سال گذرنے کو آیا۔ گورکھ کے پچیس پونڈ وزن کی جگہ درد نے اختیار کرلی۔ آفس کا کام کرتے وقت

اسے کم زوری محسوس ہونے لگی۔ جتنا کھانا کم کیا' اتنا ہی اور کم ہوتا چلا گیا۔ اگر زبان کی لذت پر قابو نہ رہا اور ایک لذیذ نوالہ نگل لیا تو یہی ڈر کہ بگڑے دماغ کے درد کو دعوت نامہ بھیجا جا رہا ہے۔ ڈاکٹروں نے نئی نئی دواؤں کی آزمائش کر ڈالی' لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔" جب چالیس پونڈ وزن ہوا ہو گیا تو ڈاکٹر کہنے لگے : "دق ہو سکتی ہے۔" کیا خوب کہ درد نئے انداز سے رفتہ رفتہ جال پھیلا رہا ہے اور زندگی پر قبضہ کر رہا ہے۔ آخر فیصلہ کیا گیا کہ کسی اچھے ہسپتال میں داخل ہو کر سراغ لگایا جائے کہ وہ آفت ہے تو کیا ہے' جس کی گرفت روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے' جو ڈیڑھ سال کے پرہیز کے بعد بھی باہر نکلنے کا نام نہیں لیتی' چنانچہ گورکھ دہلی میں لابھ رام ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ تین ہفتے تک معائنہ چلتا رہا۔ جسم کی باہر نکلنے والی غلاظتوں اور رطوبتوں اور اندرونی اجزا کا معائنہ بے سود نکلا۔ گورکھ سوچتا کہ وہ ایک پن کشن ہے جو آتا ہے سوئی چبھو جاتا ہے۔ یا کوئی ٹکڑا نکال لیتا ہے' لیکن بے درد درد کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتا۔ اس کی ناامیدی بڑھتی گئی اور مرض لاعلاج ثابت ہونے لگا۔ گورکھ سوچنے لگا کہ اس کے آخری دن آگئے ہیں۔ زندگی کا کیا بھروسا؟ جو کچھ زندگی سے حاصل کرنا ہے کر لیا جائے۔

ایک دن آپریشن کے ذریعہ گورکھ کے پیٹ سے آنت کا ایک حصہ نکال لیا گیا۔ گولی ہسپتال میں ٹھیری ہوئی تھی۔ آپریشن کے دو دن بعد دونوں سینما دیکھنے چلے گئے۔ فلم میں سیکس کا رنگ کافی نمایاں تھا۔ گورکھ واپس ہسپتال آیا تو گولی سے بے تابانہ ہم آغوش ہو بیٹھا۔ ملن سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ گورکھ نے دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر روبرو کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ "بغیر اجازت ہسپتال چھوڑ کر جانا منع ہے۔ کہاں چلے گئے تھے؟ تمہیں آرام کرنا چاہئے تھا۔ آنت میں چھید بڑا بھی ہو سکتا ہے اس طرح تم جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔" گورکھ نے صفائی پیش کی : "مجھے تو کسی نے ہدایت نہیں کی تھی کہ آرام ضروری ہے۔"

ڈاکٹر آئندہ احتیاط کرنے کی تاکید کر کے رخصت ہوا تو گولی بولی۔ "تمہیں ملن بالکل بند کر دینا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ یہی درد کی وجہ ہے۔ اسی سے نقصان ہو رہا ہے۔"

"میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔" گورکھ نے اپنی چلائی۔

"تو ڈاکٹر سے رائے کیوں نہیں طلب کرتے؟" گولی نے کہا۔

"ڈاکٹر سے کچھ کہنے کی ضرورت میں محسوس نہیں کرتا۔ یہ بات الگ ہے کہ آج کل سرعت انزال کا شکار ہو گیا ہوں' کیونکہ چالیس پونڈ وزن درد کے سپرد کر چکا ہوں۔" گورکھ بولا۔

"مجھے تو ہر دم تمہاری صحت کا خیال رہتا ہے۔" گولی کی آواز میں تشویش نمایاں تھی۔

"فکر نہ کرو۔ مروں گا تو تمہارے دامن سے لپٹ کر۔" گورکھ نے ہنس کر کہا۔

درد کا معاملہ تو ڈاکٹروں کی سمجھ میں خاک نہیں آیا' لیکن پھر بھی انہوں نے بارود بھری گولیاں یعنی (اینٹی

بایوٹک گولیاں) کھانے کی صلاح دی۔ جس بے درد نے چہرہ دکھانے سے بھی انکار کردیا اس کا علاج کیا ہوتا؟ ڈاکٹروں نے سوچا ہوگا جب قتل عام ہوتا ہے تو یہ کہاں دیکھا جاتا ہے کہ کس پر چھری چل رہی ہے۔ یہ گولیاں پیٹ میں اترتے ہی قتل عام مچادیں گی۔ ہر قسم کے جراثیم کا صفایا ہوجائے گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ گولیاں پیٹ میں اتاری جاتیں' ہیرالال ایک تجویز لے کر آئے۔ ٹوماٹر نام کے ایک گاؤں میں ایک وید رہتا تھا۔ مشہور تھا کہ اس کے پاس پیٹ کے تمام امراض کی ایک قدیم دوا موجود ہے۔ بس دوا اندر اور پوشیدہ درد پھڑ پھڑاتا باہر۔ نکلتے ہوئے پتہ بھی نہ دے گا کہ کس راستے سے رخصت ہوا۔ ان سب خاصیتوں کے باوجود پرہیز ضروری تھا۔ یعنی بیس دن دوا کھاؤ اور صرف لسی پیو۔ اناج کا ایک دانہ' چائے کا ایک گھونٹ بھی مضر۔ شرط کڑی تھی' لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ وید کا دعویٰ تھا کہ علاج کے دوران درد سر اٹھانے کی جراءت نہ کرے گا اور اس قدر پرہیز کے باوجود بھی وزن بڑھے گا۔

گورکھ میرٹھ میں ہی ٹھیر گیا۔ گھر میں دودھ' گھی' دہی اور لسی کی کمی نہ تھی۔ روزانہ تازہ مکھن تیار ہوتا۔ لسی غریبوں میں تقسیم کردی جاتی۔ اب وہ گورکھ کے کام آتی۔ پانچ دن بعد گورکھ قسمت کو کوستا' درد کو دعوت نامہ بھیجنے لگا۔ "اے غیبی درد! اپنا جلوہ دکھا' تا کہ اس علاج سے چھٹکارا حاصل ہو۔" آخر ایک دن درد نے فریاد سن لی اور علاج کے دسویں دن زور شور کے ساتھ حاضر ہوا۔ گورکھ کو علاج برخواست کرنے کا اچھا بہانہ ملا۔ اور وہ دال روٹی پر بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑا۔ باقی رہ گئیں بارود بھری گولیاں جو ڈاکٹروں نے تجویز کی تھیں۔ ان کے پٹاخے بھی بجالئے گئے۔ ایک ماہ لگا تار گولیاں جراثیموں کا صفایا کرتی رہیں' مگر درد کا فرشتہ بچ نکلا۔ گورکھ نے باقی گولیاں مکان کے باہر کھلی نالی کے سپرد کردیں۔ اس نے اپنے آپ سے کہا : "درد میرے پیٹ میں نہیں' میرے دماغ میں ہے۔ دماغی درد ہی پیٹ میں جابسا ہے۔ پیٹ سے اٹھنے والی ہر صدا کو دماغ غور سے سنتا ہے۔ ہر ادا کو عاشق کی نظروں سے دیکھتا ہے' ہر جنبش پر لٹو ہوجاتا ہے۔ اگر دماغ کو پیٹ سے باہر نہ نکالا تو ان کا باہمی تفرقہ ختم ہوجائے گا اور میں لمبی تان کر سو جاؤں گا۔" زندہ بچنے کے لئے ان دونوں کے عشق کا خاتمہ ضروری ہے۔ لیکن یہ خاتمہ ہو تو کیوں کر ہو؟ کیسے ان دونوں میں فساد کرایا جائے؟ دماغ کہتا ہے کہ اگر دو گھونٹ شراب بھی پی لی تو یقیناً" موت ہوجائے گی۔ اول اسی کو غلط ثابت کرنا چاہئے۔" اور گورکھ دو گھونٹ نہیں آدھی بوتل بیئر پی گیا۔ ڈیڑھ سال بعد پیٹ کو شراب کا وصل حاصل ہوا تھا۔ پیٹ خوشی سے جھوم اٹھا اور دماغ نہ نہ کرتا اسی سرور میں ڈوب گیا۔ گورکھ نے سوچا کہ جب درد ظاہر ہوگا دیکھا جائے گا۔ ہر روز تو شکل دکھاتا نہیں۔

چند ہفتے اسی طور گزر گئے۔ درد بے پاؤں آیا تو سہی' لیکن وہ پہلا سا زور و شور نہ رہا۔ جیسے جیسے گورکھ پیٹ کی مانگیں پوری کرنے لگا' درد بے دم ہونے لگا۔ پھر اٹھا تو ایسا لگا کہ آخری دم بھر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ آخری ملاقات ہو۔ جو گم نام تھا' گم نام ہی رہا۔ بارہا دماغ کو بھرماتا اور پیٹ کو للچاتا' لیکن دونوں کو اپنی اپنی جگہ

اپنے کام میں مصروف پاتا۔ دونوں کے درمیان جدائی ہو چکی تھی۔ چنانچہ گورکھ کی بجائے درزدالٹے مونہہ بستر مرگ پر سو گیا۔

گورکھ اور گولی کی شادی کو سات سال کا عرصہ گزر گیا' مگر زندگی پر سکون نہ ہو سکی۔ شاید زندگی اسی لئے زندگی ہے کہ انسان کو مکمل اختیار کسی شے پر نہیں۔ مکمل محض قیاسی ہے' ادھورا پن حقیقی ہے۔ ہر جذبہ اگرچہ کسی پایہ تکمیل کو پہنچنا چاہتا ہے' لیکن جتنا آگے بڑھو' منزل اتنی ہی دور کھسکتی جاتی ہے۔ ان سات برسوں میں گولی کے لئے میرٹھ کی کشش ذرا بھی کم نہ ہوئی۔ سال میں دو یا تین چکر ضرور لگتے۔ امر اور سمر بھی چلے جاتے۔ گورکھ نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ میرٹھ کو لے کر پہلے جیسی تکرار نہ ہوتی۔ گورکھ سمجھ گیا کہ وہ گولی کو کسی حالت میں میرٹھ جانے سے نہیں روک سکتا۔ اس لئے جب بھی گولی کا دل چاہتا' وہ اسے بخوشی روانہ کردیتا۔ گولی کو اکیلے سفر کرتے ہوئے قطعی خوف یا جھجک محسوس نہ ہوتی۔ ایک طرف سے ریل گاڑی میں بیٹھا دیا جاتا اور دوسری طرف اتار لیا جاتا۔

گورکھ سے اس سلسلے میں کبھی کوتاہی نہ ہوئی۔ گولی نے کبھی محسوس نہ کیا کہ گورکھ اس کے ہجر میں کس قدر تنہائی محسوس کرتا ہوگا۔ گورکھ نے بھی اس بات کا ذکر چھوڑ دیا۔ جب بھی گولی کا میرٹھ جانے کا پروگرام بنتا' وہ رضامندی کا اظہار کردیتا۔ اگرچہ اس کی رضامندی اور نارضامندی کے کوئی معنی نہ تھے۔ بیوی بچوں کو ریل کے ڈبے میں چڑھا کر' سامان ٹھیک طرح لگا کر وہ گارڈ کی ہری جھنڈی اور سیٹی کا منتظر رہتا۔ وہ گولی' امر اور سمر سے بغل گیر ہوتا۔ جب گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگتی تو وہ ڈبے سے نیچے کود پڑتا اور حسرت بھری نگاہوں سے ریل گاڑی کو پلیٹ فارم سے سرکتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ گولی دروازے پر کھڑی ہو کر ہاتھ ہلاتی یا کھڑکی سے ہاتھ نکال کر رومال لہراتی۔ جیسے ہی گاڑی رفتار پکڑتی اور دوریاں بڑھتی جاتیں' گورکھ گم صم گاڑی کے آخری ڈبے کو کھسکتا ہوا دیکھتا رہتا' یہاں تک کہ وہ نظر سے اوجھل ہو جاتا۔ گورکھ محسوس کرتا کہ وہ پلیٹ فارم پر ہے' لیکن دل ریل گاڑی کے ڈبے میں قید ہے۔ وہی ڈبا جس میں گولی سفر کر رہی ہے۔ گولی سیٹ پر موجود ہے' لیکن اس کے دل کی جانب اس کی کوئی نظر نہیں۔ وہ میرٹھ کے خوابوں اور والدین سے ملنے کی خوشی میں خوش ہے۔ دل پگھلتا ہوا' سیٹ کے نیچے سرکتا ہوا۔ فرش پر آجاتا ہے اور گولی سے نظر ملانے کی کوشش کرتا ہوا' فرش کی درار سے ٹپک پڑتا ہے۔ اب لوہے کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ ہے اور وہ کسی پہیئے کی کمانی پر اٹکا ہوا ہے۔ زوردار گردشوں کی وجہ سے لوہے کی پٹڑی پر گر پڑنے کا خطرہ ہے لیکن اوپر اٹھنے کی طاقت بھی موجود نہیں۔ گردشوں سے جب حواس گم

ہو جاتے ہیں تو بوند بوند ریل کے پہیئے پر ٹپک پڑتا ہے اور ریزہ ریزہ ہو کر ریل کی پٹڑی سے چپک جاتا ہے۔ سینہ دل سے خالی ہے، مگر سانس کی آمدورفت ضرور جاری ہے۔

گورکھ اس کیفیت کو کبھی سمجھ نہ سکا۔ کتنے لوگ شادی شدہ ہیں، لیکن اس کی طرح تو نہیں ہیں۔ یہ کیا، صورت دیوانگی ہے؟ وہ تو ہر شے کے ساتھ دو قدم چل کر لوٹ آتا تھا۔ ہر چمکتی شے کا آرزومند ضرور تھا، لیکن کوئی چیز اسے قید نہ کر سکی تھی۔ ہر رو کے ساتھ ضرور بہا تھا، لیکن لہریں اسے دور تک نہ لے جاسکیں تھیں۔ وہ کیا ہے جو اس کی شخصیت کو مکمل باندھ کے رکھ سکے؟ وقت ہر چیز، ہر جذبے، ہر ارمان، ہر ضرورت کی صورت بدل دیتا ہے۔ بارہا ہزاروں ارمان کروٹیں بدلتے رہے۔ کیسے کیسے خواب سجائے۔ لیکن آج زندگی آگے نکل آئی۔ ان ارمانوں اور خوابوں میں اگر دوبارہ گزر کی جائے، تو وہ شوخی کہاں، وہ رنگینی کہاں؟ اگرچہ ان دھڑکنوں کی یاد اب بھی ذہن کے کسی گوشے میں پوشیدہ ہے، لیکن ان میں اب وہ چمک کہاں؟ ماضی کے وہ فروزاں ستارے وقت کی گرد میں چھپ گئے۔ دل اگر کہیں اٹکا بھی تو گولی پر، اور سات سال سے اسی طرح اٹکا ہوا ہے۔ اگرچہ وہ حالات کو اچھی طرح سمجھ گیا ہے، گولی کو بہتر جانتا ہے، سمجھتا ہے کہ اسے کیا پسند ہے، کیا ناپسند ہے، اس میں کتنی خوبیاں ہیں، کتنی خامیاں ہیں، لیکن اس آگاہی کا اس کے دیوانہ پن سے کیا تعلق؟ کیا سروکار؟ کیا رشتہ؟ اگر گولی جو ہے، وہ نہ ہو کر کچھ اور ہوتی تو کیا دیوانگی کچھ کم ہوتی؟ جہاں تک اس کے دل کا سوال ہے گولی جو ہے وہ ہے۔ اس کے جیسی اور کوئی نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔ اگر دل یہ سب مانتا ہے تو گولی جو کرے اور کہے، سب واجب ہے۔ اسے گولی کی جدائی ہنستے ہنستے برداشت کرنی چاہئے۔ یوں خود کو مٹی میں نہیں ملانا چاہئے۔ دل کو ریل کی پٹڑی پر نہیں ٹپکانا چاہئے۔ اگر دل میں تصویر یار ہے تو وصل دائم ہوا۔ یہ اداسی، یہ غم کی گھٹائیں کیوں؟ ہجر کی رات اتنی سیاہ کیوں؟ جدائی کی شامیں اتنی ویران کیوں؟ دل کا شکیب کہاں کھو جاتا ہے؟ کیوں کھو جاتا ہے؟ دوریاں کیوں پہروں رلاتی ہیں؟ یہ دھڑکنوں کی بڑھتی رنجشیں کیوں نالہ کش ہیں؟ یہ غم کے ابر کیوں چھائے ہیں؟ محبت میں کیا کمی ہے؟ کیوں وہ گولی کی جسمانی نزدیکیاں چاہتا ہے؟ کیوں وہ روحانی نزدیکیوں پر اکتفا نہیں کرتا؟ بہت دیر تک وہ خود سے گفتگو کرتا رہتا۔ اپنے دل، اپنے جذبات، اپنی دیوانگی کی تہہ تک پہنچنا چاہتا، ان کا تجزیہ کرنا چاہتا، مگر الجھنوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ ہر شے کو خدا نے ایک فطرت بخشی ہے۔ ہر شے ایک دوسرے کو کھینچتی، توڑتی یا جوڑتی ہے۔ ایک دوسرے کی زندگی اور موت کا دارومدار کس قدر باہمی نزدیکیوں پر منحصر ہے۔ ذرہ ذرہ کسی نہ کسی تلاش میں گام زن ہے۔ پر سکون کوئی شے نہیں۔ مکمل وصل، مکمل سکون فقط مرگ ہے۔ اگر پروانہ شمع پر مرمٹتا ہے تو اس میں شمع کا کیا قصور؟ شمع تو پروانے کو دعوت نامہ نہیں بھیجتی؟ پروانے کے علاوہ اور بھی اڑنے والے پتنگے ہوتے ہیں۔ وہ تو شمع پر نہیں جل مرتے۔ صرف پروانہ ہی کیوں جل مرتا ہے؟ شمع کا کام ہے جلنا۔ وہ تو جلے گی ہی۔ اسی طرح پروانے کا کام ہے مرمٹنا، اس لئے وہ مرے گا ہی۔ جس نے شمع کو جلنا سکھایا، اس نے

پروانے کو مرنا سکھایا۔ یہ صرف اپنے اپنے دل کی بات ہے کہ کون کس پر مرمٹے۔ اس کا تجزیہ مشکل ہی نہیں ' نا ممکن ہے۔ انسان ہر روز کتنے چہرے دیکھتا ہے ' کتنے لوگوں سے ملتا ہے ' کتنی شخصیتوں سے ٹکراتا ہے۔ لیکن دل پر کوئی اثر نہیں محسوس کرتا۔ آہ وہ ایک نظر جو سر راہ چلتے چلتے نظر سے ملتے ہی ہزاروں رنگ تصور میں بھر جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسے خرد کی ترازو پر تولنا ہی کاوش ناکام ہے۔

دل کو بہت سمجھانے پر بھی گورکھ کی الجھنیں کم نہ ہوتی۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ گولی کی جدائی سہہ نہیں سکتا تھا۔ یہ حقیقت ایک سوال بن کر جب بھی جواب طلب کرتی ' الجھنیں کچھ اور بڑھ جاتیں اور گورکھ مایوسی کے غار سے نہ بچ سکتا۔ وہاں اندھیرا تھا ' گھٹن تھی ' بے تابی تھی ' تنہائی تھی۔ ان سے دور بھاگنا نا ممکن تھا۔ بادہ کشی کچھ دیر کے لئے ضرور خود فراموشی طاری کرتی ' لیکن وہی خود فراموشی کسی غار میں اور گہرا دھکیل دیتی۔ بار بار ہجر کی اذیت برداشت کرنے سے گورکھ کو تنہائیوں سے محبت سی ہو گئی۔ فطرت سے وہ پہلے ہی تنہائی پسند تھا۔ زمانے کی رنگ رلیوں ' کھیل تماشوں اور قہقہوں میں اسے عجیب سا کھوکھلا پن نظر آنے لگا۔ یکایک ہنستے ہنستے وہ مایوسی اور تنہائیوں کا شکار ہو جاتا۔ پیٹ کے درد کے دورے کی طرح ' مایوسی اور تنہائی کا دورہ ' اطلاع دیے بغیر نازل ہو جاتا اور گورکھ یکایک ماحول سے بے خبر ہو جاتا۔ پہروں دور خلاؤں میں دیکھتا رہتا۔ جسم کی تمام جنبشیں تھم جاتیں۔ اگر کسی شجر کی شاخ پر نظر جم جاتی تو گھنٹوں وہاں سے نہ پلٹتی۔ بڑھتے بڑھتے یہ مایوسی کے دورے گولی کی موجودگی میں بھی پڑنے لگے۔ گولی اگر پوچھتی "کیا سوچنے لگے؟" تو وہ چونک اٹھتا اور "کچھ نہیں" کہہ کر خاموش ہو جاتا۔

پیشہ وارانہ زندگی میں گورکھ نے کبھی کوتاہی نہ کی۔ کمپنی نے اس کی لیاقت اور کام میں خوش اسلوبی کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے چھوٹی عمر میں ڈپٹی چیف انجینئر کا عہدہ عطا کر دیا۔ رہنے کے لئے خوب صورت بنگلہ ملا۔ بنگلے کے پچھلے حصے میں نوکروں کے رہنے کے لئے علیحدہ کمرہ ' رسوئی اور غسل خانہ موجود تھے۔ مفت میں رہنے کے لالچ میں گھر کے کام کے لئے نوکر آسانی سے مل جاتے۔ عموماً مرد کوئلے کی کانوں میں کام کرتے اور ان کی عورتیں گھر کا کام سنبھال لیتیں۔ بدلے میں تنخواہ بھی بندھی ہوتی۔ گولی کی غیر موجودگی میں گورکھ کو کھانے پکانے کی اور گھر کی دیکھ بھال کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔ رہن سہن ' پیشہ ورانہ زندگی اور بڑھتی ہوئی لیاقت اور ہنر کی شہرت کے پیش نظر گورکھ کو کامیاب کہا جا سکتا تھا۔ لیکن گورکھ کا دل ہمیشہ بھٹکتا رہتا۔ جیسے زندگی کی بنیاد ہی ہل رہی ہو۔ کہاں بھاگ جائے؟ بے چینی کے عالم میں کہیں نہ کہیں نوکری کے لئے عرضیاں بھیجتا رہتا۔ کئی بار انٹرویو پر بھی بلایا گیا۔ لیکن واپس دگوا ڑی لوٹ آیا۔ دو مرتبہ کہیں دوسری نوکری پر چلے جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ کمپنی

نے تنخواہ بڑھادی یا رتبہ بڑھادیا۔ آفس کا کام تو سبھی کرتے ہیں۔ گورکھ اسے دیوانگی کی حد تک لے بیٹھتا۔ آفس کی کوئی بھی مشکل اس کی ذاتی مشکل بن جاتی اور وہ دل وجان سے اس کا حل ڈھونڈتا۔ دماغی الجھنوں سے اور گولی کی غیر حاضری میں تنہائی کے احساس سے بچنے کا ایک عذر آفس کا کام تھا۔ اس کے علاوہ ہر وقت کسی نہ کسی دوسرے شغل میں مصروف رہنے سے دماغ کو خالی رہنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ چھٹی کے دن وہ رنگ اور برش لے کر بیٹھ جاتا۔ اس کی پینٹنگز میں ایک نیا موڑ رونما ہوا۔ وہ بچپن کی حسینائیں کہیں نہ کہیں جھلکتی ضرور، لیکن ایبسٹریکٹ آرٹ ایک نیا نقش جما گیا۔ فروزاں رنگوں میں پنہاں تاریک غار، شکستہ کانچ کے ٹکڑوں کی نوکوں پر رقصاں شعاعیں، شبنم آلودہ خاروں کی سیمیں ادائیں، سایوں کے دامن میں مبہم شکلیں، میدانوں کی وسعت میں اجنبی نگاہیں، دائرے، لکیریں، زاویے، مثلث، کہسار کے سلسلوں میں پنہاں شباہتیں، بے ترتیب رنگوں کی حسین آمیزش، ایک نظر پر تبسم، ایک نظر پر اشک، زرد آسماں اور نیلے پھول، سمندر کی لہریں اور ریت کے گل، پھٹے جوتے کے ہمراہ گلاب۔۔۔۔ ایک نظر مصوری کے ان بے ترتیب عکسوں کو دیکھ کر اس کا دل ہمیشہ پکار اٹھتا : یہ کیا بناڈالا؟ یہ تو وہ نہیں جو خواب وخیال میں پوشیدہ ہے، دل کے کسی گوشے میں آباد ہے۔ یہ کیا ہے؟ آہ گورکھ! یہ تیرے تخیل، تیرے احساس، تیرے تصور، تیرے دل کی جھلک تو نہیں۔ یہ سب افکار تجھ سے کہیں جدا ہیں۔ یہ کیا خاکے کھینچ رہا ہے؟ پھر یکایک گورکھ کو ان سوالات سے کوئی سروکار نہ رہتا۔ وہ ایک رنگ پر دوسرا رنگ چڑھادیتا۔ تصویر کا مضمون ہی بدل ڈالتا۔ یہ نقوش، یہ رنگ، یہ خاکے، یہ افکار سب اس کے قبضے میں ہیں۔ یہ کتنے بے زبان ہیں۔ وہ جب چاہے ان کی ہستی مٹا سکتا ہے، ان کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ وہ ان کا جنم داتا ہے، ان میں روح پھونک سکتا ہے، ان کی جان لے سکتا ہے۔ کتنی طاقت ہے اس کے برش میں بھرے رنگوں کی ایک جنبش میں!

ڈاکٹری علاج سے بے زار ہو کر گورکھ نے خود ڈاکٹر بننے کی ٹھانی۔ سوچا کیوں نہ ہومیوپیتھی کی تعلیم حاصل کی جائے؟ ہومیوپیتھی کا مطالعہ زور پکڑتا گیا۔ خط وکتابت کے ذریعہ اس نے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ کھانسی، زکام، بخار، سردرد، جیسی بیماریوں کے علاج میں جب کامیابی حاصل ہوگئی تو اعتماد بڑھ گیا۔ گولی سمر اور رام کو کوئی تکلیف ہوجاتی تو اپنی تجویز کی ہوئی دوا کھلادیتا۔ ایلوپیتھک دوائیں استعمال کرنی قطعی بند کردیں۔ پہلے تو علاج گھر والوں تک ہی محدود رہا، پھر پڑوسی بھی مریضوں میں شامل ہوگئے۔ ان دنوں کئی پیچیدہ بیماریوں کے علاج میں اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ گولی کا سردرد، سمر کا دیرینہ بخار، امر کے ٹانسلز، سب اس کی دواؤں سے سکون پا گئے۔

فوٹوگرافی کا پرانا شوق بھی نئی کروٹیں لینے لگا۔ گولی کو ہر روز نئے انداز سے آرائش کرنی پڑتی، نئے لباسوں میں ملبوس ہونا پڑتا۔ کچھ روز تو گولی کو ماڈل کا رول اچھا لگا، لیکن جلد ہی دل بھر گیا۔ ادھر گورکھ کا شوق بڑھتا گیا۔

اس نے بہت سا فوٹو گرافی کا سامان اکٹھا کر لیا۔ شام کو فوٹو کھینچا' رات کو دھویا اور چھاپا۔ اسی میں صبح ہو گئی۔ آنکھوں میں نیند بھرے آفس چلا گیا۔ اگلے دن شام کو دو رات نیند پوری کرنے کے لئے سو گیا یا آفس سے چھٹی کر لی۔

سیاہ اور سفید فلمیں تو گورکھ کے قابو میں آ گئیں' لیکن رنگین فلم گھر میں دھونی اور چھاپنی مشکل تھی۔ رنگین فلم کے کیمیکل کہیں دستیاب نہ تھے۔ گورکھ کی معلومات کے مطابق وہ باہر کے ملکوں میں آسانی سے مل سکتے تھے۔ فلموں کو گھر میں دھونے اور چھاپ لینے کی کئی وجہیں تھیں۔ پہلی تو یہی کہ وہ گولی کو نوخیز اداؤں میں بے دھڑک فلم پر اتار سکتا تھا۔ کوئی دوسرا اسے نہ دیکھ سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ مصروفیت رہتی تھی' دل چسپی بڑھتی تھی' وقت مزے میں گذر جاتا تھا' راتیں بے چینی کے بغیر کٹ جاتی تھیں۔ دن میں بھی دماغ فوٹو گرافی کی پیچیدگیوں میں پھنسا رہتا تھا۔ کیمرہ کس زاویہ پر رکھا جائے؟ کتنے اونچا یا نیچا رکھا جائے؟ روشنی کس جانب سے پھینکی جائے؟ دائیں سے یا بائیں سے' اوپر سے یا نیچے سے؟ روشنی کو کم اور زیادہ کرنے سے فوٹو کے موڈ پر کیا اثر پڑتا ہے' نقش کس طرح بدل جاتے ہیں۔ لباس اور آرائش' ماحول اور میک اپ فوٹو کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ گورکھ امر اور سمر کے بھی فوٹو کھینچتا' لیکن اس کی فوٹو گرافی زیادہ تر گولی سے شروع ہو کر گولی پر ختم تھی۔ فوٹو گرافی کا دوسرا کوئی موضوع' کوئی کردار نہ تھا۔ کاش وہ رنگین فلم کو بھی اسی طرح قابو میں کر لے جس طرح اس نے سفید اور سیاہ فلم کو کر لیا ہے۔ فوٹو گرافی کے متعلق بہت سی کتابیں اس کے پاس اکٹھی ہو گئیں۔ رنگین فلم کو کس طرح دھویا اور چھاپا جا سکتا ہے' یہ اسے تھیوری کی حد تک بخوبی معلوم ہو گیا۔ کمی تھی تو فقط سامان کی۔

ایک روز رات کو فلمیں دھوتے دھوتے گورکھ سوچنے لگا کہ کیوں نہ سینما کی طرح چلتی پھرتی فلم بنائی جائے۔ وہ ہیرو ہو گا اور گولی ہیروئن۔ کتنا مزہ آئے گا جب وہ خود کو سینما کے اسکرین پر دیکھیں گے۔ وہ ایک ایسی فلم بنائے گا جو زندگی میں ہمیشہ یادگار بن کر زندہ رہے گی۔ وہ فلم اس کی محبت کی تصدیق ہو گی۔ ہر خیال ایک ابتدا ہے' تاہم اسے عملی جامہ پہنانا مشکل ہوتا ہے۔ اگر مشکلات بڑھتی جائیں تو شوق ہار جاتا ہے۔ گورکھ کیمرہ اور پروجیکٹر خریدنے کی تاک میں رہتا۔ بازار میں یہ سامان نہیں مل سکتا تھا۔ کوئی شخص باہر کے کسی ملک سے خرید کر لایا ہو اور فروخت کر رہا ہو تو حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس نے اخباروں میں اشتہاروں کے ذریعہ کیمرہ اور پروجیکٹر خرید لیا۔ اس طرح گھر کی فلموں کی ابتدا ہوئی۔ فوٹو گرافی کا تمام شوق ایک خرچیلا شوق تھا' لیکن گولی اسے خرچ کے لئے کبھی منع نہ کرتی۔ شادی کے پہلے دو برسوں کو چھوڑ کر گھر کا خرچ چلانے کی ذمہ داری اسی نے سنبھال رکھی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسے گورکھ کی فلم کی اداکارہ بننے کا کوئی شوق نہ تھا۔ گورکھ منت سماجت' چاپلوسی اور کبھی کبھی زبردستی سے گولی کو فلم کے لئے پوز دینے پر راضی کر لیتا۔ جیسے جیسے تجربہ بڑھتا گیا' فلموں میں نکھار آتا گیا۔ مانا کہ وہ فلمیں سینما میں دکھائی جانے والی فلموں کا تکنیکی طور پر مقابلہ نہ کر سکتی تھیں' لیکن گورکھ

اسی میں خوش تھا کہ اس کا چہرہ گولی کے ہمراہ پردہ ء سیمیں پر نمودار ہوگیا۔ اسی طرح وہ دونوں اداکار بن بیٹھے۔ وہی فلم بنانے والے، وہی اداکار، وہی دیکھنے والے۔ اس احساس میں بھی کس قدر لطف تھا۔

آرام و آسائش کے ساتھ ساز و سامان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ گولی پنجاب سے بہترین صوفے، مسہری اور کرسیاں خرید لائی۔ دگواڑی میں بنا ہوا فرنیچر اسے پسند نہ تھا۔ پھر پہلے کولر خرید اگیا، اس کے بعد ایر کنڈیشنر۔ گرم پانی کے لئے گیزر۔ ایک بار گولی میرٹھ گئی تو نئی کار کا تحفہ ساتھ لے آئی۔ مرزاپور سے غالیچے خریدے گئے۔ گولی کو گھر سجانے کا شوق تھا۔ گورکھ بھی پیچھے نہ رہا۔ اس نے وہ بچپن کا فقیری انداز چھوڑ دیا۔ گھر کو صاف رکھنے اور سجانے کا ایسا چسکا لگا کہ گورکھ دیواروں اور دروازوں پر رنگ اور روغن بھی خود کرنے لگا۔ لوگ کہنے لگے کہ "اگر کسی کا خوب صورت گھر دیکھنا ہو تو وہ گولی اور گورکھ کے گھر جائے۔"

امراو سمر دونوں ذہین، ہونہار اور پڑھائی میں ہوشیار نکلے۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہونے لگے گولی کو گھر میں بیٹھنا اکھرنے لگا۔ گھر کے کام کے لئے زیادہ زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔ خادم موجود تھے۔ یکا یک گولی نے اسکول میں نوکری کرنے کی ٹھانی۔ پہلے تو گورکھ کو یہ خیال پسند نہ آیا کہ اس کی بیوی اسکول میں نوکری کرے، لیکن جب گولی نے نوکری شروع کر دی تو دونوں کی شہرت اور بھی بڑھ گئی۔ ایک تو مالی حالت بہتر ہو گئی، دوسرے گولی جلد ہی بہترین استادوں میں شمار ہونے لگی۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کے لئے سفارشیں کرانے کی غرض سے اس کے پاس پہنچ جاتے۔ کچھ ہی دن میں گولی ساری کالونی میں مشہور ہو گئی۔

گورکھ کی قابلیت اور کام سے خوش ہو کر کمپنی نے اسے ایک اور ترقی دی۔ گورکھ کو کاروبار کے سلسلے میں کلکتہ، بمبئی، مدراس اور بنگلور جانا پڑتا۔ اسے جس کام کے لئے بھیجا جاتا، وہ اسے بخوبی مکمل کر کے لوٹتا۔ اس سلسلے میں گورکھ نے آسام سے لے کر گجرات اور کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک تمام ہندوستان کی سیر کر لی۔ پہلی بار جب کاروبار کے سلسلے میں اس نے ہوائی سفر کیا تو پاؤں ہواؤں میں تھے۔ پھر وقت نے کروٹ بدلی۔ اب وہ مہینے میں دو یا تین بار ہوائی جہاز میں سفر کرتا۔ کمپنی کی کار کا ڈرائیور ہوائی اڈے یا ریلوے اسٹیشن پر اس کا منتظر رہتا۔ اچھے ہوٹلوں میں قیام کرتا، بہترین ناچ اور تماشے دیکھتا، لذیذ غذائیں کھاتا، اپنی لیاقت اور مہارت کی وجہ سے سب سے عزت پاتا۔ اس بات کا وہ خاص خیال رکھتا کہ کمپنی کا نقصان نہ ہو اور کارخانوں کے لئے بہترین سامان خریدا جائے۔ کمپنی کے افسر بھی ہر کامیابی پر اس کی کمر ٹھونکتے رہتے۔ اس کی شہرت اس حد تک پہنچی کہ کمپنی کے لئے کئی نامی شخصیتوں کا گورکھ اور گولی سے دوستانہ تعلق قائم ہو گیا۔ عموماً گورکھ صرف کام سے کام رکھتا۔ ماتحتوں اور افسروں کے ساتھ محض دفتری تعلقات رکھتا۔ ذاتی معاملوں کو نہ اٹھاتا۔ ایک خاص دوری برقرار رکھتا مگر گولی دنیادار تھی۔ اسے لوگوں سے برتاؤ کرنا، دوستی لگانا اور دوستی نبھانا خوب آتا تھا۔ گورکھ کی اگر شہرت تھی تو صرف کام کی وجہ سے۔ اپنی عادت کے مطابق وہ ہمیشہ خود کو سب سے الگ مانتا اور دفعتاً الجھ بھی پڑتا۔ اس کے

برعکس گولی بہت سنبھل کر بات کرتی۔ اور ہر ایک کے ساتھ دوستی نبھاتی۔ گورکھ کی دنیاداری کی کمی وہ کسی حد تک پوری کر دیتی۔

شہرت بڑھی تو گولی اور گورکھ روٹری کلب کے ممبر چن لئے گئے، جس سے دنیاوی تعلقات میں اضافہ ہوا۔ چند برس میں گولی اور گورکھ کا نام چیدہ چیدہ لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ کمپنی کے کاروباری تعلقات باہر کے کئی ملکوں سے بھی تھے۔ اٹلی، جرمنی اور جاپان سے انجینئر آتے رہتے تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں کمپنی اپنے کئی ملازموں کو باہر کے ملکوں میں بھیج چکی تھی۔ آخر گورکھ کی بھی باری آگئی۔ دو مہینے تک گورکھ اٹلی، جرمنی، انگلینڈ اور فرانس کے دورے پر رہا۔

گورکھ نے باہر کے ملکوں کے بارے میں کتابوں میں بہت کچھ پڑھا تھا، رسالوں میں تصویریں دیکھی تھیں۔ باہر کے ملکوں کو لے کر اس نے ذہن میں ایک دنیا سجائی تھی۔ روم میں وہ دیوانوں کی طرح گھومتا پھرا۔ جگہ جگہ کی تصویریں اتاریں اور خریدیں۔ ہر جگہ کی تاریخی اہمیت جاننے کی کوشش کی۔ عمارتوں کی تعمیر کو آرٹسٹ کی نگاہ سے پرکھا۔ عجائب گھروں میں وقت گزارا۔ فلمیں دیکھیں، جن میں حسیناؤں کے برہنہ جسموں اور ان کی دل کش اداؤں کی نمائش شامل تھی گورکھ کے لئے باہر کی دنیا ایک نئی دنیا تھی۔ وہاں سیکس کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ سرعام بغل گیری اور بوسہ بازی پہلے تو اسے عجیب لگی، لیکن دیکھتے دیکھتے نیا پن دھندلا پڑ گیا۔ جیسے جیسے وہ یورپ کے ایک ملک سے دوسرے ملک کی سیر کو نکلا، اسے گھر کی یاد آنے لگی۔ اکیلے باہر سیر کرنے کا کیا مزا؟ کاش گولی ساتھ ہوتی! ان حسین نظاروں کا، اس کھلی آزادی کا، ان حسین عمارتوں کا، عجائب گھروں کا، جا بجا بکھری خوب صورتی کا۔ کیا فائدہ؟ اگر گولی ساتھ ہوتی تو وہ بھی کھلی سڑک پر اس کے لب چوم لیتا۔ کھانے پینے میں اسے پہلے ہی کوئی پرہیز نہ تھا۔ مگر ولایتی شراب کا ذائقہ کچھ اور ہی تھا۔ کھانے میں لذت بھی نئی تھی، پھر بھی گولی کی پکائی ہوئی دال روٹی اور ترکاری اسے یاد آنے لگی۔ جب گولی کی زیادہ یاد آتی تو بادہ کشی بڑھ جاتی۔ تصور کے توسن دوڑاتا، گولی کو خط لکھتا، تصویریں کھینچتا۔۔ گولی کو یہ سب نظارے تصویروں کے ذریعہ تو دکھا سکتا تھا۔

دورے کے آخری پندرہ دنوں میں واپس لوٹنے کی بے چینی اس قدر بڑھ گئی کہ وہ دن نہیں، گھنٹے شمار کرنے لگا۔ دو مہینے گزار کر جب وہ واپس دگواڑی پہنچا تو اس کے سوٹ کیس میں نیا کیمرہ، کیمرے کی فلمیں، فلموں کو گھر میں دھونے اور چھاپنے کے لئے کیمیکلز، باہر کے ملکوں کی تصویریں، گولی کے لئے ساڑیاں، چولیاں، خوب صورت لباس، گاؤن، رنگارنگ ربن، سینٹ کی شیشیاں اور دیگر آرائش کا سامان بھرا ہوا تھا۔ ہیرالال نے کافی روپیہ کسٹم ڈیوٹی کے طور پر ادا کیا۔ رنگین فلمیں اب وہ گھر میں تیار کر سکتا تھا۔ تمام سامان موجود تھا۔

گورکھ اب جیسی چاہے، ویسی فلم بنا سکتا تھا۔ کیمیکلز اس کے پاس تھے۔ گولی کے لئے نئے نئے لباس اس کے پاس تھے۔ انگیا، رومال، ربن، انڈرویر۔ البتہ خوش بوئیں فلم پر نہیں اتاری جا سکتی تھیں۔ تاہم فلم کو اتنا

خوب صورت ضرور بنایا جاسکتا تھا کہ جب بھی دیکھا جائے ایک نئی مہک آئے۔ یورپ کے دورے کے بعد گورکھ کا فلم بنانے کا شوق دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا۔ آخر گولی تنگ آنے لگی۔

"مجھے کیا فلم لائن میں بھرتی کروانا ہے' جو پاگلوں کی طرح کیمرے اور فلم کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔" گولی کہتی۔

"جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے' تو جوانی کی یہی یادگار کام آئے گی۔ پھر ہم سفید بالوں والے جھری دار چہرے والے' پوپلے مونہہ والے' چار پانچ دانت نکلوائے' اپنی جوانی کی بہار دیکھا کریں گے۔ گھبراؤ نہیں' ذرا سا اور ساتھ دو۔" گورکھ تسلی دیتا۔

فلم کا موضوع کیا تھا؟ یہی کہ گولی اس سے بہت قریب ہے مگر پھر بھی بہت دور۔ بلندیوں میں پنہاں۔ یادوں کی چلمن میں' طلوع ہوتے ہوئے اور ڈھلتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں' پانی کی لہروں میں' مہتاب کی کرنوں میں۔ گورکھ نے گولی کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی ہے' گولی کے لئے وہ اجنبی ہے۔ گولی کا سایہ بھی نہیں پکڑ سکا ہے۔ جب بھی اسے قریب سے دیکھا ہے' ایک خواب دیکھا ہے' ایک تصور کا تعاقب کیا ہے۔ اس کے ذرا سے مس نے وہ ارماں جگائے ہیں جو زندگی بھر کے لئے جاوداں ہو اٹھے ہیں' وہ بے چینی بخشی ہے' جو لاعلاج ہے' وہ سکون دیا ہے جو لاجواب ہے۔ وہ نئی دلہن کی طرح جب بھی قریب آئی ہے' ایک نیا چراغ روشن ہوا ہے۔ ہزار گل مہکے ہیں۔ ہزار کلیاں چٹکی ہیں۔ لیکن وہ وصال دائمی کیوں نہیں' مکمل کیوں نہیں؟ اس میں کیا کمی رہ گئی ہے؟ وہ پایہء تکمیل کو کیوں نہیں پہنچا؟ گولی کا اس پر کوئی بس نہیں۔ اس کا ذمہ دار صرف گورکھ کا دل ہے۔ گولی آفتاب ہے۔ اگر گورکھ ہی آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے تو اسے روشنی کیوں کر نصیب ہو سکتی ہے؟

شادی کے بعد تقریباً" ایک سال تک گورکھ میرٹھ سے آنے والے تمام خط چوری چھپے پڑھتا تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکیا خط دینے کے لئے گھر پہنچے' وہ پوسٹ آفس سے خط حاصل کرلیتا۔ گولی کے نام میرٹھ سے آیا ہوا خط بڑی احتیاط سے کھولتا' اسے پڑھتا اور پھر بند کر دیتا۔ اسی طرح جب گولی خط لیٹر بکس میں ڈالنے کو دیتی تو گورکھ اسے پہلے پڑھ لیتا اور پھر بند کر کے لیٹر بکس کے سپرد کر دیتا۔ گولی بھی سمجھ گئی تھی کہ گورکھ دونوں طرف کی خط و کتابت چوری چھپے پڑھتا ہے' لیکن اس نے گورکھ سے کچھ نہ کہا۔ جب بھی میرٹھ سے خط آتا تو کہتی : "لیجئے' میرٹھ سے خط آیا ہے۔ آپ کو بہت سا پیار اور دعا لکھی ہے۔ پڑھ لیجئے۔" اسی طرح جب خود خط لکھتی تو کہتی : "میرٹھ خط لکھا ہے۔ آپ کو کچھ لکھنا ہو تو کچھ جگہ خالی ہے' ورنہ آپ اسے بند کر کے لیٹر بکس میں ڈال دیں۔" گورکھ کو معلوم نہ ہو سکا کہ گولی کو اس کے چوری چھپے خط پڑھنے کا علم ہو چکا ہے۔ گورکھ نے جو خط بھی پڑھا' اس میں کوئی خاص بات نہیں لکھی تھی۔ گولی کی ماں پدما کو گھر کے مرچ' مسالے' باسمتی چاول' اصلی گھی'

ساڑی بلاؤز کی ہی فکر پڑی رہتی تھی۔ ہیرالال کم خط لکھتے۔

کچھ وقت گذرا ہوگا کہ ایک دن گولی کہنے لگی "مجھے پتہ ہے کہ آپ چوری چوری سارے خط پڑھتے رہے ہیں۔ کیا میرے ماں باپ نے کبھی آپ کے خلاف کوئی ذرا سی بات لکھی؟"

"گورکھ نے شرم سے سر جھکا لیا۔"

"اس بات کو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ میرٹھ سے کیا خط و کتابت ہوتی ہے گورکھ کو اس سے کوئی سروکار نہ رہا تھا۔ ایک دن اتفاق سے گولی کے لکھے ہوئے خط پر اس کی نظر پڑ گئی۔ وہ اسکول پہنچنے کی جلدی میں اسے پوسٹ کرنے کے لئے ساتھ لے جانا بھول گئی تھی۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا : "امر تو آپ کے پاس ہی ہے۔ اسے آپ میرٹھ کے کسی اچھے اسکول میں داخل کرا دیں۔ یا دہرہ دون کے اسکول میں اس کے داخلے کی کوشش کریں۔ وہ آپ کے پاس رہے گا تو اپنے گھر کا ہو جائے گا۔ رہی بات سمر کو پڑھانے کی' اسے بھی میں کسی نہ کسی طرح میرٹھ میں پڑھانے کی کوشش کروں گی۔"

خط پڑھ کر گورکھ حیران رہ گیا۔ ہیرالال اگر اسے کاروبار میں نہ پھنسا سکے تو اس کی اولاد کو اپنائیں گے۔ ان کے صرف ایک ہی تو لڑکا ہے۔ کاروبار چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ اگر چار لڑکے بھی ہوتے تو کم تھے۔ گورکھ تو گھر داماد نہیں بن سکا' اس لئے امر اور سمر پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ بچپن سے ہی ان کا رخ کاروبار کی طرف موڑنا چاہتے ہیں۔

گورکھ نے خط پڑھ لیا' لیکن گولی سے کچھ نہ کہا۔ سوچا کہ گولی اگر اسے بھسلا کر بھی امر اور سمر کو میرٹھ یا دہرہ دون میں پڑھانے کی کوشش کرے گی تو وہ چالاکی سے کام لے گا۔ پہلے کی طرح گولی سے نہیں الجھے گا۔

ایک دن گولی نے بات چھیڑ ہی دی۔ "آپ کو معلوم ہے کہ اندرا گاندھی تک نے دہرہ دون اسکول میں پڑھا ہے۔ سارے مشہور و معروف لوگوں کے ہونہار بچے دون اسکول میں پڑھتے ہیں۔ میرے والد کی بہت پہنچ ہے۔ اخراجات تو ہوں گے' لیکن امر اور سمر کی زندگی بن جائے گی۔ انہیں دہرہ دون اسکول میں داخل کروا دینا چاہئے۔"

گورکھ نے بڑے معصومانہ انداز سے جواب دیا "میں تو خطرواڑ اسکول میں پڑھا ہوں اور چیف انجینئر بننے والا ہوں۔ اسکول سے فرق تو پڑتا ہے' لیکن بچوں کے لئے ماں باپ کی تعلیم و تربیت بھی بہت معنی رکھتی ہے۔ جس طریقے سے تم بچوں کو پڑھاتی ہوں' کوئی استاد نہیں پڑھا سکتا۔ اور پھر میں بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بچے ہی زندگی کی رونق ہیں۔ اور یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ تمہیں بھی بچوں کی بہت یاد آئے گی۔"

"جب کبھی یہ بات اٹھتی گورکھ کا یہی جواب ہوتا۔

زندگی میں بظاہر کوئی کمی نہ تھی۔ عہدہ میں ترقی' خوب صورت' لائق بچے' امیر خاندان کی برسرروزگار بیوی' بڑھتی ہوئی شہرت' آرام دہ رہن سہن' مصوری' فوٹو گرافی' ڈاکٹری' کلب' ہندوستان کے علاوہ باہر کے ملکوں کی بھی سیر۔ اگلے تین برس میں گورکھ تین بار باہر کے ملکوں کے دورے پر گیا۔ روس' جاپان' سنگاپور' ہالینڈ' سوئزرلینڈ' یعنی آدھی دنیا کی سیر کرلی۔ لیکن دل پر کچھ بس نہ چل سکا۔ شادی کے پندرہ سال بعد بھی گولی اس سے دور تھی۔ دلوں کا سنگم کہاں ہو سکا۔ وہ محبت کہاں مل سکی جس کی وہ جستجو میں رہا۔ اسکول میں چھٹیاں ہونے پر گولی میرٹھ جانے کی اسی طریقے سے راہ دیکھتی تھی جیسے وہ کل ہی والدین سے جدا ہوئی ہو۔ سال میں تقریباً" ایک' دو مہینے کے لئے گورکھ گھر سے باہر رہتا تھا۔ یعنی سال کا چوتھائی حصہ جدائی میں کٹ جاتا تھا۔ اس کے باوجود گولی کتنی سرد تھی۔ اسے کبھی جسمانی محبت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس قدر قریب ہو کر بھی گولی سے ناواقف ہے۔ جب سے اس نے اسکول میں نوکری شروع کی ہے' اس کی روز مرہ کی تھکن میں اضافہ ہو چلا ہے۔ وہ جلد ہی بستر میں دراز ہو کر سو جاتی ہے۔ گورکھ کا دل تو چاہتا کہ اسے آغوش میں بھرے لیکن پھر اس ڈر سے رک جاتا کہ وہ تھک کر سو گئی ہے' خفا ہو جائے گی۔ اس نے گولی کی فلمیں بنا ڈالیں' تصویریں کھینچ لیں۔ ہر تصویر میں تصور کی اڑان سے رنگ چرا چرا کر بھر ڈالے لیکن بدلے میں کیا ملا؟ فقط گولی کی خفگی! کیا اس نے کبھی رضامندی سے فوٹو کھنچوائی؟ کیا وہ رضامندی سے اداکارہ بنی؟ وہ گورکھ کا صرف یک طرفہ شوق تھا۔ مجبوراً" گولی نے اس کا ساتھ ضرور دیا' لیکن اس کا دل کہیں اور تھا۔ فوٹو گرافی کا تمام صلہ یہی ملا کہ اس نے گولی کا موڈ خراب کیا' اسے پریشان کیا۔ اتنے سال اکٹھے گذر گئے' لیکن کیا کبھی گولی نے محبت میں پہل کی؟ جب بھی اس نے گولی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا' اس کے دل سے یہی آواز اٹھتی رہی کہ وہ کیوں گولی کے ساتھ زبردستی کر رہا ہے۔ جماع تو جانور بھی کر لیتے ہیں۔ کتنا واہیات فعل ہے۔ سیکس بد فعلی ہے' جب تک اس میں رنگینی نہ رچی ہو' اس میں ایک ادا' ایک بانکپن' ایک سراب' ایک خواب' ایک تصور نہ پیدا کیا جائے۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے "جب دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔" اگر دل میں محبت کا جذبہ ہے تو جسموں کا ملن ہر روز نئی شکل اور نئی صورت' اختیار کرے گا' نیا نشا اور نیا سرور پیدا کرے گا۔ ٹھنڈی سے ٹھنڈی عورت بھی کبھی تو گرم ہوتی ہوگی' لیکن اس کے ساتھ تو یہی معاملہ رہا کہ ہمیشہ اسی نے پہل کی' ہمیشہ وہی گرم ہوتا آیا ہے۔ ایک سری نگر کے شومندر کے پاس ہوئے واقعہ کو چھوڑ کر۔ آخر اس میں کیا کمی ہے' کیا خامی ہے' جو وہ گولی کے دل میں محبت کی چنگاری نہ سلگا سکا۔ اس کی تمام سیکس کی آگاہی گولی پر صرف ہو گئی۔ اس نے کیا کیا طریقہ نہ آزمایا' مگر ہر طریقہ ہر نکتہ' ہر ارادہ' ہر نیاپن گولی کے قریب پہنچتے ہی پارہ نہ ہو گیا۔ آہ! وہ ایک عورت کو بھی مکمل حاصل نہ کر سکا۔ وہ ایک عورت جو اس کی محبوبہ بھی ہے' بیوی بھی ہے اور دیوی بھی!

ایک رات وہ گولی کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا کہ گولی پلٹ کر سو گئی۔ اسی ادا کا سامنا اسے وصل کی

پہلی رات کو بھی کرنا پڑا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا دایاں ہاتھ گولی کے پہلو میں رکھ دیا اور اندھیرے میں آنکھیں کھولے چھت کی جانب تکتا رہا۔ نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ دیر تک جب نیند نہ آئی تو وہ مایوسی کے غار میں اترتا چلا گیا۔ چاروں طرف اس قدر تاریکی تھی کہ کہیں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں تھی۔ اس بے قراری میں نہ جانے کب آنکھ لگی ہوگی کہ اس نے پیشانی پر ایک گریزاں گداز محسوس کیا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ کھلی آنکھوں سے سو رہا ہے۔ شاید جاگ رہا ہے۔ کوئی چارپائی کے سرہانے' پیچھے کی طرف سے ہی اس طرح کا لمس عطا کر سکتا ہے۔ لیکن گولی تو پہلو میں موجود ہے۔ اس کے ہونٹوں سے دبی آواز میں ایک ہی لفظ نکلا : "گولی" اور اس نے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ دو قدم پر سفید لباس میں ملبوس ایک نازنین قریب ہی موجود تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس وجہ سے اس کا چہرہ اور نقوش قطعی مبہم تھے۔ کھڑکی پر پردے کھنچے تھے۔ باہر بجلی کے ستون پر لٹکتے لیمپ کی روشنی' کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا کر' پردوں کے کونے سے کھسک کر' ایک مہین لکیر کی صورت میں کمرے میں داخل ہو کر' اجنبی چہرے کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ اس لئے نقوش پہچاننا اور بھی مشکل کام تھا۔ گورکھ نے گھبرا کر ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا تو ساکت لبوں نے جیسے کہا : "میں گولی نہیں ہوں۔" اتنا کہتے ہی اس کا دایاں ہاتھ گورکھ کی جانب بڑھا۔ جھالر دار آستین سے نکلا ہوا وہ سیمیں ہاتھ ایک بار پھر گورکھ کی پیشانی کو چوم گیا۔ کتنی لذت تھی اس لمس میں 'کتنا گداز' کتنا اپناپن۔ کسی محبت کرنے والے کے ہاتھ میں ہی یہ جادو ہو سکتا ہے۔ گورکھ نے اپنا دایاں ہاتھ' جو ابھی تک گولی کے پہلو میں تھا' آہستہ سے نکال کر اسی اجنبی کی طرف بڑھا دیا اور سرگوشی کی : "کھڑی کیوں ہو؟ آؤ' یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

اسے کوئی جواب نہیں ملا' لیکن اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو سہارا ضرور ملا۔ اس نازنین نے گورکھ کی انگلیوں میں اپنی نازک انگلیاں پرو دیں۔ گورکھ نے محسوس کیا کہ ایک گرم سانس باہم پیوست دو ہاتھوں کی انگلیوں کو چھوتی ہوئی ہواؤں میں گھل رہی ہے' دماغ مہک اٹھا ہے۔ گورکھ اس کی ہتھیلی کے ذریعہ جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں شمار کر سکتا تھا۔ جیسے وہ ہتھیلی تڑپ رہی ہو' اس کا علیحدہ کوئی وجود ہو۔ ان لغزیدہ انگلیوں میں جیسے الگ الگ ایک ہلچل مچی ہو۔ ایسی جنبش جیسے کوئی تان پورے پر راگ چھیڑ رہا ہو۔ لذت کے مارے گورکھ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ دل نے صدا دی : کاش وقت ٹھہر جائے' رات یہیں ٹھہر جائے یہ روشنی کی بل کھاتی واحد شعاع بھی ٹھہر جائے۔ دو ہاتھوں کا وصل دائمی ثابت ہو۔

اجنبی صورت نے جیسے اس کے دماغ میں گریزاں خیال پڑھ لئے ہوں۔ پھر ساکت لبوں نے جیسے سوال کیا ہو : ایک ہی لمس میں دل ہار بیٹھے! پھر گولی کی محبت کے راگ کیوں الاپتے رہتے ہو؟

اس سے پہلے کہ گورکھ کوئی جواب دیتا' وہ اجنبی صورت اس روشنی کی لکیر میں شامل ہو گئی۔ گورکھ کو ایسا لگا جیسے وہ شعاع بن کر کھڑکی سے باہر نکل پڑی اور بجلی کے ستون پر لگے لیمپ میں پیوست ہو گئی۔ گورکھ آہستہ

وہ بستر چھوڑ کر اٹھا' کھڑکی سے پردے ہٹا کر دیر تک بجلی کے ستون اور ستون پر تاباں روشنی کو دیکھتا رہا۔ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ اگر دل میں محبت ہو تو جسم کے ہر مسام سے ٹپکتی ہے۔ بار بار اپنی ہتھیلیاں چومتا رہا' اپنی پیشانی سہلاتا رہا۔ جسم کے ان دو حصوں سے کوئی شے پگھل کر خون میں تحلیل ہو گئی تھی۔ دل و دماغ میں ایک نشہ بھر گیا تھا۔ کیا اس کے ہاتھوں اور لبوں میں وہ محبت نہیں جو دو لمحے پہلے اس اجنبی عورت کے ہاتھوں سے اس کی رگ رگ میں اتر گئی؟ ضرور ایسا ہی ہے' ورنہ گولی کیوں متاثر نہیں ہوتی!

کئی راتیں گورکھ نے بے خوابی میں گذاریں' اس آرزو میں کہ شاید اس نازنین سے پھر ملاقات ہو جائے۔ ذرا سی آواز پر وہ چونک کر اٹھ جاتا۔ اس لمس کو بھلانا ناممکن تھا۔ اس صورت کو نظر انداز کرنا محبت کی توہین تھی۔ اگر وہ محض تصوراتی پرچھائیں تھی تو دوبارہ کیوں وصل کی راحت عطا کرنے نہ آئی؟ وہ تو ہر رات امید باندھتا ہے اور ہر صبح امید ٹوٹ جاتی ہے۔ شاید وہ اب دوبارہ کبھی نہ آئے گی۔ وہ فقط محبت کی اصلیت جتانے آئی تھی۔ محبت میں ابتدا کیا اور انتہا کیا' آغاز کیا' اور انجام کیا۔ یہ وہ جذبہ ہے جو نہ شروع ہوتا ہے اور نہ ختم۔ وہ محبت کے وسیع سلسلے کی ایک جھلک دکھانے آئی تھی۔ وہ یہ سمجھانے آئی تھی کہ محبت کا ایک ادنیٰ سا لمس بھی کتنا پر اثر ہوتا ہے۔

کمپنی کے کام سے گورکھ کو اکثر کلکتہ جانا پڑتا تھا۔ دھنباد سے کول فیلڈ ایکسپریس چلتی تھی، جو کلکتہ تقریباً" پانچ گھنٹے میں پہنچ جاتی تھی۔ کمپنی کے خرچ پر وہ ہمیشہ ایر کنڈیشنڈ کلاس میں سفر کرتا تھا۔ اس روز زیادہ مسافر نہ تھے۔ اس کے ڈبے میں تقریباً" ساری سیٹیں خالی پڑیں تھیں۔ جیسے ہی پلیٹ فارم چھوڑ کر گاڑی آسنسول کی طرف بڑھی گورکھ اونگھنے لگا۔ ایک گھنٹے بعد آنکھ کھلی تو برابر کی سیٹ پر ایک حسینہ کو موجود پایا۔ گورکھ قدرے گھبرایا۔ اتنی خالی سیٹیں چھوڑ کر وہ نازنین اس کے پاس ہی کیوں بیٹھ گئی؟ اسے بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ یکایک اس کی نگاہیں اجنبی نازنین کے چہرے سے ٹکرائیں۔ شکل کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔

اچانک گورکھ کے مونھ سے نکلا: "تم یہاں؟ اس وقت؟"

"کیوں؟ اس وقت کیوں نہیں؟" نازنین نے فوراً" ہی جواب دیا۔ اس نے گورکھ کا ہاتھ تھام کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" اور بھی مسافر ہیں۔ کوئی دیکھ رہا ہوگا۔ تم کیا آسنسول سے سوار ہوئی؟"

اس کے یاقوتی لب ہلے : "میں حقیقت تو ہوں، لیکن صرف تمہارے لئے۔ زمانے کے لئے میں غیر موجود ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔"

گورکھ کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی، لیکن حسینہ کی موجودگی پر اسے یقین نہ آیا۔ "چند ماہ ہوئے تم رات کی سیاہی میں وصل کا ایک لمس عطا کر گئی اور آج دن کے اجالے میں چلی آئی ہو؟"

"وہ اس لئے کہ تم مجھے اچھی طرح پہچان لو۔ خوب غور سے دیکھ لو۔"

گورکھ نے ایک نظر اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ "میں تمہیں کس طرح پہچانوں؟ کتنی عجیب ہو تم!" "کیا تم واقعی حقیقت ہو؟ یہ موتیوں کی مالا، یہ کمر سے لٹکتا سرخ فیتہ، یہ نیلا لبادہ، جو نہ ساڑی ہے، نہ شلوار اور نہ ہی اوڑھنی۔ یہ چمکتے ستارے، جو دن کی روشنی میں جھلملا رہے ہیں۔ یہ سینے کے ابھاروں کو نکھارتا سیاہ کپڑے کا ٹکڑا جس کے ظلمات میں ایک نہیں، دو چاند طلوع ہوئے ہیں۔ یہ گھنگھریالے بالوں میں الجھے کچنار کے پھول۔ اور یہ مٹی سے بھرے ننگے پاؤں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں ڈبے میں کس نے گھسنے دیا؟ تم حقیقت نہیں، فقط ایک تصور ہو۔ لیکن یہ تمہارا لمس قطعی حقیقی ہے۔"

اجنبی صورت مخاطب ہوئی : "تم میرے لباس کی تفصیل بیان کرکے ہی چپ کیوں ہو گئے؟ میرے بارے میں بھی تو کچھ کہو۔"

گورکھ نے کہا "میں کیا کہوں؟ کیا کوئی اپنے قیاس کو صحیح لفظی جامہ پہنا سکتا ہے؟ قیاس ایک لہر کی طرح ہوتا ہے' جو پل پل بدلتی رہتی ہے۔ اسے ایک جگہ روک لینا ناممکن ہے۔ لیکن قیاس کی بھی بنیاد ہوتی ہے۔ میرا ذہن تو ہمیشہ سے الجھنوں میں پڑا رہا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے تصور میں کیا کیا دیکھا' میرے دماغ نے کیا کیا سوچا' کیوں سوچا۔ پھر بھی تم جانی پہچانی لگتی ہو۔ محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں کہیں دیکھا ہے۔"

"ضرور دیکھا ہے' قیاس کی چلمن پر اترنے سے پہلے کوئی نہ کوئی حقیقت تو تھی۔ تم اسے کبھی نہ بھلا سکو گے۔ خود تڑپ کر مجھے بھی تڑپاؤ گے" اجنبی نازنین بولی۔

"یہ کیسا اقرار کہ تم بھی تڑپ رہی ہو۔ میں تو عمر بھر سینے میں ایک آگ دبائے پھرتا رہا۔ گیلی لکڑی کی طرح سلگتا رہا۔ جلتا رہا' بجھتا رہا۔ اب تم بھی کچھ اپنی کہو۔"

اجنبی نازنین اپنے لب گورکھ کے بالکل قریب لے آئی۔ اس کی ٹھنڈی آہیں گورکھ کی پیشانی اور لبوں سے ٹکرانے لگی۔ ان آہوں کی سانس بھرتے ہوئے گورکھ اس نازنین کے اور قریب کھسک آیا۔ نازنین کے لب گورکھ کے گوش کا لمس لیتے ہوئے کہنے لگے: "اپنی گوکل کو بھول گئے؟ میں کتنی کم سن تھی۔ آج تیس سال بعد بھی میں اس محبت کی آگ میں جل رہی ہوں۔"

گورکھ نے یکایک نازنین کے رخساروں پر بوسہ دیا۔ "گوکل میں تمہیں کبھی نہ بھلا سکا۔ تم میری پہلی محبت ہی نہیں' بلکہ آخری محبت بھی ہو۔ ہم دو دیوانے' دو کم سن' دو انجان' محبت کی نام سے بھی بے خبر' محبت کر بیٹھے۔ ہمیں تو معلوم ہی نہ ہوا کہ ہم محبت میں گرفتار ہیں۔ آج بھی دل کو ٹٹولتا ہوں تو اس سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ جو کچھ ہمارے درمیان ہوا وہ کیا تھا؟"

گوکل نے بچپن کی طرح گورکھ کے رخسار پر کاٹ لیا۔ "پگلے! اسی کو محبت کہتے ہیں۔ اور محبت کا کوئی نام نہیں ہوتا۔"

گورکھ بے تاب ہونے لگا۔ "میں تمہیں بچپن کی طرح کندھے پر بیٹھا کر چکر دوں؟ اپنا جسم تم میری آغوش کے سپرد کر دو۔ بچپن کی طرح مجھ سے لپٹ جاؤ' جیسے تم لچکتی شاخ کی طرح مجھ سے لپٹ جایا کرتی تھیں۔" گوکل نے کہا "میں تو تیار ہوں۔ لیکن تم جو کہہ رہے ہو' وہ سب سن رہے ہیں۔ میں جو کہہ رہی ہوں' وہ کوئی نہیں سن رہا ہے۔ تم جو کر رہے ہو سب دیکھ رہے ہیں۔ میں جو تمہارے قریب ہوتی چلی جا رہی ہوں' یہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں اپنے گرد چکر لیتے دیکھ کر کوئی تمہیں ڈبے سے نیچے نہ اتار دے۔"

گورکھ بولا "بچپن میں تمہارے لبوں کا بوسہ لینے کو بہت دل چاہتا تھا۔ میں ذرا ذرا سا' تمہارے لبوں کے

کنارے چوم کر ہی رہ جاتا تھا۔ آج ایک ایسا بوسہ عطا کرو جس کا ثانی میری زندگی میں نہ ہو۔"

لبوں سے لب ٹکرائے' تو گیلی چاندنی کے نشے' کے زیر اثر یکایک گورکھ زور سے چلایا۔ "گوکل!"

"صاحب' آج آپ کی طبیعت شاید ٹھیک نہیں ہے۔ آپ بہت دیر سے بڑبڑا رہے ہیں' ہاتھ پاؤں پٹخ رہے ہیں۔ اور یہ گوکل کون ہے؟" ٹکٹ چیکر پوچھ رہا تھا۔

ٹکٹ چیکر گورکھ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ گورکھ ہمیشہ اسے پانچ' دس روپیہ ٹپ دیتا تھا۔ وہ ڈبے میں شراب اور کھانا مہیا کر دیتا۔

"کل میں رات بھر سو نہ سکا۔ اور پھر آفس کے کام کی ذمہ داری۔" گورکھ بولا۔

"صاحب' آپ برا نہ مانیں تو اپنا ڈاکٹری معائنہ کروالیں۔ آپ کے بازو' سر اور پاؤں سوتے سوتے حرکت میں تھے۔"

گورکھ مسکراتا ہوا ہوڑہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

گورکھ اب اتنا تنہا نہ رہا۔ اسے بچپن کا ساتھی مل گیا۔ قیاس اور تصور نے زور پکڑا تو وہ گوکل کو جب چاہتا مجسم کر لیتا۔ ایک دن گوکل پوچھنے لگی "تمہاری قیاسی جنت کو فقط میرے جسم کی ضرورت ہے۔ تم نے ایک بار بھی نہ پوچھا کہ مجھے بھوک لگتی ہے کہ نہیں' سردی لگتی ہے کہ نہیں' میری اور ضرورتیں کیا ہیں۔ تیس سال کیسے گزرے؟"

گورکھ نے جواب دیا "تم تو پرچھائیں ہو۔ صرف میرے لئے حقیقت ہو۔ یہ تم خود ہی قبول کرتی ہو۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ پرچھائیاں آزاد ہوتی ہیں۔ انہیں روزمرہ کی زندگی کی مصیبتیں اور ضرورتیں نہیں ستاتیں۔ تم بتاؤ کیا تمہیں بھوک لگتی ہے؟ جب بھی میں نوالہ منہ میں رکھا کروں گا' تمہیں یاد کر لیا کروں گا۔ تعجب ہے کہ تیس سال تک تم میرے دل کے کسی گوشے میں پوشیدہ تھیں۔ اچانک یہ کیا ہوا کہ مجسم ہو اٹھیں؟"

گوکل بولی "کیوں دل کی باتیں زبان پر لاتے ہو؟ دل ہی میں رہنے دو۔"

گوکل کی شکایت سن کر گورکھ گوکل کو ہر وقت ساتھ رکھنے لگا۔ آفس میں جاتا تو محسوس کرتا کہ وہ کار کی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھی ہے۔ گولی کے ساتھ فلم دیکھنے جاتا تو ایک سیٹ خالی دیکھ کر بیٹھتا۔ ایک طرف گولی ہوتی' دوسری طرف گوکل۔ آفس میں کام کرتے کرتے تھک جاتا اور نظر اٹھاتا تو دیکھتا کہ گوکل سامنے بیٹھی مسکرا رہی ہے۔ ہر روز اس کی نئی سج دھج ہوتی۔ اس کا لباس تصور کے بہشت میں تیار ہوتا۔ اسے کسی مادی چیز کی ضرورت نہ پڑتی۔ قیاس کے رنگ گوکل کے تن و من پر کھل اٹھتے۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ نوالہ اس کے منہ میں رکھتی۔ قمیض پہنتے ہوئے وہ اس کے بٹن بند کر دیتی۔ گورکھ بھی اسے محبت کے جھولے میں جھولاتا۔ روز اس کی تصویریں اتارتا۔ روز اس کے لئے نیا لباس تیار کرتا۔ عاجزی سے اس سے درخواست کرتا: "آج یہ نیا

لباس پہن لو۔"

"لو پہن لیتی ہوں۔ تم بہت تنگ کرتے ہو۔" گوکل مسکرا کر کہتی

"سچے دل سے کہتی ہو؟" گورکھ پوچھتا۔

"بھلا میں تم سے کبھی خفا ہو سکتی ہوں؟ مگر محبت میں ناز و ادا تو بھی ہونی چاہئے۔" گوکل جواب دیتی۔

"ضرور ادائیں دکھایا کرو۔ جب تم ادائیں دکھاتی ہو تو بہت پیاری لگتی ہو۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں تمام دن چکر دیا کروں، تمہارے لب چومتا رہا کروں، تمہیں آغوش میں بٹھا کر رکھوں۔"

"یہی تو تم کرتے رہتے ہو۔ کیا ابھی تک میری محبت سے دل نہیں بھرا؟" گوکل پوچھتی۔

"مرتے دم تک کبھی نہ بھرے گا۔ میں اپنی قیاسی دلہن کو ہمیشہ زندہ رکھوں گا۔" گورکھ جواب دیتا۔

گورکھ خوش رہنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اندھیرے غار سے نکل آیا ہے۔ گوکل ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے، اس کے ساتھ سوتی ہے، اس کے ساتھ جاگتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں سارے جہاں کو ٹھکراتے جا رہے ہیں۔ اس کے وجود کے ایک ٹکڑے کا نام گوکل ہے۔ وہ گوکل میں سمایا ہے اور گوکل اس میں سمائی ہے۔

جب سے گورکھ کو گوکل ملی، اسے گولی کا مونہہ پھیر کر سونا اچھا لگنے لگا۔ گولی کے مونہہ پھیرتے ہی وہ گوکل سے رات بھر کے لئے ہم آغوش ہو جاتا

گوکل نے گورکھ کی زندگی میں نئے رنگ بھر دیئے۔ مایوسی کے غبار بہت کچھ دب گئے۔ لیکن بے چینی سے قطعی چھٹکارا پانا گورکھ کے لئے ناممکن تھا۔ فوٹو گرافی کا شوق آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ گولی کی تصویریں کھینچنا، اسے موڈ میں لانا، کتنا مشکل تھا۔ ادھر گوکل جیسے ہر اشارے کو سمجھتی تھی۔ گورکھ کبھی کبھی احساس کے ہاتھوں گناہ گار ہو جاتا۔ اور خود کو ملامت کرتا: "جب تمہارا تصور اتنا تخلیق ہے کہ خواب اور حقیقت میں فرق ہی نہیں رہتا؟ تم گوکل کے عشق میں مبتلا ہو اور گوکل ہر وقت تمہارے ساتھ رہتی ہے، تو کیا یہ گولی سے دغا نہیں؟ گوکل کو کس قدر پیار کرنے لگے ہو۔ عشق کا طوفان بے روک ہو چلا ہے۔ بالکل بے لگام ہو گیا ہے۔ تمہیں کسی کا ڈر نہیں، کسی سے شرمساری نہیں، کوئی دیوار بھی درمیان نہیں۔ گر یہی سب جانتے ہو تو گولی سے صاف صاف اقرار کیوں نہیں کرتے۔"

"فضول ہیں یہ سب احساسات، اقرار اور بے وفائی کی باتیں۔ میں نے کوئی بے وفائی نہیں کی۔ نہ اقرار کیا، نہ انکار۔ جو ہوا، اس پہ میرا بس نہیں۔ جو ہوا، ٹھیک ہوا۔ مجھے اس کے لئے صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس کے دل سے دوسری آواز ابھرتی۔ گورکھ جب بھی ان الجھنوں میں گرفتار ہوتا تو دیکھتا کہ گوکل قریب

ہی حسرت سے اسے تک رہی ہے۔ یکایک وہ اسے کھینچ کر آغوش میں بھرلیتا اور اس کے لبوں پر بے تحاشا بوسوں کی برسات کرتے ہوئے کہتا: "اے میری پاک محبت! مجھے معاف کر۔ میرے جذبات ناپاک ہیں۔ یہ تیری پاک محبت وہ طوفان ہے جس میں میرا وجود تو کیا' یہ سارا جہاں بہہ جائے گا اور اس بہاؤ میں اگر کوئی زندہ بچے گا تو صرف ہم اور تم۔"

گورکھ کے دو دوست نوکری چھوڑ کر امریکہ میں جا بسے۔ گورکھ کو کچھ مہینے پہلے ہی چیف انجینئر کا عہدہ ملا تھا۔ بیس سال کی لگاتار' محنت اور مشقت کا ثمر تھا کہ گورکھ اتنی کم عمر میں اس عہدے پر پہنچ گیا۔ اس عہدے پر پہنچ کر ہندوستان میں کوئی دوسری نوکری تلاش کرنے کا کوئی مطلب نہ تھا۔ گوپی کی چچیری بہن کی حال ہی میں شادی ہوئی اور اس کا شوہر امریکہ میں بس گیا تھا۔ گورکھ نے جب انجینئرنگ کی ڈگری لی تھی' تو کالج کے پرنسپل نے اسے امریکہ بھیجنے کی تجویز پیش کی تھی' جو اس نے نامنظور کردی تھی۔ پھر جب وہ بمبئی میں ملازم تھا تو اس کے دو دوست امریکہ چلے گئے تھے۔ بہت عرصے تک ان سے خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ گورکھ کو بھی امریکہ جانے کا موقع ملا تھا' لیکن پھر اس نے خیال بدل دیا۔ تاہم امریکہ کی کشش بار بار زور مارتی رہی۔ بار بار اسے خیال آتا کہ کیوں نہ وہ امریکہ میں نوکری ڈھونڈ لے"؟ جہاں کچھ روپیہ جمع ہوا' وہ واپس ہندوستان آجائے ا۔ کسی کہسار کے دامن میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنوالے گا۔ اس میں صرف ایک کمرہ ہوگا اور ایک رسوی گھر۔ باہر پھول لگائے گا۔ اور اندر کینوس پر' طرح طرح کے رنگ بکھیرے گا۔ فلسفہ پڑھے گا اور آزاد زندگی بسر کرے گا۔ جب چاہے گا' گوکل کو روبرو بیٹھا لیا کرے گا۔ اگر کوئی اور نہ ہوگا تو گوکل تو ضرور ہوگی۔ یہ کیا کہ ہر روز سویرے اٹھ کر مقرر وقت پر آفس جاؤ۔ کام اگر جلد ختم ہو جائے تو بھی گھنٹوں خالی کرسی پر بیٹھے رہو۔ نوکری کیا ہے' ایک قید ہے۔ اس قید نے اس کا دل اور دماغ جکڑ رکھا ہے۔ کیوں وہ عمر بھر کے لئے اس زنداں میں پڑا رہے؟ پہاڑی علاقہ میں ایک جھونپڑی اور چند لاکھ روپے بینک کھاتے میں۔ کسی کی ماتحتی کرنے کی ضرورت نہیں۔ صبح سے شام تک غلامی کرنے کی ضرورت نہیں۔ دنیاداری کی ضرورت نہیں۔ پھر کوئی فکر نہ ہوگی کہ کل کمپنی کی حالت کیا ہوگی۔ فیکٹری چلے گی کہ نہیں۔ اس کا بنایا ہوا ڈیزائن کامیاب ہوگا کہ نہیں۔ عمر چالیس سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ بس پانچ سال کی محنت اور اس کے بعد ایک پرسکوں تنہا گوشہ۔ اس دوران امر اور سمر بھی امریکہ میں آباد ہو جائیں گے اور ان کی تعلیم بھی مناسب ہوگی۔ دوسرے وہ ہیرالال کے اثر سے چھٹکارا پا جائیں گے۔ گوپی بھی امریکہ سے ہر سال دو تین مہینے کے لئے ہندوستان نہ آسکے گی۔ پھر امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ ایسے ملک میں کام کرنے سے تیکنیکی آگاہی اور مہارت میں اضافہ ہوگا۔ ہندوستان میں جو سیکھنا تھا' سیکھ لیا۔"

ان دنوں انجینئرنگ میں تعلیم یافتہ اور تجربہ کار لوگوں کو امریکہ کا ویزا ملنا آسان تھا۔ ذرا سی کوشش کے بعد گورکھ نے ویزا حاصل کرلیا۔ مگر امریکہ کے لئے رخصت ہونے کے وقت تک وہ الجھنوں میں مبتلا رہا کہ اگر وہاں نوکری نہ مل سکی تو کیا ہوگا؟" آفس سے ایک مہینے کی چھٹی منظور کروا کے' آفس میں کسی کو یہ بتائے بغیر کہ وہ امریکہ جا رہا ہے' وہ نیویارک پہنچ گیا۔ سوچا کہ اگر نوکری حاصل ہو گئی تو دگواڑی کی نوکری سے استعفیٰ دے دے گا۔ اور اگر نوکری نہ ملی تو اپنی نوکری پر واپس چلا آئے گا۔

گولی کی چچیری بہن سریکھا اور اس کے شوہر پران نے گورکھ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ایک مہینے تک گورکھ نیویارک میں در در کی خاک چھانتا پھرا۔ نوکری کے لئے بہت سی درخواستیں بھیجیں' لیکن نوکری نہ ملی۔ پران اسے امریکہ کے ماحول اور رنگ ڈھنگ سے واقف کروانے لگا: "یہ ہندوستان نہیں ہے۔ یہاں ہندوستان میں لی ہوئی انجینئرنگ کی ڈگری اور تجربے کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ ہندوستان سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ یہاں آتے ہیں اور کسی ریستوراں میں برتن صاف کرنے کا کام کرتے ہیں یا جھاڑو مارتے ہیں۔ ہندوستان میں ضرور اس کام کو ہیچ سمجھا جاتا ہے' لیکن یہاں کوئی اسے برا نہیں سمجھتا۔"

گورکھ کے دل میں ابھی غیرت کا مادہ موجود تھا۔ وہ امریکہ میں قیام کرنے کے لئے اس قدر زحمت اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ پران اسے شاید یہ سب کچھ اس لیے سمجھا رہا تھا کہ وہ کچھ بھی کام کرنا شروع کر دے اور ان کے سر سے بلا ٹلے۔ یہ احساس کہ وہ دور کے رشتہ داروں پر بوجھ بن رہا ہے' گورکھ کو ہمیشہ تنگ کرتا۔ اتنے دن اس نے بس یہی کیا کہ نوکری کے لئے عرضیاں بھیج دیں اور گھر میں بیٹھ کر جواب کا انتظار کرتا رہا یا کسی کمپنی میں جا کر جوتے گھس آیا۔ اس کے لئے وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔

سریکھا کی ایک چار سال کی روتی صورت' چڑچڑی لڑکی سارے دن گھر میں طوفان مچائے رکھتی تھی۔ جب سریکھا حاجت رفع کرنے کے لئے باتھ روم میں داخل ہوتی تو وہ بند دروازے کو پیٹنے لگتی۔ اس قدر آنسو بہاتی' اس قدر شور مچاتی' اتنی زور سے چلاتی کہ کئی بار حاجت روک کر سریکھا اسے باتھ روم میں داخل کرلیتی۔ گورکھ نے ناچار سریکھا کی روتی صورت لڑکی سے ہی محبت بڑھانے کی کوشش کی۔ دس پندرہ دن میں وہ گورکھ سے اتنی مانوس ہو گئی کہ اس کی گود میں بیٹھ کر راحت محسوس کرنے لگی۔ اس کے رونے اور چلانے میں کمی آگئی۔ گورکھ رشتہ داروں کا کم سے کم احسان اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ بات سریکھا پر واضح کر دی گئی تھی کہ گورکھ جو ڈالر بطور قرض لے گا' سارا قرض روپیوں کی صورت میں ہندوستان میں مقیم اس کے بھائی کو لوٹا دیا جائے گا۔ اس کے باوجود بھی گورکھ سریکھا یا پران کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے گریز کرتا۔ وہ نہ تو سیر تفریح پر پیسہ خرچ کر سکتا تھا اور نہ کوئی چیز خرید سکتا تھا۔ ایک مہینے تک گھر میں بیٹھے اس قدر کاہلی' سستی' اور ویرانی کا احساس ہوا کہ امریکہ اسے شمشان کی طرح نظر آنے لگا۔

امریکہ میں بھی گورکھ کو اکثر گولی کی یاد آتی اور اس یاد کے ساتھ گولی کی صورت بھی جھلک مارتی۔ گولی تو دور تھی لیکن گوکل قریب ہی کنکھیوں سے اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ ایک دن گورکھ اس سے پوچھنے لگا : ''گوکل، تم اس قدر قریب ہو کہ میں تمہارے سینے کی ہل چل سے سانس کی آمدو رفت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ تم گوکل کی بھٹکتی روح ہوگی۔ جیسے مجھے گولی ملی، شاید تمہیں کوئی گولا مل گیا ہوگا۔ جیسے گولی کی کیفیت ہے، ویسی ہی تمہارے گولے کی ہوگی۔ جیسے تمہاری روح تمہارے تن سے نکل کر میرے پاس رہتی ہے، ویسے ہی میری روح میرے تن سے پرواز کرکے تمہارے قریب منڈلاتی ہوگی۔ کیا میں نے ٹھیک کہا؟''

گوکل نے باہمی فاصلہ اور بھی کم کردیا۔ ''لو، میری نفس اپنے لبوں اور رخساروں پر محسوس کرو۔ پھر خود ہی فیصلہ کرلو۔''

چھٹی ختم ہونے کو آئی۔ گورکھ نے سوچا کہ اگر وہ کچھ دن اور کوشش جاری رکھے تو ممکن ہے کہ مناسب نوکری اسے مل جائے۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ دونوں طرف سے نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ اسی امکانی خطرے کے پیش نظر گورکھ دگواڑی واپس آگیا۔ آتے ہی اسے اپنے ماحول کو ایک نئے انداز سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اپنا گھر، اپنی شان، اپنے ملک کی متوالی گلیاں۔ یہاں کچھ تو ہے جو وہاں نہیں۔ مانا کہ محرومی ہے، غریبی ہے، ماحول دھواں دھواں سا ہے، پھر بھی کچھ ایسا ہے، دل جسے اپنا مانتا ہے۔ آخر یہاں بھی تو پھول کھلتے ہیں، غنچے چٹکتے ہیں، باد صبا چلتی ہے۔ سب کچھ تو موجود ہے۔ اگر کوئی دامن بچا کر چلا جائے تو قصور کس کا؟ اسے امریکہ کا خیال چھوڑ دینا چاہئے۔ امریکہ کی چمک دمک کے کھوکھلے پن پر اچھی بھلی زندگی قربان نہیں کرنی چاہئے۔

تقریباً ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ کمپنی نے کاروبار کے سلسلے میں گورکھ کو جاپان بھیجا۔ وہاں سے وہ واپس آیا تو اسے پھر امریکہ یاد آیا۔ امریکہ کے ویزا کی شرط تھی کہ ایک سال کے اندر اندر واپس جانا ضروری ہے۔ اس درمیان اگر دوبارہ امریکہ نہ پہنچے تو ویزا ختم۔ خیر خواہ کہنے لگے : ''اپنی ہی مت سوچو، اپنے بچوں کے مستقبل کا بھی خیال کرو۔ یہاں تو لوگ پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر خوانچہ لگا رہے ہیں۔ کاروبار تم کر نہیں سکتے۔ اگرچہ بچے ہوشیار ہیں، لیکن یہاں ان کا کیا حال ہوگا؟''

ایک خیر خواہ نے مشورہ دیا : ''امریکہ میں تو ایک پاؤں کا انگوٹھا رکھنا ہی کافی ہے۔ اگر تم دو تین مہینے کی چھٹی لے کر وہاں نوکری نہیں تلاش کرسکتے تو نہ کرو۔ یہ کام گولی بھی کرسکتی ہے۔ اس کے اسکول میں تو دو مہینے کی تعطیل ہوتی ہے۔ کیوں نہ پہلے وہ وہاں اپنے لئے نوکری تلاش کرلے اور اس کے بعد تمہیں بلا لے۔'' یہ تجویز گولی کو بھی پسند آئی۔ گورکھ کو سریکھا اور ہری ان کا برتاؤ یاد آیا تو گولی سے کہنے لگا : ''میں ان لوگوں کے پاس جاکر دوبارہ قیام کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ اگر کچھ ہاتھ نہ آیا تو کم سے کم تم بھی امریکہ کی سیر کا لطف تو حاصل کرلوگی۔''

گولی بولی "تمہیں تو ہر شخص پرایا لگتا ہے۔ تمہارا کہیں بھی دل نہیں لگ سکتا۔ میں تمہیں امریکہ میں آباد ہو کر دکھاؤں گی۔"

گولی کے ساتھ ہونے سے گورکھ کے لئے سفر کا رنگ ہی بدل گیا اور امریکہ کی خوب صورتی میں بھی چار چاند لگ گئے۔ کچھ دن امریکہ میں قیام کر کے وہ واپس دگواڑی آ گیا۔ ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ گولی کا خط آیا کہ وہ واپس آ رہی ہے۔ دو ہفتے میں ہی گولی واپس آ گئی۔ واپس آئی تو تھکی تھکی اور اداس لگ رہی تھی۔ عادت کے مطابق گولی نے کچھ نہ کہا، لیکن گورکھ سمجھ گیا کہ اپنی چچیری بہن اور بہنوئی کے برتاؤ سے تنگ آ کر واپس چلی آئی ہے۔

ایک سال اور گزر جانے کے بعد پھر امریکہ کے ویزا کا سوال اٹھا کہ اسے قائم رکھا جائے یا گنوا دیا جائے؟ گولی اور گورکھ کچھ دن سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہے۔ آخر دونوں میں سے کوئی بھی امریکہ نہ گیا۔

جب گورکھ کی شادی ہوئی تو گولی کی چھوٹی بہن بھولی تقریباً تین سال کی ہو گی۔ شادی کو پندرہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا کہ گورکھ نے بھولی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ گولی گرمیوں کی چھٹیوں میں میرٹھ گئی تو لوٹتے وقت بھولی کو بھی اپنے ساتھ لے آئی۔ دگواڑی میں تو دھواں دھواں ماحول اور کوئلے کی کانوں کے سوا کچھ نہ تھا، البتہ سو میل کے دائرے میں کئی پرکشش مقام موجود تھے۔ چھٹی کے دن تینوں سیر سپاٹے کو نکل جاتے۔ باقی دن گورکھ صبح کو آفس چلا جاتا، گولی، امر اور سمر ایک ساتھ اسکول چلے جاتے۔ اور شام کو لوٹتے۔ بھولی گھر میں اکیلی رہ جاتی۔ گورکھ دوپہر کا کھانا گھر پر کھاتا۔ آفس سے بنگلے کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ کھانا کھاتے ہی وہ گھنٹہ بھر کے لئے لمبی تان کر سو جاتا۔ برسوں سے اس کا یہی معمول تھا۔ دگواڑی میں کام کا وقت ہی کچھ ایسا رکھا گیا تھا کہ دوپہر کے کھانے کے لئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ مل جاتا تھا۔

ایک دن بھولی کہنے لگی : "یہ بھی کیا کہ کھانا ختم کرتے ہی آپ سو جاتے ہیں۔ میں سارے دن گھر میں اکیلی بیٹھی رہتی ہوں۔ کہاں تک ریڈیو اور کتابوں سے دل بہلاؤں؟ میں تو یہاں آ کر بہت بور ہو رہی ہوں۔"

گورکھ کو ہنسی آ گئی۔ "میں تمہارا دل لگانے کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ تم کہتی ہو تو سونا بند کر سکتا ہوں۔ تم اپنے کالج کی اور میرٹھ کی کوئی بات سناؤ۔"

"کالج اور سہیلیوں کی باتیں کسی جیجاجی کو نہیں سنائی جا سکتیں۔ آپ ہی کوئی بات کیجیے۔"

"میں کیا بات کروں؟ مجھے کوئی خاص بات کرنی ہی نہیں آتی۔"

"چلو تاش کھیلتے ہیں۔"

دونوں رمی کھیلنے لگے تو کچھ دیر بعد بھولی نے پتے پھینک دیئے۔ "رمی کھیلنے کے لئے کم سے کم چار کھیلنے

والے ہوں تو لطف آتا ہے۔ دو کھیلنے والوں میں پتے معلوم ہو جاتے ہیں۔"

گورکھ نے کہا "چلو میں تمہیں جوئے کا کھیل فلاش سکھائے دیتا ہوں۔"

بھولی بولی "مجھے تھوڑا تھوڑا تو آتا ہے۔ جیئے، سکھائیے۔"

گورکھ بھولی کو فلاش سکھاتا رہا، لیکن بھولی کا دل اس میں بھی نہ لگا۔ اس نے جماہی لے کر کہا "میں نے سنا تھا کہ آپ انجینئر ہیں، ڈاکٹر ہیں، فوٹو گرافر ہیں، لیکن۔۔"

گورکھ بولا "رک کیوں گئیں؟ بے دھڑک کہو۔ یہی نا کہ میں بور ہوں۔ بور ہی نہیں، میں شرابی ہوں۔ میرا دماغ بھی تھوڑا خراب ہے۔"

"اتنی شراب کیوں پیتے ہیں آپ؟ اتنے سگریٹ کیوں پھونکتے ہیں؟" بھولی کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"یہ تم آسانی سے نہیں سمجھ سکو گی۔ شراب میں نشہ ہے، خواہ عارضی ہی سہی۔ اسی طرح سگریٹ کے مونہہ پر شعلہ ہے، دھواں ہے، جلن ہے، جو دل کی جلن سے ملتی جلتی ہے۔"

"شراب میں کیسا نشہ ہوتا ہے؟"

"یہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ تو نشہ کر کے دیکھنا ہوتا ہے۔ پیو گی تھوڑی سی شراب؟"

"نہیں نہیں۔ اگر شام تک نشہ رہا تو آفت آ جائے گی۔"

"یہ بالکل ممکن ہے۔ میری دو بہنیں جوان ہو گئیں تو انہوں نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا جو آج تم کر رہی ہو۔ وہ شراب کا نشہ کر کے دیکھنا چاہتی تھیں، لیکن مسئلہ یہی تھا کہ یہ کیوں کر ممکن ہو؟ ہوٹل میں جا کر تو پینے سے رہیں۔ انہیں مجھ پر اعتماد ہے۔ اسی لئے دل کی بات کہتے ہوئے انہیں مجھ سے کوئی جھجک نہ ہوئی۔ تم میری چھوٹی سی بہن شنو سے تو خوب واقف ہو۔ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر بن چکی ہے۔ میں نے ہی اسے پہلی بار شراب پلائی تھی۔ میں نے اسے تھوڑی سی دی، جسے وہ حلق سے اتار کر کہنے لگی: "بھیا کچھ اثر نہیں ہوا۔" میں نے تھوڑی سی اور پلا دی۔ اس نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ "بھیا کچھ اثر نہیں ہوا۔" اس کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی پی گئی۔ نشہ ایسا چڑھا کہ وہ خود سے باتیں کرنے لگی۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ اسے بھائی سے کتنی محبت ہے۔"

"لیکن شراب تو کڑوی ہوتی ہے!" بھولی نے کہا۔

"ضروری نہیں کہ کڑوی لگے۔ شراب کو اس طرح بھی استعمال کیا جا سکتا ہے کہ پینے والے کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ شراب پی رہا ہے یا شربت۔ شراب کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ اسے پھلوں کے رس میں، کوکا کولا میں، سوڈا واٹر میں ملا کر یا اور بھی کئی طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

"آپ شراب پر کتاب کیوں نہیں لکھ دیتے؟" بھولی ہنس دی۔

"تم اپنی بات کرو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نشے کا تجربہ کرنا چاہتی ہو۔"

"آپ نے گولی کو کیوں نہیں پلائی؟"

"میں نے بہت کوششیں کی کہ گولی بہکے، لیکن گولی اپنے ارادے اور اصول کی پکی ہے۔ میں بھی کسی زمانے میں گولی جیسا ہی تھا۔ وقت نے بدل دیا۔ مجھے تمہاری بہن کے پکے ارادے پر فخر ہے۔"

"میری بہن بور ہے، ڈرپوک ہے۔"

"تمہیں پینی ہے تو بات کرو۔ بہت مزہ دار، نشہ آور شے بنا کر لاؤں؟"

"منظور ہے، لیکن تھوڑی سی پلانا اور میرے قریب ہی رہنا۔ اگر نشہ چڑھ گیا تو کیا ہوگا؟"

"تھوڑی سی پلاؤں گا۔ اگر نشہ آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو بتا دینا۔ اس کا بھی علاج ہے۔ قہوہ پلا دوں گا۔"

گورکھ بھولی کے لئے جام بنا کر لے آیا اور اس سے کہا "ذرا آہستہ آہستہ پینا۔ جلدی مت کرنا۔"

بھولی نے آہستہ آہستہ جام حلق سے نیچے اتارا۔ "مجھے تو معلوم ہی نہ ہوا کہ اس میں شراب ملی ہے۔"

"ایک کش سگریٹ کا بھی لگا لو۔ دیکھو گلے میں خراش پیدا ہوتی ہے کہ نہیں۔"

"منظور ہے۔"

گورکھ نے سگریٹ سلگا کر بھولی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ بھولی نے دو کش کھینچے، کھانستی ہوئی کہنے لگی۔ "یہ مجھے موافق نہیں آئی۔ تمہیں ایک لطیفہ سناؤں؟ لیکن کسی کو بتانا نہیں۔"

"سناؤ۔ میں کیوں کسی کو بتانے لگا؟"

بھولی نے جو لطیفہ سنایا، اس میں سیکس کا رنگ زیادہ اور ہنسی کا رنگ کم تھا۔ گورکھ نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں ایسے بھڑکا دینے والے لطیفے کس نے سکھائے۔ تم دونوں بہنوں میں بہت فرق ہے!"

"وہ تو ہے۔ میں بھولی ہوں، وہ گولی ہے۔" بھولی ہنس پڑی۔ پھر کہنے لگی "آپ کو ایک پہیلی سناؤں؟ یہ بوجھ کر دکھایئے۔"

بھولی نے پہیلی سنائی۔ گورکھ چند لمحے سر کھجاتا رہا، پھر بولا "میں تمہاری پہیلی نہ سمجھ سکا۔"

"آپ ہار گئے۔"

"ہاں، میں ہار گیا۔" گورکھ نے اعتراف کیا۔

"آپ بھی کچھ سنائیں۔ کیا میں ہی سب کچھ سناتی رہوں گی؟"

"میں نے کہا نا کہ میں بور ہوں۔ مجھے کوئی پہیلی لطیفہ یا مذاحیہ قصہ نہیں آتا۔ میرے ذہن میں فلسفہ ہے میرے پاس کتابیں ہیں، فارمولے ہیں۔ میں نے تو ناول پڑھنے بھی چھوڑ دیئے۔"

"ضرور آپ بور ہیں۔" بھولی نے شوخی سے کہا۔

"مجھے اب آفس جانا ہے۔" گورکھ کہنے لگا اگر نشہ قابو میں ہے اور تمہاری طبیعت ٹھیک ہے تو کیا میں جاؤں؟"

"ذرا سا نشہ تو ہے، مگر اچھا لگ رہا ہے۔ آپ کو جانا ہے تو جائیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" بھولی نے کہا۔

شام کو گورکھ آفس سے لوٹا تو بھولی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ بھولی نظریں چرا کر مسکراتی رہی۔

اگلی دوپہر آئی تو بھولی کہنے لگی "کل مجھے بہت اچھا لگا۔ عموماً" میں دن میں نہیں سوتی، لیکن کل میں سو گئی۔ شام کو بھوک بھی زیادہ لگی۔ کوئی نئی بات سنایئے۔"

"نئی بات کیا ہوگی؟ برسوں ہم صبح سے شام تک ہر روز وہی کام کرتے رہتے ہیں۔ یعنی کولھو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔" گورکھ بولا۔

"مجھے آپ کا فلسفہ بگھارنا اچھا نہیں لگتا۔ کوئی اور بات کیا کیجئے۔"

"میں نے جو تمہاری تصویریں اتاریں، کیا تمہیں اچھی لگیں؟" گورکھ نے پوچھا۔

"ضرور اچھی لگیں۔" بھولی نے جواب دیا۔

"میں تمہیں گولی کی تصویروں کا البم دکھاتا ہوں۔ لیکن جیسے تمہارا لطیفہ میرے دل میں پوشیدہ ہے، اسی طرح تم اس البم کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔" گورکھ نے البم بھولی کے سامنے رکھ دی۔

بھولی دیر تک البم دیکھتی رہی۔ پھر کہنے لگی "اتنی تصویریں؟ آپ کو میری بہن کے سوا کیا کچھ اور نظر نہیں آتا؟ لگتا ہے آپ اس کے دیوانے ہیں!"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن امر اور سمر کی تصویریں بھی موجود ہیں۔ دوسری تصویریں بھی کھینچی ہیں۔ تم کہو تو تمہاری اور تصویریں اتار دوں؟"

"میں تصویر کے لئے تیار ہوں۔ میں ساڑی پہن کر تصویر کھنچوانا چاہتی ہوں۔ میں نے ابھی ساڑی پہننی شروع نہیں کی۔ دیکھنا چاہتی ہوں کہ ساڑی میں کیسی لگتی ہوں؟"

"تو بدل ڈالو لباس۔ میں کیمرہ تیار کرتا ہوں۔"

گورکھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد بھولی نے اسے آواز دی۔ گورکھ اندر پہنچا تو بھولی نے ساڑی اور بلاؤز کسی طرح پہن تو لئے تھے، مگر وہ ایک ہاتھ سے بلاؤز کو کمر کی طرف کھینچے کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔ "یہ کام مجھ سے نہیں ہونے والا۔ بلاؤز بہت کھلا ہے۔ کمر کے پیچھے لگے ہوئے ہک مجھ سے بند نہیں ہو رہے ہیں۔"

"میں بند کئے دیتا ہوں۔" گورکھ نے بڑھ کر بلاؤز کے دو ہک بند کر دئے۔ ایک ہک بھولی کی انگیا کے ہک کے بالکل قریب پڑتا تھا۔ گورکھ نے بلاؤز کو پیچھے کی طرف کھینچ کر چند سیفٹی پن لگا دیئے۔ اسی طرح بازوؤں کے گرد کپڑا کھینچ کر سیفٹی پن جڑ دیئے۔ گورکھ کے کہنے پر بھولی نے کاسنی رنگ کی کانچ کے منکوں کی مالا اور جھمکے،

ساڑی کے رنگ سے میل کھاتے ہوئے، پہن لئے۔ رخساروں پر پاؤڈر اور سرخی جمائی اور لبوں پر لپ اسٹک۔ پھر بولی۔ "چلیئے، کھینچئے تصویر۔"

"ابھی آرائش ادھوری ہے۔" گورکھ نے بھولی کی آنکھ کی پتلیوں میں نیلا رنگ بھرا، اور مژگان پر مسکارا کی لکیر کھینچی۔ بھولی آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر مسکرانے لگی۔

گورکھ نے کہا "باہر لان میں چلتے ہیں۔ آج سورج کی روشنی نہ زیادہ تیز ہے اور نہ زیادہ مدھم۔"

بھولی لجا گئی۔ "میں اس لباس میں باہر نہیں نکلتی۔ نوکر لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟"

"تمہاری تصویر ہی تو اتار رہا ہوں۔ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟" گورکھ نے اسے ہمت دلائی۔

چند تصویریں لان میں اور چند آئینے کے سامنے اتار کر گورکھ نے کیمرہ رکھ دیا۔ بھولی کہنے لگی "مجھے اس بلاؤز کے شکنجے سے تو نکالئے۔ چاروں طرف پن لگے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں سے بلاؤز پھٹ گیا تو بڑی مصیبت آئے گی۔ اور جسم میں سوئی گھس گی تو چھوٹی مصیبت!"

"بڑی مصیبت سے میں تمہیں چھٹکارا دلوا سکتا ہوں۔ لیکن چھوٹی مصیبت تو تم برداشت کر ہی لو۔" گورکھ نے آہستہ آہستہ تمام سیفٹی پن نکال ڈالے۔ بلاؤز کی دو ہک جو پیٹھ پر بند کئے تھے، وہ بھی کھول دیئے اور کمرے سے باہر ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ بھولی کے بازو اور ٹانگیں کتنی ملائم اور بغیر مو کے تھیں۔ گولی سے قطعی برعکس۔ دو بہنوں کے "دل دماغ اور جسم" میں اس قدر فرق؟ گولی کبھی کبھی ٹانگوں پر بال صفا لگا لیتی۔ لیکن گورکھ کو تو گولی کے مو بھی بہت پیارے لگتے تھے۔ ان پر لب پھیرتا تو ایک خاص لطف آتا۔ البتہ گولی کے ہونٹوں کے اوپر اگے روئیں کی سیاہ لکیر اس کی خوب صورتی کو ضرور کم کر دیتی تھی۔ گولی نے اس کا بھی علاج نکال لیا تھا۔ دہلی جاکر دو تین بار الیکٹرو لیسس کروا آئی تھی۔ ایک اسی قسم کی مشین گھر میں بھی رکھ لی تھی۔ گورکھ نے ایک ایک بال کی جڑ میں سوئی چبھو کر بجلی دوڑا کر بال کی جڑ ہی اکھاڑ پھینکی تھی۔

گورکھ روز دوپہر کے وقت بھولی کی تصویریں اتارتا۔ بھولی کیمرہ کے سامنے دل کش اداؤں سے، شوخ انداز سے گورکھ کے اشاروں کے مطابق بل کھاتی، پوز بناتی، جسم موڑتی، اٹھتی بیٹھتی اور لیٹتی۔ ایک روز گورکھ لگاتار ڈیڑھ گھنٹے تک فوٹو اتارتا رہا۔ آفس جانا بھی بھول گیا۔ بھولی کے چہرے سے تھکن ٹپک رہی تھی۔ گورکھ کیمرا اسٹینڈ سے اتارنے لگا تو بھولی پوچھنے لگی "اتنی تصویریں اتار چکے ہیں آپ۔ کیا کریں گے ان کا؟"

گورکھ نے جواب دیا: "تمہیں دکھاؤں گا۔ تم اپنی ادائیں اور خود کو دیکھ کر خود سے پیار کرنے لگو گی۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"تمہاری یادگار سلامت رہے گی۔ یہ سلائڈ فلم ہے۔ اسے پروجیکٹر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک دو دن میں فلم دھو کر، سلائڈز بنا کر تمہیں پروجیکٹر سے دکھاؤں گا۔ سلائڈ فلم کو چھپا کر رکھنا بھی آسان ہے۔" گورکھ

نے کہا۔ دل میں یہ بات تھی کہ تمام تصویریں گولی کو نہیں دکھانی چاہئیں۔
"پھر کیا ہو گا؟" بھولی نے چنچل لہجے میں پوچھا۔
"ہونا کیا ہے، تم خوش ہو جاؤ گی۔"
"میں تو اس پل بھی خوش ہوں۔ آپ کو ہی میری تصویریں اتار کر خوشی حاصل ہو رہی ہے۔"
"یہی سمجھ لو۔ آرائش کرتے وقت اور فوٹو کھنچواتے ہوئے مزہ تو تمہیں بھی آتا ہے۔ ذرا آئینے میں صورت تو دیکھو کتنی پیاری لگ رہی ہو۔"
گورکھ نے بھولی کی آنکھوں کی پتلی پر ہرا رنگ، آنکھوں کے نیچے سرخ رنگ اور ہونٹوں پر نیلا لپ اسٹک لگایا تھا۔ بھولی کی بکھری زلفیں اس کی پیشانی اور رخسار چوم رہی تھیں۔
"میری کیوں تعریف کرنے لگے؟ اپنے کیمرے سے ہی کھیلتے رہیں۔ آپ کو میں اچھی لگ رہی ہوں؟ لیکن میں تو سمجھتی ہوں کہ میں اس وقت بھوتنی سے کم نہیں۔"
"کیسی بات کرتی ہو؟ خود کو میری نظر سے دیکھو۔ مصور کی نظر سے دیکھو۔"
"یہ نیلے رنگ کی لپ اسٹک کہاں سے خرید لائے۔ معلوم ہے، جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کے ہونٹ نیلے پڑ جاتے ہیں!"
"یہ کیا کہتی ہو!" گورکھ نے اپنی ایک انگلی بھولی کے ہونٹوں پر رکھ دی۔ "تم بہت پیاری ہو۔ چھوٹی سی گڑیا کی طرح۔" گورکھ نے بھولی کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے ایک بوسہ اس کی پیشانی کا لیا۔
بھولی اس کے اور قریب سرک آئی۔ ایک دو پل وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ یکایک اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو گورکھ کے ہونٹ کھسکتے ہوئے، اس کی ناک سے رگڑ کھاتے ہوئے، رخسار کو چھو گئے۔ گولی نے کہا "میں اتنی کم سن نہیں ہوں جتنی آپ سمجھتے ہیں۔ آج میں بہت زیادہ تھک گئی ہوں۔ میری بہن کو تو آپ بہت زیادہ تنگ کرتے ہوں گے۔"
گورکھ گھبرا گیا اور گولی کا ہاتھ تھام کر بولا "سچ بتاؤ، کیا تمہیں فوٹو کھنچوانا اچھا نہیں لگا؟ تم نے پہلے کیوں نہ کہا؟ میں بھی دیوانوں کی طرح تمہاری تصویریں اتارتا چلا گیا۔ مجھے محسوس نہ ہوا کہ تم یہ سب صرف میری خوشی کے لئے کر رہی ہو۔"
بھولی اس درمیان قریب ہی چارپائی کے کونے پر بیٹھ چکی تھی۔ وہ واقعی تھک گئی تھی۔ گورکھ نے کہا "آرام سے لیٹ جاؤ، میں بھی تھک گیا ہوں۔ آفس ذرا دیر سے چلا جاؤں گا۔ تھوڑا آرام کئے لیتا ہوں۔"
بھولی چپ چاپ چارپائی پر دراز ہو گئی۔ گورکھ اس کے قریب ہی دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔ بھولی کے ناخنوں کے نیل پالش پر انگلیاں پھیرتے پھیرتے دونوں کی انگلیاں باہم پیوست ہو گئیں۔ گرفت کھلی تو انگلیاں

چہرے پر رقص کرتے کرتے گلے کا ہار بن گئیں۔ بھولی کی آنکھوں کی پتلی کا ہرا اور لال رنگ، ہونٹوں کا نیلا رنگ، رخساروں اور ہونٹوں سے چپکتے، دانتوں اور زبان کی نوک سے ہو کر حلق سے نیچے اتر۔نے لگے تو بھولی کہنے لگی "آج ایک نشہ اور پلا دو، تا کہ چہرے کے یہ رنگ خون میں گھل جائیں۔"

گورکھ دو جام بنا لایا۔ ادھر جام ٹکرائے اور ادھر لب۔

ایک روز گورکھ کہنے لگا "میری عمر بیالیس سال کے قریب ہو گئی۔ جو میں کہنے جا رہا ہوں، اس پر یقین کر سکو

" کہئے۔" بھولی بولی۔

"کل مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ علم ہوا کہ ایک نازنین کا حقیقی محبت بھرا بوسہ کیا ہوتا ہے۔ اگرچہ میں تصوراتی بوسوں اور مردانہ قسم کے بوسوں سے خوب واقف ہوں۔"

"کیا کہا؟" بھولی کی غزالی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔

"یہی کہ جس طرح تم بوسہ لیتی اور دیتی ہو، آج تک مجھے نصیب نہ ہوا۔"

"سچ کہتے ہیں آپ؟"

"ہاں۔ تمہیں ایک راز کی بات سناؤں؟"

"کیا؟"

"وہ کوئی خوش نصیب ہی ہو گا، جس سے تمہاری شادی ہو گی۔"

بھولی سمجھ تو بہت کچھ گئی، مگر اظہار کچھ اس طریقے سے کیا:

"تمہاری آہوں کا کچھ کچھ سبب سمجھ میں آنے لگا ہے۔"

گورکھ کمرے سے باہر گیا اور ایک شیشی اٹھا لایا۔ اس نے بھولی سے کہا۔

"جانتی ہو، اس شیشی میں کیا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"یہ کیمیکل میں فلم دھونے کے لئے استعمال کرتا ہوں۔ اس سے فلم پر کھینچی تصویر وجود میں آتی ہے۔ مگر یہ تیز زہر بھی ہے۔ تم نے جو مجھے بوسے کی سوغات بخشی ہے، اس کے عوض میں اسی وقت یہ کیمیکل پی لیتا ہوں۔ تمہاری تصویر سینے میں کھینچ جائے گی اور مجھے راحت مل جائے گی۔"

بھولی نے گورکھ کے ہاتھ سے شیشی چھین لی اور اس کے لبوں پر لب رکھتی ہوئی بولی "اگر آپ کو یہ سوغات اتنی ہی اچھی لگی تو کھایئے قسم کہ کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے، کبھی اس طرح جان دینے کی بات نہیں سوچیں گے۔ میں اپنی بہن کا گھر اجاڑنے تو نہیں آئی۔ آپ اس قدر دیوانے ہیں، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔"

گورکھ خاموش ہو گیا۔ بھولی بے قابو سی ہو رہی تھی۔ دیوانہ وار وہ گورکھ سے لپٹی جا رہی تھی۔ گورکھ نے اقرار کیا کہ وہ خودکشی نہیں کرے گا۔ بھولی کی جان میں جان آئی۔ کہنے لگی "اچھا مذاق کر لیتے ہیں آپ!"

گورکھ کی آنکھ میں آنسو چھلک آئے۔ اس نے انہیں چھپانے کی کوشش کی، لیکن وہ بھولی کی نظر سے نہ بچ سکے۔ وہ ہونٹوں سے آنسو پیتے ہوئے بولی "آپ یقیناً" دیوانے ہیں۔ لیکن اپنی زندگی سے گزر کر کوئی کام نہیں کرنا چاہئے۔ آپ نے میرے بوسے کی قیمت اصل سے زیادہ چکا دی۔ یہ قیمت مجھے ہمیشہ عزیز رہے گی۔"

اس رات گورکھ گولی کے ساتھ لیٹا تو دیر تک جاگتا رہا۔ ہر روز کی طرح گولی کروٹ بدل کر سو رہی تھی۔ گولی کے بازو پر گورکھ کا ہاتھ تھا۔ گورکھ کی آنکھ ذرا لگی ہوگی کہ اسے اپنی پیشانی پر جانا پہچانا لمس محسوس ہوا۔ سڑک پر لگے بجلی کے ستون سے ہو کر، کھڑکی کے شیشوں سے چھنتی، پردوں سے سرکتی، روشنی کی ایک لکیر گوکل کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ آج پھر وہ روبرو کھڑی تھی۔ اس نے ایک ہفتے سے گوکل کو یاد نہیں کیا تھا۔ یکایک اسے سامنے دیکھ آہستہ سے بولا۔ گوکل!"

اگرچہ اندھیرے میں گوکل کی صورت واضح نہ تھی، پھر بھی گورکھ نے محسوس کیا کہ وہ قدرے مسکرائی ہے۔ پھر وہ قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے جگمگاتا سفید لباس اور نقری گہنے پہنے ہوئے تھے۔ اس لباس سے جیسے دودھیا چاندنی چھنک رہی تھی۔ وہ گورکھ کے سینے پر جھک کر، اس کے لبوں سے لب ملا کر کہنے لگی : "الوداع، ہمیشہ کے لئے الوداع۔ اب میں نہ ملوں گی۔ خواہ مخواہ تصور کو حیران اور پشیمان نہ کرنا۔"

گورکھ کی روح چلائی : "دو پل تو ٹھہرو۔" اور اس کے ہاتھ ایک مہتابی شعاع کو چیر کر رہ گئے۔ آنکھیں ملتا ہوا وہ بستر سے اٹھا۔ کمرے میں اب بھی ایک تنویر کا حلقہ قائم تھا، جیسے کوئی روشن دیا ابھی ابھی خاموش ہوا ہو۔ الوداع کے وہ الفاظ اس کے وجود میں گونج رہے تھے۔ اس نے گوکل کو وجود میں لانے کی لاکھ کوشش کی، مگر ایک یاد کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ وہ اپنا قیاسی محبوب کھو بیٹھا تھا۔

اگلی دوپہر کو بھولی نے اس کی شکل دیکھ کر کہا "کیا بات ہے؟ آج آپ بہت اداس ہیں۔ کیا کچھ کھو گیا ہے؟"

"ہاں ایک ہی رات میں، بہت کچھ کھو دیا ہے، لیکن تم اسے نہیں سمجھ سکو گی۔" گورکھ کہنے لگا۔

"آپ کیا ہمیشہ پہیلیوں میں ہی بات کرتے ہیں؟"

"ہر ایک سے نہیں۔ تم یکایک نزدیک آ گئی۔ کچھ ہی دن میں دور چلی جاؤ گی۔ آج وہ بوسہ عطا کرو کہ لبوں سے کبھی جدا نہ ہو سکے۔"

دو ہفتے اور گزر گئے۔ بھولی کو دگواڑی میں رہتے ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے۔ گورکھ کو کاروبار کے سلسلے میں دہلی جانا تھا۔ بھولی بھی اس کے ساتھ ہو لی۔ ریل کے سفر کے دوران اتفاقاً" فرسٹ کلاس کے ڈبے میں مکمل

تنہائی نصیب ہوئی یہ بھولی کے بوسوں کی آخری رات تھی۔

دہلی ریلوے سے اسٹیشن میرٹھ تک انہوں نے ٹیکسی میں سفر کیا۔ بھولی کمبل اوڑھ کر گورکھ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ گورکھ آہستہ آہستہ اس کے لبوں پر انگلیاں پھیرتا رہا۔ دونوں کے دل میں ایک دائرہ' ایک حد' ایک ضبط تھا۔ دونوں اردو کے روایتی شاعروں کی طرح محبوب کی گردن سے کبھی نیچے نہ اترے تھے۔ اس روز ٹیکسی کی سیٹ پر کمبل کے اندھیرے میں گورکھ نے بھولی کے سینے کے دائرے چھو لئے۔ اور بے خود ہو کر انہیں ہولے ہولے سہلاتا رہا۔ بھولی سرور کے عالم میں آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ ٹیکسی کے میرٹھ پہنچنے سے پہلے ہی بھولی اچھل کر اٹھ بیٹھی۔ ڈرائیور تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے کرایہ لے کر چلتا بنا۔

گورکھ واپس دگواڑی آیا تو بے حد مایوس اور اداس تھا۔ اسے بھولی کی یاد آتی 'گوکل کی یاد آتی اور یہ احساس بھی کرید تا کہ پہلے گوپی سے صرف تصور میں دغا کی اور پھر سچ مچ بھی بے وفائی کر بیٹھا۔

قیاسی دلہن کے ساتھ' محبت آزاد تھی۔ کوئی دائرہ' کوئی حد' کوئی رکاوٹ حائل نہ تھی۔ آہ وہ گوکل کا مکمل پیار آج کیوں سو گیا؟

بھولی کے ساتھ ایک ضبط تھا' ایک حد بندی تھی۔ حقیقت اور قیاس کا فرق' کتنا نزدیک' کتنا دور! مگر گورکھ کا دل خود کو بے وفا قرار دینے سے انکار کر رہا تھا۔

"کسی کے قیاس میں کیا ہے؟ اس سے کسی کو کیا مطلب؟ میں اگر بادشاہت کے خواب سجالوں اور اسی دنیا میں گزر کرنے لگوں تو کسی کو کیا غرض؟ اگر مجھے کسی قیاس سے تسلی ملتی ہے تو زمانے کا کیا بگڑتا ہے؟ بھولی کے بوسے زندگی کی ایک حقیقت کا احساس ایک زندہ تصور' ایک لٹتی بہار۔ اگر وہ گناہ تھے تو ان گناہ کے پھولوں میں یہ رنگت کیوں؟ یہ خوشبو کیسی؟ یہ مہک کیسی؟ یہ پھول سدا بہار کیوں؟ ذہن کے کسی گوشے میں ہمیشہ خنداں' ایک تنویر کی طرح' روشنی کی طرح' شعاع کے مانند۔ اگر واقعی کچھ گناہ ہوتا تو سویدائے دل اس روشنی میں یوں تاباں نہ ہوتا۔

گولی کے بھائی راجندر کی شادی ہوئی اور بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی سے کچھ ماہ قبل ہیرالال نے ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کروائی تھی اور وہیں رہنا شروع کر دیا تھا۔ سارے میرٹھ میں اس کوٹھی کی شہرت تھی۔ کئی قریبی رشتہ داروں کے دلوں میں تو حسد کی آگ سلگ اٹھی تھی' شادی کے موقع پر گورکھ نے لوگوں کو فقرے کستے سنا : "دولت کے زور پر شان و شوکت دکھائی جا رہی ہے۔ زر کی دیوالی منائی جا رہی ہے۔" جو لوگ یوں ٹھنڈی آہیں بھر رہے تھے' وہ سب ہیرالال کے قرض دار تھے۔ وقت پڑنے پر وہ ہیرالال کے آگے ہاتھ پھیلانے سے نہ چوکتے تھے۔ ان کی حیثیت اور وقعت ہیرالال کے بغیر صفر کے برابر تھی۔ اور وہ لوگ ان کے اکلوتے لڑکے کی شادی کے موقع پر خوشی کی جگمگاہٹ سے اندر ہی اندر جل رہے تھے۔

راجندر کی شادی ہوئے ابھی چھ مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ بہو پیلو' نے اپنے اختیارات جتانے شروع کر دیئے۔ راجندر والدین کی حکم عدولی تو نہ کرتا' لیکن بیوی کو بھی کچھ نہ کہتا۔ ہیرالال اور پدمانہ بہو کو کچھ کہتے اور نہ لڑکے کو۔ بہو کے برتاؤ سے پریشان ہو کر ایک بار صلاح مشورہ کرنے وہ دگواڑی آئے۔ مسئلے بہت سے تھے۔ پشتوں سے سب ساتھ رہتے آئے تھے۔ کاروبار اس طرح پھیلا کہ راجندر کے بغیر چل نہیں سکتا تھا۔ ہیرالال کو قدم قدم پر راجندر کی ضرورت پڑتی' اس لئے علیحدہ رہنا ناممکن تھا۔ پدما اپنی بہو کی دخل اندازی۔ بد دماغی اور برے برتاؤ کی وجہ سے زیادہ پریشان تھی۔ الجھن جوں کی توں رہی۔ کوئی حل نہ نکل سکا۔

میرٹھ واپس پہنچنے کے چھ مہینے بعد ہیرالال پر فالج کا دورہ پڑا۔ وہ پہلے ہی دل کے مریض تھے۔ کئی برس سے بلڈ پریشر کے شکار تھے۔ کاروباری فکروں اور بھاگ دوڑ الگ جی کا جنجال بنی ہوئی تھیں۔ دواؤں پر زندگی چل رہی تھی۔ فالج کے دورے نے کیفیت ہی بدل دی۔ ڈاکٹروں کے علاج سے آرام تو آگیا' لیکن جسم کے دائیں حصے اور دائیں آنکھ کو ہمیشہ کے لئے لقوہ مار گیا۔ ہیرالال زندگی بھر سرگرم عمل رہے تھے۔ مریض کی طرح بستر سے لگ جانا ان کی فطرت میں شامل نہ تھا۔ ایسوں کے لئے منزل کا احساس کم ہو جاتا ہے اور چلتے رہنا ہی منزل بن جاتا ہے۔ زندگی کو جس رخ بہا لیا جائے' زندگی اس رو بہنے لگتی ہے۔ ایک دم دھارے بدلنے ناممکن ہوتے ہیں۔ انسان جب تک بھاگ سکتا ہے' بھاگتا رہتا ہے۔ مگر یہ دوڑ اسی وقت تک جاری رہتی ہے جب تک ہموار زمین پر پاؤں پڑتے رہیں۔ جہاں ٹھوکر لگی' یکایک نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ جب تک آنکھ کھلتی ہے' عمر گزر جاتی ہے۔ فالج

کے بعد ہیرالال کے دل و دماغ کی حالت کچھ ایسی ہی ہوگی۔ وہ اپنی مجبوری کسی پر ظاہر تو نہ کرتے، لیکن انہیں گھر بیٹھنا اور کسی کا محتاج ہونا بالکل پسند نہ تھا۔ اب دو قدم رکھنے کے لئے بھی انہیں کسی سہارے کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہ اس مجبوری سے سمجھوتا نہ کر سکے۔ راجندر کی شادی کے ساتھ وابستہ ناامیدی نے بھی اپنا اثر دکھایا ہوگا۔ ایک روز ناشتے کے بعد بستر پر لیٹے تو پھر نہ اٹھے۔ دگواڑی خبر پہنچی تو گولی دیوانی ہو گئی۔ اسی رات ٹیکسی لے کر گورکھ اور گولی کلکتہ پہنچے۔ گولی کو مشکل سے ہوائی جہاز میں دہلی کی سیٹ ملی۔ گورکھ چند دن بعد ٹرین کے ذریعہ میرٹھ پہنچا۔

ہیرالال کی اچانک موت کے بعد تمام کاروبار کی ذمہ داری راجندر کے سر آپڑی۔ کاروباری فراست میں وہ ہیرالال کو بھی مات کر گیا، اس لئے کاروبار میں اضافہ ہی ہوا۔ مگر پدما کی زندگی اور بھی دوبھر ہو گئی۔ پیلو اسے بالکل محتاج بنا کر رکھنا چاہتی تھی کسی نہ کسی بات پر آپس کا تناؤ بڑھ جاتا۔ پدما کی صحت پہلے ہی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ہیرالال کی موت کے بعد وہ اکثر بیمار رہنے لگی۔ پیلو کی وجہ سے گولی کا میرٹھ جانا بھی، تقریباً" بند ہو گیا۔

گورکھ کی ملازمت کا نقشہ بھی بدلنے لگا۔ اسے چیف انجینئر کے عہدے پر لگے ہوئے چار سال ہونے کو آئے تھے۔ اس درمیان کمپنی میں کافی بدانتظامی پھیل گئی۔ گورکھ جتنا تیکنیکی معاملوں میں ہوشیار تھا، دنیاوی امور میں اتنا ہی اناڑی تھا۔ اس نے ایک لیبر یونین کے لیڈر کی ترقی روک دی۔ افسر جانتے تھے کہ وہ شخص نکما ہے، لیکن گورکھ کا ساتھ دینے کی بجائے کئی افسر اس کے خلاف ہو گئے۔ آفس میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ گروہ بندی اور پالیٹیکس کی لپیٹ میں آفس پہلے ہی آچکا تھا۔ کچھ لوگ گورکھ کی کامیابی سے جلتے تھے۔ گورکھ نے کسی کو سر پر بٹھایا، نہ گرایا، نہ اکسایا، نہ بھڑکایا اور نہ کسی سے قریبی تعلقات قائم کئے۔ اگر کوئی رشتہ تھا تو صرف کام کا۔ وہ صرف تیکنیکی مہارت کی بدولت ترقی کرتا گیا تھا۔ اب تک یہ پالیسی کامیاب رہی، مگر وقت کے ساتھ پٹ گئی۔ جب کئی بار "گھیراؤ" اور کچھ جانے پہچانے غنڈے بھی اس کے مخالفوں میں شامل ہو گئے تو وہ ڈر گیا کہ کہیں جان سے ہی ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔ ایک خیر خواہ نے سمجھایا : "یوں ہوا کے رخ کے خلاف چل کر سب کی دشمنی مول لینا ٹھیک نہیں۔ معلوم نہیں، دو مہینے پہلے ہی ایک غنڈے نے سرعام ایک افسر کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا تھا!"

گورکھ حالات کے آگے جھک گیا۔ اس نے جلدی سے یونین کی مانگیں پوری کر دیں اور سب کی ترقی بحال کر دی، لیکن اس کے دل کو صدمہ ضرور پہنچا۔ حقیقت کے ایک کڑوے گھونٹ نے ہی سارے اصول مٹی میں ملا دیئے۔ وہ بلاناغہ اسی طور آفس جاتا، کرسی پر بیٹھتا، کام کرتا۔ چپراسی اسے چائے پلاتا، لوگ اس کی عزت کرتے، وہ دورے پر جاتا، پی اے "یس سر" کہتا، لیکن گورکھ کہیں دل ہی دل میں ٹوٹ چکا تھا۔ جیسے اس کا خزانہ لٹ گیا ہو اور وہ ایک تھکا ہوا، لٹا ہوا مسافر ہو۔

گورکھ کا ایک دوست علی صابر دو سال سے ایران میں ملازمت کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ گورکھ کے تحت کام کر چکا تھا۔ اکثر اس کے خط آتے رہتے تھے۔ وہ گورکھ کے تیکنیکی علم اور تجربے سے بہت متاثر تھا۔ ایک بار اس نے لکھا : "آپ وہاں بہت اونچے عہدے پر ہیں۔ لیکن اگر آپ ایران میں ملازمت کرنا چاہیں تو یہ بالکل ممکن ہے۔ یہاں جلد ہی کافی دولت کمائی اور بچائی جا سکتی ہے۔ یہاں ٹیکس بھی کوئی نہیں۔"
برسوں سے گورکھ یہی سوچتا آیا تھا کہ اگر اس کے پاس چار پانچ لاکھ روپے بچ جائیں تو وہ نوکری کے بکھیڑوں سے رخصت لے لے۔ اگر ایران میں تین سال بھی کام کر لیا جائے تو پھر تمام عمر کام کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ یہاں کی جھوٹی شان سے، بہتر تو یہی ہے کہ ایران میں دولت کمائی جائے۔ اس نے علی کے کہنے پر ملازمت کے لئے عرضیاں بھیج دیں۔ کچھ دن بعد ایران کی ایک کمپنی نے اسے ٹیلی گرام کے ذریعہ نوکری کی پیش کش کی۔ گورکھ کو دگواڑی میں پندرہ سال سے بھی زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ دگواڑی سے کہیں دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے تار ملتے ہی نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ آفس میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جنرل منیجر، جو اسے بہت مانتا تھا، کہنے لگا : "مجھے یہ امید نہ تھی کہ تم استعفیٰ دوگے۔ میں تمہیں دہلی بھیج دیتا ہوں۔ تم استعفیٰ واپس لے لو۔" مگر گورکھ پر تو باہر جانے کا شوق سوار تھا۔ اس نے کسی شرط پر بھی استعفیٰ واپس لینے سے انکار کر دیا اور ایران کی کمپنی سے تین سال کا کنٹریکٹ حاصل کر لیا۔ دوبار دہلی جا کر وہ ایران کی ایمبیسی میں ویزا کی عرضی دے آیا۔ ایمبیسی کے باہر سڑک تک لمبی قطاریں دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ اتنے لوگ ایران جاتے ہیں، سب ہی اس کی طرح دولت کے پیاسے ہیں۔ ایمبیسی میں لگاتار تین ماہ چکر لگانے کے باوجود گورکھ کو ویزا نہ ملا۔ ایران سے کمپنی کے خط آنے لگے جلد نوکری پر پہنچو۔
گورکھ نے دہلی میں پڑاؤ ڈال دیا۔ وہ ہر روز ایمبیسی جاتا اور ناکام لوٹتا۔ اسے چیف انجینئر کی کرسی چھوڑے کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ قطار میں کھڑے ہو کر گھنٹوں انتظار کرنا اسے بہت کھلتا تھا۔ اسے اپنی حالت پر رونا آنے لگا۔ پریشانی اس قدر بڑھی کہ وہ سوچنے لگا : "کیوں نہ اپنی نوکری واپس لے لوں؟ کیا رکھا ہے ایران جا کر نوکری کرنے میں؟ مانا کہ آفس سازشوں اور پالیٹکس کا اڈا بن گیا ہے، لیکن کون سا ایسا اونچا عہدہ ہے جو ان کی لپیٹ میں نہیں آتا؟ اگر ترقی کرنے کا شوق ہے تو پریشانیاں جھیلنا بھی سیکھو۔ اپنا رویہ بدل ڈالو۔ کچھ لوگوں کو اپنی مٹھی میں رکھو۔ سازشوں کا مقابلہ کرو۔ مخالفوں کو ان ہی کے ہتھیار آزما کر مات دو۔"
ایک دن گورکھ کو سر راہ ریتا مل گئی۔ اس نے حال ہی میں انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ گورکھ نے ہی کمپنی میں ملازمت کے لئے اس کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن آفس میں کبھی اس سے تیکنیکی گفتگو کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ ادب سے سلام کر کے کہنے لگی "اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟"

"ضرور کہئے، کھل کر کہئے۔" گورکھ بولا۔

"آپ کی آفس میں اتنی شہرت تھی کہ شاید آپ کو اندازہ بھی نہ ہو گا۔ کمپنی کے کتنے کارخانے ہیں۔ کہیں بھی کوئی مشکل سامنے آتی تو آپ کو یاد کیا جاتا۔ میں سوچتی ہوں کہ اتنی کم عمر میں آپ اتنے اونچے عہدے پر ہی نہیں پہنچے بلکہ اپنی قابلیت کی ایک مہر سب کے دلوں پر ثبت کر گئے۔ میں نے آپ کے لکھے ہوئے مضامین بھی تیکنیکی رسالوں میں پڑھے ہیں۔ کسی کو اتنی عزت اور اتنا اونچا عہدہ ملے تو وہ باہر کے کسی ملک میں کیوں جائے؟ کیا صرف دولت کے لئے؟"

ریٹا کی بات سچے دل سے نکلی معلوم ہوتی تھی گورکھ سوچنے لگا کہ اسے ایران میں کیا چاہئے؟ وہ ریٹا کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ صرف اتنا کہہ کر رہ گیا : "مجھے تو آج ہی معلوم ہوا کہ آپ لوگ مجھے اس قدر سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ آپ کی بات ٹھیک ہے۔ میں نے کبھی غور سے نہیں سوچا کہ مجھے کیا حاصل ہے۔ کبھی کبھی جب کوئی چیز ہاتھ سے نکل جاتی ہے، تب ہی اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ آپ کے مشورے کا شکریہ۔"

گورکھ محسوس کرنے لگا کہ اس نے ناسمجھی اور جلد بازی سے کام لیا ہے۔ بیس سال کی محنت کے بعد حاصل کیا ہوا رتبہ اور عزت خاک میں ملا دی۔ کل وہ چیف انجینئر تھا، لیکن آج ایران کا ویزا بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر اسے پیشہ ورانہ اور ذاتی زندگی میں دل کا چین اور اطمینان حاصل نہ ہوا تو یہ اس کے دماغ کا ہی خلل ہے۔ ان ہی خیالات کے تحت اس نے جنرل مینیجر کو ملازمت اور رتبہ بحال کرنے کی درخواست پیش کر دی، جو ایک دن میں ہی منظور ہو گئی۔ مگر جب وہ خوشی خوشی اپنے آفس کے کمرے کی جانب لپکا تو اس کے پی اے نے راستہ روک کر کہا "صاحب اندر مصروف ہیں۔ آپ تھوڑا انتظار کریں۔"

کمرے کے اندر سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ تو کبھی آفس میں اس طرح کھل کر نہیں ہنستا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے اندر جانے دیا گیا۔ اس کا ماتحت اس کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسے چیف انجینئر کا عہدہ دے دیا گیا تھا۔ گورکھ کو دیکھتے ہی وہ بولا "آؤ گورکھ بیٹھو۔ سنا ہے تم نے اسی کمپنی میں دوبارہ ملازمت اختیار کر لی ہے؟" گورکھ نے "ہاں" کہہ کر مختصر سا اقرار کیا۔ پھر ایک چھوٹا سا کمرہ اس کے لئے عارضی طور پر خالی کر دیا گیا۔ جو لوگ اسے جھک کر سلام کرتے تھے، سینہ تانے اسے طنز آمیز نظروں سے تک رہے تھے، جیسے پوچھ رہے ہوں : "استعفیٰ تو بڑی شان سے دیا تھا۔ آ گئے واپس دم ہلاتے!"

گورکھ ایک ہی دن میں کیفیت سمجھ گیا۔ آفس کے اندر اور باہر سرگوشیاں چل رہیں تھیں۔ اس نے کبھی کسی کا دل جیتنے، کسی کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کون اسے تازہ ماحول سے واقف کرواتا؟ وہ اپنی تیکنیکی مہارت اور لیاقت کے نشے میں چور آگے بڑھتا گیا تھا۔ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا تھا، کام یابی نصیب

ہوئی تھی۔ کبھی کسی نے حکم عدولی نہ کی تھی' اس کے تیکنیکی فیصلے کے خلاف آواز نہ اٹھائی تھی۔ آج جب وہ دوبارہ نوکری پر آیا تو ماحول بدل چکا تھا۔

شام کو گورکھ آفس سے لوٹا تو اس کے ایک ماتحت شام لال نے اسے فون کیا : "میں آپ کی بھلائی کے لئے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہو۔" گورکھ بولا۔

"آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ بہت لوگ آپ کی نوکری بحال ہونے کی وجہ سے ناخوش ہی نہیں ہیں' مخالفت پر کمربستہ ہو رہے ہیں۔"

"میں نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف تین مہینے کا عرصہ ہی تو گزرا ہے۔ بیماری کے دوران میں بھی تو میں چار مہینے تک آفس سے غیر حاضر رہا تھا۔

"آپ خود بات سمجھنے کی کوشش کریں مجھے جو کہنا تھا' کہہ دیا۔" شام لال نے نرمی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

گورکھ اگلے دن آفس پہنچا تو اس کے کمرے کے دروازے پر لگا ہوا اس کے نام اور عہدے کا عارضی بورڈ ٹکڑے ٹکڑے ہوا پڑا تھا۔ کمرے میں جگہ جگہ "ہائے ہائے" اور مردہ باد!" کے لیبل چپکے ہوئے تھے۔ گورکھ کو آفس کے اسٹاف سے یہ امید نہ تھی۔ اس نے سوچا کہ لوگوں کا یہ غصہ عارضی ہے۔ وہ اسے دل سے چاہتے ہیں' جیسے ریتا چاہتی ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ نہیں' زیادہ تر لوگ اس کے خلاف ہی ہیں شاید اکیلی ریتا ہی اسے پسند کرتی ہوگی۔

گورکھ فوراً گھر واپس آ گیا۔ مقدر کا فیصلہ سامنے تھا۔ اسے ہر حال میں ایران جانا ہوگا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایران ایمبیسی سے ویزا حاصل کرنا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔

گولی نے گورکھ کو اپنے ایک رشتہ دار کے نام جو گورنمنٹ میں بہت بڑے عہدے پر تھا سفارشی خط دیا تھا۔ ایران کی ایمبیسی میں جانے کی بجائے سفارشی خط لے کر گورکھ پہلے اس رشتہ دار سے ملا۔ خط پڑھتے ہی اس رشتہ دار نے ایران کی ایمبیسی کے ایک اعلیٰ سفارت کار کو ٹیلی فون کھڑکایا۔ اگلے ہی روز گورکھ کو ویزا مل گیا۔ اس کی زندگی میں کئی مقام ایسے آ چکے تھے جب وہ دوسروں کی مدد لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بچپن کا وہ عہد کہ بڑے آدمیوں سے ہمیشہ دور رہے گا' کئی بار ٹوٹا تھا۔ اب اس کے پاس نہ کوئی عہد تھا' نہ خود پر اعتماد۔ وہ کسی درخت سے ٹوٹے پتے کی طرح تھا۔ ہوا جدھر چاہے' اڑا لے جائے۔ بلکہ درحقیقت وہ درخت سے ٹوٹے پتے کی طرح بھی نہ ہو سکا تھا۔ اگر پتہ اڑتا اڑتا شعلے پر جا گرے تو اپنے آپ جل جاتا ہے۔ لیکن گورکھ ابھی جلنا نہیں چاہتا تھا

وہ جینا چاہتا تھا۔ جہاں مخالف ہوا چلی' وہ خود کو بچانے کے لئے تلملانے لگا۔ اس وقت سارے اصول لمبی تان کر سو گئے۔ ویزا کے ہاتھ میں آتے ہی کئی واقعات گورکھ کے دماغ میں ابھرنے لگے۔ وہ واقعات جو مقدر کے ہاتھ میں ہیں۔ کسی کا ان پر کوئی بس نہیں۔ ایسے میں تدبیر' رسوخ' چاپلوسی' تحفے' رشتہ داری' ہوشیاری جیسے حربے ہی کارگر ہو سکتے ہیں۔ گورکھ ان سے کیسے دامن بچا سکتا تھا۔ اسے فنا تو ہونا نہیں تھا۔

جب بھی گورکھ کار میں گولی کے ہمراہ نکلتا تو بہکنے لگتا۔ کار مستی میں تیز رفتار سے چلاتا' لبوں پر گیت ہوتے' جیسے وہ کار نہیں چلا رہا ہو' بلکہ ہوائی جہاز اڑا رہا ہو۔ کیا ساری مستی اس وقت کے لئے ہی مخصوص تھی؟ گولی ویسے تو کبھی دیر تک اس کے قریب نہیں بیٹھتی تھی' لیکن چلتی گاڑی میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ اسے گورکھ کے پاس ایک ہی جگہ دیر تک بیٹھنا پڑتا۔ ایک تو گولی کی قربت کا نشہ' دوسرے گورکھ شراب پینے سے بھی باز نہ آتا تھا۔ ایک نشے میں دوسرا نشہ یوں تحلیل ہوتا کہ گورکھ بے خودی میں گنگناتا گیت گاتا' غزل کے اشعار زبان پر لاتا' گولی کو گدگداتا' اور گاڑی چلاتا۔ نتیجہ یہی ہوتا کہ کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا۔ کئی حادثوں سے دوچار ہونے کے باوجود اس کا انداز یہی رہا۔

گولی کا بھائی راجندر ٹاٹا نگر سے نئی کار خریدنے کے لئے آیا ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ٹاٹا نگر میں نئی کاروں کی قیمت کچھ کم تھی۔ نئی کار خرید کر راجندر' گولی' گورکھ' امر اور سمر واپس دگواڑی لوٹ رہے تھے۔ شام کا وقت تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ شام کو سب نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور دگواڑی کی طرف روانہ ہوئے۔ راجندر نئی گاڑی چلا رہا تھا۔ امر اور سمر دونوں اس کی کار میں سوار تھے۔ گورکھ راجندر کے پیچھے پیچھے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس نے دو بوتل بیئر چڑھا رکھی تھی۔ گولی اس کے قریب بیٹھی تاکید پر تاکید کئے جا رہی تھی کہ گاڑی آہستہ چلائے۔ اگر راجندر آگے نکل جاتا ہے تو نکل جانے دے۔ مگر گورکھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ دو دن سے اسے گولی کر قربت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ وہ مستی میں گنگنا رہا تھا کہ گاڑی کے پہیے پھسلے اور گاڑی سڑک چھوڑ کر سڑک کے کندھوں پر چڑھ گئی۔ رفتار زیادہ تھی' اس لئے رکتے رکتے پتھروں اور جھاڑیوں سے گذرتی پھسلتی چلی گئی۔ گورکھ اور گولی' دونوں کے ہوش اڑ گئے۔ سامنے دو اونچی اور لمبی جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ گورکھ ان جھاڑیوں سے ٹکرانا نہیں چاہتا تھا' لیکن کار ان جھاڑیوں کو دل دے بیٹھی اور ان ہی میں جا پھنسی۔

دونوں کے حواس کچھ سنبھلے تو دونوں اپنے اپنے جسم کو دیکھنے لگے۔ کہیں بھی چوٹ نہیں لگی تھی۔ دونوں صحیح سلامت تھے۔ جیسے ہی کار کے دروازے کھول کر دونوں نے جھاڑیوں سے نیچے جھانکا' ایک گہرا دریا رواں نظر آیا۔ اگر کار پانچ فٹ اور آگے سرک جاتی تو دونوں روحیں جسم چھوڑ کر پرواز کر گئی ہوتیں۔

راجندر نے جب گورکھ اور گولی کی کار نہ دیکھی تو وہ اپنی کار کو واپس لایا۔ گاڑی جس ادا سے جھاڑیوں میں

پھنس گئی تھی، وہ بلاشبہ ایک خوب صورت نظارہ تھا۔ جھاڑیوں کا پچھلا حصہ کاٹ کر کار باہر نکالی گئی۔

راجندر نے گورکھ سے کہا "آج تم دونوں موت کے مونہہ میں جانے سے بال بال بچے۔ میرا خیال ہے، تم نئی گاڑی چلاؤ۔ بلکہ بہتر ہے کہ گولی کو نئی کار چلانے دو اور میں تمہاری کار لے کر آتا ہوں۔ باقی سفر کم رفتار سے طے کریں گے۔"

گورکھ بولا "میں اپنے اور گولی کے بارے میں تو سوچ ہی نہیں رہا تھا۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ خدا بھی بڑا کارساز ہے۔ یہ اسی کا کرم ہے کہ کچھ دیر پہلے امر اور سمر تمہاری کار میں اس شوق میں سوار ہو گئے تھے کہ نئی کار میں سفر کریں گے۔"

ایک مرتبہ گولی اور گورکھ بھونیشور کی سیر کو نکلے۔ ٹاٹا نگر سے آگے بڑھے تو جنگلوں کی راہ پکڑلی۔ راہ میں آدی واسی لوگوں کے گاؤں پڑتے تھے۔ ان کے میلے لگتے تھے۔" دونوں نے سوچا کہ آدی واسیوں کا رہن سہن دیکھتے ہوئے چلیں گے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گورکھ نے کھانے کے بعد دو بوتل بیئر پی لی تھی۔ گولی نے کہا "مجھے گاڑی چلانے دو۔ تم ذرا آرام کرلو۔ صبح سے گاڑی چلا رہے ہو۔" لیکن گورکھ نہ مانا۔

ابھی کچھ فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ ایک گائے کھیت سے نکل کر بھاگتی ہوئی سڑک پار کرنے لگی۔ گائے کو بچانے کی کوشش میں کار ایک پیڑ سے ٹکرا گئی۔ کار کا مونہہ پچک گیا، گرم پانی رسنے لگا اور بھاپ اڑنے لگی۔ گورکھ نے کار کا گھونگھٹ اٹھایا تو ریڈ-یٹر پھٹ چکا تھا۔

فیئٹ کار کی نزاکت مشہور تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اگر مونہہ پر ایک طمانچہ پڑے تو فورا" رو دے گی! گورکھ کی کار پہلے بھی تین بار اسی طرح دھواں دھواں ہو چکی تھی۔ بہر حال، پھٹے ریڈ-یٹر میں کپڑا ٹھونس کر اور پانی بھر کر کچھ فاصلے تک کار چلائی گئی۔ مگر کار کو آہیں بھرتے اور گرم ہوتے دیکھ کر رکنا پڑا۔ تنگ سڑک، اونچے اونچے گھنے پیڑ، سبک رو، خنک ہوا، لیکن دور دور تک کوئی آدم نہ آدم ذات۔ یکایک ایک ٹرک آتا دکھائی دیا تو اسے روک لیا گیا۔

ٹرک ڈرائیور بولا "کیا بات ہے صاحب، کیا ہوا؟"

گورکھ نے جواب دیا "ہونا کیا تھا، ایک گائے یکایک سامنے آ گئی۔ خود تو بچ نکلی لیکن میرا ریڈ-یٹر پھاڑ گئی۔" اگلے شہر تک کار ٹرک کے پیچھے رسے سے باندھ کر لے چلو۔ جو کہو گے انعام دے دوں گا۔"

ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھا ایک شخص رضامند ہو گئے۔ تقریبا" تیس میل کے بعد ڈرائیور نے ٹرک ایک پولیس اسٹیشن کے سامنے روک دیا۔ گورکھ سمجھا کہ اسے پولیس اسٹیشن میں کوئی کام ہو گا۔ لیکن ماجرا کچھ اور ہی نکلا۔ کار سے بندھا ہوا رسا کھول کر ٹرک ڈرائیور نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور چلتا بنا اور ایک پولیس کا سپاہی گورکھ سے کہنے لگا "آپ کو انسپکٹر صاحب اندر بلا رہے ہیں۔"

گورکھ گولی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ انسپکٹر بولا؟ "میں آپ کو آگے نہیں جانے دوں گا۔ معلوم نہیں آپ پیچھے کیا نقصان کر آئے ہیں۔ میں یہاں کے سیدھے سادے گاؤں والوں کا خادم ہوں۔ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ شاید کسی کے جانور کو چوٹ لگی ہو اور وہ رپورٹ درج کروانے یہاں آئے۔"
گورکھ نے حقیقت بیان کی، بہت منت سماجت کی، لیکن انسپکٹر اپنی بات پر اڑا رہا۔ شام ڈھلنے لگی تو انسپکٹر کہنے لگا "آپ دونوں کا بستر یہاں الگ الگ کمروں میں لگے گا۔ آپ دونوں ہی قصوروار ہیں۔ آپ کو علیحدہ علیحدہ سونا پڑے گا۔"
اب گورکھ کے ہوش ٹھکانے آئے۔ "دیکھئے آپ خواہ مخواہ ہمیں پریشان کر رہے ہیں۔ چار گھنٹے گزر چکے ہیں اور کوئی بھی شخص شکایت کرنے نہیں آیا۔ یقین کیجئے، ہم سے کسی بھی آدمی یا جانور کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔" آپ میرا بیان لے لیں اور ہمیں جانے دیں۔" انسپکٹر مسکرا کر چپ ہو گیا۔ کچھ وقت اور گذر گیا تو گورکھ کی بے چینی بڑھنے لگی۔ گولی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گورکھ بولا "فکر کیوں کرتی ہو؟ میں مرتے دم تک تمہیں اکیلا نہ چھوڑوں گا۔"
یکایک گورکھ کو یاد آیا کہ اس کے ایک دوست کا رشتہ دار، اڑیسہ میں ایم پی ہے۔ دماغ پر زور دیا تو اس کا نام بھی یاد آ گیا۔ گورکھ نے انسپکٹر سے کہا "دیکھئے میں چیف انجینئر کے عہدے پر ہوں۔ بھونیشور میں مسٹر ڈبو رام ایم پی میرے بہت قریبی دوست ہیں۔ آپ ان سے بات کرلیں۔"
یہ سنتے ہی انسپکٹر کا رویہ بدل گیا۔ اس نے سپاہی کو اندر بلا کر مٹھائی اور چائے منگوائی۔ گورکھ اور گولی سے اصرار کیا کہ چائے ضرور پی جائے۔ گورکھ اور گولی ایک دوسرے کی طرف تکتے ہوئے سوچنے لگے کہ کہیں اس چائے اور مٹھائی میں کوئی نشیلی چیز نہ ملی ہو۔ لیکن انسپکٹر کو ناراض کرنا بھی مناسب نہ تھا۔ اس لئے دو دو گھونٹ چائے پی لی گئی۔ رات کو دس بجے کے قریب انسپکٹر نے ایک ٹرک کو روک کر ڈرائیور کو حکم دیا کہ کار اگلے شہر تک پہنچا دے۔
گورکھ اور گولی کی جان میں جان آئی۔ یہ کس مصیبت میں پھنس چلے تھے؟ نہ جانے کیا انجام ہوتا۔ گورکھ کو اپنی حیثیت، اپنی قابلیت بے معنی لگ رہی تھی۔ اگر اس ایم پی کا نام زبان پر نہ آتا تو کیا ہوتا؟ گورکھ کو بچپن کی باتیں یاد آئیں۔ بڑے لوگوں کی دوستی ہی کام نہیں آتی، ان کا صرف نام لینا بھی کافی ہوتا ہے۔ اس نے بہت بڑی غلطی کی کہ امریکہ کا ویزہ گنوا دیا۔ یہ ملک اس کے رہنے کے قابل نہیں۔ یہاں آدمی کی کوئی قیمت نہیں، اس کی عزت کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ پہلا موقع تو نہیں کہ وہ مصیبت کے بھنور میں بچ نکلا ہو۔ لیکن ہر موقع پر، ہر وقت تو قسمت ساتھ نہ دے گی۔
اس واقعہ کو ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایک روز دو پہلوان نما آدمی ڈنڈے کھڑکاتے گورکھ کے پی اے کو

دھکا مار کر زبردستی آفس کے کمرے میں گھس آئے اور کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ پھر رعب دار لہجے میں بولے "اپنے دونوں ماتحتوں کو باہر بھیجیں۔ کمرہ اندر سے بند کریں۔ ہمیں اپ سے ایک خاص بات کرنی ہے۔"

گورکھ اپنے ہی آفس کے کمرے میں اس حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے ذرا سختی سے کہا" آپ کو اندر آنے کی اجازت کس نے دی؟ آپ اپنا نام اور کام بتائیں۔"

ایک مونچھ والے نے زور سے میز پر مکا رسید کیا اور کہا" پہلے اپنے ماتحتوں کو کمرے سے باہر نکالیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

دونوں ماتحت موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے پہلے ہی باہر جانے کی تیاری کر چکے تھے۔ ان کے باہر جاتے ہی دوسرا مونچھ والا بولا "میں یہاں پولیس تھانے کا سب انسپکٹر ہوں۔ آپ کی عزت کو مد نظر رکھتے ہوئے وردی پہن کر نہیں آیا۔"

گورکھ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ جیسے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی ہو۔ "آپ بیٹھیں۔ میں چائے اور ناشتہ منگواتا ہوں۔ کہئے کیسے تکلیف کی؟"

"میرے پاس آپ کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ میں ابھی آپ کو ہتھکڑی لگا کر حوالات میں بند کر سکتا ہوں۔" اتنا کہتے ہی اس نے کاغذ میز پر رکھ دئے۔

گورکھ کے حواس پہلے ہی گم ہو چکے تھے۔ "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا۔ دراصل میں ایسا کوئی کام کرنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔"

"آپ کے جرم کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آپ کو کیورا نگر کی کورٹ سے دو بار سمن بھیجے گئے۔ آپ کورٹ میں حاضر نہیں ہوئے۔ اس لئے مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو قید کرکے کورٹ میں پیش کیا جائے۔"

گورکھ دماغ پر زور دے کر سوچنے لگا تو اسے یاد آیا کہ تقریباً" ایک سال پہلے جب گائے والا حادثہ ہوا تھا تو وہ راہ میں کچھ ایسے ہی چھوٹے سے مقام سے گزرے تھے۔ وہاں گیسٹ ہاؤس میں کچھ دیر کے لئے آرام بھی کیا تھا۔ ضرور یہ اسی پولیس انسپکٹر کی شرارت ہے۔ سب انسپکٹر بولا" آپ دو دن کے اندر اندر کیورا نگر کورٹ سے رسید لے کر آئیں کہ آپ کی وہاں پیشی ہو گئی۔ ۔ اس سے زیادہ وقت میں آپ کو نہیں دے سکتا۔ باقی میرے انعام کا خیال رکھیں۔"

دوسرے مونچھ والے نے ڈنڈا زور سے میز پر ٹھونکا اور وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

گورکھ نے کیورا نگر میں کسی بارسوخ ہستی سے جان پہچان نکالنے کے لئے دوڑ دھوپ کی۔ اسے پتہ چلا کہ اس کے ایک دوست کا رشتہ دار کیورا نگر کی کورٹ میں جج کے عہدے پر ہے۔ گورکھ فوراً" کچھ تحفے خرید کر کیورا

نگر روانہ ہوگیا۔ تین سو میل کا بس کا سفر بڑی مشکل سے کٹا۔ بارہا اسے خیال آیا کہ کار میں سفر طے کرلیتا تو بہتر رہتا۔ بسوں میں اندر اور باہر چھت پر سوار' دروازوں کے ہینڈل سے لٹکتے مسافر اور پھر بے پناہ گرمی۔ کیورا نگر پہنچ کر گورکھ نے جج کے گھر کا پتہ معلوم کیا اور دروازے پر دستک دی۔ جج باہر آیا تو اس نے تعارف کا خط جج کے ہاتھ میں تھمادیا اور ساتھ میں تحفے پیش کئے۔ جج اسے ڈرائینگ روم میں لے گیا اور اس سے معاملے کی تفصیل پوچھی۔

چائے پی کر گورکھ رخصت ہونے لگا تو جج بولا "آپ کل صبح کچہری چلے آئیں۔ میں کیس دیکھے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

صبح کو گورکھ کچہری پہنچا تو جج نے اسے اپنے کمرے میں طلب کیا اور اسے بتایا کہ پولیس انسپکٹر نے تیز رفتار سے گاڑی چلانے کا الزام عائد کیا تھا۔ گاڑی اتنی تیز چلائی جارہی تھی کہ لوگوں کی جان اور مال کو خطرہ ہوگیا تھا۔ پھر جج نے بہت سی موٹی موٹی قانون کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی گواہ نہیں۔ تمہیں چاہئے کہ اس کیس کو لڑو۔ اس میں کوئی جان نہیں۔ پولیس اپنے لگائے ہوئے الزامات ثابت نہ کرسکے گی۔"

گورکھ بولا "میں کیس لڑنا نہیں چاہتا۔ میری غیر حاضری میں کورٹ کے سمن واپس ہوگئے اور میرے ہتھکڑیاں لگنے کی نوبت آگئی۔ تین سو میل کے فاصلے سے میں مقدمہ لڑنے کے لئے حاضر نہیں ہوسکتا۔ کوئی اور صورت نکالیں۔"

جج سر کھجاتے ہوئے کہنے لگا "بڑا پیچیدہ معاملہ ہے۔ اس کا حل نکلنا مشکل ہے۔" پھر اس نے اپنے کورٹ کلرک کو طلب کیا۔ ذرا دیکھو کیا کوئی دوسری صورت نکل سکتی ہے؟"

کلرک نے بہت سی موٹی موٹی کتابیں کھنگال ڈالیں۔ ایک گھنٹے کی محنت کے بعد مسکراتا ہوا آیا اور بولا۔ "اگر یہ جرم قبول کریں اور انہوں نے پہلے کبھی کوئی جرم نہ کیا ہو اور کسی کورٹ نے انہیں مجرم قرار نہ دیا ہو تو آپ انہیں وارننگ دے کر چھوڑ سکتے ہیں۔ لیکن میں کہوں گا' یہ سراسر پولیس کی زیادتی ہے۔ اصولاً" انہیں یہ کیس لڑنا چاہئے۔ یوں ہار کر نہیں بیٹھنا چاہئے۔" پھر وہ گورکھ سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا : "کیا اس پولیس انسپکٹر سے آپ کی ذاتی دشمنی ہے؟"

اب گورکھ خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے کلرک اور جج کے سامنے ساری حقیقت بیان کردی۔ جج بولا اس سر پھرے پولیس انسپکٹر کو سبق سکھانا چاہئے۔ آخر معاملہ میری کورٹ میں ہے۔ میں صلاح دوں گا کہ ایسی زیادتی کبھی برداشت نہ کریں۔"

گورکھ مسکراتے ہوئے بولا "آپ مجھے اقبال جرم پر بری کردیں۔ عین مہربانی ہوگی۔"

گورکھ کورٹ میں پیش ہوا۔ اس نے جرم قبول کیا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

ایسے اور بھی کئی واقعات یکایک گورکھ کی نظروں کے سامنے تازہ ہوا ٹھے۔ وہ آہنی اصول کہ رشوت لینا اور دینا دونوں یکساں جرم ہیں، کبھی کا ہوا ہو چکا تھا۔ کچھ رہ گیا تھا تو موقع شناسی اور تجربہ کہ زندگی میں سیدھے راستے بھی اتنے سیدھے نہیں ہوتے۔ سیدھی راہ پر چلتے چلتے بھی تمہارے ہزار دشمن پیدا ہو جائیں گے، جو تمہیں راہ سے ہٹانا چاہیں گے۔ کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرو، کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ سب کو دعائیں بانٹتے پھرو، لیکن اپنے آپ کو بچاتے چلو۔ یہاں سچائی ہر روز دم توڑتی ہے۔ اس کو زندہ رکھنے کے لئے اسی کے دامن کی ہوا کافی نہیں۔ بیرونی پنکھا بھی درکار ہوتا ہے۔ آج سچائی اپنے پاؤں پر نہیں ٹھیر سکتی۔ اسے کھڑا کرتے کرتے اگر خود ہی گر پڑے اور دوبارہ نہ اٹھ سکے تو کیا حاصل؟ شاید زمانے کی نظر میں شہید سمجھے جاؤ۔ مگر یہ بھی لازم نہیں کہ کوئی سمادھی بنے۔ ہو سکتا ہے کہ دو گز زمین بھی نہ ملے۔ کہاں تک انسان سچائی کو لے کر سچائی کی خاطر لڑے؟ گورکھ تسلیم کرتا گیا کہ اس نے زمانے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں، کب سے اپنے اصولوں کا گلا دبا دیا ہے۔

۳

ایران کا ویزا حاصل کر کے گورکھ دگواڑی پہنچا تو گولی نے بتایا "تمہارے دہلی روانہ ہوتے ہی کسی خیر خواہ کا فون آیا تھا۔ اس نے اپنا نام تو ظاہر نہیں کیا' اتنا کہا کہ گھیراؤ کے بعد پٹائی کا پورا انتظام ہو چکا ہے۔ گورکھ سے کہیں کہ وہ آفس نہ آئے۔ شکر خدا کا کہ تم دہلی روانہ ہو گئے اور آفت سے بال بال بچ گئے۔ اب جلد ہی یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔"

گورکھ اس رات اپنا مختصر سامان اٹھا کر دہلی روانہ ہو گیا۔ اس کا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ نہ معلوم کتنی طویل جدائی ہو گی۔ گولی دگواڑی میں اکیلی رہے گی۔ جلد سے جلد وہ گھر کا سامان فروخت کر کے میرٹھ چلی جائے گی۔ شاید میرٹھ سے کوئی رشتہ دار مدد کے لئے آئے۔ اسے گولی کی دلیری اور ہمت پر شک نہ تھا۔ اسے تو آنے والی جدائی کی سیاہی رلا رہی تھی۔

جب بھی گورکھ ملک سے باہر جانے کی تیاری کرتا' گوپال داس جیوتشی کی پیشن گوئی لے کر بیٹھ جاتے۔ بظاہر وہ گورکھ کے فیصلے میں دخل اندازی نہیں کر سکتے تھے' لیکن ظاہر تھا کہ انہیں گورکھ کا ہندوستان چھوڑ کر باہر رہنا پسند نہ تھا۔ اپنی ناپسندگی کا اظہار وہ پیشن گوئی کے ذریعہ کرتے۔ کوئی نہ کوئی جیوتشی ضرور انہیں اپنا ہم خیال مل جاتا' جو بتاتا کہ ستارے گردش میں ہیں' برا وقت دستک دے رہا ہے' اس لئے گورکھ کو بیرونی ملک میں جانا نہیں چاہیے۔ برا وقت آگے تھا یا پیچھے یا سر پر منڈلا رہا ہے' مگر گورکھ کے پاس اب ایران جانے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔

تہران کے ہوائی اڈے پر گورکھ اترا تو کمپنی کا ایک ملازم اسے ساتھ لے جانے کے لئے موجود تھا۔ وہ اسے ہوٹل میں لے جانے کی بجائے سیدھا آفس لے گیا اور وہاں اس نے تمام ملازموں سے گورکھ تعارف کرایا۔ یالٹر بردرز کا صدر دفتر امریکہ میں تھا۔ ایران سرکار نے انہیں کافی کام دے رکھا تھا۔

شام کو گورکھ کے ہوٹل میں رہنے کا انتظام کر دیا گیا۔ اس طرح ایک نئی زندگی کی شروعات ہوئی۔

اس زمانے میں تہران پر یورپ کا اثر نمایاں تھا۔ بازاروں میں یورپ میں بنی ہوئی ہر چیز آسانی سے دستیاب تھی۔ پندرہ دن کے اندر گورکھ کے لئے مکان کا بندوبست ہو گیا۔ خوب صورت گھر' ایرانی غالیچے اور یورپ کا سازو سامان۔ کباب اور شراب۔ باسمتی ایرانی چاول اور ایرانی پلاؤ۔ ہندوستانی اور ایران کھانے کی لذتوں میں۔

کچھ کم ہی فرق تھا۔ اتنی سبزیاں گورکھ نے ہندوستان میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ کچھ ہی عرصے میں کئی ہندوستانی گورکھ کے دوست بن گئے۔ ایک ڈاکٹر سے قریبی دوستی ہو گئی۔ چھ مہینے میں ہی گورکھ نے نئی کمپنی میں بھی اپنی تیکنیکی قابلیت کا ثبوت فراہم کردیا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والوں میں ایک انگلینڈ کا رہنے والا تھا' ایک فرانس کا اور دو امریکہ کے۔ اسے ان کے ساتھ کام کرنا اچھا لگا۔ پہلے مہینے میں تنخواہ ملی تو خرچ نکال کر پچاس ہزار روپے کی بچت ہو گئی۔ بچت کے نوٹ شمار کرتے وقت گورکھ ہنسنے لگا۔ اس نے ہندوستان میں ۲۳ سال ملازمت کی تھی۔ جب اس نے استعفیٰ دیا تو کل ملا کر ۷۰ ہزار روپیہ بچت کھاتے سے ملا۔ ان ہی ۲۳ سال میں لگ بھگ اتنا ہی روپیہ اس نے کفایت شعاری کر کے بچالیا ہو گا' مثلاً" سستی شراب پی کر یا کسی شوق کو دبا کر۔ لوگ یوں ہی تو باہر ملکوں کی راہ نہیں پکڑتے!

گورکھ کو تہران میں اگر کوئی تکلیف تھی تو وہ تھی گولی کی غیر موجودگی۔ تقریباً" ہر روز اسے تین صفے کا خط لکھتا۔ کوئی نہ کوئی درد بھرا گیت یا غزل اس میں شامل کرتا۔ خط لکھنے کے بعد جواب کے انتظار میں دن گنتا۔ ایک اداسی' ایک غم کی گھٹا اس کے وجود پر چھائی رہتی۔ کسی بھی چیز سے لطف اندوز نہ ہونے کی ضد' کبھی نہ ہنسنے اور مسکرانے کی قسم اسے جکڑے رہتی۔ یہ کیسی محرومی تھی؟ کیا کھو گیا تھا؟ کیا چیز "اور" چاہئے تھی کہ وہ دن رات گھلتا جا رہا تھا؟ جیسے اپنے وجود سے لڑ رہا ہو' جیسے اپنی فطرت سے لڑ رہا ہو۔ جیسے اس کا ایران میں کوئی نہ ہو' جیسے اس کا ایران آنا ناواجب ہو۔ اس نے کمپنی میں اپنے ساتھیوں کے سامنے جب گولی کو بلانے کا ذکر چھیڑا تو کچھ ہمدردی جتانے لگے' کچھ مذاق اڑانے پر اتر آئے۔ اسے بتایا گیا کہ ملازمت کا ایک سال پورا ہونے سے پہلے گورنمنٹ بیوی کے لئے ہرگز ویزا نہ دے گی۔ اس کے کئی ساتھی انجینئر وہاں کئی سالوں سے بغیر بیوی بچوں کے اکیلے رہ رہے تھے۔ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ ایران میں دولت کما کر گھر لوٹ جائیں۔ بچوں کی تعلیم کے بارے میں پتہ چلا کہ سب ہی خوش حال لوگ بچوں کو باہر کے ملکوں میں پڑھاتے ہیں۔ ایک ایرانی دوست کہنے لگا :

"پڑھنے کے لئے ہم لوگ یہاں سے ہندوستان جاتے ہیں۔ تم بیوی بچوں کو ہندوستان میں ہی رہنے دو۔ یہاں تین سال دولت کماؤ۔ پھر ہندوستان جا کر خوب صورت مکان بنوالینا۔ کام کرنا ہو تو کرنا' نہ کرنا ہو گا تو نہ کرنا۔" ایرانی دوست کی بات ٹھیک تھی۔ یہی سوچ کر تو گورکھ نے دگواڑی کی ملازمت چھوڑی تھی۔ لیکن تین سال کی بات تو دور' وہ ابھی تین مہینے میں ہی نیم جاں ہو چلا تھا۔

ان ہی دنوں ایران کے شاہ کی حکومت کے خلاف عوامی شورش بڑھتی گئی۔ چاروں طرف ملٹری گشت کرتی رہتی۔ بازاروں میں جلوس نکلتے اور نعرے لگتے۔ ایک دن گورکھ بازار میں مٹر گشت کر رہا تھا کہ ایک شراب کی دکان ہجوم نے توڑ دی۔ کمپنی میں ملازم تمام امریکنوں کو سخت ہدایت دی گئی کہ شہر کے کچھ خاص خاص حصوں میں نہ جائیں۔ وہاں جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ تناؤ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس طرح چھ ماہ گزر گئے۔ دفتر کرسمس پر

ایک ہفتے کے لئے بند ہونا تھا۔ گورکھ سوچنے لگا' کیوں نہ دہلی جاکر گولی سے مل آؤں؟ چھ مہینے میں چار لاکھ روپے کما لئے ہیں اور ہوائی جہاز کا کرایہ تو صرف تین ہزار روپیہ ہے۔ کمپنی سے کانٹریکٹ کے مطابق سال میں ایک مہینے کی چھٹی یا تنخواہ ملتی ہے۔ چنانچہ گورکھ دہلی پہنچ گیا۔ گولی نے رسوخ آزما کر اپنے لئے ایران کا ویزا حاصل کر لیا۔ بچوں کو بورڈنگ اسکول میں داخلہ مل گیا اور گولی اور گورکھ ایران جانے کی تیاری کرنے لگے۔

اتنے میں خبر گرم ہوئی کہ شاہ کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا ہے۔ کمپنی کی طرف سے ٹیلی گرام آیا کہ گورکھ واپس ایران آنا ملتوی کردے۔ شاید کمپنی بند کرنی پڑے۔ اس کے کچھ عرصے بعد کمپنی کے ایک افسر سے گورکھ کی ٹیلی فون پر بات ہوئی اور اسے ایران لوٹنے سے قطعی منع کردیا گیا۔

وقت گورکھ کے عہد آزما رہا تھا۔ اس نے پانچ لاکھ مانگے تھے' وہ موجود تھے اور محفوظ تھے۔ ایران میں اس نے یہی کام عقل مندی کا کیا کہ دوستوں کی صلاح مان کر اپنی جمع پونجی انگلینڈ کے بینک میں جمع کروادی۔ اب اس کا ضمیر سوال کر رہا تھا: "تم فقیری اختیار کرنے کی عمر میں اضافہ کرتے رہے۔ آخری بار ۴۵ سال کی عمر میں یہ معرکہ سر کرنے کا عہد کیا تھا' بشرطیکہ تمہارے پاس پانچ لاکھ روپیہ موجود ہو۔ تم نے عمر کے ۴۵ برس پورے کر لئے ہیں اور پانچ کی بجائے تمہارے پاس چھ لاکھ موجود ہیں۔ سوچ کیا رہے ہو؟ مارو زمانے کو ٹھوکر۔ تلاش کرو کوئی تنہا گوشہ' جہاں جھونپڑی بنا کر رہ سکو۔"

جب گورکھ لاجواب رہا تو پھر وہی آواز گونجی: "خاموش کیوں ہو؟ کم سے کم بات تو کرو۔ جس راہ پر چل نہیں سکتے اس کے سنہرے خواب سجانے سے فائدہ؟ کیا جینے کی ہوس ختم نہیں ہوئی؟ کیا دولت کم پڑ گئی؟ مہنگائی بڑھ گئی؟ خوابوں کے رنگ اڑ گئے؟ یا دل چھوٹا پڑ گیا؟ کچھ تو جواب دو!"

گورکھ پھر خاموش رہا۔

"کیوں خود کو ابہام میں مبتلا رکھتے ہو؟ تم وہ نہیں ہو جو سوچتے ہو۔ شاید کسی زمانے میں کوئی جذبۂ صادق رکھتے تھے۔ آج کل تو خود کو بے وجہ بھٹکاتے رہتے ہو۔ وہی کرو جو دنیا کرتی ہے۔ وہی کرتے بھی ہو جو دنیا کرتی ہے۔ یہ محض خود فریبی ہے کہ ہر وقت خود کو دنیا سے الگ سمجھتے ہو اور زمانے سے خفا خفا رہتے ہو۔ وہ بھی بے وجہ۔"

گورکھ کچھ نہ بولا۔ نظریں فلک تک اٹھائے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرید تا رہا۔ قریب ہی کوئی اس کا مذاق اڑاتا رہا' اسے اکساتا رہا' بھڑکاتا رہا' طنزیہ ہنسی ہنستا رہا۔ لیکن گورکھ بے حس و حرکت خاموش وہیں کھڑا رہا۔ یکایک گولی کی آواز سنائی دی تو وہ چونک اٹھا: "دور فضاؤں میں کیا دیکھ رہے ہو۔ دوپہر کی تیز دھوپ ہے اور آسمان پر نہ کوئی پرندہ ہے' نہ بادل کا ٹکڑا۔ بھروسا رکھو' ہندوستان میں اتنا نام کمایا ہے' دوسری نوکری مل جائے گی۔"

"تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ کل سے ہی نوکری کی تلاش شروع کردیتا ہوں۔" گورکھ نے کہا۔

نئی نوکری کی تلاش کا خیال آتے ہی گورکھ کو علی صابری کی باتیں یاد آئیں۔ ایک عرصہ تک علی نے گورکھ کے تحت دگواڑی میں کام کیا تھا۔ تہران میں گورکھ اکثر علی کے گھر چلا جاتا تھا۔ بہت سی شامیں اس کے ساتھ گزاری تھیں۔ دونوں آپس میں بے تکلفی سے بات کرنے لگے تھے۔ گورکھ نے جب علی کو دگواڑی میں گزرے ہوئے واقعات بتائے تو اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ کہنے لگا "تمہیں اپنی خصوصیات ہی معلوم نہیں۔ مانا کہ تم گروہ بندی میں نہیں پڑتے تھے' کام کے لحاظ سے سب کو ایک ہی ترازو میں تولتے تھے' سب تمہارے تیکنیکی علم کی تعریف کے پل باندھتے تھے' لیکن سارے ماتحت تم سے نفرت بھی کرتے تھے۔"

"وہ کیوں؟ میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی اور نہ کبھی ناجائز بات کہی۔" گورکھ بولا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" علی نے کہا۔ "لیکن تم ہر کام میں دخل اندازی تو کرتے تھے۔ ایک تیکنیکی مشکل کے کئی حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن تم سمجھتے تھے کہ درست وہی ہے جو تمہارے ذہن میں ہے۔ ہر جگہ اپنی ٹانگ اڑانے کی اور ہر کام میں غلطیاں نکالنے کی ضد تم پر سوار رہتی تھی۔ تم نے کسی ماتحت پر اعتبار نہیں کیا۔ ماتحتوں کا کام بھی تم خود ہی کرتے رہے۔ تم ہی سب کچھ تھے۔ دوسرے کی کوئی جگہ' کوئی وقعت تھی ہی نہیں۔ اس ماحول میں سب کی زبانیں بند تھیں۔ بڑے افسر سوچتے تھے کہ تمہارے بغیر کمپنی کا کام ہی نہیں چل سکتا۔ تم بھی یہی سوچتے ہوگے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا اب کمپنی نہیں چل رہی ہے؟ کیا اب کام نہیں ہو رہا ہے؟ تمہارے جاتے ہی لوگوں کو آزادی مل گئی اور ایک عقل مند' مگر ضدی آدمی سے چھٹکارا بھی۔"

گورکھ علی کی باتوں پر غور کرتے ہوئے بولا "یقین تو نہیں آتا۔ تم کہتے ہو تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوگے۔ شاید ایسا ہی ہوا ہوگا۔"

"شاید نہیں' یقیناً ایسا ہی تھا۔" علی نے کہا "ایک بار ہم سب انجینئر ایک خاص ڈیزائن بنا کر تمہارے پاس لے گئے۔ سب ہی نے اپنی عقل کا پورا زور لگایا تھا کہ اس میں کوئی غلطی نہ رہے۔ لیکن تمہارے پاس جب ڈیزائن پہنچا تو کئی جگہ لال سیاہی کے نشان لگ گئے۔ کسی نے مذاق میں کہا : "نشان بھی کس ڈیزائن سے لگائے ہیں!" میں آج سب باتیں بے دھڑک کہہ رہا ہوں۔ دگواڑی میں کس کی مجال تھی کہ تمہارے سامنے زبان کھولے "تمہیں ایک صلاح دوں؟"

"ضرور۔" گورکھ نے کہا۔

"دوسروں کے کام کو خوردبین سے مت دیکھو۔ تم اپنا کام کرو' دوسروں کا اپنا کام کرنے دو۔ مانا کہ تم سب سے اچھا کام کر سکتے ہو' لیکن دوسرے کی بھی انا ہوتی ہے۔ اس نے بھی تجربہ حاصل کیا ہے' ڈگری لی ہے۔ دگواڑی میں تو یہ مشہور تھا کہ جو ہے گورکھ ہے۔ اس کے سوا سب نکمے۔ ایسی صورت میں لوگ کس طرح

تمہاری عزت کر سکتے تھے؟ کیسے تمہیں اپنا سمجھ سکتے تھے؟"

گورکھ خاموش رہا۔ علی پھر کہنے لگا: "میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ ایک بات کہے دیتا ہوں۔ برا نہ ماننا۔ تم کو جہاں تک پہنچنا تھا' پہنچ چکے۔ میری بات یاد رکھنا۔ خواہ کتنی ہی نوکریاں اور شہر بدل لو' کوئی نہ کوئی تیکنیکی الجھن دماغ میں لئے پھرو گے۔ اور اسی حالت میں مروگے۔ معاف کرنا' میں ذرا سخت الفاظ استعمال کر گیا۔

گورکھ اور گولی' دونوں ہی ملازمت ڈھونڈنے لگے۔ گورکھ ہر روز کہیں نہ کہیں عرضی بھیجتا' لوگوں سے ملتا اور بے چین رہتا۔ گولی کہتی "اتنے بے تاب کیوں ہو رہے ہو؟ نہ ٹھیک طرح کھانا کھاتے ہو نہ کسی چیز میں دلچسپی لیتے ہو۔ سوتے جاگتے' ہر وقت نوکری کی ہی سوچتے رہتے ہو۔ ایسی بھی کیا مصیبت پڑی ہے۔"

گولی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ گورکھ کو احساس نہ تھا کہ ملازمت کے بغیر وہ اتنا بے چین رہے گا۔ مصوری' فلمیں' غزلیں' کتابیں' کہیں بھی دل نہ لگتا۔

کچھ دن بعد ہندوستان بجلی کی طرف سے گورکھ کے پاس انٹرویو کے لئے بلاوا آیا۔ بورڈ کے ممبروں نے اس سے سوال کیا "ابھی تک آپ سامان خریدتے تھے' یہاں فروخت کرنے کا سوال ہے۔"

گورکھ ہنستے ہوئے بولا "یعنی کرسی بدل لینے کا سوال ہے؟ کچھ انجینئر خریدنے والے کی نبض نہیں پکڑتے اور اپنی ہی ہانکتے رہتے ہیں۔ میرا تجربہ آپ کے لئے بالکل مناسب بیٹھتا ہے اور میں آپ کی کمپنی کا کام بخوبی انجام دے سکتا ہوں۔"

اسی روز گورکھ کو ملازمت پر رکھ لیا گیا۔ کمپنی دہلی میں اپنا نیا آفس کھولنا چاہتی تھی' چنڈی گڑھ' لکھنؤ اور راجستھان تک کام بڑھانا چاہتی تھی۔ گورکھ کو صدر دفتر کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ دگواڑی کے مقابلے میں تقریباً دوگنی تنخواہ اور رہنے کے مکان کا کرایہ الگ۔ گورکھ اپنے ماں باپ کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ نوکری ملتے ہی اس نے الگ مکان کرائے پر لے لیا۔ بہت سا گھر کا سامان گولی نے فروخت کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ پھر جمع ہونے لگا۔ گولی نے کئی اسکولوں میں عرضیاں بھیجیں۔ بچوں کی پڑھائی کے سلسلے میں دہلی میں کتنی پریشانی اور بد انتظامی ہے' اس کا علم ان کو ان ہی دنوں ہوا۔ گورکھ کو جوانی میں اسکول ماسٹر کی نوکری کے لئے دیا ہوا انٹرویو یاد آگیا۔ آخر گولی کو دہلی کے مشہور کول کرسچین اسکول میں نوکری مل گئی۔ آزادی کے اتنے سال بعد بھی کرسچین اسکول ہی اچھے سمجھے جاتے تھے اور ملک کے ہونہار بچے ان ہی اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ وجہیں آئینے کی طرح عیاں تھیں۔ جو دیکھنا اور پرکھنا چاہے' آئینہ اٹھا لے۔

نئی نوکری کے دوران میں گورکھ نے زندگی کا ایک نیا رخ دیکھا۔ وہ بھی کبھی چیف انجینئر رہا تھا۔ اس نے کبھی کسی ملاقاتی کو زیادہ دیر تک کمرے کے باہر کھڑا نہیں رکھا تھا۔ نئی کمپنی میں اس کا رتبہ کسی چیف انجینئر یا

جنرل منیجر سے کم نہ تھا' لیکن کاروبار کے سلسلے میں اسے بہت سے لوگوں کے دروازوں پر جوتے رگڑنے پڑتے۔ آہستہ آہستہ آفس میں مزید ملازم بھرتی ہو رہے تھے۔ علی کی نصیحت کو مد نظر رکھتے ہوئے گورکھ نے انہیں کھلی چھٹی دے دی کہ جس طرح چاہیں کام کریں۔ اس کے علاوہ وہ ان کے آرام کا خاص خیال رکھنے لگا۔ لوگ ذاتی معاملوں میں اس سے مشورہ لینے لگے۔ جن لوگوں کے ساتھ کاروباری رشتہ تھا' وہ رفتہ رفتہ دوستی میں بدلنے لگا۔ روز بروز ان لوگوں کی فرمائشیں بڑھنے لگیں۔ جن سے بزنس حاصل ہو سکتا تھا۔ کسی کو کار چاہئے' کسی کو وہسکی کی بوتل اور کسی کو نقد نارائین۔ ہفتے میں پانچ رات کھانا کاروباری لوگوں کے ساتھ ہوٹلوں میں ہوتا۔ گولی بھی ساتھ رہتی۔ کاروباری سلسلے میں گھر پر بھی دعوتیں اور پارٹیاں ہونے لگیں۔ ماتحت لوگ عزت سے پیش آتے۔ اگر دگواڑی میں لوگوں کے دلوں میں ڈر تھا تو دہلی میں حقیقی عزت تھی۔ پہلے سال کے آخر تک کمپنی کا نیا کاروبار خوب چل نکلا۔ یہاں گورکھ کی لیاقت اور مہارت کا چرچا پھیلنے لگا۔ گورکھ کو ایک عرصے سے ایم ایس کرنے کا شوق تھا۔ دگواڑی میں کوئی یونیورسٹی قریب نہ تھی۔ دہلی میں صبح کے وقت تعلیم حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس نے ایم ایس کی ڈگری کے لئے داخلہ لے لیا اور ایم ایس کی تیاری کرنے لگا۔ دہلی کے علاو گورکھ کو چنڈی گڑھ اور لکھنؤ کبھی جانا پڑتا تھا۔ وہاں کے دفتروں کی بھی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ ہمیشہ پابہ رکاب رہتا۔ کبھی ٹرین میں' کبھی ٹیکسی میں' کبھی کار میں' کبھی ہوائی جہاز میں فاصلے طے ہوتے۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگی کہ یہ تمام خوبیاں اس کی شخصیت میں کہاں پوشیدہ تھیں؟ لیکن جب بھی وہ تنہا ہوتا تو نوکری کو خوب کوستا۔ مانا کہ تنخواہ اچھی ہے' عزت ہے' دہلی میں رہنا ہے' اونچی سوسائٹی میں بیٹھنا اٹھنا ہے' ہوٹل ہیں' تفریح ہے' کمپنی کی طرف سے بہت سی سہولتیں میسر ہیں' کمپنی سے کوئی شکایت نہیں' لیکن یہ جو بزنس حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے لوگوں کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے' مسکہ لگانا پڑتا ہے' تحفے یا رشوتیں دینی پڑتی ہیں' ان سے کس طرح ذہنی سمجھوتا کیا جائے؟ یہاں اگر پھول ہیں تو کانٹے بھی موجود ہیں۔ صرف تیکنیکی خوبیوں کی بنیاد پر کوئی سامان نہیں بک سکتا۔ مانا کہ دگواڑی میں اس کا رویہ دوسرا تھا' لیکن اس جیسا اور کوئی اسے ابھی تک تو ملا نہیں۔ اس کے دوست اور رشتہ دار کہتے : "گورکھ' اس سے زیادہ شان دار نوکری تم کو نہیں مل سکتی۔" ان کے لہجے میں گورکھ حسد کی جھلک صاف دیکھ لیتا۔ وہ مسکراتا اور خاموش ہو جاتا۔ حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ گورکھ کو فخر تھا کہ نوکری کے جس قسم کے تقاضے ہیں' وہ ان سے بخوبی عہدہ بر آ ہو سکتا ہے۔ اور ایک سال میں ہی اس نے کافی نام پیدا کر لیا ہے۔

دہلی میں گھریلو نوکر بہت مشکل سے ملتے تھے۔ گورکھ اور گولی ملازمت میں مصروف رہتے۔ گھر میں کاروباری مہمانوں کی بھی بھیڑ رہتی۔ دونوں نے سوچا کہ اگر کوئی مستقل مدد مل جاتی تو بہتر ہوتا۔ گورکھ نے پیش

کش کی: "میرے گاؤں میں دور کے رشتے سے میرا ایک بھائی ہے۔ اس کے چھ لڑکیاں ہیں اور ہاتھ بھی تنگ ہے۔ میں کوشش کر سکتا ہوں، شاید وہ اپنی ایک لڑکی ہمیں سونپ دے۔ اسے خادمہ کی طرح تو نہیں رکھ سکتے، لیکن ساتھ رہے گی، گھر کا کام کرے گی، اسے پڑھا بھی دیں گے، شادی بھی کرنی پڑے گی۔ نہیں تو کوئی کیوں اپنی لڑکی دے گا؟"

یہ تجویز گولی کو پسند آئی۔ "اگر وہ ہماری چند سال مدد کر دے تو اس کی شادی کرنے میں یا شادی کے وقت مالی مدد کرنے میں ہمیں کیا دشواری ہو سکتی ہے؟"

گورکھ گاؤں گیا اور کلپنا کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اس کی عمر تیرہ سال کے قریب ہوگی۔ وہ خوب صورت بھی تھی اور کام کرنے میں چست بھی۔ صبح کو امر اور سمر کو ناشتہ کراتی، گولی کا لنچ تیار کرتی۔ اگر کپڑے دھونے والی نوکرانی چھٹی کر جاتی تو کپڑے بھی دھو دیتی۔ اگر برتن صاف کرنے والی نوکرانی ناغہ کر جاتی تو برتن صاف کر دیتی۔ ہر چیز قرینے سے سجا کر رکھتی۔ گولی شام کے وقت اسے پڑھا دیتی۔ فیصلہ یہی ہوا تھا کہ وہ پرائیویٹ طور پر پڑھ لے گی۔ گھر کے قریب ہی ایک اسکول تھا جس میں وہ چند گھنٹے سائنس اور انگریزی پڑھ آتی۔

چند ماہ میں گھر کی تمام ذمہ داری کلپنا نے سنبھال لی۔ گولی نے بھی بخوشی سارا کام اسے سونپ دیا۔ کلپنا ہی گھر کے خرچ کا سارا حساب رکھتی۔ کون سی چیز کہاں رکھی ہے، یہ علم کلپنا کو ہی رہتا۔ کون سی چیز بازار سے منگوانی ہے یا ختم ہو رہی ہے، کلپنا ہی بتاتی۔ شام کو پارٹی ہے۔ پارٹی میں کیا انتظام رہے گا؟ کس طرح کا کھانا پکے گا؟ میز کس طرح سجائی جائے گی؟ گل دستہ کہاں رکھا جائے گا۔ چند مہینوں میں کلپنا سب سمجھنے لگی۔ اسے زیادہ تاکید کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ جو بھی کام اس کے سپرد کیا جاتا، وہ خوش اسلوبی سے کر دیتی۔ گولی جب اسے بازار سے سامان لانے کے لئے بھی اکیلے بھیجنے لگی تو پڑوسن نے کہا "اسے اکیلا مارکیٹ نہ بھیجا کریں۔" پھر ایک دن چند آوارہ لڑکے اس کے پیچھے ہو لئے اور وہ بھاگتی اور ہانپتی گھر لوٹی تو اس نے اکیلے مارکیٹ جانا خود ہی چھوڑ دیا۔

ایک صبح امر سمر اور گولی اسکول جا چکے تھے۔ گورکھ کی یونیورسٹی میں کوئی کلاس نہ تھی۔ وہ دیر سے سو کر اٹھا۔ جیسے ہی اس نے غسل خانے کا دروازہ کھولا، دیکھا کہ وہاں کلپنا کپڑے بدل رہی ہے۔ اس وقت وہ بالکل برہنہ تھی۔ گورکھ نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا، لیکن اس ذرا سے وقفے میں کلپنا نے اپنے جسم کو ڈھکنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ وہ ہاتھ لٹکائے بے نیازی سے کھڑی رہی۔

جیسے ہی کپڑے بدل کر کلپنا باہر نکلی، گورکھ بولا۔ "غسل خانہ کا دروازہ بند کیوں نہیں کیا؟"

"مجھے خیال نہیں رہا۔" کلپنا نے دھیرے سے کہا۔ "آپ سو رہے تھے۔ لیکن اگر بند نہیں بھی کیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟"

گورکھ قدرے غصے سے بولا "کیا مطلب؟"
کلپنا نے جواب دیا: "میں کیا آپ کو پہچانتی نہیں؟ اب تک پہچان گئی ہوں۔ اس لئے اگر دروازہ کھلا بھی رہ گیا اور آپ نے مجھے بغیر کپڑوں کے دیکھ بھی لیا تو مجھے یقین ہے کہ کسی غلط نظر سے نہیں دیکھا۔"
کلپنا کی بات سن کر گورکھ حیرت میں پڑ گیا۔ کلپنا نے آج تک کبھی اس اعتماد سے بات نہ کی تھی۔ گورکھ اسے کچی عمر کی نادان لڑکی سمجھتا آیا تھا۔ اس نے کہا "تمہیں مجھ پر اس قدر اعتماد اور بھروسا کیوں ہے؟"
"آج سے نہیں، پہلے دن سے ہے؟" کلپنا بولی۔ "اس دن سے ہے جب آپ مجھے لینے کے لئے گاؤں آئے تھے اور میرے پتاجی نے میری رضامندی چاہی تھی۔ میں نے حامی بھری تھی، تب ہی انہوں نے مجھے آپ کے ساتھ بھیجا تھا۔"
"لیکن تمہیں پہلے دن ہی مجھ پر اتنا بھروسا کیسے ہو گیا؟" گورکھ نے پوچھا۔
"آپ کے چہرے سے، آپ کی نظروں سے۔ میں کیا گاؤں کے جوانوں اور لڑکوں کی گندی نظریں نہیں پہچانتی؟ پھر گاؤں سے چلے تو چنڈی گڑھ میں ایک رات ہوٹل میں گزاری۔ اس وقت آپ کتنے گھبرائے ہوئے تھے، کیوں کہ ہوٹل کے کمرے میں ایک ہی پلنگ موجود تھا۔ آپ دوبارہ ہوٹل کے کلرک سے پوچھنے گئے کہ دو علیحدہ چارپائیوں والا کمرہ چاہئے۔ جب کمرہ نہ ملا تو بڑے اداس واپس لوٹے۔ یاد ہے، میں نے اس وقت کیا کہا تھا یہی کہ آپ پلنگ پر سو جائیں، میں زمین پر سو جاتی ہوں۔ لیکن آپ نے زمین پر بستر لگا لیا اور کہنے لگے کہ آپ بچپن سے زمین پر سونے کے عادی ہیں۔"
کلپنا، تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ تم بہت سمجھ دار بھی ہو۔ میں تو تمہیں نادان بچی ہی سمجھتا رہا۔ لیکن کسی باپ کے لئے بھی اپنی جوان ہوتی ہوئی لڑکی کو عریاں دیکھنا مناسب نہیں۔"
"آپ نے مجھے دیکھنے کے لئے تو دروازہ نہیں کھولا تھا۔ پھر مجھے دیکھتے ہی آپ نے دروازہ بند کر دیا، جیسے کوئی بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔ میں تو کہتی ہوں کہ آپ نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔"
"کلپنا، تم شریر بھی ہو اور تیز بھی!"
"میں جو بھی ہوں، لیکن مجھے آپ سے کوئی شرم نہیں۔ کہئے تو ابھی میں اپنی قمیض اتار دوں؟ آپ یا تو آنکھیں زور سے بند کر لیں گے یا دوسرے کمرے میں چلے جائیں گے۔"
"ادھر آؤ میرے پاس۔ مجھے تم پر پیار آنے لگا ہے۔ میری اپنی بیٹی بھی شاید مجھ سے اتنا پیار نہ کرتی۔"
کلپنا بے دھڑک گورکھ کی گود میں بیٹھ گئی اور بولی "آج جب آپ کھل کر بات کرنے لگے ہیں تو میں بھی اپنے دل کی بات کہوں؟"
"کہو، ضرور کہو۔ مجھے ہمارا ساتھ اور تمہاری باتیں آج ایک نئی صورت لے کر راحت دے رہی ہیں۔"

گورکھ بولا۔

"میں جانتی ہوں، گھر میں میری کیا حیثیت ہے اور کون مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے؟ کہو تو بتاؤں؟"

"ضرور بتاؤ؟"

"آنٹی کی نظر میں میں نوکرانی ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کبھی غصے سے نہیں بولتیں' بات بہت آرام سے کرتی ہیں' مجھ پر بھروسا بھی کرتی ہیں۔ ان کے پرس میں کتنے ہی روپے پڑے ہوں' پرس مجھے تھما دیتی ہیں۔ کوئی چیز تالے میں نہیں رکھتیں۔ مجھے کھانے پینے کی کھلی چھوٹ ہے۔ شام کو وہ مجھے پڑھاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی میں ان کے لئے نوکرانی ہوں اور کچھ نہیں۔ مجھے یہاں گھر کے کام کے لئے لایا گیا ہے۔ میں یہ اچھی طرح جانتی ہوں۔ آنٹی کی نظر میں یہی میری حیثیت ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ انہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں۔ جس طرح محبت سے وہ امر اور سمر کو گود میں بٹھاتی ہیں اور چومتی ہیں' کیا انہوں نے مجھے ایک بار بھی پیار کیا ہے؟ کبھی نہیں۔ میں تو دونوں سے عمر میں چھوٹی ہوں اور لڑکی ہوں۔ اس کے باوجود میں آنٹی کو "ممی" کہہ کر پکارتی ہوں۔ امر اور سمر مجھ پر کس طرح رعب جماتے ہیں' یہ آپ خوب جانتے ہیں۔ میں ان کے لئے ناشتہ تیار کرتی ہوں۔ اسکول سے آکر وہ کپڑے اتار کر جگہ جگہ پھینک دیتے ہیں۔ میں انہیں اٹھاتی ہوں' دھوتی ہوں' سکھاتی ہوں' پریس کرتی ہوں۔ ان کی کتابیں تک اٹھا کر الماری میں لگا دیتی ہوں۔ انہیں مجھ سے غرض ہے تو صرف اپنے کاموں کے لئے' وقت پر ناشتے کے لئے۔ کوئی بھائی اپنی سوتیلی بہن سے بھی ایسا برتاؤ نہیں کر سکتا جیسے امر اور سمر مجھ سے پیش آتے ہیں۔ ان کی نظروں میں بھی میں نوکرانی ہوں۔ صرف نوکرانی۔ مجھے تو ان کی بھی ڈانٹ سہنی پڑتی ہے۔ کیا کبھی وہ آج تک محبت سے پیش آئے؟ کیا کبھی مجھے ساتھ لے کر بازار گئے؟ کیا کبھی سینما دکھایا؟ کیا کبھی اپنے کسی دوست سے تعارف کرایا؟ کبھی نہیں!"

یکایک کلپنا خاموش ہو گئی۔ گورکھ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا "مجھ سے ڈرنے شرمانے' اور جھجکنے کی ضرورت نہیں۔ میرے بارے میں بھی دل کھول کر کہو۔ خوب شکایت کرو۔ جو کہنا سچ کہنا اور کوئی بات نہ چھپانا۔ تمہیں اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم!"

"یہاں دہلی میں تو میری سب سے پیاری چیز آپ ہیں۔ میں نے آپ کی آنکھوں میں اور آپ کے برتاؤ میں محبت دیکھی۔ جب میں رسوئی کی گرمی میں کام کرتی ہوں تو آپ ہی مجھے آرام کرنے کو کہتے ہیں۔ جب سب ناشتہ کرتے ہیں تو آپ ہی مجھے بلاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: کلپنا بیٹھ جاؤ۔ تم بھی کبھی سب کے ساتھ ناشتہ کر لیا کرو۔ جب آپ آفس سے آتے ہیں اور ممی آپ کو بتاتی ہیں کہ کپڑے دھونے والی دو دن پھر چھٹی کر گئی اور آپ میرے چہرے پر تھکن کے نشان ڈھونڈتے ہیں' تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری ساری تھکن جاتی رہی۔ میں کبھی نہیں بھول سکتی کہ آپ مجھے ممی سے ضد کر کے فلم دکھانے کے لئے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آپ ہی میرا دل

بہلانے کی کوشش کرتے ہیں اور کوئی نہیں۔ آپ کو ایک بات اور بتا دوں۔ آپ کے کہنے سے ہی میں ساتھ چل پڑتی ہوں' ورنہ مجھے معلوم ہے کہ ممی مجھے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی۔"

کلپنا کی باتیں گورکھ حیرت سے سنتا رہا۔ پھر بولا

جس کو کبھی محبت نہ ملی ہو' اس کے لئے محبت کی ایک کرن بھی آفتاب سے کم نہیں۔ میں تم پر ناراض بھی تو ہوتا ہوں۔ ایک دو بار تو میں نے تم پر بہت غصہ کیا۔ تمہیں مار بھی پڑی۔ "تو کیا ہوا؟ کوئی اپنوں پر ہی ناراض ہوتا ہے' پرائے پر نہیں۔ مجھے وہ مار بھی پیاری سی لگی۔ مجھ پر ناراض ہو کر آپ کا اپنا دل کتنا خراب ہوتا ہے' میں سمجھتی ہوں۔" "جو تم کہہ رہی ہو' ٹھیک ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے تم سے ہمدردی ضرور تھی' محبت تو نہ تھی۔ تم نے ہی ہمدردی کو محبت کا درجہ دے دیا۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ تمہارے اس اقرار نے میرے دل میں ضرور محبت جگا دی ہے۔"

گورکھ نے کلپنا کی پیشانی چوم کر اسے سینے سے لگا لیا "آج سے تم میری پیاری کلپنا ہو۔ معلوم ہے کلپنا کسے کہتے ہیں؟ کلپنا کا مطلب ہے' قیاس' تصور۔ خدا نے مجھے کوئی لڑکی عطا نہیں کی۔ آج میں نے تمہیں اپنی بیٹی تسلیم کیا۔ تم یہ بھی نہ سمجھو گی کہ میں بہت زیادہ تصور میں گم رہتا ہوں۔ اس قیاس کے دامن پر آج کلپنا کا لفظ بھی لکھ ڈالتا ہوں۔"

گورکھ صبح سے رات گئے تک مصروف رہتا۔ ایک تو ملازمت کی مصروفیتیں' دوسرے یونیورسٹی کی پڑھائی' تیسرے پرانے شوق۔ وقت ہوا کی طرح گزر جاتا۔ مگر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جیسے ایک خلا اس کا تعاقب کرتا رہتا۔ کیا اس نے عادت ہی بنالی تھی کہ جس شہر میں بھی رہنا ہے' جس حالت میں بھی رہنا ہے' مایوس رہنا ہے' گھبرائے ہوئے رہنا ہے؟ کتنے لوگ ہوں گے جو اس کی طرح خوش حال اور کام یاب ہوں گے؟ یہاں دگواڑی سے زیادہ عزت تھی' بہتر ملازمت تھی' دو دو کاریں دروازے پر موجود تھیں۔ شان دار رہن سہن' دلی کی رنگینیاں' سیر تفریح شوق۔ کہیں بھی تو کچھ کمی نہیں۔ کمی ہے تو صرف اس کے دل میں' جو بے وجہ مایوسی کے غار میں رہنے کا عادی ہو چکا ہے۔ زمانے سے مقابلہ آسان ہے اور خود کا سامنا کرنا مشکل۔ دل بغیر کسی وجہ کے گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے چلو بھاگ چلو۔ کہیں دور بہت دور' جہاں کوئی بھی نہ ہو۔ اگر وہ اس سے سوال کرتا ہے۔ "جہاں کوئی بھی نہ ہو؟" تو خاموش ہو جاتا ہے۔ شادی ہوئے تقریباً" بیس سال گزر گئے' لیکن وہ جذبہ' وہ وحشت' وہ دیوانگی نہیں ہوگی۔ اگر کبھی طبیعت سنبھلنے بھی لگتی تو سنبھلتے سنبھلتے پھر بگڑ جاتی۔

ایک بار کچھ ایسی ہوا چلی کہ گورکھ کا تمام شکیب ہوائیں لے اڑیں۔ وحشت کے صحرا میں کھڑا وہ سوچتا رہا کہ کس کے سامنے اپنا دکھڑا روئے۔ اس کے نزدیک رہنے والے جانتے تھے کہ یکایک وہ کہیں گم ہو جاتا ہے۔ اسے اپنے وجود کا علم بھی نہیں رہتا۔ لیکن کسی نے بھی اسے پاس بیٹھا کر اس کا حال زار نہ پوچھا۔ اگر کوئی پوچھتا بھی تو کیا ہوتا؟ "کچھ نہیں۔" اس کا مرض تو لاعلاج تھا۔ وہ ایک درد لے کر پیدا ہوا تھا۔ اور اسی کے ساتھ اسے مرنا تھا۔ کوئی دوا' کوئی علاج' کوئی رتبہ' کوئی ماحول اس کا علاج نہیں۔ مال و زر اس کا علاج نہیں۔ اس کا علاج کیا ہے' یہ وہ خود نہیں جانتا۔ پھر کون اس کا درد بتائے؟ کون اس کی دوا کرے؟ اس نے مرض کی بہت چھان بین کر لی۔ جب اسے ہی پتہ نہ چلا تو اور کس کو کیا پتہ چلے گا؟ بہتر یہی ہے کہ یوں ہی جیے جاؤ۔ خدا نے ہر شے کو ایک فطرت عطا کی ہے۔ اگر انسان اپنی فطرت کو ٹھیک سمجھ لے اور اس سے دوستی کر لے تو درد بھی دوا بن سکتا ہے۔ اب وہ کچھ ایسا ہی سوچنے لگا تھا۔ خود سے لڑنا اس نے بند کر دیا تھا۔ اگر دل مایوسی کے دریا میں ڈبوتا ہے تو ڈوبنے میں کیا حرج ہے؟ ڈوب جانے دو۔ پڑے رہو رونی صورت بنائے۔ لطف اٹھاؤ بے چینی اور مایوسی سے۔ دل الگ دھڑکے تو دھڑکنے دو۔ بغاوت کرے تو کرنے دو۔ کہاں جائے گا سینے سے باہر نکل کر؟ ہر تیز رو کے ساتھ

بڑھے چلو' چلے چلو۔ مت پوچھو کہ منزل کہاں ہے۔ خود سے کبھی سوال نہ کرو۔ چھوڑ دو سارے سوال۔ مت چاہو جواب۔ ختم ہو جائے گا سارا فرق سوال اور جواب کا۔ اگرچہ یہ فلسفہ اچھا تھا' لیکن فطرتاً" انسان اتنا آزاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر اسے پوری آزادی دے دی جائے تو کسی نہ کسی زنجیر سے خود کو ضرور باندھ لے گا اور پھر سوال کرے گا: "یہ زنجیر کیسی ہے؟"

دہلی آئے ہوئے گورکھ کو دو سال ہو رہے تھے۔ امر انٹر کلاس پاس کر کے چنڈی گڑھ کالج میں چلا گیا تھا۔ سمر ابھی دہلی میں ہی تھا۔ گولی اور گورکھ پیشہ ورانہ اور سماجی زندگی سے بہت حد تک مطمئن تھے۔ دگواڑی کی نسبت گولی کی صحت بہتر ہو گئی تھی۔ اور وہ کم ہی بیمار پڑتی تھی۔ دگواڑی کی ہوا میں کوئلے کی کانوں کا دھواں اور گرد دونوں شامل تھے۔ دہلی کی ہوا میں صرف گرد تھی' وہ بھی سال کے چند مہینے۔ زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا ہی تھا کہ تبدیلی کے بادل پھر اُمڈنے لگے۔ گولی کا ایک طالب علم اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنے والدین کو اسکول لے آیا۔ طالب علم کے باپ کا نام ولیم تھا۔ ہوتے ہوتے ولیم کی گورکھ سے بھی جان پہچان ہو گئی۔ دوستی بڑھی تو ڈنر اور چائے پر اکھٹے ہو جاتے۔ ولیم کو امریکہ کے بارے میں کافی علم تھا۔

ایک روز گورکھ کی باتیں سن کر ولیم کہنے لگا" تم چاہو تو دوبارہ امریکہ جانے کے لئے کوشش کر سکتے ہو۔ شاید کامیابی حاصل ہو جائے۔ اگر تمہیں کوئی امریکن کمپنی یہیں بیٹھے بٹھائے نوکری کی منظوری بھیج دے تو سمجھو کام بنا بنایا ہے۔"

گورکھ کے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ یاٹلر بردرز کو' جن کے ساتھ وہ کچھ مہینے ایران میں کام کر آیا ہے' درخواست بھیجی جائے۔ شاید وہ اسے امریکہ بلالیں۔ اس نے یہی کیا۔ ایک مہینے بعد اسے امریکہ سے نوکری کا خط ملا اور یوں اس کے لئے امریکہ جانے کا راستہ کھل گیا۔ گولی کہنے لگی "اب کیوں رات دن سوچتے رہتے ہو؟ برسوں سے امریکہ جانے کے ارمان سجائے بیٹھے تھے۔ اتفاقاً" بات بن گئی تو چلے جاؤ۔ جا کر اس پار بھی دیکھ لو۔"

گورکھ سوچ رہا تھا کہ جب جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اتنے سال سے کبھی امریکہ نے اسے ٹھکرایا کبھی اس نے امریکہ کو ٹھکرایا۔ کالج سے پاس کرتے ہی موقع ملا تو نہ گیا۔ بمبئی میں وظیفہ ملا اور یونیورسٹی میں داخلہ ملا تو نہ گیا۔ دگواڑی سے ایک بار گیا تو نوکری حاصل نہ کر سکا۔ دوسری بار گولی کے ساتھ گیا تو گولی نوکری حاصل نہ کر سکی۔ ایران گیا تو امریکن کمپنی میں جگہ ملی اور اسی کمپنی نے امریکہ بلا لیا۔ گورکھ نے لڑکپن میں ٹامس ہارڈی کے کئی ناول پڑھے تھے۔ اتفاق زندگی میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔ کس طرح سے ایک ادنیٰ سا اتفاق زندگی کا رخ بدل دیتا ہے' ان ناولوں سے گورکھ نے یہی راز سیکھا تھا۔

جب گورکھ کے امریکہ جانے کی خبر پھیلی تو اس کے پتاجی پھر جیوتشیوں کی پیشن گوئی لے کر بیٹھ گئے۔

ایک صاحب فرمانے لگے: "ابھی گورکھ کے لئے امریکہ جانا بالکل مناسب نہیں۔ اس میں جان کا خطرہ ہے۔ دو سال بعد موقع اچھا رہے گا۔"

گورکھ خوب جانتا تھا کہ یہ آخری موقع ہے۔ یا اب یا پھر کبھی نہیں۔ ہوا یوں کہ پیشن گوئی کرنے والے صاحب دو سال میں خود دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ کسی کے ڈرانے کا گورکھ کے دل پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا' لیکن پھر بھی کچھ اثر ضرور تھا' جو دوسری شکلوں میں جھلک دکھاتا تھا۔ خیالوں کی آتی جاتی لہروں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ اگرچہ امریکہ نوکری پر جا رہا تھا' لیکن دہلی کی شان و شوکت اس کے قدم روک رہی تھی۔ ایران میں چھ مہینے نوکری کر کے وہ ایک نیا ماحول دیکھ چکا تھا۔ وہاں کوئی کسی کو "سر" نہیں کہتا اور کوئی کسی کو سلام نہیں کرتا۔ ہر شخص صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ کیا گورکھ ہمیشہ سے یہی نہیں چاہتا تھا؟ اگر یہی چاہتا تھا تو کیوں سوچ رہا تھا کہ یہاں ماتحت اسے کس طرح سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں' چار فقروں میں دو بار "سر" کا لفظ ضرور استعمال کرتے ہیں' چپراسی کار سے ہینڈ بیگ نکال کر آفس تک لے جاتا ہے۔ اگر سامنے کھڑا ہو تو کار کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اگر اسے ظاہری شان و شوکت کی پروا نہیں تو کیا اپنی قابلیت پر یقین ڈگمگا رہا ہے؟ مانا کہ ہندوستان میں اس نے ایک جگہ پیدا کر لی ہے' سمندر کے اس پار نہ جانے کیا ہو گا؟ نئے سرے سے پھر زندگی شروع کرنی ہو گی۔ امریکہ میں کوئی نہیں پوچھتا کہ ہندوستان میں پاپڑ بیلتے آئے ہو یا تندوری روٹی سینکتے رہے ہو۔ وہ تو صرف یہ دیکھیں گے کہ امریکہ میں کام کر سکتے ہو یا نہیں۔ پھر امریکہ میں کسی اونچے عہدے پر تو پہنچنے سے رہے۔ وہاں تو فقط تیکنیکی علم کی بدولت نوکری پر قائم رہا جا سکے گا۔ کوئی بھی سفید چمڑی والا کالی چمڑی والے کے ماتحت کام نہیں کرنا چاہتا۔ جو کچھ اب تک ۲۵ سال کی نوکری میں حاصل کیا' سب یہیں ختم؟ ۴۵ سال کی عمر میں فقیری لینے کا ارادہ بھی ختم؟ پھر خیالوں میں ہی فقیری اختیار کرنے کی عمر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ "بس تین چار سال اور کام کر لوں۔" یعنی لالچ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اگر چار سال بعد واپس آنا چاہوں تو کون راستہ روکے گا؟ چار سال کی بات ہے' پھر واپس انڈیا۔ باہر کے بہترین ترقی یافتہ ملک میں کام کرنے کا تجربہ بھی تو معنی رکھتا ہے۔ واپس آنے پر ہو سکتا ہے کہ بڑی بڑی کمپنیاں صلاح و مشورہ کرنا چاہیں۔ وہ یونیورسٹیوں میں اپنے فن اور علم کے بارے میں لیکچر دے سکتا ہے اور باقی وقت آرام سے گزار سکتا ہے۔ دل چاہے گا تو کوئی کام کرے گا' ورنہ نہیں۔ اگر موقع ملا ہے تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ "امریکہ میں بھی وہ ہندوستانی ہی رہے گا' امریکن نہیں بن جائے گا۔ نہ اس کی شخصیت بدلے گی نہ شوق' نہ مزاج۔ کئی دن تک گورکھ خود کو طرح طرح کے خیالوں کی زنجیروں سے باندھتا اور کھولتا رہا۔

امریکہ میں رہنے کے خیال سے امر اور سمر بہت خوش تھے۔ گولی بھی بہت خوش تھی۔ اپنی بھابھی کے

رویہ کی وجہ سے میرٹھ سے اس کا دل کھٹا ہو چکا تھا۔ گھر میں اگر کسی کے دل کو چوٹ پہنچی تھی تو وہ کلپنا تھی۔ گورکھ اس کی آنکھوں میں غم' درد' اور مجبوری کے افسانے پڑھ کر بھی انجان سا بنا رہتا۔ آخر ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ سامنا ہوا تو کلپنا سے کہنے لگا؟ "میں تمہیں باضابطہ گود لے لوں گا۔ ابھی تو کوئی بھی میرے ساتھ نہیں جا رہا ہے۔ جب گولی اور بچے امریکہ آئیں گے تو تمہیں بھی ضرور امریکہ بلاؤں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔"

کلپنا خاموش رہی۔ جب سے اس نے گورکھ کے امریکہ جانے کی خبر سنی تھی' ایک اداسی کی گھٹا اس کے چہرے پر چھائی رہتی تھی۔ کئی بار وہ اس سے اکھڑپن سے بھی پیش آئی تھی۔ گھر میں اسے اپنی اصل اوقات پہلے سے ہی معلوم تھی۔ یہ خیال اسے کھائے جا رہا تھا کہ گولی امر اور سمر تو ضرور امریکہ جائیں گے' لیکن وہ؟ اسے تو واپس گاؤں جانا پڑے گا۔ پھر شاید کبھی بلاوا آئے یا نہ آئے۔ گورکھ کی بات سن کر چند لمحوں تک وہ گھائل نظروں سے گورکھ کو تکتی رہی' جیسے پوچھ رہی ہو :

"کیا یہی آپ کی محبت ہے جس کا دم بھرا کرتے تھے؟ کہا کرتے تھے کہ تم جیسی بیٹی نہیں ملے گی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں اور کبھی میری جانب رخ بھی نہ کریں گے۔"

جب کلپنا دیر تک خاموش ایک جگہ ساکن کھڑی رہی تو گورکھ اس کے قریب سرک آیا اس نے کلپنا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ آنکھوں میں نمی موتی پرونا چاہتی ہے۔ کلپنا نے گورکھ کا ہاتھ جھٹک دیا اور دوسرے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

گورکھ نے امریکہ جانے کی خبر اپنی کمپنی میں بھی نہ پھیلنے دی۔ جب رخصت ہونے میں چند روز باقی رہ گئے تو کمپنی سے یکایک استعفٰے دے دیا۔ آفس میں شان دار پارٹی دی گئی۔ ایک سینیر افسر کہنے لگا "اپنا اپنا فیصلہ ہے۔ یہ عمر نئی زندگی شروع کرنے کی تو نہیں۔ مگر میں گورکھ کی ہمت کو داد دیتا ہوں۔"

گورکھ کی عمر ۴۴ سال ہونے کو آئی تھی۔ اس عمر میں لوگ باہر کے ملکوں سے واپس آکر ہندوستان میں کوئی اونچا عہدہ تلاش کرتے ہیں۔ مگر گورکھ برعکس راہ اختیار کر رہا تھا۔

گورکھ کے امریکہ جانے سے چند روز پہلے کلپنا اس سے کہنے لگی "مجھے گاؤں چھوڑ آؤ۔" گورکھ اسے واپس گاؤں چھوڑ آیا۔ راستے میں کلپنا بالکل خاموش رہی۔ نہ اس نے شکوہ کیا' نہ شکایت۔ نہ اس نے آہیں بھری' نہ وہ روئی۔ گورکھ واپس آنے لگا تو وہ کہنے لگی: "آپ خوب خوش رہیں۔ بہت دولت کمائیں۔" وہ لفظ تیر کی طرح گورکھ کے دل پر لگے۔ کلپنا صرف اس کی خاطر گاؤں چھوڑ کر آئی تھی۔ آہ! وہ کیوں کسی کی سچی محبت کے لئے جان و ایمان دینے کی بات کرتا ہے؟ اس نے تو آج بدترین خود غرضی کو بھی مات دے دی۔ اس کو وہی کرنا ہے جو اس کا دل کہتا ہے۔ کوئی اسے نہیں روک سکتا۔ کسی کے موتیوں سے آنسو' کسی کے دل کی دھڑکنیں' کسی کا پیار۔ اسے ان ہیروں سے کیا غرض؟ دور وہ شیشے کے مینار جو درخشاں ہیں۔ وہ تو ان ہی کی جانب بڑھے گا۔ کلپنا

کا پیار سچا ہے۔ اس نے بدلے میں کبھی کچھ نہ مانگا' کبھی کچھ نہ چاہا۔ وہ اس کے ایک اشارے پر قربان ہو سکتی ہے۔ وہ کلپنا کا گناہ گار ہے' قرض دار ہے۔ کلپنا کو چھوڑ کر جانا اس کی شکست ہے۔ لیکن وہ شکست ماننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ ضرور اسے گود لے گا اور اسے امریکہ لے کر جائے گا۔ وہ ضرور اسی راہ سے واپس آئے گا۔ کلپنا کی بھیگی پلکیں اسے ضرور واپس کھینچ لائیں گی۔ ان ہی خیالات سے خود کو بھرماتا ہوا گورکھ واپس دہلی آگیا۔

ایک جمعرات کی رات کو گورکھ دہلی ایرپورٹ پر سب سے رخصت ہو کر ہوائی جہاز میں سوار ہو گیا۔ والدین کی بھیگی پلکیں' گولی' امر اور سمر کی نم آنکھیں' بہنوں اور بہنوئیوں کی صورتیں' دوستوں اور رشتہ داروں کی حسرت آمیز نظریں' کلپنا کی آخری الوداع' سب اسے یاد آتی رہیں۔ نیویارک پہنچنے پر سنیچر کو گورکھ نے گولی کی چچیری بہن سریکھا اور اس کے شوہر پران کے گھر قیام کیا۔ پران کہنے لگا : "سنا ہے' اب کی بار انڈیا سے ہی نوکری لے کر آئے ہو؟"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے۔" گورکھ نے جواب دیا۔

"ضرور تنخواہ کم دی ہوگی۔ یہاں کئی کمپنیاں یہی کرتی ہیں۔ جب کسی کو باہر سے بلاتی ہیں تو تنخواہ کم دیتی ہیں۔ ورنہ انہیں کسی کو باہر سے بلانے سے کیا فائدہ؟"

"مجھے ذرا اپنا نوکری کا خط دکھانا۔ وہ حقیقی بھی ہے کہ نہیں۔ تلسا یہاں سے ہزار میل دور ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں جاؤ اور پھر واپس یہیں آنا پڑے۔"

گورکھ سوچنے لگا کہ جب اس نے امریکن ایمبیسی میں نوکری کی منظوری دکھائی تھی تو کسی نے کہا تھا : "ایمبیسی کی تاریخ میں یہ دوسرا موقع ہے کہ کسی امریکن کمپنی نے انڈیا میں بیٹھے بٹھائے کسی کو نوکری دی ہے۔" اس نے نوکری کی منظوری کا کاغذ پران کی طرف بڑھا دیا۔

تنخواہ کے بارے میں پڑھ کر پران کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا : "مجھے تو اس میں گول مال لگتا ہے۔ تم انہیں ٹیلی فون کیوں نہیں کر لیتے؟ آج کل نیویارک میں بھی نوکری مل سکتی ہے۔"

گورکھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شکریہ' مگر اب تو میں تلسا تک جا کر ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ نیویارک میں تو میں چار سال پہلے نوکری تلاش کر چکا ہوں۔ آج بھی وہی حالت ہوگی۔ ویسے آپ لوگ گھبرائیں نہیں۔ اگر تلسا میں نوکری سے نہ لگا تو بھی واپس آ کر آپ لوگوں کو دوبارہ تکلیف نہ دوں گا۔"

صبح کو گورکھ ہوائی جہاز سے تلسا پہنچا تو ہوائی اڈے پر کمپنی کا وائس پریزیڈنٹ موجود تھا۔ اس نے گورکھ کا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ "یہ ہیں امریکی انداز!" دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ ایک مہینے کے لئے گورکھ کے رہنے کا انتظام ایک ہوٹل میں کر دیا گیا۔ ہوٹل کے اخراجات کمپنی کو ادا کرنے تھے۔

گورکھ آفس پہنچا تو سارے ملازموں سے اس کا تعارف کروایا گیا۔ ایک کمرہ اس کے لئے پہلے سے وقف کر دیا گیا تھا۔ اس قدر عمدہ انتظام' صفائی' دوستانہ تعلقات' وقت کی پابندی گورکھ نے ہندوستان کے کسی دفتر میں نہیں دیکھی تھی۔ امریکہ میں کام کرنا اس کے لئے ایک نیا' خوش گوار تجربہ تھا۔ کام زیادہ نہ تھا۔ گورکھ اسے آسانی سے سرانجام دے سکتا تھا۔ نئی باتیں' نئے ہنر سیکھنے کا بہترین موقع اسے ملا تھا۔ اس کے باوجود تین دن بعد گورکھ نے گولی سے ٹیلی فون پر کہا۔ "مجھے کچھ مزہ نہیں آرہا ہے۔ میں واپس آرہا ہوں۔ میرا یہاں دل نہیں لگتا۔ تمہاری یاد ستا رہی ہے۔ میں بہت اداس ہوں۔"

"بڑی عجیب بات کرتے ہو! ابھی تو پہنچے ہو۔ کچھ دن تو اور رک کر دیکھ لو۔" گولی نے اس کی ہمت بڑھانے کی کوشش کی۔

ایک ہفتے بعد گورکھ نے ہندوستان میں اپنی پہلی کمپنی کے ڈائریکٹر کو خط لکھا: "میں غلطی سے امریکہ آگیا۔ آفس میں لگ بھگ خالی بیٹھا رہتا ہوں۔ دہلی کی زندگی اور مصروفیات بہت یاد آتی ہے۔ میں واپس آنا چاہتا ہوں۔"

دس دن بعد گورکھ نے سب رشتہ داروں' دوستوں' بہنوں' والدین اور ان سب لوگوں کو جن سے ذرا سی بھی دوستی یا واسطہ تھا' خط لکھنے شروع کئے۔ ہر خط میں امریکہ کی کوئی نہ کوئی خامی اور برائی لکھی ہوتی۔ یہ سارے خط اس نے آفس کے وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر لکھے۔ جب کوئی بھی خط لکھنے کو باقی نہ رہا تو جس کا جواب نہ آیا' اسے دوبارہ خط لکھا اور جس کا جواب آیا اسے پہلے سے بھی زیادہ طویل داستان لکھی۔

پندرہ دن گورکھ نے سوچا کہ ہوٹل کی بجائے اپارٹمنٹ میں شاید سکون نصیب ہو۔ لگاتار طرح طرح کا گوشت کھا کر پیٹ ہی نہیں' دل اور دماغ بھی بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ اپنا گھر ہوگا تو دال اور چاول تو پک سکتے ہیں۔ چند روز بعد ہی اس نے اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ اگلے تین دنوں میں ایک پرانی امپالا کار بھی خرید لی۔

سردی کا موسم تھا۔ دو بار برف پڑ چکی تھی۔ لیکن سردی صرف سڑک پر تھی۔ چھوٹی جگہ بھی ایر کنڈیشنڈ تھی۔ لوگ آفس میں گھستے ہی کوٹ اور سویٹر اتار کر لٹکا دیتے۔ کون کپڑوں کا وزن جسم پر لادے پھرے۔ ایک مہینے کے اندر اندر گورکھ سردی کے ان رنگوں سے سمجھوتا کرنا سیکھ گیا۔ اس نے چند رسوئی کے برتن' دو تکیے' دو کمبل' اور ایک ٹیلی ویژن خرید لیا۔ اب وہ اکثر گھر میں ہی کھانا پکا لیتا۔ ٹیلی ویژن پر ایک رات میں پندرہ فلمیں ٹیلی کاسٹ ہوتیں۔ ان میں سے کوئی فلم دیکھ لیتا۔ ہر روز شراب پیتا' لیکن سنیچر اور اتوار کو زیادہ پیتا۔ یہ دونوں دن چھٹی کے تھے۔ کہاں ہندوستان کی وہسکی اور بیئر اور کہاں اسکاچ اور امریکن بیئر۔ دنیا کے کسی بھی ملک کی بہترین شراب خریدی جا سکتی تھی۔ شراب تو شراب بوتلیں بھی کتنی حسین تھیں۔ گورکھ سوچتا: "پینے کا مزہ ہے تو امریکہ میں۔ یہاں نشہ بھی کس قدر لطیف ہے۔ کسی نزاکت سے سر گھومتا ہے۔ پھر عجیب شہر ہے۔ دودھ'

پانی، کوکا کولا، پھلوں کے رس اور شراب، تقریباً" سب کی ایک ہی قیمت!"

گورکھ کو جو بھی ہندوستانی جہاں بھی نظر آیا، اسے پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ہندوستانی سے بات اور دوستی کیے بغیر جیسے اس کی زندگی ادھوری تھی۔ جب پہلا ہم رنگ شخص اسے نظر آیا تھا تو کتنی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ جب بہت سے ہندوستانی چہرے نظر آئے تو ہندوستان کا نقشہ نظر آگیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تلسا میں نقشہ چھوٹا تھا اور ہندوستان میں وہی نقشہ بڑا۔ فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہندوستانی۔ بنگالی، مدراسی، پنجابی، گجراتی، کشمیری، یوپی والے۔ اس کے علاوہ ہندو، مسلم، سکھ عیسائی صرف کہنے کو بھائی بھائی۔ پھر کاروباری، ڈاکٹر، انجینئر اور ورکر۔ اور سب سے اہم فرق امیر اور غریب کا۔ سب ایک دوسرے سے الگ الگ، اپنی اپنی ٹولیوں میں بٹے ہوئے۔ یہاں تک کہ جن کے پاس عالی شان مکان تھے، وہ چھوٹے مکانوں میں رہنے والوں سے دور رہتے۔ چھوٹے مکانوں والے اپارٹمنٹ میں رہنے والوں کو ہیچ سمجھتے۔ سب کے سب صرف نام کو ہندوستانی، خصلت میں امریکنوں سے بھی بدتر۔ لیکن گورکھ سب کے گلے پڑ جاتا۔ کوئی بھی مل جائے، اس کا نام پتہ پوچھتا، اسے فون کرتا رہتا۔ اس لئے وہ کئی فرقوں اور گروہوں میں شامل ہو گیا۔ عجیب صورت حال تھی کہ تنہائی کے پرستار کو امریکہ پہنچتے ہی تنہائی ڈسنے لگی تھی۔ ہر روز وہ کسی کے دعوت نامہ کی راہ دیکھتا۔ بن بلائے بھی کسی کے دروازے پر دستک دے بیٹھتا، اگرچہ کچھ لوگوں کو یہ بات ناگوار گزرتی۔ اسے ڈر تھا اگر ایک شام کو بھی اکیلا رہ گیا تو تنہائی کی بلا اس طرح لپٹ جائے گی کہ صبح تک نہ جانے اس کا کیا حال ہو جائے۔ اگرچہ امپالہ، شراب اور تنخواہ اسے امریکہ کی طرف کھینچتی، مگر ہندوستان کی یادیں زیادہ پرکشش تھیں۔ آہ! وہ کیوں امریکہ چلا آیا؟ جو کچھ بھی ہندوستان میں تھا، وہ لفظوں میں بیان تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن وہ کچھ ایسا تھا کہ دل اسے کبھی بھول نہیں سکتا۔ مانا کہ امریکہ میں زر کی افراط ہے، عیش و آرام کے سارے سامان ہیں، ہوا صاف ہے، سڑکیں کھلی ہیں۔ کاریں خوب صورت ہیں۔ شراب نشیلی ہے، بجلی کبھی فیل نہیں ہوئی، عام آدمی بھی اتنے عیش سے رہ سکتا ہے جو ہندوستان میں ناممکن ہے، لیکن ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ چاندنی چوک کی گلیاں کیا بری تھیں؟ شاید دولت کی ہوس اسے کھینچ لائی ہے۔ ممکن ہے یہ ہوس دل میں اس طرح رہتی ہو کہ کبھی سر نہ اٹھاتی ہو، مگر اندر ہی اندر کریدتی جاتی ہو۔ پھر اگر دولت ہی کمانی تھی تو ہندوستان کیا برا تھا؟ ہندوستان میں کیا امیر لوگ نہیں رہتے؟ آج تک تو کبھی دولت کے بارے میں سوچا نہیں، امریکہ پہنچتے ہی کون سی ہوا لگ گئی؟ یاد ہے، دس سال پہلے کسی نے صلاح دی تھی کہ دہلی میں بیس ہزار کا پلاٹ خرید لو۔ کس انداز سے، کس ادا سے اس نے مشورہ دینے والے کا مذاق اڑایا تھا۔ کہا تھا: "عقل مند اچھے مکانوں میں رہتے ہیں اور بے وقوف ان مکانوں کو تعمیر کرواتے ہیں۔ موت سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔ دولت کے مارے بستر پر دم توڑتے ہیں اور مجھ جیسے خانہ بدوش ہسپتال میں مرتے ہیں۔ سب تنہا آئے تھے، سب تنہا رخصت ہوتے ہیں۔ مجھ جیسوں کو زمانے کو الوداع کہتے

ہوئے کوئی غم' کوئی دکھ نہیں ہوتا کیوں کہ مجھ جیسوں کو زمانے کے ساتھ باندھ کر رکھنے والی زنجیر ہی نہیں ہوتی۔"
"اچھا بھئی گورکھ' تمہاری مرضی۔ خدا تمہاری تمنا پوری کرے۔" اس دوست نے کہا تھا۔ اور اس دوست کا فلیٹ آج بیس لاکھ کا ہو گیا۔ لیکن گورکھ "تو یہ سب کیوں سوچنے لگا؟"

گورکھ نے ایران میں کمایا ہوا پیسہ ہندوستان بھیج دیا۔ وہ گولی کو ہر خط میں لکھتا کہ کہیں زمین خرید لو۔ گھر کا سامان بیچ کر جو بھی ہاتھ لگے اس سے جائداد بنالو۔ گولی نے بھی چند مہینوں میں نہ صرف گھر کا تمام سامان فروخت کر دیا' بلکہ ایک کمرشیل پلاٹ اور تین رہائشی پلاٹ خرید ڈالے۔ یوں اس نے تمام جمع پونجی صرف کر دی۔ اس نے گورکھ کو "لکھا مجھے تعجب ہے کہ امریکہ پہنچتے ہی تم اتنے کیوں بدل گئے۔ جو بات میں برسوں سے کہتی رہی' اسے اس طرح عملی جامہ پہنایا۔"

گورکھ خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچنے لگا : "ٹھیک ہے' میں نے اپنے نام سے تو کچھ نہیں خریدا۔ جو بھی خریدا گولی نے خریدا۔ میں تو آج بھی پھکڑ رام ہوں۔"

زمین اور جائداد خرید لینے کے بعد گورکھ شیخ چلی کی طرح خواب سجانے لگا : "تین سال میں امریکہ سے چھٹکارا۔ سب ایک جگہ رہیں گے۔ کمرشیل فلیٹ کا کرایہ آئے گا۔ اس وقت عمر پچاس سال ہوگی۔ ہندوستان واپس جا کر روزگار کے بکھیڑے میں نہیں پڑوں گا۔ سارا وقت مصوری میں صرف کر دوں گا۔ کھلی آزادی ہوگی اور نوکری کی پابندی سے چھٹی۔ باقی سب کچھ تو کر لیا' ڈراما کمپنی میں بھرتی نہ ہو سکا۔ اسٹیج پر اداکاری بھی کیا پرلطف آرٹ ہے۔ یہ میرے لئے خاص طور پر موزوں رہے گی۔ نئی نئی شکلوں میں دنیا کے سامنے آؤں گا۔ کبھی لمبی ڈاڑھی کے ساتھ' کبھی مونچھ بھی صفاچٹ۔ شاید اسی بہانے اندر کی حقیقی صورت جو اب تک دھوکا دیتی رہی' باہر نکل آئے اور اسے روبرو دیکھ لیا جائے۔ شاعروں کے ساتھ نشست رہے گی۔ اور فلسفے کی کتابیں ساتھ دیں گی۔ اتنے کام مصروفیت کے لئے کافی ہوں گے۔ کیا خوب زندگی گزرے گی۔ لوگ مستقبل کے لئے چار سال جیل میں کاٹ لیتے ہیں۔ اگر میں امریکہ میں پھنس گیا تو کیا ہوا؟ میری روح تو آزاد ہے۔ میں اسے کبھی کسی جال میں نہ پھنسنے دوں گا۔"

گورکھ کے ارادے تو نیک تھے مگر جب چار دن گزارنے مشکل ہوں تو چار سال کا عرصہ تو بہت طویل ہوتا ہے۔ اس عرصے کو صرف ایک چیز کم کر دیتی تھی۔ وہ تھی شراب۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اپنا نشہ کھونے لگی۔ کتنی بھی پی لو' احساس ہے کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ جتنی تیز رفتار سے دوڑو' اتنی ہی تیز رفتار سے تعاقب کرتا ہے۔ یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟

چھ مہینے بعد گولی اور امر امریکہ آ گئے۔ گولی کی آمد سے پہلے گورکھ نے اپارٹمنٹ کو سجا دیا۔ کرائے پر

صوفے، میز، کرسیاں اور بستر لے آیا۔ چھ مہینے تو اس نے بغیر سامان کے گزارہ کیا تھا۔ زمین پر سویا تھا۔ اس کا اثاثہ صرف ایک ٹیلی ویژن سیٹ تھا، جس نے تنہائی میں خوب اس کا ساتھ نبھایا تھا۔

امر کو چار دن بعد ہی کمپیوٹر سائنس میں ۲۰۰ میل دور یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ ہندوستان میں اسے انجینئرنگ میں داخلہ نہ مل سکا تھا، کیوں کہ امتحان میں نمبر کم آتے تھے۔ تین لاکھ روپے امر کے داخلے میں صرف ہو گئے۔ باقی بچت سے گورکھ نے ایک خوب صورت مکان خرید لیا۔ اب یہ امریکہ میں ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ صرف دو لاکھ لگا کر پچاس لاکھ کا قرض لے لو اور مکان اپنے نام کروالو۔ مکان خرید لیا تو اسے سجانے کے لئے سازو سامان بھی قسطوں پر لے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری تنخواہ قسطوں میں ختم ہو جاتی۔ گولی کو گورکھ کے اس نئے رویہ پر بہت حیرت ہوئی۔ آرام اور آرائش کو پلیگ کی طرح سمجھنے والا شخص، اس قدر کیوں بدل گیا؟ اب تو خوش حال اور کام یاب لوگوں کے زمرے میں شامل ہونے کی دھن ہی گورکھ پر سوار تھی اور اس کے لئے وہ سب ضروری تھا جو کہ وہ کر رہا تھا۔ مینڈکوں کے ساتھ مینڈک بننا ضروری تھا۔

گورکھ کو محسوس ہونے لگا کہ پران ٹھیک کہتا تھا کہ کوئی امریکن ڈگری ہونی ضروری ہے۔ ہندوستان میں باہر کے ملکوں کی ڈگری کی اہمیت ہے۔ اور امریکہ میں امریکہ سے حاصل کی ہوئی ڈگری کی۔ امریکہ میں مستقبل بنانے کے لئے کسی امریکن یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ دہلی میں گورکھ ایم ایس کی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر امریکہ چلا آیا تھا۔ چنانچہ اس نے تلسا میں یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور دوبارہ طالب علم بن بیٹھا۔ ہفتے میں چار دن، صبح سات بجے سے پانچ بجے تک آفس میں کام کرنا پڑتا۔ اس کے بعد وہ سیدھا یونیورسٹی چلا جاتا اور رات کے دس بجے گھر پہنچتا۔ چھٹیاں بھی پڑھائی کی نذر ہو جاتیں۔ چنانچہ پارٹیاں اور دعوتیں کم کرنی پڑیں۔ اکثر لوگوں کے دعوت نامہ ٹھکرانے پڑے۔ ایک دن گولی کہنے لگی: "میں تمہارا نیا رخ کبھی نہ سمجھ سکوں گی۔ ہندوستان میں تو اچھے اچھوں سے بات کرنے کو آمادہ نہ تھے۔ لوگ تمہارے قریب آنا چاہتے تھے تو تم دور بھاگتے تھے۔ یہاں آکر کیوں الٹی گنگا بہنے لگی؟ تمہاری دوستی اسٹور میں جھاڑوں لگانے والوں سے، غیر تعلیم یافتہ مزدوروں سے، انجینئر سے، ڈاکٹر سے، چھوٹے سے، بڑے سے، طالب علموں سے۔ شہر میں کوئی ہے جس سے تمہاری یاری نہ تھی؟"

گورکھ نے جواب دیا: "وہ سب ایک ہی طبقے میں شامل ہیں۔ سب ہندوستانی ہیں۔ دیکھ لو، ایک بھی امریکن سے میں نے دوستی نہیں کی، یعنی امریکہ پہنچ کر بھی ہم ہندوستان میں رہے۔ یہ صحیح ہے کہ پہلے میں تنہائی پسند تھا۔ مگر امریکہ پہنچ کر میں تنہائی سے گھبرا گیا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں ایک دن بھی اکیلا گھر میں رہ گیا تو تنہائی کی وبا خون میں پھیل جائے گی۔ اسے مایوس رکھنے کے لئے ہی میں ہفتے میں ایک بار تمہیں ضرور ٹیلی فون کرتا تھا۔ میرا ایک ماہ کا ٹیلی فون کا خرچ ہی پانچ ہزار روپیہ تھا۔"

گوپی کے امریکہ آنے کے بعد مصروفیت اور گوپی کی رفاقت کی وجہ سے گورکھ کا بہت سے لوگوں سے ناطہ ٹوٹ گیا۔ گوپی نے بھی کچھ عرصہ تک ایک معمولی سی نوکری کی، پھر وہ بھی کالج میں داخل ہو گئی۔ ان دنوں کمپیوٹر سائنس کا زور تھا۔ گوپی نے تیکنیکی مضمون پڑھنے شروع کر دئے اور ساتھ ہی بچوں کے کسی اسکول میں پڑھانے کی نوکری حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتی رہی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان کی سندیں اور تجربہ امریکی معیار پر پرکھا جائے۔ تقریباً" ڈیڑھ سال کی کوشش کے بعد گوپی کو اسکول میں پڑھانے کے قابل تسلیم کر لیا گیا۔ ایک دو اسکولوں میں اسے نوکری ملی، لیکن امریکن بچوں کو قابو میں رکھنا اور انہیں پڑھانا اس کے لئے مشکل تھا۔ امریکہ میں تو بارہ تیرہ سال کے بچوں کو آزادی چاہئے، روک میوزک چاہئے اور کھلا سیکس چاہئے۔ گوپی اس ماحول سے سمجھوتا نہ کر سکی۔

تغیر سے ہی زندگی میں حرکت ہے۔ امریکہ آنے کے بعد گورکھ کی شخصیت میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ پھر بھی کہیں ایک شے تو ساکن تھی۔ شادی کے ۲۳ سال بعد بھی گوپی کی کشش ذرا ہی کم ہوئی تھی۔ گورکھ ہمیشہ محبت کا پیاسا رہتا، جیسے کسی پیاس کے مارے نے دو بوند ہی پانی پیا ہو اور اس کی پیاس اور بھی بھڑک اٹھی ہو۔ جیسے کسی بھوکے نے ایک نوالہ حلق سے نیچے اتارا ہو اور اس کی بھوک اور بھی بے قابو ہو گئی ہو۔ یہ وہ طوفان تھا جو تھمنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ کبھی ذرا کم بھی ہوتا تو پھر بھڑک اٹھتا۔ یوں تو اسے سب کی محبت حاصل تھی۔ والدین، بھائی، بہن، اولاد اور گوپی، سب اسے چاہتے تھے۔ مگر گورکھ کا دل اس محبت کا شکر گزار ہو کر بھی تڑپنا اور مچلنا بند نہ کرتا۔ عہد گزشتہ کے محبوبوں کی یاد تازہ ہو اٹھتی۔ آہ وہ تصوراتی محبوب! گوکل، وہ بھی حسد کا شکار ہو گئی۔ بھولی کے دو بوسے کیا لئے کہ پھر لوٹ کر نہ آئی۔ اور گوپی جو ہمیشہ پلٹ کر سو جاتی ہے اور آج کل کچھ کچھ خراٹے بھی بھرنے لگی ہے، شاید پڑھائی اور کام کی وجہ سے تھک جاتی ہے۔ لیکن وہ تو روزانہ گوپی سے زیادہ کام کرتا آیا ہے اور یہی دستور برسوں سے چلتا آیا ہے۔ جب وہ امریکہ آیا اور گوپی ابھی ہندوستان میں تھی تو ایک رات گورکھ آئینہ میں اپنی صورت دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ باہر سردی تھی اور برف گر رہی تھی، لیکن اپارٹمنٹ میں مرضی کے مطابق گرمی بڑھائی جا سکتی تھی۔ وہ نہا کر نکلا تھا اور لباس پہن رہا تھا کہ اس کے وجود سے ایک حسینہ کا سراپا سرکتا ہوا باہر نکل آیا اور آئینہ میں اس کے روبرو نظر آیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو کوئی موجود نہ تھا۔ دوبارہ آئینے پر نظر گئی تو وہی حسینہ مسکرا رہی تھی۔ گورکھ اس کے لباس، جسم اور شکل کو دیکھے جا رہا تھا کہ حسینہ اس سے مخاطب ہوئی : "محبت کرو گے؟" یکایک اس کا ہاتھ اپنے سینے کی جانب اٹھا۔ آہ! کتنی زور سے دھڑک رہا تھا اس حسینہ کا دل۔ وہ اپنے لبوں پر انگلی پھیرنے لگا تو انگلی حسینہ کے لبوں پر جا ٹکی۔ وہ اپنے لبوں پر زبان پھیرنے لگا تو ایک نامعلوم لذت کے احساس سے رگ رگ میں خون جھنجھنانے لگا۔ جیسے کسی نے پرسوز ستار پر

مضراب سے چوٹ کی ہو۔ وہ ہاتھ وہ لب' وہ جسم حرکت میں رہتے' جب تک جذبات ایک کنج نہ بنا لیتے' ایک گوشہ نہ ڈھونڈھ لیتے۔ اگرچہ منزل اس قدر قریب نظر آتی کہ ایک ہاتھ بڑھا کر اسے چوما جا سکتا تھا' ایک قدم چل کر اسے پار کیا جا سکتا تھا' لیکن وہ قریب پہنچتے پہنچتے بھی کبھی اس قدر قریب نہ پہنچ سکتا۔ بے دم' بدحواس' شکستہ پر لئے' جب وہ پیش از منزل ہی رو پڑتا تو سراب ٹوٹتا۔ یہ سراب تسکین' کچھ وقفے کے لئے طوفان کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی۔ اُمڈتے بادل برس کر راحت پا جاتے اور سر کا بوجھ اتار کر آسمانوں میں بلند پرواز کرنے لگتے۔ اس تسکین کو گولی کی بھی ضرورت نہ تھی۔ جب ایک سراب سے ہی دل بہلانا ہے تو موجودگی کیا اور غیر موجودگی کیا؟ رفتہ رفتہ وہ بھی گولی کی جانب سے کروٹ بدل کر سونے لگا۔ کبھی کبھی تو بستر ہی اٹھا کر زمین پر لگا لیتا۔ میرٹھ سے جب راجندر کا خط آیا کہ پدما کی حالت نازک ہو چلی ہے اور وہ چند دنوں کی مہمان ہے' ملنا ہو تو آ کر مل جاؤ' تو گولی ہندوستان روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گئی۔ گولی کے رخصت ہو جانے کے بعد پہلی بار گورکھ کو محسوس ہوا کہ ہجر کے دانت تیز ضرور ہیں' لیکن ان میں وہ زہر نہیں رہا جو کبھی بھرا رہتا تھا۔

تین سال کے عرصے میں گورکھ نے ایم ایس کی ڈگری حاصل کر لی اور گولی نے کمپیوٹر سائنس کا سرٹیفکیٹ لے لیا۔ گورکھ نے اپنی لیاقت اور قابلیت کا بھرپور ثبوت دیا۔ تنخواہ میں کئی لاکھ روپیہ سالانہ کا اضافہ ہوا' لیکن ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ساری تنخواہ قرض کی قسطیں ادا کرنے میں ہوا ہو جاتی۔ ادھر کمپنی کی حالت روز بروز بگڑنے لگی۔ امریکن کمپنیاں جب کام ہوتا ہے تو ملازم رکھتی ہیں اور جب کام نہیں ہوتا تو بے دھڑک نکال باہر کرتی ہیں۔ وہاں کوئی بھی نوکری اس لحاظ سے مستقل نہیں۔ کمپنی کو کام نہ ملا تو کچھ ملازم نکال دیئے گئے۔ حالت اور خراب ہوئی تو کئی اور ملازم نکال دئے گئے۔ اور اس کے بعد گورکھ کو بھی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

جن بینکوں سے گورکھ نے سامان اور گھر خریدنے کے لئے قرض لیا تھا' ان کو قسطوں میں قرض کی رقم واپس ادا کرنا ضروری تھا۔ گورکھ کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اب نوکری سے نکالے جانے کے بعد قسطیں کیسے ادا ہوں گی؟ اس نے مکان بیچنے کی ٹھان لی۔ اتفاق سے ان ہی دنوں گولی کو ایک اسکول میں نوکری مل گئی۔ گورکھ کو مکان بیچنے کی جلدی تھی۔ کافی نقصان اٹھا کر اس نے مکان بیچ دیا اور اس طرح مکان کے لئے لیا ہوا قرض اتارا۔ اسی طرح گھر کا کافی سامان بھی سستے داموں بیچ دیا گیا۔ گولی اور گورکھ مکان اور سامان بیچ کر ایک کمرے کے سستے اپارٹمنٹ میں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ دوست خود بخود کنارہ کش ہو گئے۔ شاذ و نادر ہی کوئی ملاقات کو آتا۔ گورکھ کو مینڈکوں کی دوستی کا راز معلوم تھا' پھر بھی وہ مینڈکوں کی ٹولی میں جا ملا تھا۔ کاش وہ ان سے الگ رہتا اور شروع سے ہی اپارٹمنٹ میں قیام رکھتا۔

وقت پھر کہہ رہا تھا : "چلو گورکھ' اب واپس ہندوستان لوٹ چلو۔ تم تین سال یہاں رہنا چاہتے تھے۔ یہ

مدت ختم ہوئی۔ باہر کی ہوا کھالی۔ یونیورسٹی سے ڈگری لے لی۔ کام کا تجربہ حاصل کر لیا۔ کبھی تو اپنے کہے پر عمل کیا کرو۔ چھوڑو امریکہ کو، ہندوستان میں تمہیں کوئی بلا رہا ہے۔"

گورکھ پھر خاموش ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جلد ہی اس نے دوسری نوکری تلاش کرنی شروع کر دی۔ چار ماہ لگاتار کوشش کے بعد تقریباً" چھ سو میل دور اسے ایک کمپنی میں نوکری مل گئی)۔ گوپی تلسا میں ہی رہی اور گورکھ نئی نوکری پر روانہ ہو گیا۔

نئی جگہ پر گورکھ کو کام بالکل پسند نہ آیا۔ ماحول بھی اچھا نہ لگا۔ یہ خیال کہ امریکہ میں ہر کمپنی میں افسروں کے تعلقات اپنے ماتحتوں سے دوستانہ ہوتے ہیں، غلط ثابت ہوا، وہاں افسر ماتحتوں سے کچھ اسی طرح کا برتاؤ کرتے جیسے ہندوستان میں کرتے ہیں۔ گورکھ کے دل سے صدا اٹھتی : "اے گورکھ، تو کسی بھی قیمت پر امریکہ میں ٹھہرنا چاہتا ہے۔ تجھے ڈالر سے محبت ہو چکی ہے۔ آگے آگے دیکھ، کیا ہوتا ہے۔ تو اپنی تمام غیرت طاق پر رکھ کر، سڑک پر جھاڑو مارنے کا کام بھی بخوشی کرنے لگے گا۔ آہ! تجھے اپنی گراوٹ کا احساس بھی نہ ہو گا۔ پھر گورکھ خود کو تسلی دینے لگتا۔ "بس چند ماہ اور۔ اگر یہی صورت حال رہی تو میں ضرور یہاں سے نکل جاؤں گا۔ میں صرف چھ مہینے اور کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر پھر بھی اپنی پسند کی نوکری نہ مل سکی تو میں ضرور انڈیا واپس چلا جاؤں گا۔ "بارہا یہ احساس اس کے دل کو کچوٹنے لگا "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ "مگر وہ پھر اپنے کو دلاسا دے لیتا : "کچھ نہ کرنے سے بہتر ہے کچھ کر گزرنا۔ اگر میں ہندوستان میں ہی بیٹھا رہتا تو تمام عمر یہ خیال چین سے سانس نہ لینے دیتا کہ امریکہ کیوں نہ آ گئے۔ اگر دولت ہاتھ نہ آئی تو کچھ نقصان بھی تو نہ ہوا۔ ایک سال بعد امر ڈگری حاصل کر لے گا۔ سمر بھی ایم بی بی ایس کر کے یہاں آ سکتا ہے۔ بچوں کا مستقبل تو روشن ہوا۔ میں نے عمدہ تعلیم حاصل کر لی۔ اس پار بھی دیکھ لیا۔ یہاں کے ماحول سے بھی واقفیت حاصل کر لی۔ ہندوستان میں لوگ مغربی تہذیب کی برائیوں کی تو خوب نقل کر لیتے ہیں، لیکن اچھائیوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اتنے برسوں میں یہاں کیا کسی کو کام سے دل چراتے دیکھا؟ کیا کوئی پانچ منٹ بھی نوکری پر دیر سے پہنچا۔ خواہ جنرل منیجر ہو یا ورکر۔ اس ملک کے ترقی کا راز یہی ہے کہ سب اپنا اپنا کام دل و جان سے سرانجام دیتے ہیں۔ کبھی غفلت نہیں کرتے، کسی کام میں دیر نہیں کرتے۔ خیر، جو کچھ بھی دیکھا اور سیکھا، یہ بھی زندگی کے تجربات میں شامل ہو گیا۔ اس لحاظ سے یہاں آنا رائیگاں تو نہ ہوا۔ سوچنے کا انداز ہے۔ نئے سرے سے زندگی کی کڑیاں جوڑنے میں، محنت اور مشقت کرنے میں بھی تو ایک لطف، ایک مزہ حاصل ہوا۔"

ابھی کچھ اور بھی تجربات باقی تھے۔ گورکھ ایک چلتے پھرتے گھر میں کرایہ دار تھا۔ امریکہ میں سب سے سستی رہائش کا انتظام یہی ہے۔ گھر ٹرک کے ٹائروں پر کھڑا تھا، اسے جہاں جی چاہے کھینچ کر لے جاؤ اور ڈیرا ڈال دو۔ سہولت کے حساب سے کتنا آرام دہ۔ درختوں کے جھنڈوں کے درمیان کھڑا یہ ٹرک نما گھر کس قدر دل کش

ہے۔ کمرہ میں گھستے ہی محسوس ہوتا کہ سفر کی تیاری میں ہے۔ رات کو سنسناتی ہواؤں کا شور اور صبح کو پرندوں کی چہچہاہٹ۔ گورکھ 'مان جاکہ ہندوستان کے کسی بھی مکان سے تو یہ ٹرک ہی بہتر ہے!

گورکھ کو یہ الجھن بھی گھیرے رہتی کہ گولی کو بلائے یا نہ بلائے۔ سوچتا کہ کہیں دوسری جگہ مناسب ملازمت مل جانے تک بہتر ہوگا کہ گولی کچھ وقت اور تلسا میں ہی رہے۔ ہر روز وہ آفس سے آکر گولی کو فون کرتا۔ آفس چند روز کے لئے بند ہو رہے تھے۔ گورکھ کے اصرار پر گولی بس میں سوار ہو کر دو دن کے لئے گورکھ کے پاس گئی۔ کہنے لگی "تین سال کے بعد مجھے تلسا میں مناسب نوکری مل سکی ہے۔ کیوں نہ میں تلسا میں ہی نوکری کرتی رہوں اور آپ یہاں لگے رہیں۔ چھٹیوں میں مل لیا کریں گے۔"

گورکھ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کہنے لگا "میں تو ہندوستان واپس جانے کی سوچ رہا ہوں۔ میرے خیال میں تم تلسا میں گھر کا باقی سامان بھی فروخت کر کے یہاں میرے پاس آجاؤ۔ اگر میں یہاں کچھ عرصہ اور نوکری کرتا رہا تو میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یا تو کوئی دوسری مناسب ملازمت ہاتھ آئے 'نہیں تو انڈیا ہی بھلا۔ میرا دماغی توازن پہلے ہی بگڑا ہوا ہے' یہاں اور بگڑتا جا رہا ہے۔ پھر آگرہ یہاں سے بہت دور ہے۔ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہندوستان لوٹنا ہی تو والدین کو ایک بار امریکہ کی سیر کروا دینی چاہئے۔ ایک معیاد مقرر کئے لیتے ہیں۔ اگر اگلے چھ مہینے میں دوسری ملازمت نہ ملی تو واپس انڈیا۔"

گولی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ رضامند ہو گئی۔ چنانچہ والدین کو امریکہ کی سیر کروادی گئی۔ دو ماہ گوپال داس اور ساوتری گورکھ کے پاس قیام کر کے واپس انڈیا چلے گئے۔

پانچ مہینے کا عرصہ گزر گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں ملازمت کے لئے درخواستیں بھیجنے کے بعد ایک روز گورکھ بولا "گولی' یہ آخری بیس عرضیاں ہیں۔ کوئی جواب آیا تو ٹھیک ہے اور نہ آیا تو بھی ٹھیک ہے۔ اب ہم یہاں اور نہیں رہیں گے۔" ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ کارٹر سے ایک کمپنی کی طرف سے ٹیلی فون آیا۔ گورکھ کو انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا۔

انٹرویو کے بعد جلد ہی تقرر نامہ بھی مل گیا۔ گولی کہنے لگی "ابھی ہماری قسمت میں واپس. نہیں لکھا ہے۔ میں ہندوستان واپس جانا بھی نہیں چاہتی۔"

گولی اور گورکھ کارٹر آ گئے۔ کمپنی نے کچھ روز ہوٹل میں رہنے کا انتظام کر دیا۔ پھر گورکھ نے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ امریکہ میں رہتے ہوئے چار سال مکمل ہونے کو آئے تھے' لیکن تلسا کے مکان اور سامان کی خرید و فروخت کی وجہ سے جیب خالی تھی۔ ایک سال کے اندر نیا گھر پھر عیش و آرام کے سامان سے بھر گیا۔ نئی نوکری گورکھ کو پسند آئی۔ گولی کو بھی ملازمت مل گئی۔

گورکھ جب ہندوستان سے امریکہ آیا تھا یہ سوچ کر آیا تھا کہ ہر سال ایک ماہ کے لئے ہندوستان کی سیر پر جایا کرے گا۔ لیکن حالات کچھ ایسے رہے کہ چار سال میں ایک بار بھی گورکھ ہندوستان کا چکر نہ لگا سکا۔ شروع میں جب آیا تھا تو واپسی کے لئے دن گنتا تھا' پھر ہفتے اور پھر مہینے' مگر حالات نے ساتھ نہ دیا۔ پہلے نئی نوکری' پھر کالج کی پڑھائی' پہلی نوکری سے چھٹی' دوسری نوکری کے لئے جدوجہد۔ اب خیر سے ہندوستان کا دورا کرنے کا وقت آگیا تھا۔ گولی کہنے لگی : "کلپنا کو ضرور ساتھ لے آنا۔ آپ کے کہنے کے مطابق انڈیا چھوڑنے سے پہلے اسے گود لے لیا گیا تھا۔ اس کے تمام قانونی کاغذات آپ کے پاس موجود ہیں۔"

"میں ضرور کوشش کروں گا۔" گورکھ بولا۔

گورکھ ہندوستان پہنچا تو جدھر نظر اٹھاتا رنگ و نور اکھڑا اکھڑا سا دکھائی دیتا۔ عوام کے چہرے' بازار' دکانیں' سڑکیں' آمدورفت' گھر کا حلیہ' جیسے ہر شے سے ملمع اترا ہوا ہو۔ اسے تعجب ہوا کہ امریکہ میں صرف چار سال گزارنے کے بعد ماحول اتنا بدلا بدلا کیوں لگ رہا ہے۔

جلد ہی ساتھ لائے ہوئے تحفے تقسیم ہو گئے' ملاقاتیں ہو گئیں' عوتیں ختم ہوئیں اور گورکھ کلپنا کے

بارے میں سوچنے لگا۔ پتہ چلا کہ سارے کاغذات قانونی طور پر صحیح نہ تھے' لیکن پھر بھی کوشش کی جا سکتی تھی۔ کلپنا کو لانے کے لئے جب گورکھ گاؤں پہنچا تو کلپنا اسے سڑک پر ہی مل گئی۔ گورکھ کو ایک نظر دیکھ کر اس نے نگاہ پھیر لی اور جیسے ایک طویل داستان بن کے سمجھا گئی۔ کلپنا کے باپ نے بتایا کہ دو سال تک وہ کسی سے نہیں بولتی تھی۔ ہر وقت گم صم رہتی۔ سارے دن بادلوں اور پہاڑوں کو دیکھتی رہتی۔ بڑی مشکل سے زبان کھولتی۔ جادو ٹونا اتارنے والوں کو بلایا گیا۔ انہوں نے جھاڑ پھونک کی۔ اب کچھ عرصے سے بولنے لگی ہے۔

گورکھ دل ہی دل میں شرمندہ تھا۔ کلپنا کے باپ سے کہنے لگا : "میرے حالات ہی ایسے تھے کہ میں اسے لینے پہلے نہ آسکا۔ اب آپ اسے میرے ہمراہ بھیج دیں۔"

کلپنا کا باپ بولا "اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس کی عمر اب ۱۸ سال ہونے کو آئی۔ مجھے تو اس کی شادی کی فکر ہے۔ میں اسے نہیں بھیج سکتا۔"

گورکھ بولا "جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ جو مالی مدد درکار ہوگی' وہ میں کرنے کو تیار ہوں۔"

گورکھ واپس امریکہ پہنچا تو گولی کہنے لگی "کلپنا کو ساتھ نہیں لائے؟"

گورکھ نے جواب دیا "اس کے باپ نے منع کر دیا۔"

کئی سال سے گورکھ ایک خواب دیکھتا آیا تھا۔ جب اس کی دادی فوت ہوئی تو خواب کی صورت اختیار کر گئی۔ گورکھ دیکھتا کہ دادی آنکھوں پر چشمہ لگائے' ہاتھوں میں سونے کے کڑے اور چوڑیاں پہنے' سر پر دوپٹا اوڑھے چرخہ چلا رہی ہے۔ دھاگا اس نے روئی کے گولے سے کھینچ کر نکالا ہے اور اسے تکلی پر لپیٹے جا رہی ہے۔ پوپلے مونہہ اور جھری دار چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ قریب ہی کچے سوت کے دھاگے' روئی کے گولے اور دھاگوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔

اس کے بعد دادا انتقال کر گئے۔ مرتے ہی وہ دادی کے قریب پہنچ گئے۔ لکڑی کی کرسی پر بیٹھے' گنجے سر پر ترچھی ٹوپی سجائے' لمبی قمیض اور تنگ پاجامہ پہنے' حقے کی نلی مونہہ میں دبائے' دھواں اڑا رہے ہیں۔ اس کے بعد گورکھ کی بیوہ تائی کی موت ہوئی۔ اسے بھی دادا' دادی کے ساتھ جگہ مل گئی۔ وہ دادی کے قریب زمین پر بیٹھی' قدرے گھونگھٹ نکالے' دونوں ہاتھوں میں چلم تھامے کھانس رہی ہے۔ جب سے گورکھ ہندوستان سے لوٹ کر امریکہ آیا' اس منظر میں اضافہ ہو گیا۔ کلپنا دادا کے قریب نیلی شلوار اور نیلی قمیض پہنے' سر پر نیلی پٹی باندھے چارپائی پر پڑی ہے۔ شاید اس کے سر میں درد ہے۔ وہ بالکل ساکن اور خاموش ہے۔ یکایک وہ خود دروازے پر آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کلپنا ایک نظر اسے دیکھ کر مونہہ پھیر لیتی ہے۔ وہ کہیں سفر سے لوٹا ہے۔ اس کا نیا سوٹ اور ہاتھ میں تھاما ہوا چمک دار سوٹ کیس اس کی خوش حالی کی گواہی دے رہے ہیں۔ وہ سب کو ایک نظر دیکھتا ہے۔ سوٹ کیس کمرے کی ڈیوڑھی پر ہی پٹک دیتا ہے۔ کوٹ اتار کر زمین پر پھینک دیتا ہے۔ گلے سے لٹکتی اس کی ریشمی

ٹائی کی گاؤں میں کیا ضرورت؟ وہ ٹائی اتار کر پھینکتا ہے تو ٹائی تائی کے قریب جا گرتی ہے۔ گورکھ کی نظر اپنے قمیض پر پڑتی ہے۔ اس قدر صاف ستھرے، کھڑے کالر والی قمیض کی کیا ضرورت؟ وہ قمیض اتار کر کلپنا کے پاؤں کی طرف پھینک دیتا ہے۔ اسے اس طرح کپڑے اتار کر پھینکتے دیکھ کر دادی کے چرخے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور وہ کہتی ہے : "آ گئے بیٹا؟"

وہ دہلیز چھوڑ کر اب کمرے میں داخل ہو چکا ہے۔ یکایک تائی کی نظریں اس کے چہرے پر جم جاتی ہیں۔ اس کی کھانسی کو یک بیک راحت مل جاتی ہے۔ اس کی چلم میں کوئلے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور وہ ایک لمبا کش لے کر کہتی ہے : "آ گئے بیٹا؟"

اب وہ تائی کے قریب سے گزرتا ہوا دادا کی کرسی کے پاس کھڑا ہے۔ چشمہ آنکھوں پر سیدھا کرتے ہوئے، دادا زور زور سے حقہ گڑگڑانے لگتے ہیں اور ان کے لبوں سے نکلتے تمباکو کے دھوئیں کے بادل اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ ان کی آواز میں جیسے ایک طنز ہے۔ وہ کہتے ہیں "آ گئے بیٹا؟ بہت دیر کر دی!"

وہ دادا کے پاس چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ کلپنا ابھی تک مونہہ پھیرے ساکن پڑی ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کرتا ہے اور اس کے سر پر بندھی پٹی پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ کلپنا اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بھی خلا میں دیکھ رہی ہے۔ وہ کلپنا کو سینے سے لگانے کے لئے اس پر جھکتا جا رہا ہے، جھکتا ہی جا رہا ہے کہ یکایک کلپنا کا جسم چارپائی سے اونچا اٹھنے لگتا ہے اور کمرے کی چھت تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ ہاتھ پھیلائے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کلپنا کی نیلی قمیض اور نیلی شلوار ہوا میں ہے۔ اس کے سر کی پٹی نیچے تک ہوا میں بل کھا رہی ہے۔ وہ ہاتھ بڑھائے دیوانہ وار کلپنا کی طرف بڑھتا ہے، لیکن ہزاروں قلابازیاں کھانے کے بعد بھی کلپنا اس کی پہنچ سے دور ہے۔

کچھ دن بعد گورکھ کو خبر ملی کہ کلپنا کی شادی طے ہو گئی ہے۔ اس کا شوہر عمر میں اس سے بیس سال بڑا ہے۔ وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔ گورکھ نے کچھ مالی مدد کلپنا کے والد کو بھیج دی۔ پھر خبر آئی کہ کلپنا ماں بن گئی ہے۔ اس نے ایک لڑکی کو جنم دیا ہے۔ اس کے ایک سال بعد اطلاع ملی کہ کلپنا نے ایک لڑکے کو جنم دیا ہے۔ پھر ڈیڑھ سال بعد خبر آئی کہ کلپنا کے بیٹا ہوا۔ لیکن گورکھ کا خواب ایک جگہ ٹھہر چکا تھا۔ اس میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ اس خواب کی ہو بہو وہی صورت رہی جو پہلے تھی۔

کارٹر میں گورکھ کو رہتے ہوئے دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس کے کام کی قدر ہونے لگی اور اس کے ساتھ اس کی مصروفیت بھی بڑھتی گئی۔ گولی بھی نوکری کرتی تھی۔ آمد و رفت کا وقت اور لنچ کا ایک گھنٹہ ملا کر دن کے دس گھنٹے ڈیوٹی پر گزر جاتے۔ صبح کے ۶ بجے سے لے کر شام کے ۶ بجے تک بھاگ دوڑ مچی رہتی۔ ایک روز گولی کہنے لگی : "افسوس کہ آپ کلپنا کو ساتھ نہ لا سکے۔ اگر وہ آ جاتی گو گھر کے کام کاج میں مدد مل جاتی۔ میں گھر

اور دفتر کے کام کی وجہ سے تھک کر چور ہو جاتی ہوں۔"

گورکھ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "مجھے ہندوستان میں اپنے ایک اور رشتہ دار ملے تھے۔ کئی سال پہلے وہ بھی امریکہ آئے تھے، لیکن ان کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہوئی جیسی دو سال پہلے ہماری تھی، اس لئے وہ اپنی لڑکی کو امریکہ میں ایک اور رشتہ دار کے پاس چھوڑ کر واپس ہندوستان چلے گئے۔ اب وہ بیٹی کو بھی واپس ہندوستان بلانے کی سوچ رہے تھے۔ میں نے ذکر چھیڑا کہ کیوں نہ وہ امریکہ میں ہمارے ساتھ رہے تو کہنے لگے کہ آپ اسے اپنے پاس رکھ تو لیں، لیکن اس کی پڑھائی اور شادی کی ذمہ داری آپ کے سر رہے گی۔ تم کہو تو میں اس لڑکی کو اپنے یہاں رکھنے کے لئے کوشش کر سکتا ہوں۔"

گورکھ امریکہ میں اپنے اس رشتہ دار سے ملنے گیا جن کے یہاں رچنا رہتی تھی تو اسے پتہ چلا کہ وہ خود رچنا کی ذمہ داری سنبھالنے سے دامن بچانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ گورکھ رچنا کو ساتھ لے کر آ گیا۔ رچنا کو اسکول میں داخلہ مل گیا اور اس کی وجہ سے گھر کے کام میں سہولت ہو گئی۔

زندگی پھر ایک مقام پر ٹھہر گئی تھی۔ ایک دن گولی کہنے لگی کہ اب ایک گھر خرید لینا چاہئے۔ جو کچھ مکان کے سلسلے میں تلسا میں ہوا تھا، وہ ابھی گورکھ کے ذہن میں تازہ تھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں پھر کوئی مصیبت نہ آ پڑے۔ اس ڈر کے باوجود قرض لے کر ایک گھر خرید لیا گیا۔ اسی وقت ہندوستان میں جو تین رہائشی پلاٹ خریدے تھے، ان میں سے ایک فروخت کر دیا گیا۔ والدین کو دوبارہ امریکہ کی سیر کے لئے بلایا گیا۔ والدین یورپ کی سیر کرتے ہوئے چند ماہ گورکھ کے پاس امریکہ میں رہے۔ سال بھر بعد گولی ہندوستان کی سیر کر آئی۔ سمر ہر سال امریکہ آتا تھا۔ جب اس نے ہندوستان سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لی تو وہ مستقل طور پر امریکہ آ گیا۔ کڑی محنت کے بعد اسے ایم ڈی میں داخلہ مل گیا۔ امر کو ایک یورپین لڑکی سے محبت ہو گئی۔ پہلے تو گولی اور گورکھ بہت خفا ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ لڑکے کی شادی ہندوستانی تہذیب اور رسم و رواج کے مطابق ہونی چاہئے۔ جب ان کا کوئی بس نہ چلا تو انہوں نے یورپین بہو کو گلے لگا لیا۔

کچھ عرصہ بعد گوپال داس سخت بیمار ہوئے اور انہیں ہسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ گورکھ ہندوستان ان سے ملنے کو پہنچا تو دیکھا کہ بالکل ہمت ہار بیٹھے ہیں۔ خیر کسی طرح جان بچ گئی۔

گورکھ کی ماں بھی بڑھاپے کی وجہ سے بیماریوں کا شکار رہنے لگی تھی۔ والدین امید لگائے بیٹھے تھے کہ گورکھ واپس ہندوستان لوٹ آئے گا، لیکن ان کی یہ امید پوری نہ ہوئی۔

گورکھ کو امریکہ میں رہتے ہوئے چار سال اور گزر گئے۔ اس درمیان اس نے دو بار ہندوستان کا دورہ بھی کیا۔ کمپنی میں گورکھ اپنے کام میں ماہر سمجھا جانے لگا۔ کہاں تو وہ تین سال بعد انڈیا واپس جانے والا تھا کہاں اسے انڈیا سے آئے ہوئے تقریباً ١٥ سال گزر گئے تھے۔ وہ انڈیا جانے کے بارے میں سوچتا ضرور، لیکن زندگی اپنا رخ

بدل چکی تھی۔ اب اسے دوبارہ ہندوستان میں بسنا مشکل نظر آتا۔ ۵۷ سال کی عمر میں اسے کون ہندوستان میں نوکری دے گا؟ امریکہ میں ۶۵ سال کی عمر تک لوگ کام کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد ریٹائر ہوگا تو سوچے گا۔ سمر کی عمر بھی شادی کے لائق ہو چکی تھی۔ دو بار گولی لڑکی دیکھنے ہندوستان گئی، لیکن بات نہ بنی۔ امریکہ میں گورکھ کے ایک دوست کی لڑکی جسے وہ گواڑی کے زمانے سے جانتا تھا، میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ آج بات ہوئی اور کل کورٹ میرج۔ ہندوستانی رسم و رواج کے مطابق پھر رسم پوری نہ ہو سکی، جس کا گولی کو بہت صدمہ ہوا۔ ہندوستان میں دس سال پہلے خریدی ہوئی زمین اور جائداد تشویش اور نقصان کا باعث ثابت ہوئی۔

گوپال داس کم زوری اور بڑھاپے کی وجہ سے اس کی نگرانی نہیں کر سکتے تھے۔ جائداد کے سلسلے میں انہیں بہت سرگرم رہنا پڑتا تھا۔ زیادہ بھاگ دوڑ ان کی صحت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ آخر میں وہ دونوں پلاٹ بھی بیچ دیئے گئے۔ زمین کا ایک ٹکڑا اب بھی رہ گیا۔ گورکھ نے سوچا اگر بڑھاپے میں ہندوستان جانا پڑا تو وہ پلاٹ کام آئے گا لیکن اس کو سنبھالنا بھی محال تھا۔ اس کے ساتھ یہ شرط لگی ہوئی تھی کہ اس پر جلد سے جلد مکان کھڑا کیا جائے، ورنہ لیز کینسل ہو جائے گی۔ اس لئے اسے بھی فروخت کر دیا گیا۔

عمر کے بڑھنے سے انسان کی بنیادی فطرت نہیں بدلتی، اگرچہ وقت اور تجربات اس کا رخ ضرور بدل دیتے ہیں۔ اس طرح نہ گولی بدلی اور نہ گورکھ۔ مصوری، فلسفہ، غزلیں، گیت اور دل کا وہی عالم۔ اگرچہ ان کی شباہت بہت کچھ بدلی ہوئی لگتی، لیکن ماجرا تو وہی تھا۔ مانا کہ شراب نوشی کم کر دی، کیوں کہ ذیابیطس کی شکایت شروع ہو چکی تھی، مگر شراب کا شوق تو کم نہیں ہوا۔ مانا کہ تصویروں نے نئے جامے پہن لئے، لیکن ان کے موضوعات نہ بدلے۔ زباں پر نئی غزلیں، نئے گیت رہنے لگے، لیکن ان کا مضمون نہ بدلا۔ فلسفہ کئی کروٹیں لے کر نئے الفاظ ڈھونڈ لیتا، مگر اس کا عنوان وہی تھا۔ دل کی وحشت اور آوارگی کو چھپانے، دبانے اور برداشت کرنے کے لئے نئے طریقے تلاش کر لئے لیکن وہ سوز تو پرانا تھا۔

ایک دن گورکھ تصورات کی دنیا میں کھویا ہوا تھا کہ تیسری منزل پر آفس کی کرسی پر بیٹھا زمین بوس ہو گیا۔ اس کا دل اتنا گھبرا رہا تھا کہ وہ کار اسٹارٹ کر کے گھر آگیا۔ ایک جام شراب کا بنایا، پھر دوسرا اور اس کے بعد تیسرا۔ جب طبیعت میں گراوٹ پھر بھی کم نہ ہوئی تو اس نے سوٹ کیس سے پلاسٹک کی گڑیا نکالی اور اسے آغوش میں لے کر بیٹھ گیا۔ دیر تک اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا، گلے میں پڑی موتیوں کی مالا کی چمک پرکھتا رہا، ریشمی گاؤن کی ڈوری کھینچتا رہا۔ گڑیا آنکھیں جھپکاتی، چیں چیں کرنے لگی تو اس سے یوں مخاطب ہوا : ''آج تو پھر زندہ ہوا تھی؟''

گڑیا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر کیوں نہ دو دو باتیں ہو جائیں۔ میں گرا جا رہا ہوں۔ سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ کچھ بات کریں تو دل

بیلے۔"

گڑیا نے مسکرا کر جواب دیا : "تم کہو تو میں ضرور سنوں گی۔ تمہارے الفاظ ہی سے تو مجھ میں زندگی کی لہر دوڑ اٹھتی ہے۔ تمہارے تصور سے ہی مجھے زبان ملتی ہے۔ تمہاری آرزو ہی میرے جسم میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ تمہاری بات کیوں نہ سنوں گی؟"

"کیا سناؤں؟ کچھ سنانے کو بھی تو نہیں۔ کچھ بولنے کو بھی تو دل نہیں چاہتا۔ چلو کہیں دور چلیں۔ کسی دشت میں، تنہائی میں۔ اس ماحول سے دور۔"

"وہاں کیا کریں گے؟"

"خطرناک راستوں سے گزرتے، پہاڑوں کی چوٹیاں عبور کرتے، سرد ہواؤں کا مقابلہ کرتے، برف کے تودوں کی خنکی میں ٹھٹھرتے ہوئے۔ جب لب نیلے پڑنے لگیں گے اور ایک قدم چلنا بھی مشکل ہو گا اور موت سامنے کھڑی راہ تک رہی ہو گی تو ایک طرف تم ہو گی اور ایک طرف موت، دیکھتے ہیں کس کی جیت ہوتی ہے؟ میں موت سے بھاگتا ہوا تمہاری طرف حرکت کروں گا۔ بولو، ہے منظور؟"

"تو پھر چلو اٹھو، مجھے تو کوئی تیاری نہیں کرنی، کوئی لباس نہیں بدلنا۔ مجھے تو سردی نہیں لگتی۔ لیکن تم ٹھیک طرح لباس پہن کر آؤ۔ میں کہتی ہو سویٹر، موزے، دستانے، ٹخنوں تک لمبے جوتے، برساتی، کوٹ، سر پر ٹوپی، سب ہی کچھ پہن لو۔ نہ معلوم کس راہ سے گزرنا ہو، کتنے طوفانوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لئے تیار ہو کر آؤ۔ میں منتظر ہوں۔"

گورکھ نے قرینے سے لباس پہن لیا اور واپس آ کر بولا "میں تیار ہوں۔"

"یہ گلے کے بٹن بند کرو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔"

"جو حکم، جان من۔"

سفر شروع ہوا۔ میدان ختم ہوئے تو پہاڑی علاقہ سامنے تھا۔ کبھی گڑیا آگے اور کبھی گورکھ آگے۔ ایک اونچائی کو عبور کر لیا تو پھر غار میں جا گرے۔ اس سے نکل کر آئے تو اونچائی کچھ اور بڑھ گئی۔ جتنی گھاٹیاں، وادیاں اور کہسار، پار کرتے ہوئے آگے بڑھے، خنکی اتنی ہی بڑھتی گئی۔ طوفانی سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ گڑیا ٹھٹھرنے لگی۔

"تم تو کہتی تھیں کہ تمہیں سردی نہیں لگتی۔ اب کیوں ٹھٹھر رہی ہو؟ لو، میرا کوٹ پہن لو۔ یہ آخری بلندی ہے۔ اگر اسے پار کر گئے تو پھر وادیاں ہی وادیاں۔"

لیکن اونچائی پر قدم رکھتے رکھتے پاؤں پھسلا۔ پہلے گڑیا گری، پھر گورکھ۔ دونوں ہی دریا کے برفیلے پانی میں ڈوبنے لگے۔ جسم کی حرارت برف کے تودوں کے حوالے ہوئی۔ یکایک کنارہ نظر آیا تو مشکل سے سرکتے سرکتے

اس تک پہنچے۔ گڑیا قریب کھسکتے ہوئے بولی "ہم دونوں ہی بچ گئے۔ میرا تو دم نکل رہا ہے۔ مجھے سینے سے لگالو۔"

اسی پل گورکھ کی نظر دروازے کی طرف اٹھی وہاں رچنا کھڑی تھی۔ وہ اسکول سے گولی اور گورکھ کے آفس لوٹنے سے پہلے ہی واپس آگئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کتنی دیر سے دروازے پر کھڑی تھی۔ گورکھ گڑیا کو ابھی تک سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ رچنا پر نظر پڑتے ہی اس کے حواس ٹھکانے آئے اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے گڑیا کو سوٹ کیس کے سپرد کیا۔ چند لمحے بعد رچنا نے دروازے پر دستک دی تو گورکھ نے دروازہ کھول دیا۔

کچھ وقفے کی خاموشی کے بعد رچنا بولی "انکل جی' آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آپ چائے پئیں گے؟ آپ نے اتنے گرم کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟"

یکایک گورکھ کو اپنے لباس کا خیال آیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ وہ پسینے میں لت پت ابھی تک ہانپ رہا تھا۔

"ہاں چائے' ٹھیک رہے گی۔ تم چائے بنالاؤ۔" گورکھ بولا۔

رچنا چائے کا گلاس لے کر دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو گورکھ لباس بدل چکا تھا۔ پیشانی پر پسینہ ابھی تک نمایاں تھا۔ رچنا بھی چائے کا پیالہ لے کر قریب ہی بیٹھ گئی۔ گورکھ اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

رچنا بولی "میں دیر سے دروازے پر کھڑی تھی۔ میں نے ایک بار آواز بھی دی' لیکن آپ نے نہ سنی۔ مجھے آپ کی حرکتیں یاد کر کے عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔"

گورکھ نے کہا "تو نے بہت برا کیا۔ تجھے بے ٹکٹ کا تماشا دیکھنے کا کوئی حق نہ تھا۔ تجھے فوراً" دروازہ بند کر دینا چاہئے تھا۔ میں غلطی سے دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ مجھے وقت کا احساس ہی نہ رہا۔"

"آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے اور میں گھبرا رہی تھی۔ میں تو آنٹی کو ساری بات بتاؤں گی۔"

"یہ کام کبھی نہ کرنا۔ تو بھی تو میری اچھی گڑیا ہے۔ قسم کھا کہ کسی کو نہیں بتائے گی۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے اور نہ کوئی بیماری۔ جو تو نے دیکھا' اسے بھول جا' دل میں چھپا کر رکھ۔ میں کبھی کبھی اپنے کو بہت تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اس لئے خوابوں سے پیار کر لیتا ہوں۔"

"آپ سے تو سب پیار کرتے ہیں۔ سب آپ کو چاہتے ہیں۔ آپ کے لئے کمی کس بات کی ہے؟ یہاں رہتے ہوئے چار سال ہو گئے۔ میں نے آپ کا یہ رخ کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ انسان کے بہت سے رخ ہوتے ہیں۔ اکثر وہ زمانے کی نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ لیکن کبھی نہ کبھی' کسی نہ کسی پر' اچانک راز کھل ہی جاتا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے تو اسے راز ہی رکھے گی۔"

گولی ہندوستان کی سیر کے بعد واپس آئی۔ تو ایک دن نرم لہجے میں' سلیقے اور شائستگی سے' تہذیب یافتہ طریقے سے' اس نے گورکھ پر وہ سب باتیں ظاہر کر دیں جو وہ سن کر آئی تھی۔ اس نے کہا "بھولی نے میری بھابھی

کو ضرور تمہارے متعلق کچھ بتایا ہے۔ اس بات کا میرے بھائی کو بھی علم ہے، لیکن وہ لوگ کبھی کھل کر بات نہیں کریں گے۔ تمہارے اور بھولی کے درمیان کچھ رہا تھا، جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ خدا کرے یہ سنی سنائی ہی ہو۔ مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔ پھر بھی افواہیں بغیر کسی بنیاد کے نہیں اڑا کرتیں۔ جب میں دہلی گئی تو کچھ ایسی ہی باتیں میں نے تمہارے اور کلپنا کے بارے میں بھی سنیں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ سب کہاں تک سچ ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے اندھیرے میں نہ رکھو۔ ٹھیک ٹھیک بے جھجک، کھل کر، بتاؤ کہ معاملہ کیا تھا۔"

"میرا کسی سے کوئی ناجائز رشتہ نہ تھا۔ تم یقین کرو۔" گورکھ بولا۔

"میں نے تمہیں کئی بار سمجھایا کہ تم گھر کے معاملوں میں زیادہ دخل نہ دیا کرو۔ اب کلپنا کی بات ہی لے لو۔ میں اسے ٹھیک اس کی جگہ کے مطابق رکھتی تھی۔ تم اسے زیادہ سر پر اٹھاتے تھے۔ یا خفا ہوتے تھے یا زیادہ محبت کا اظہار کرتے تھے۔ مجھ سے کہہ کر جاتے کہ آج کلپنا کو سینما ساتھ نہیں لے جائیں گے، مگر کلپنا سامنے پڑ جاتی تو اسے بھی ساتھ لے جانے کے لئے اصرار کرتے۔ کیا ضرورت تھی کہ میاں بیوی جہاں جائیں، کلپنا بھی ساتھ جائے؟ اسی طرح کیا ضرورت تھی کہ بھولی کی تصویریں اتارتے چلے گئے؟ کبھی اس کی آنکھوں میں کاجل لگایا کبھی اس کے ناخنوں پر نیل پالش چمکایا۔ فرمائشیں کر کر نئے نئے لباس پہننے اور کیمرے کے سامنے نئے نئے انداز سے آنے کے لئے اصرار کیا۔"

گورکھ نے بہت سی تصویریں تو گولی کو دکھائی تک نہیں تھیں۔ تکرار سے بچنے کے لئے اس نے کہا "ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے تمہاری طرح ہی پیش آنا چاہئے۔ میں ویسے تو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہوں، لیکن اگر کوئی گھر میں رہنے کے لئے آجائے تو دخل اندازی پر اتر آتا ہوں۔ بچوں کے ساتھ بھی میرا یہی وطیرہ رہتا ہے۔"

گولی سمجھانے لگی "بچوں کی بات الگ ہے۔ مگر اب رچنا سے دور رہا کرو۔ نہ زیادہ خفگی ظاہر کرو، نہ اسے سر پر اٹھاؤ۔ تمہیں اس سے بات کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ گھر کا کام مجھے کرانا ہے۔ تم دخل اندازی چھوڑ دو۔ باقی میں اس کا ہر طرح خیال رکھتی ہوں۔ نئے لباس، نئی بالیاں، نئی کتابیں۔"

گورکھ سوچ رہا تھا کہ گولی کو اس پر شک ہو چکا ہے۔ وہ کھلم کھلا تو اس پر الزام نہیں لگائے گی۔ وہ بھی اسے حقیقت کیسے بتائے؟ کہاں سے داستان شروع کرے؟ اس نے اگر مونہہ کھولا تو غیر ضروری پریشانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ جو آج تک پس پردہ رہا اسے پردے میں ہی رکھنا ہو گا۔ گولی چاہے کچھ بھی سوچتی رہے، زمانہ چاہے کچھ بھی کہتا رہے۔ اس نے گولی سے کہا "میں تمہاری بات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

لیکن عمل کیا خاک ہوتا؟ رچنا بہت موڈی تھی۔ یکایک اس طرح اداس ہو جاتی جیسے کسی مردے کا منہ دیکھ کر آئی ہو۔ شاید اسے ہندوستان کی یاد آتی ہو گی یا کوئی اور بات ہو گی جسے وہ ظاہر نہ کرتی تھی۔ بارہا دریافت کرنے پر بھی خاموش رہتی، جس سے ماحول میں ایک تناؤ سا پیدا ہو جاتا۔ گورکھ سوچتا کہ وہ خود بھی تو موڈی ہے۔

کیا وہ کسی کو اپنے موڈی ہونے کی وجہ بتا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو رچنا کو موڈی ہونے کا اختیار کیوں نہیں دینا چاہتا؟
گورکھ بارہا سوچتا کہ اسے اپنے ظاہری رویہ میں گولی کی طرح ہموار ہونا چاہئے۔ اپنے موڈ اپنے تک ہی رکھنے چاہئیں۔ اگر موڈ خراب بھی ہو تو کسی کو پتہ نہ چلے کہ اندر ہی اندر کیا ہو رہا ہے۔ لیکن وہ ظاہری رویہ کو اندرونی تاثرات اور مسرت سے بچا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ خدا نے اس کے چہرے کو اس کے دل کا آئینہ بنا دیا تھا۔ وہ اپنی دورنگی شخصیت پر کہاں تک پردہ ڈالے؟ ممکن نہ تھا کہ غار میں گرے تو آہ نہ بھرے اور مینار پر چڑھے تو مسرت کا اظہار نہ کرے۔

گورکھ بازار جانے لگتا اور اس کا موڈ اچھا ہوتا تو رچنا سے کہتا "چل، تجھے بھی گھما لاؤں۔" شروع شروع میں تو رچنا خوشی خوشی ساتھ چل پڑتی۔ بعد میں کئی بار اصرار کرنا پڑتا۔ ایک دن کہنے لگی "آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ آنٹی نہیں چاہتیں کہ میں اکیلے آپ کے ساتھ کار میں بازار جاؤں۔"

جو بات رچنا نے سمجھ لی تھی، وہ گورکھ کیوں نہ سمجھ سکا؟ یہی سوچتے ہوئے وہ کہنے لگا "تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے بھی کئی بار محسوس کیا ہے کہ تمہاری آنٹی بظاہر کچھ نہیں کہتی، لیکن جب بھی تم ساتھ جاتی ہو، کچھ چپ چپ ہو جاتی ہے۔ آئندہ کبھی یہ فرمائش نہیں کروں گا۔"

گورکھ خاص خیال رکھنے لگا کہ رچنا کو بازار ساتھ نہ لے جائے۔ ان ہی دنوں رچنا کو کار چلانے سکھانے کا مسئلہ سامنے آیا۔ گورکھ بے تعلق سا ہو گیا۔ کچھ روز بعد گولی خود ہی کہنے لگی "تم ہی اسے سکھا دیا کرو۔ مجھ سے یہ سردرد نہ سہا جائے گا۔"

رچنا نے جب سے گورکھ کا بغیر ٹکٹ کا تماشا دیکھا تھا، وہ اور بھی کھل گئی تھی۔ گولی کے سامنے وہ گورکھ سے ہر بات تعظیم سے، موقع کے مطابق کرتی، لیکن گولی کی غیر حاضری میں گورکھ سے گفتگو کرتے وقت اسے اپنی زبان پر قابو نہ رہتا۔ وہ کم سن لڑکیوں کی طرح خود اچھل کود مچاتی۔ اس کی آواز میں ایک لچک پیدا ہو جاتی، جیسے اس پر سے کوئی وزن اٹھا دیا گیا ہو۔ وہ چہک چہک کر کہتی رہتی : "انکل جی، یہ دیکھو میری نیل پالیش۔ اس لباس میں میں کیسی لگ رہی ہوں۔ آپ میرا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے۔ دو دن سے سردرد کی دوا مانگ رہی ہوں۔ آپ بھول جاتے ہیں۔ میں ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا لوں؟ آنٹی کے آتے آتے صاف کر دوں گی۔ میرا ماتھا بہت چوڑا ہے۔ آگے سے بالوں کی لٹیں کاٹ لوں اور انہیں ماتھے پر لہرانے دوں؟"

گورکھ سوچتا کہ بہتر ہوتا اگر رچنا گولی سے اس قسم کی گفتگو کرتی۔ اسے رچنا کی باتوں سے لطف بھی ملتا اور وہ اس پر روک بھی نہ لگاتا۔

ایک دن گورکھ نے کلپنا کو ٹوکا : "تو اس طرح میرے گلے سے مت لٹکا کر۔ آخر میرا گلا ہے، دیوار پر لگی کھونٹی تو نہیں۔ اگر تیری آنٹی نے دیکھ لیا تو کچھ کا کچھ سمجھ لے گی۔"

رچنا بولی "میں بھی زندہ چیز ہوں، آپ کے سوٹ کیس میں بند گڑیا نہیں۔ میں سوچتی تھی کہ سارے گھر میں صرف ایک سوٹ کیس کو کیوں تالہ لگا کر رکھا جاتا ہے۔ اب تمام بھید کھل گیا۔ مجھے بھی آپ اس طرح نہ دبایا کریں۔ میں جوان ہو گئی ہوں۔"

"میں خوب جانتا ہوں۔ لیکن میری گڑیا سے تیرا کوئی مقابلہ نہیں۔ تیرے لئے جلدی ہی کوئی لڑکا تلاش کرنا پڑے گا۔" گورکھ نے ہنس کر کہا۔

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ایک روز رچنا گورکھ کے گلے میں جھول رہی تھی کہ گولی کی نظر پڑ گئی۔ گورکھ نظریں جھکائے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ گولی نے اس سے جواب طلب کیا تو کوئی تسلی بخش جواب اس سے نہ بن پڑا۔ لوگ جھوٹ پر سچ کا ملمع چڑھاتے ہیں۔ اور گورکھ کے سچ پر جھوٹ کا ملمع چڑھ چکا تھا۔ گولی کو تقریباً یقین ہوتا جا رہا تھا کہ گورکھ بے وفا بھی ہے۔ اس نے گورکھ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "جو بھی معصومانہ حرکت کرنی ہے، میرے سامنے کرو۔ مجھ سے چوری چھپے یہ حرکت کرنے کی کیوں ضرورت پڑی؟ چوری وہی کرتے ہیں، جن کے دل میں کھوٹ ہوتا ہے۔"

گولی کو جوش خون (بلڈ پریشر) کی تکلیف رہتی تھی۔ گورکھ اپنی دواؤں سے اس کا علاج کرتا رہتا، مگر زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ اس گفتگو کے بعد گولی کا بلڈ پریشر اور بڑھ گیا۔ گولی کو انگریزی دوا کا سہارا لینا پڑا۔

ایک دن گولی آفس سے لوٹی تو کہنے لگی : "آج میرے دل کی طرف درد اٹھا، جو سرکتا ہوا بائیں بازو کی طرف بڑھ گیا۔"

سمران دنوں دل کے امراض کا ڈاکٹر بننے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے ای۔ سی۔ جی۔ دیکھ کر کہا کہ کچھ خرابی ہو سکتی ہے۔ چند دن اور گزرے۔ گولی دل کے درد کی بار بار شکایت کرنے لگی۔ ایک دن زارو قطار آنسو بہاتے ہوئے بولی "میرے باپ اور ماں بھی اسی طرح چل بسے۔ میں بھی زیادہ دن زندہ نہ رہوں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔"

گورکھ اسے دلاسا دیتا رہتا۔ اس نے دل کے امراض کے بارے میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ گولی نے نوکری سے استعفا دے دیا۔ رچنا اور گورکھ اس کی تن دہی سے تیمارداری کرنے لگے۔ اس کی خوراک کا خاص خیال رکھا جانے لگا۔ علاج کے لئے کئی ہومیوپیتھک دوائیاں آزما ڈالیں۔ لیکن درد بڑھتا ہی گیا۔ گولی کو یقین ہو گیا کہ وہ دل کی سخت مریض ہے اور زیادہ دن زندہ نہ بچے گی۔ گورکھ لاکھ دلاسے دیتا، مگر گولی نڈھال رہتی۔

ایک روز سمر نے بتایا کہ موجودہ میڈیکل سائنس میں ایک ٹیسٹ ایسا بھی ہے جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نظر آ جاتا ہے۔ دل میں ایک چھوٹا سا کیمرہ اتار کر دل کے اندرونی حصے کی تصویریں لی جا سکتی ہیں۔

تصویریں کیا' ایک چلتی پھرتی فلم بنائی جاتی ہے۔ دل نے کیا کیا' کب سکڑا' کب پھیلا' کب خون آیا' کدھر سے کدھر گیا' سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی ایک ایسا ٹیسٹ ہے جس سے دل کی بالکل صحیح حالت کا یقینی علم ہو سکتا ہے۔ باقی تمام ٹیسٹ غلط بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ گولی اسی ٹیسٹ کے لئے رضامند ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے متفق ہو کر پر زور لہجہ میں کہا : "دل کی کوئی بیماری موجود نہیں ہے۔ درد کسی اور وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ جو درد ہے وہ دل کا درد نہیں۔"

اس تشخیص کے بعد گولی کے دل کا درد یکایک بند ہو گیا۔ پہلے وہ بار بار دل کو پکڑ کر بیٹھ جاتی تھی' اب کئی مہینے گزر گئے' لیکن درد کا دورہ نہ پڑا۔

اس واقعہ کے بعد گورکھ کے ذہن میں تصور اور حقیقت کا فرق کچھ اور بھی کم ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا "گولی کبھی جھوٹ نہیں بولتی اور نہ اپنی جسمانی تکلیف کو کبھی بڑھا چڑھا کر بیان کرتی ہے۔ ضرور اس کے دل میں درد اٹھتا تھا۔ اس کا وہم شدت احساس سے دل کے درد صورت اختیار کر لیتا تھا۔ جب وہ وہم دور ہو گیا تو درد بھی مٹ گیا۔ آہ! مگر اس کی گوکل کیوں تصور سے حقیقت نہ بن سکی؟ وہ کس قدر زندہ ہو اٹھی تھی۔ کیا خطا ہوئی کہ ساتھ چھوڑ گئی۔ تصور میں ہمیشہ جھلملا کر رہ جاتی ہے۔ سامنے کبھی نہیں آتی۔"

اسکول کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد رچنا نے کالج میں داخلہ تو لے لیا' لیکن پڑھائی اس کے بس کی نہ تھی۔ کار چلانی وہ سیکھ ہی چکی تھی۔ اس کے استعمال کے لئے ایک پرانی کار خرید دی گئی اور وہ ایک اسٹور میں ملازم ہو گئی۔ وقت کا تقاضا تھا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر گولی اور رچنا ہندوستان روانہ ہو گئے۔ جلد ہی انہیں ہندوستان میں ایک انجینئر لڑکا پسند آگیا۔ گورکھ رچنا کی شادی میں شرکت نہ کر سکا۔ وہ ایک امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ امتحان کے بعد وہ ہندوستان گیا۔ رچنا نے اپنے شوہر اور تمام رشتہ داروں میں گورکھ اور گولی کی اس قدر تعریف کی تھی کہ سب بہت محبت سے ملے۔ چند ماہ بعد رچنا اور اس کا شوہر امریکہ آ گئے۔ کچھ مشکلات کے بعد رچنا کے شوہر کو ملازمت مل گئی۔ وہ گولی اور گورکھ سے دور رہنے لگے اور خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگے۔

نشے کی صورت میں احساسات لطافت کی حدیں بھی چھو سکتے ہیں۔ اور کثافت کے غار میں بھی دفنا سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کے درمیان لٹکا دیں۔ نشے میں بھی خودی کا ایک جز ہوش مند رہتا ہے اسے کوئی نشہ نہیں بہکا سکتا' کوئی عارضی خود فراموشی کی دوا یا زہر نہیں سلا سکتا۔ عموماً" نشہ کی حالت میں گورکھ ایک میان کی حدوں سے پرے خوب صورتی کا لطف حاصل کرتا۔ جیسے جیسے نشہ بڑھتا' روزمرہ کی الجھنیں گہری نیند سو جاتیں۔ تخیل کا مرجھایا گلستان تروتازہ ہو اٹھتا۔ ہزاروں گل مسکرانے لگتے۔ شراب کے نشے سے تو گورکھ کئی بار لطف اندوز ہو چکا تھا' لیکن بھنگ کا نشہ پہلی بار اس نے تقریباً" تیس سال پہلے میرٹھ میں آزمایا تھا۔ اس روز گولی کے بہت سے رشتہ دار جمع تھے۔ گولی کی چچیری بہن سریکھا نے بھنگ کے پکوڑے بنائے تھے۔ کھائے تو سب ہی نے' لیکن شاید سب کا مشترکہ اثر گورکھ پر پڑا۔ شروع میں بستر پر دراز ہو کر وہ چپ چاپ اس نشے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ یکایک زبان کھولی تو لطف زبان سے ٹپکنے لگا۔ لطف اگر زبان تک محدود رہتا تو بھی غنیمت تھا' لیکن جب فرش پر ٹپکنے لگا تو سارا لطف خاک میں مل گیا۔ کئی سال کا عرصہ گزر گیا۔ ان لوگوں میں سے کوئی بھی ملتا اور اس واقعہ کا ذکر کرتا تو گورکھ شرمسار ہو کر سر جھکا لیتا۔ لیکن لوگ زمین کی بات کم کرتے اور آسمان کی زیادہ۔ لوگ کہتے : "کاش ایک بار وہی راز پھر افشاں ہو جائیں جو اس روز ہوئے تھے۔ کیا بات تھی' کیا ادا تھی' کیا انداز تھا!" گورکھ بہت غور کرنے پر بھی کچھ یاد نہیں کر سکتا تھا کہ ایسی کیا بات تھی جو لوگوں کو تیس سال بعد بھی یاد رہی۔ گولی یا تو ذکر نہ کرتی اور اگر کرتی تو طنز سے یہی کہتی : "کہا ہو گا جو کہا تھا۔ میری تو مصیبت تھی۔ تم ہواؤں میں تھے اور میں فرش سے چپکی تھی۔ تمہیں تو فرش پر رکھی بالٹی بھی نظر نہیں آ رہی تھی اور مجھے بالٹی کے سوا کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ تمہیں ہی لوگوں کو بغیر ٹکٹ کا تماشا دکھانے کا شوق ہے۔" یہ تماشا سرعام ہوا تھا' اس لئے مشہور ہو گیا تھا۔ جو تماشے گورکھ کمرے میں بند ہو کر اپنے ساتھ کر بیٹھا تھا' ان کا کسی کو علم نہ تھا۔ اس نے بارہا نشہ کیا۔ ہر بار وہ بات تو نہ بنتی' لیکن کئی مرتبہ اس نے شعاعوں کے میناروں کو چھو لیا' کئی مرتبہ خارجی نشہ وہ عالم سرمستی اور بے خودی پیدا کرنے میں ناکام بھی رہا۔ اگر ناکامی ہاتھ لگتی' تو بھی گراوٹ کا احساس نہ ہو تا کہ اتنا بلند تو نہ اڑے' لیکن اڑے ضرور۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے "نشہ میں بہکنے والے انسان کا کیا یقین' اس کی بات کے کیا معنی۔" لیکن میرٹھ کے واقعہ کو چھوڑ کر گورکھ نے جو بھی نشہ کیا' وہ خود سے خود کا لطف حاصل کرنے کی تمنا کے زیر اثر کیا۔

بھنگ' سلفہ' گانجا' افیم' گورکھ نے سب کچھ استعمال کر لیا۔ بیرونی نشہ کے بعد کئی مہینوں تک طبیعت میں ایک اندرونی سکون رچ جاتا' جو اس قدر راحت بخش تھا کہ کئی ماہ تک نشہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ ایک نور کا ہالا سا دماغ میں لہراتا رہتا۔ ایک بار لالچ کر بیٹھا کہ لگاتار نشہ کر کے دیکھا جائے۔ پہلے دن جس بلندی کو پہنچا' دوسرے دن اس کے پاؤں بھی نہ چھو سکا۔ اس طرح یہ خیال ذہن میں بیٹھ گیا کہ اگر بیرونی نشے کا زیادہ

استعمال کیا' تو وہ خداداد توفیق ختم ہو جائے گی۔ اگر سال میں ایک یا دو بار نشہ کیا' تو وہ قائم رہے گی۔ اس لئے وہ نشے کی غلامی سے بچ گیا۔

یہ بھی ضروری نہ تھا کہ اسے خارجی نشہ کی ہمیشہ ضرورت پڑے۔ کبھی کبھی وہ کیفیت یوں بھی طاری ہو جاتی۔ نہ وہ آنے کی اطلاع کرتی' نہ جانے کی خبر دیتی۔

آفس میں لنچ کا ایک گھنٹہ مقرر تھا۔ آفس کے قریب ہی کئی ہوٹل اور ریستوراں موجود تھے۔ اکثر گورکھ گھر سے کھانا لے کر آتا اور آفس کے کمرے میں بیٹھ کر کھالیتا۔ اس کے بعد تقریباً" آدھے گھنٹے کے لئے باہر لان میں بیٹھ جاتا۔ وہاں ہری گھاس تھی' بینچ تھے' شجر تھے' پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ سردی میں باہر لان میں بیٹھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ مطلع صاف ہوتا اور سردی کی دھوپ سہانی لگتی۔ کبھی کبھی وہ بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا اور اسے دگواڑی کی یاد آجاتی۔ کہ یہاں آکر دن میں سونے کا لطف جاتا رہا۔

ایک دوپہر کو گورکھ اسی طرح لان میں بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ ماحول سے بالکل بے خبر ہو گیا۔ وہ صورت نہ نشے کی تھی' نہ ہوش کی۔ ایسی کیفیت پہلے بھی ایک بار طاری ہوئی تھی' جب جالندھر میں وہ اسکول ماسٹر کی نوکری کے لئے انٹرویو دے کر' باپ سے پٹ کر' واپس انجینئرنگ کالج جا رہا تھا اور ریل کا سفر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے شانے پر اپنے ہم شکل سائے کا ہاتھ محسوس کیا تو چونک اٹھا۔

"اب تو آفس لوٹنے کا وقت قریب ہے۔ لان میں کتنے لوگ موجود ہیں۔ بہتر ہوتا کہ کہیں تنہائی میں ملے ہوتے۔" گورکھ نے کہا۔

"میں صرف پانچ منٹ لوں گا۔ آج ۳۸ سال بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ بے فکری سے بات کرو۔ کوئی نہیں دیکھ رہا ہے' کوئی نہیں سن رہا ہے۔" ہم شکل سایہ بولا۔

"کیوں بن بلائے مہمان کی طرح چلے آئے؟ کیا بات کروں؟"

"خود سے اس قدر تو پریشان رہتے ہو۔ کئی باتوں کا جواب چاہتے ہو۔ ہر جواب ایک سوال بن کر رہ جاتا ہے۔ پھر بھی پوچھتے ہو کیا بات کروں؟ سناؤ کیا حال ہے؟"

"وہی جو پہلے تھا' کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا۔"

"بڑی ایمان داری سے بات کر رہے ہو! وہ بھی وقت تھا کہ دو روپے کے لئے محتاج تھے' آج دو لاکھ بھی تمہارے لئے معمولی بات ہے۔ کبھی تم بارہ سال کی عمر میں دنیا چھوڑ کر فقیری لینے پر آمادہ تھے' آج ساٹھ برس کی حد کو پار کر چکے ہو اور دنیا کی دلدل میں دھنستے ہی جا رہے ہو۔ کبھی تم انجینئرنگ کی ڈگری حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے' آج تم نے آفس کے کمرے کی دیوار پر بارہ ڈگریاں لٹکا رکھی ہیں۔ سارے آفس میں تمہاری لیاقت کا چرچا ہے۔ شادی ہو گئی' صاحب اولاد ہو گئے' سمر ڈاکٹر بن گیا' امر انجینئر بن گیا۔ دونوں کی شادیاں ہو گئیں۔ پھر بھی

حال ویسے کا ویسا ہی رہا؟"

"میں تہہ دل سے خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے یہ سب نعمتیں مجھے عطا کیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی قسمت والے کو ہی یہ نعمتیں ملتی ہیں۔ خوشی اور رنج' اچھا اور برا' ایک ہی تصویر کے دو پہلو ہیں۔ پھر بھی تقدیر مہرباں رہی اور تدبیر کام یاب ہوئی۔ کچھ حاصل ہوا' کچھ چھن گیا۔ شادیوں کے بعد بیٹوں سے رشتے قطع ہو گئے۔ اس کے باوجود کہیں تو کچھ ہے جو ویسا ہی قائم ہے' اسی طرح سے موجود ہے۔ اس میں کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔ سوچتا ہوں' شاید وہ میری فطرت ہے' میری طبیعت ہے' میرا مزاج ہے' میرے افکار ہیں' میرے شوق ہیں' میرا دل ہے' میرا ذہن ہے' میرا جسم ہے' میرا خون ہے' میرا رگیں ہیں' یعنی میں خود ہوں۔ اور میں کیا کہوں؟"

"ٹھیک راستے پر چلتے چلتے رک کیوں گئے؟ کچھ کہتے کہتے گھبرا کیوں گئے؟ مجھ سے کیا پردہ؟ کہہ ڈالو۔"

"مجھے اور کچھ نہیں معلوم۔"

"تو میں اسے ایک لفظ میں بیان کرنے کی اجازت چاہوں گا۔"

"میں تمہیں اجازت دینے والا کون ہوتا ہوں؟ تم اپنی مرضی کے مالک ہو' میں اپنی مرضی کا۔ روزمرہ کی زندگی میں تو تمہارے وجود کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں کہ تم زندہ بھی ہو یا تمہارا جنازہ نکل چکا ہے۔ جو کہنا ہے صاف صاف کہو' تا کہ میں بھی سمجھ سکوں۔"

"خود فریبی۔"

"یہ بات میں سمجھ نہیں پایا۔"

"تم کیوں سمجھنے لگے کہ کس طرح سے اس روگ میں مبتلا ہو؟ اور کیوں مبتلا ہو؟ چراغ تلے کا اندھیرا چراغ نہیں مٹا سکتا' اس کے لئے کسی دوسرے اور تیسرے چراغ کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"چپ کیوں ہو گئے؟ تمہارے سر کی قسم' میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔ کہے جاؤ۔"

"جس نے تمہیں زندگی بھر پریشان کیا' جس کے تم نے ہزار اسم رکھے' جیسے تم نے گلی گلی تلاش کیا' جو تخیل اور تصور کی چلمنوں سے ضیا کی جھلک ملتی رہی' وہ تمہاری خود فریبی ہے۔ نہ وہ سرمستی ہے' نہ وہ فاقہ پرستی' نہ وہ خود فراموشی ہے' نہ وہ بے نیازی' اس کا صرف ایک ہی نام ہے۔ جو میں دوبارہ دہرا چکا ہوں۔"

"میں نے کس طریقے سے' کس طور سے اپنے آپ کو فریب میں یا بھرم میں ڈال رکھا ہے؟ میں کس سراب کی تلاش میں گام زن ہوں؟ بلندیوں اور پستیوں میں' جگمگاتی شعاعوں میں' اندھیرے غاروں' میں سورج کی تپش میں' چاند کی ٹھنڈک میں' راتوں کی بے خوابی میں' دن کی سرگرمی میں' کیا صرف میری خود فریبی کا ہی جلوہ درخشاں ہو رہا ہے؟"

"اپنے آپ کو' خود کو' دیکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تم اپنی خودی کو کائنات سے کیوں نسبت دے رہے ہو؟ کس رشتے سے تم ان کے ساتھ جا ملے ہو؟ سورج ہر حال میں چمکتا ہے۔ شعلہ ہر حال میں جلاتا ہے۔ اور تم ہر حال میں مینڈک کی طرح رنگ بدلتے ہو۔"

"وہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ میں بہت رنگ بدل لیتا ہوں۔ ہم اور تم کائنات سے الگ نہیں ہو سکتے۔ کوئی شے بھی کائنات سے جدا نہیں۔ میں ہر رو کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوں اور اکثر نا امید لوٹ آتا ہوں۔ پھر بھی یہ احساس تنگ کرتا رہتا ہے کہ کوئی چیز جوں کی توں سلامت ہے۔ کائنات میں ذرے ذرے کی ایک فطرت ہے اور فطرت کائنات کو خدا کی مشیت سے ملی ہے۔"

"بات تو بہت خوب صورت انداز سے ادا کرتے ہو۔ پھر کیا یہ اداسی کے غار اور نشے کی حالت میں روشنی کے مینار تمہاری فطرت کے جز ہیں؟"

"ضرور ہوں گے۔"

"تو اپنی فطرت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ ہر وقت اس کے ساتھ کیوں الجھتے رہتے ہو؟ آج تک اس سے سمجھوتا کیوں نہیں کیا؟ یہ تمناؤں کے باغ کیوں سجائے ہیں؟ یہ آشاؤں کے دیپ کیوں جلائے ہیں؟ ہر وقت یہ کیوں سوچتے رہتے ہو کہ یوں نہ ہو کر کچھ یوں ہو جائے۔ کاش گزرا وقت لوٹ آئے' کاش میں زندگی نئے سرے سے جی سکوں۔ اگر دل میں قرار ہے' خود پر اعتماد ہے تو یہ تلخ زبانی کیوں؟ یہ شکوے گلے کیسے؟ یہ خوف اور وحشت کس لئے؟ صرف نشے کی حالت میں ہی روشنی کے مینار کیوں؟ بچپن کے تمام اصولوں کی ہولی جلا چکے۔ جیسا وقت ہوا' اس کے مطابق فلسفہ بنا لیا۔ ہر صورت میں خود کو معصوم اور زمانے کو ظالم قرار دے دیا۔"

"تمنائیں اور آشائیں گناہ تو نہیں۔ زندگی ان ہی کے دم سے خوب صورت ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ جیتے جی کوئی تمنا نہ رہے۔ ممکن ہی نہیں کہ جیتے جی انسان کو مکمل سکون مل سکے۔ کشمکش کا نام ہی زندگی ہے۔ جو انسان صورت حال پر اکتفا کر لیتا ہے وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ جاتا ہے۔ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جو شخص مکمل سکون حاصل کر لیتا ہے وہ یا تو سنگ و خشت میں تبدیل ہو جاتا ہے یا کرنوں کا مینار بن جاتا ہے۔ انسان کے انسان رہنے کے لئے یہی بہتر ہے کہ کوئی نہ کوئی آگ لگی رہے اور انسان اسے بجھانے میں مشغول رہے۔ جب ایک آگ بجھ جائے تو کوئی دوسری آگ لگائے۔ اگر آگ نہ بھی لگے تو خیالات کو ضرور بھڑکا لے۔"

"چاہتا تو ہوں کہ تمہاری دلیل کا قائل ہو جاؤں' لیکن نہیں ہو سکتا۔ تمنائیں گناہ نہیں جب تک انسان خود ایک تمنا بن کر نہ رہ جائے' ان ہی میں الجھ کر اور بھٹک کر نہ رہ جائے۔ اسے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ جب کائنات کا ذرہ ذرہ حرکت میں ہے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ انسان بت بن جائے۔ لیکن یہ بھی کہاں تک واجب ہے کہ انسان منزل سے بے خبر چلتا چلا جائے' صرف اس لئے کہ چلتے جانا ہے۔ کسی راہ پر تو چلنا ہی ہے'

اس لئے کوئی بھی راہ اختیار کر لے۔ دو قدم چلے' پھر سوچ میں پڑ جائے۔ واپس مڑ جائے۔ پھر کسی دوسری راہ پر دو قدم چلے اور کولہو کے بیل کی طرح چلتا رہے۔ سکون کی تلاش میں نشے کا سہارا لے۔ نشے کی حالت میں جو بھی نیچائی یا اونچائی نظر آئے اس کو خدا کی دین سمجھ لے۔ خواب تو دیکھے' مگر خوابوں کو ہی حقیقت پر ترجیح دینے لگے۔ ایک سراب میں چلتا رہے اور اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ وہ شعاعوں کے مینار پر کھڑا ہے۔"

"ایک پتہ جو طوفان میں ہواؤں کے زور سے ٹوٹتا ہے' اس کا کیا ایمان ہوتا ہے؟ ایک پتنگا جو شمع پر جل مرتا ہے اس کا کیا ارمان ہوتا ہے؟ کون سی تدبیر شاخ سے ٹوٹے پتے کو راہ فنا پر جانے سے روک سکتی ہے؟ ہوائیں اسے کسی بھی طرف اڑا لے جاسکتی ہیں' چاہے اسے دریا میں ڈبو دیں یا شعلوں میں جلا دیں۔ پتے کے چاہنے اور نہ چاہنے سے اس کی تقدیر نہیں بدل سکتی۔ اس طرح پروانے کو تو شمع پر جلنا ہی ہے۔ کوئی تجزیہ' کوئی دلیل' کوئی فلسفہ' کوئی خرد' اس کی فطرت نہیں بدل سکتی۔"

"یہ دلیل اچھی تو ہے' لیکن تم پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔ پتے اور انسان میں فرق ہے۔ دونوں کی فطرت الگ الگ ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ حالات سے مقابلہ کرتا ہے۔ حالات حاوی ہو جائیں تو یہ دوسری بات ہے۔ اگر دلیل کی خاطر بھی یہ مان لیا جائے کہ انسان محض شاخ سے ٹوٹا ایک پتہ ہے تو ساری کشمکش خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ خدا کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر انسان پتے کی طرح خود کو ہواؤں کے سپرد کر دے تو زندگی اور موت کا فرق اسی وقت مٹ جاتا ہے۔ گریباں میں جھانک کر دیکھو کیا تم ایسے ہو؟ تمہیں زندگی بہت عزیز ہے۔ عزیز ہی نہیں' تم تو از سر نو جینے کی بات کرتے ہو۔ سوچتے ہو کہ گزرا وقت بھی واپس آجائے تو اسے دوبارہ جی لیا جائے۔ پروانے کی ذات تو اس سے بھی بلند ہے۔ نشے میں شعاؤں کی بلندیوں کو چھونے والے اس راز کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ جتنا پیچیدہ ہے' اتنا ہی واضح بھی ہے۔ پتنگے کی طرح ایک ارادہ' ایک ارمان' ایک منزل' ایک محبوب' ایک تصور' ایک خیال' ایک شوق' ایک لگن رکھنے والا انسان؟ وہ تم نہیں --- تمہارے تو لاکھوں چھوٹے بڑے ارمان ہیں۔ تمہاری ایک شمع نہیں' ہزار شمعیں ہیں۔ تم تو ایک شمع گل کر کے دوسری شمع جلانے سے بھی نہیں باز آتے۔"

"اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پروانے کا وجود ایک اکائی' ایک وحدت کے سوا کچھ نہیں اور ایک پتے کی کوئی چاہ نہیں' تو بھی زندگی کے مسئلے حل نہیں ہو سکتے۔ مانا کہ میں ان دونوں سے کوئی نسبت قائم نہیں کر سکتا' لیکن میرا اشارہ بنیادی صورت' یعنی فطرت کی پیچیدگی کی طرف ہے۔ حد نظر تک جھلکتی انسانی فطرت کی ناتمام رنگا رنگی اور نیرنگی' عقل اور خرد کو چکا چوندھ کر دیتی ہے--"

"اب ہم ایک دائرے میں چلتے ہوئے وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔ آج تک کبھی تم نے دوسرے کے نقطہ نظر سے کوئی تصویر نہیں دیکھی۔ آج تک تمہارے ذہن کے زنداں میں دلیل کی کمی واقع نہیں ہوئی۔

میں، تمہارا حقیقی سایہ تم سے ہار مان لوں؟ تمہیں وہیں رہنے دوں جہاں تم کھڑے ہو؟"

"ہر شخص کا نظریہ الگ ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ یہ ضرور بدلتا ہے۔ میں ضدی نہیں ہوں۔ میں نے دانستہ اگر بحث کے دوران کوئی ایسی بات کہی جو میرے اندرونی دل سے نہ اٹھی ہو تو میں نے تنہائی میں غلطی ضرور تسلیم کی۔ میں نے کسی بھی نظریہ کو نظرانداز نہیں کیا۔ تنہائی میں ضرور ہر بات پر غور کیا اور اگر وہ مناسب لگی تو بظاہر نہ سہی، دل ہی دل میں اسے تسلیم بھی کیا۔"

"ممکن ہے۔ لیکن میں تو کہوں گا تم نے خود پر ایک آہنی خول چڑھا رکھا ہے۔ اگرچہ اس میں خوف اور الجھنوں کی دراڑیں ہیں، لیکن صرف تمہاری آنکھوں کے لئے۔ کسی دوسرے کو تم ان دراڑوں کا پتہ نہیں چلنے دینا چاہتے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی تمہیں کچھ نہیں سمجھا سکتا۔"

"فلسفے کی بجائے کوئی دوسرا طریقہ آزما کر دیکھو۔"

"مجھ کو جو کہنا تھا، کہہ دیا میں بار بار اسے دہرانا نہیں چاہتا۔"

"ایک بار اور کوشش کرو۔"

"تم نے ابھی ابھی کہا کہ کہیں کوئی چیز ساکن کھڑی ہے۔ عمر کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ کیا اس پر انگلی رکھ سکتے ہو؟ کیا وہ بے سبب کی بے چینی اور اداسی ہے؟ کیا وہ شعاعوں کے ہار ہیں یا اندھیروں کے غار ہیں؟ کیا وہ زمانے سے خفگی ہے؟"

"نہیں، ان میں سے کچھ نہیں۔"

"کیا وہ کوئی ناکام تمنا ہے، جو کبھی پوری نہ ہو سکی؟"

"نہیں۔"

"کیا وہ عبادت ہے، زہد ہے، یا پھر کفر ہے، گناہ ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا وہ گلہ ہے، شکوہ ہے، مقدر ہے، ناکامی ہے، کام یابی ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا وہ محبوب کی جستجو ہے، حقیقی گوکل ہے، گوری ہے، گوپی ہے، بھولی ہے، قیاسی گوکل ہے، کلپنا ہے، رچنا ہے۔"

"نہیں۔"

"کیا وہ خواب ہے، خیال ہے، تصور ہے، تخیل ہے، نغمہ ہے، سراب ہے، حقیقت ہے؟"

"نہیں، میں سوچتا ہوں، یہ میری خداداد فطرت ہے۔"

"گھڑی کی جانب دیکھو۔ پانچ منٹ ہونے کو آئے۔ جاتے جاتے پھر دہرائے دیتا ہوں کہ اگر اس خود فریبی سے جلد نہ نکلے تو ہوائی قصر زمین پر آگرے گا' تمثال دار آئینہ چور چور ہو جائے گا۔"

گورکھ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا اور گفتگو کی گونج دماغ میں بھرے آفس کی کرسی پر آبیٹھا۔ اگرچہ ہم زاد قریب نہ تھا' لیکن کئی مشترکہ آوازوں کی گونج کان میں بھرتی چلی گئی۔ وہ آوازیں گویا کہہ رہی تھیں : "تم وہ نہیں ہو جو تم زمانے پر ظاہر کرتے ہو۔ تمہارے دو الگ الگ رنگ ہیں۔ تم خود کو فرشتہ سمجھتے ہو' لیکن شیطان کے ہمراہ پھرتے ہو۔ چلو' تمہیں ان کا حال سنائیں جنہیں تم محبوب تصور کرتے رہے۔"

خلاؤں میں گونجتی پہلی آواز سنائی دی : "کلپنا کو تو جانتے ہی ہو گے' جیسے تم نے اپنی بیٹی تسلیم کر لیا تھا۔ اگر امر' سمر کی طرح کلپنا تمہاری اولاد ہوتی تو اس کے ساتھ تم وہ سلوک ہونے دیتے جو کلپنا کے ساتھ ہو رہا ہے؟ تم جانتے ہو کہ کلپنا کا شوہر اسے دل کھول کر مارتا ہے۔ کلپنا سب کچھ سہتی ہے۔ تین بچے' اس پر گھر کی بگڑی ہوئی مالی حالت اور اوپر سے خاوند کی روزانہ مار۔ اپنی لڑکی ہوتی تو اسے کبھی کا اس مصیبت سے چھڑا لاتے۔ اس کے خط میں پوشیدہ اس کے زار زار دل اور اشکوں کو سمجھ کر بھی نہیں سمجھتے؟ پندرہ سال کے بعد بھی وہ ان ہی لمحوں میں جی رہی ہے جو کچھ وقفے کے لئے اسے دہلی میں نصیب ہوئے تھے۔ تم یہ مانتے ہو کہ اس کی محبت کا ثانی نہیں' پھر بھی اس کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ بڑے آئے سچی محبت کی تلاش کرنے والے۔ تم تو جھوٹی محبت کے بھی قابل نہیں۔ جس طرح تم نے کلپنا کا دل توڑا ہے' کوئی نہ کوئی تمہارا دل بھی ضرور توڑے گا۔ تم چار بار ہندوستان جا کر اپنے رشتہ داروں سے مل آئے' لیکن کلپنا سے ملنے بھی نہیں گئے۔ اس کے برعکس یہ کوشش کی کہ تمہاری آمد کا کسی صورت بھی کلپنا کو علم نہ ہونے پائے۔ ایک بار جب اسے پتہ چلا کہ تم ہندوستان گئے اور اس سے نہیں ملے تو اس نے خط لکھا' جو اس کے ٹوٹے دل کی صدا تھا۔ وہ خط پڑھ کر دو لمحہ کے لئے تمہارا دل بھر آیا۔ پھر اثر باقی نہیں رہا۔ آخری بار جب پچھلے سال تم ہندوستان کے دورے پر گئے تو کلپنا کو علم ہو گیا۔ اور وہ اپنے خاوند اور بچوں کو لے کر ملاقات کے لئے دہلی آئی۔ جیسے ہی وہ اسکوٹر رکشا سے اتری' اس کی نظریں صرف ایک شخص کو تلاش کر رہی تھیں۔ تم سے ملتے ہی وہ اپنے ہوش کھو بیٹھی۔ ایک چھوٹی بچی کی طرح تمہاری آغوش میں تھی' تمہارے سینے میں مونہہ چھپائے آنسو بہاتی رہی۔ کتنے لوگوں نے وہ منظر دیکھا۔ اس کو اپنے شوہر کا ہوش نہ رہا' اپنے بچوں کا ہوش نہ رہا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ صرف تمہاری آغوش میں ایک گداز اور تمہارے سینے پر آنسوؤں کے چند داغ۔ یہی اس کی زندگی کی پونجی تھی جو وہ لٹا گئی۔ تم نے اس کی پیشانی پر بوسے دئے' اس کے رخسار تھپتھپائے' اس کے ہاتھوں کو تھامے بیٹھے رہے' جیسے تمہیں اس سے واقعی محبت ہو۔ تمہیں محسوس ہوا کہ تمہارا دل ان چند آنسوؤں کے دریا میں بہہ چلا ہے' تمہاری آغوش اس گداز سے جل اٹھی ہے۔ سنبھلو او بہروپئے' سنبھلو! جب تم نے اسے بہت ہنسانے کی کوشش کی تو وہ تمہارا دل رکھنے

کے لئے پھیکی ہنسی ہنس دی۔ اس کی ریشمی ساڑی کا ایک دھاگا تمہارے امپورٹیڈ سوٹ کی جیب سے لٹک گیا۔ تم اس تار کو دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی انگلی پر لپیٹتے اور کھولتے رہے اور آخر سب کی نظر بچا کر وہ دھاگا تم نے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ کلپنا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا : یہ کیا کر رہے ہو؟ تم نے جواب دیا : یہ یادگار 'یہ ریشمی تار' میں ہمیشہ پاس رکھوں گا۔ جھوٹے کہیں کے! چند دن بعد تمہیں یاد بھی نہ رہا کہ تمہاری جیب میں کیا ہے۔ ناچیز دھاگے کا ٹکڑا سوٹ کے ڈرائی کلین کرواتے ہی دم توڑ گیا۔ تم جیسا بے درد اور بے وفا نہ کوئی ہے' نہ ہو گا۔ کبھی نہ کبھی تمہیں اس بے وفائی کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑے گا۔"

ابھی پہلی صدا کی گونج باقی تھی کہ دوسری صدا آغوش میں بھر گئی : "یاد ہے وہ ننھی سی بچی برسوں بعد بھی تجھے نہ بھول سکی؟ وہ جوان ہو کر کیسے تجھ سے ملی تھی؟ جب پہلی بار اس نے تصور کے دروازے پر دستک دی تو کس قدر کمزور تھی۔ ہاتھ کی پشت پر رگوں کا نیلا پن 'لبوں پر نام کو سرخی' رخساروں کی ابھری ہڈیوں میں دھنسی جا رہی پرنور آنکھیں۔ کیسے اس تصور نے زندگی اختیار کی؟ کیا کمی تھی اس کی محبت میں؟ وہ قیاس کا سنہری دامن جس نے حقیقی ہو کر تیرے جسم کے عضو عضو کو ڈھک لیا۔ آہ وہ محبوب جس نے کبھی تجھ پر روک نہ لگائی۔ وہ تیری محبت کی زیادتیاں برداشت کرنے کے باوجود روز بروز حسین سے حسین تر ہوتی گئی۔ لیکن کیا تو نے اس سے وفا کی؟ بھولی کے بوسوں نے اسے ہمیشہ کے لئے گہری نیند سلا دیا۔ تو اپنے قیاس سے بھی بے وفائی کرنے سے باز نہ آیا۔"

اب ایک تیسری آواز بلند ہوئی : "شملہ کی گوری کو بھول گئے؟ وہ بوقت رخصت ریلوے اسٹیشن پر اچانک ملی۔ تم نے عہد کیا کہ اس کے آخری سلام اور اقرار کو کبھی نہ بھولو گے۔ مگر ایک گم شدہ یاد کے سوا' اس کا نام بھی تم مٹا چکے۔"

ایک چوتھی آواز نے سر اٹھایا : "کچھ قیاس تھا' کچھ حقیقت تھی' ایک بنی تھی۔ لیکن کوئی تو تمہاری بیوی ہے۔ اسے بھی تم نے تنگ رکھا۔ کبھی اس کے دل کو نہ سمجھا۔ اس کے ساتھ بھی بے وفائی کر بیٹھے۔"

گورکھ اب خاموش نہ رہ سکا۔ "اے گونجتی آوازو! تم بھی مجھ سے دغا کر رہی ہو۔ میں تمہارے الزامات ہرگز تسلیم نہیں کرتا۔ میں کلپنا کے لئے کیا کروں؟ میری اپنی بہن کو اس کا شوہر پیٹتا ہے۔ میں نے کیا کر لیا؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟ میرے ہندوستان چلے جانے سے کلپنا کا شوہر کیا اسے پیٹنا چھوڑ دے گا؟ مجھے جو کلپنا سے محبت ہے' وہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ اسی طرح مجھے اپنی تمام تصوراتی صورتوں سے محبت ہے' جو دائم ہے۔ میرے لبوں پر بھولی کے بوسے ابھی تک تازہ ہیں اور تازہ رہیں گے۔ میری قیاسی گوکل ضرور سو گئی' لیکن اس کا لمس اور اس کی آغوش خلاؤں میں اب تک جگمگاتی ہے۔ وہ حقیقی کم سن گوکل' وہ زندگی میں ایک بے نام لطف کی جانب پہلی پرواز' ابھی تک اسی پرواز میں ہے۔ وہ گوری کی اداس نظریں' وہ الوداع' وہ ریل کے ڈبے کی کھڑکی سے جھانکنا

اس کا چہرہ، تصور کی کسی چلمن پر ابھی تک ساکن ہے، وہ بمبئی کی طوائف کے عریاں بدن کی جھلک، ابھی تک ایک دیدنی منظر ہے۔ لیکن گولی کو ان میں شامل نہ کرو۔"

"کیوں؟ گولی میں کیا خاصیت ہے؟" "آج اس سے شادی کے اتنے سال بعد بھی تقریباً" وہی حال دل ہے جو پہلے روز تھا۔ اس میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔"

"تو کیا ہوا، اس سے یہ تو ثابت نہ ہوا کہ اس کا ایک خاص درجہ ہے۔"

"یہ میں جانتا ہوں یا میرا دل؟ صدا! تم اسے کیا سمجھو؟ میں کبھی گولی کا مکمل پیار حاصل نہ کر سکا۔ اسے میری محبت کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ تینتیس سال میں دو گھنٹے سے بھی کم ایسا وقت گزرا ہوگا جب اس نے مجھے مرد سمجھ کر عورت کی طرح پیار کیا۔ اس کے باوجود ابھی میں اس کی پرستش کرتا ہوں۔ میرے دل کے حرم میں ایک ہی تصویر ہے۔ وہ ہے گولی۔"

"کیا خوب بات کہی! تم صرف اپنی انا سے، اپنے غرور سے، اپنے تکبر سے اور اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔ جہاں ان کو ٹھیس پہنچی، تمہاری محبت ہوا ہوئی۔ گولی کو جب حاصل نہ کر سکے، تو ایک حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ اور حسد بھی اس کے والدین سے! تم نے لاکھ چاہا کہ گولی تمہیں اس محبت اور عزت کا دسواں حصہ عطا کر دے جو اس کے دل میں اپنے باپ کے لئے ہے، لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ رد عمل کے طور پر پہلے تم نے گولی پر اپنا حق جتانا چاہا اور اس کی آزادی چھیننی چاہی کہ وہ تمام دنیا سے رشتہ ناطہ توڑ لے، لیکن ایک تناؤ ایک بدمزگی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ جب تک تمہیں یہ احساس ہوا کہ تم گولی کو پنجرے میں بند نہیں کر سکتے، بہت دیر ہو چکی تھی۔ تم نے بچپن میں پنجرے میں بند چڑیا دیکھی تھی، جو تمہیں بہت خوب صورت لگی تھی۔ وہ پنجرے میں ادھر سے ادھر پھدکتی ضرور، مگر پاس ہی لٹکے ہوئے پنجرے میں بند طوطوں کی طرح شور تک نہ مچاتی۔ گولی آخر گولی تھی، پنجرے میں بند چڑیا نہ تھی۔ محبوب کی آزادی تمہیں پسند نہیں اور تم چاہتے رہے کہ تم پر کوئی قید عائد نہ ہو۔ تمہاری مرضی کے خلاف گھر میں ایک میز کی جگہ تک نہیں بدلی جا سکتی۔ الماری میں ایک کتاب ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتی۔ پھر تم کہتے ہو کہ گولی مکمل تمہاری نہ ہو سکی! تم محبوب کو جیب میں قید رکھ کر گھومنا چاہتے ہو، چاہے محبوب کا دم ہی نہ نکل جائے!"

"اے صدا! یہ زیادتی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ اگر میں تسلیم بھی کرلوں کہ میری محبت میں کچھ ایسا جذبہ بھی موجود تھا تو یہ محبت کی انتہا تھی۔ وہ جذبہ کہ محبوب صرف عاشق کو دیکھے اور عاشق محبوب کو دیکھے ایک پاک جذبہ تھا۔ زندگی کی تمام الجھنوں کا حل، تمام ناامیدیوں اور بے قراریوں کا علاج، مجھے پہلے ہی جان لینا چاہئے تھا کہ ایسی محبت فقط فنا سی ہو سکتی ہے، حقیقی نہیں۔ محبت کی بنیاد قربانی پر رکھنی ہوتی ہے، تصور پر نہیں۔ محبوب کی ہر ادا، ہر بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اس کی تکلیف اور اس کے درد کو سمجھنا ہوتا ہے۔ اس کی مرضی کے

خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھانا ہوتا۔ محبوب اگر کہے کہ یہ دن ہے تو دن ہے' محبوب اگر کہے کہ یہ رات ہے تو رات ہے۔ من و تو کا امتیاز ختم کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ اپنی خودی کو مٹانا ہی خودی کو بڑھانا ہے۔ اپنی خودی اور عزم کو محبوب کے قدموں پر رکھ دینا ہی پہلا قدم ہے' پھر چاہے محبوب ایک ٹھوکر لگا کر سب کچھ مسمار کر دے۔ میں تو الجھتا ہی رہا۔ نہ اس طرف کا ہو سکا' نہ اس طرف ہی بڑھ سکا۔ پھر بھی اے صدائے دل! تو جانتی ہے کہ شوہر کی حیثیت سے میں نے کسی خوبی سے اپنے فرض ادا کیے ہیں اور وہ محبت کی منزل ایک ناکامی کی دیوار بن کر میرے چاروں طرف زنداں کی طرح بڑھتی گئی۔"

"اگر تم نے بطور خاوند اپنے فرائض ادا کیے تو گولی بھی پیچھے نہیں رہی۔ پھر تمہیں شکوہ کس بات کا ہے؟ زندگی کٹ گئی' خواہ اس طرح کٹی' خواہ اس طرح کٹی۔ جہاں تمہیں حقیقت کڑوی لگی' تم نے تصور کا سہارا لے لیا۔ اپنا کوئی نہ کوئی محبوب زندہ کر لیا۔ دل پھینک عاشق! لیکن کبھی اپنے گریبان میں جھانک کر نہ دیکھا۔ جب ابتدا ہی غلط ہوتی ہے تو انجام بھی غلط ہوتا ہے۔ وصل کی پہلی رات کو گولی نے تم سے تین قول مانگے تھے۔ اور تم نے وہ تینوں قول توڑ دیئے۔ کچے سوت کے دھاگے توڑنا بھی اس سے زیادہ مشکل ہوتا ہوگا' لیکن تم نے اپنے وعدے توڑنے میں دیر نہ لگائی۔"

"اے صدا! تو نے ٹھیک ہی کہا۔ میری قسمت ہی ایسی تھی۔ شادی کی بنیاد ہی کمزور تھی۔ گولی کے باپ ہیرالال نے گولی کی شادی مجھ سے صرف اس لئے کی تھی کہ وہ مجھے اپنا گھر داماد بنانا چاہتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ میں کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاؤں' ورنہ تو خود سوچ کہ کہاں گولی کی شاندار عیش و آرام کی زندگی اور کہاں چار سو روپے ماہانہ پانے والا انجینئر' جسے بمبئی میں رہنے کو ایک کمرے کا مکان بھی نصیب نہیں ہوتا۔ وہ تو میری خودداری تھی' میری ضد تھی کہ میں نے اپنا راستہ اپنی محنت اور مشقت سے تعمیر کیا' ورنہ میں محبوب کے گھر پر دم ہلاتا پڑا رہتا۔ مجھے پھر محبت کی وہی کچی داستاں یاد آ گئی۔ یاد ہے وہ گاؤں کا نوجوان جو فلمیں دیکھ دیکھ کر بمبئی کی اداکارہ پر فدا ہو گیا تھا؟ میں تو عہد طفلی سے ہی دل ہتھیلی پر لے کر پھرتا رہا۔ قسمت کہ کوئی خریدار نہ ملا۔ شادی کے بعد گولی کو ہی محبوب سمجھ لیا۔ یعنی بیوی اور محبوب کی تمیز مٹا ڈالی۔ مگر حقیقت کچھ اور نکلی۔"

"اس کے باوجود بھی گولی نے تم سے کوئی مانگ نہ کی۔ ہر قدم پر اس نے تمہارا ساتھ نبھایا۔ زمانے میں تمہاری عزت بڑھائی۔ کیا تمہیں اس کے برتاؤ میں کوئی کمی محسوس ہوئی؟ اگر تم نے مشقت کی تو اس نے بھی تمہارا ساتھ دیا۔ اپنی ہمت سے اسکول میں نوکری حاصل کی۔ پہلے بی۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ امریکہ آئی تو کمپیوٹر سائنس سے' جو ایک بالکل علیحدہ مضمون تھا' سمجھوتا کر لیا۔ ہر قدم پر اس نے تمہارا ساتھ دیا۔"

"اے صدا! یہ بات بھی صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ میں اسے وہ سب کچھ مہیا نہ کر سکا جو کہ وہ چاہتی تھی۔ کئی برس تک تو اسے مجھ غریب کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ اسے فخر تھا تو اپنے والدین پر۔ وہ اس

کے لئے پسے ہوئے گرم مسالوں سے لے کر ریشمی ساڑیوں تک' سب ہی کچھ مہیا کرتے رہنے۔ یاد ہے' میں ایک بار بنارس سے گولی کے لئے ساڑی لے آیا تھا۔ میرے الجھے دماغ کی طرح وہ آرٹ کا نمونہ تھی۔ گولی نے اسے دیکھ کر کہا تھا کہ کپڑا خراب ہے' ڈیزائن خراب ہے' رنگ خراب ہے' سنہری دھاگے نقلی ہیں' نقرئی دھاگے کالے پڑ جائیں گے۔ اور اس نے ایک دن بھی وہ ساڑی نہیں پہنی۔ یاد ہے کیسے میرا دل ٹوٹا تھا؟ میں مانتا ہوں کہ زندگی میں مجھے تنگ دستی نہیں دیکھنی پڑی' لیکن کبھی اتنا پیسہ بھی نہ ہوا کہ خرچ کرتے وقت اس کا خیال نہ آئے۔ قدم قدم پر جیب کا خیال رکھ کر زندگی گزاری۔ اگر کوئی چمک دار شے خرید لی' تو مستقبل کے ڈر اور ضروریات کی پکار نے اس کی چمک پھیکی کر دی۔ یاد کر کہ میں نے ایک چیز بھی اپنے نام میں نہ خریدی۔ زمین خریدی تو گولی کے نام' جو کچھ بھی خریدا گولی کے نام۔ لیکن گولی کو ہر وقت یہی گمان رہا کہ اس کے والدین مال دار ہیں۔ وہ اس کے لئے بہت کچھ چھوڑ جائیں گے۔ اس نے کبھی میرے پیسے کو اپنا نہ سمجھا۔ اس نے کبھی اس جائداد کو جو میں نے اس کے نام سے خریدی' اپنی نہیں سمجھا۔ اس کا اپنا زر اور جائداد تو اس کے والدین کے پاس محفوظ تھی۔ یاد کر' جب ہیرالال فوت ہوا تو تمام زمین' جائداد گولی کے بھائی راجندر کے قبضے میں چلی گئی۔ ہیرالال نے اگر کوئی وصیت کی بھی تھی تو کون زمین جائداد کے لئے لڑنے جاتا؟ اے صدا! تو جانتی ہے کہ میں بے حد خوددار ہوں۔ جو اپنی محنت سے کمایا' اسی میں خوش رہا۔ لیکن گولی کا اعتماد بھی دیکھ۔ وہ کورے کاغذ پر دستخط کر کے اپنے بھائی کو سونپ آئی۔ پہلے سنا گیا کہ اس کے نام کچھ زمین ہے' پھر سنا گیا کہ نہیں ہے۔ اس کے بعد سنا گیا کہ اس کے نام کوئی مکان ہے' پھر سنا گیا کہ نہیں ہے۔ آخر اس کے نام کچھ نہ نکلا۔ یاد ہے' ایک دن میں نے گولی سے کہا تھا کہ کم سے کم تمہیں اپنا حق اس طرح نہیں چھوڑنا چاہئے۔ مگر وہ اپنا حق حاصل کرنے کی بجائے اپنے شوہر کا گھر چھوڑنے کو تیار ہو گئی تھی۔ میں تو وہ بات زبان پر لا کر پچھتایا' لیکن گولی کے دل میں اپنے بھائی کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسے کہتے ہیں اصلی محبت' جو مجھے گولی سے کبھی نصیب نہ ہوئی۔ کیا اس نے کبھی میرا دل ٹٹولا؟ وہ مجھے کسی نہ کسی کاروبار کرنے کے لئے اکساتی رہی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ میں کاروباری آدمی نہیں۔ میں نے کاروباری مزاج پایا ہی نہیں۔ میرے قبضے میں بڑا مکان نہیں' عالی شان کوٹھی نہیں۔ میرے قبضے میں گیت ہیں' خواب ہیں' رنگ ہیں۔ لیکن ان کی زمانے میں کسی کو کیا ضرورت؟ اے صدا! کیا تو سوچتی ہے کہ زندگی کی بھاگ دوڑ اور تگ و دو ختم ہو گئی؟ نہیں۔ ابھی نہیں۔ یہاں ہندوستانیوں کے پاس کتنے عالی شان مکان ہیں۔ گولی آج بھی کاروبار چلانا چاہتی ہے' روپیہ کمانا چاہتی ہے' اپنے چھوٹے مکان کو بیچ کر بڑا مکان خریدنا چاہتی ہے۔ میں کیا کروں؟ میں بھی ہر چاہت میں گولی کا ساتھ دیتا ہوں۔ اپنے دل سے اٹھتی آواز کو دبا دیتا ہوں۔ زندگی بھر بھاگتا رہا ہوں۔ کچھ دیر اور سہی۔ بچپن میں ٹالسٹائی کی ایک کہانی پڑھی تھی۔ اس کہانی کے کردار کی طرح میں بھی بھاگتا چلا جاؤں گا' جب تک سورج نہ ڈھلے اور میں تھک کر نہ گر پڑوں۔ کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔ جب تک

سانس ہے، سرگرمی جاری رکھنی پڑے گی۔ لیکن وہ کمی، وہ ادھوراپن، وہ ناکام جذبہ محبت، وہ جلن، وہ دھڑکن، وہ خواب، وہ قیاس۔ مادی چیزوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہی میرے اپنے رہیں گے۔"

"یہ کمی یہ قیاس کہیں تمہارے دماغ کا خلل تو نہیں؟ کہیں یہ اظہار شکایت کا انداز تو نہیں؟ شادی شدہ زندگی کی ناکامیاں تو نہیں؟ یہ احساس تو نہیں کہ زندگی گزر گئی اور تم دھوبی کے کتے رہے 'گھر کے نہ گھاٹ کے؟ یعنی صرف بھٹکے رہے؟"

"اے صدا' میں لاجواب ہوں۔ یہ میری فطرت میں شامل ہوگا۔ میں تو صرف یہ کہوں گا کہ میں نے جی جان سے گولی کو چاہا۔ یاد ہے کہ سمر کی پیدائش کے بعد کیسے گولی کا پیٹ پھول گیا تھا۔ وہ مٹکے جیسا پیٹ اور دبلی ٹانگیں اور خم دار بازو۔ اگرچہ اس کے موٹے پیٹ پر ہاتھ پھرنے میں بھی مزا آتا تھا۔ میں اس سے زبردستی ورزش کرواتا تھا۔ یاد ہے، جب اس کی گردن اکڑ گئی تھی اور بڑے بڑے ڈاکٹر گردن کا درد رفع کرنے میں ناکام ہوگئے تھے۔ اگرچہ میرے لئے ٹیڑھی گردن سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا' لیکن میں نے زبردست مطالعہ کے بعد اپنی دوا سے اس کا درد ٹھیک کیا۔ یاد ہے' کیسے میں نے اس کے سر درد کے دورے ٹھیک کئے؟ میں اس کی بیماریوں کا علاج کرنے کے لئے ہومیوپیتھ ڈاکٹر بنا۔ اس کی تصویریں اتارنے کے لئے فوٹوگرافر بنا۔ زیادہ کیا کہوں' حقیقت یہی ہے کہ اس کی وجہ سے مجنوں بنا۔ لیکن جب وہ لیلیٰ نہ بن سکی تو مجنوں کی موت ہوگئی۔ اس کا ذمہ دار میں نہیں' میرے احساسات نہیں' میرا دل اور دماغ نہیں۔ اے صداؤ! کہنا ہے تو کہو کہ میری محبت طنابوں کے سہارے کھڑی تھی۔ اس میں اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی طاقت نہ تھی۔ حقیقی مجنوں امر ہے۔ شاید میری محبت میں کمی تھی۔ مجھے تمہارے تمام الزامات منظور ہیں۔"

شاید گفتگو کا سلسلہ اور بھی چلتا اور گورکھ صداؤں سے باتیں کرتا رہتا کہ گورکھ کا امریکن باس اس کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا "میں کئی منٹ سے تمہارے کمرے میں موجود ہوں اور تمہیں خبر ہی نہیں۔ کس مسئلے پر اتنا ڈوب کر غور کر رہے ہو کہ میری موجودگی کا بھی احساس نہ ہوا؟"

رچنا کی شادی کے بعد گھر میں بے رونق سی چھا گئی۔ امر اور سمر اپنی اپنی بیوی کے ساتھ دور دور جا بسے۔ گورکھ اور گولی سے تقریباً" دو ہزار میل کے فاصلہ پر۔ اولاد جب برسرروزگار ہو جاتی ہے تو والدین سے تعلقات کم زور پڑ جاتے ہیں۔ والدین کے لئے تو بچے لخت جگر ہی رہتے ہیں۔ اور ان کی بیویاں بھی ان کے لئے بیٹیاں بن سکتی ہیں، مگر یہاں بھی گولی اور گورکھ قسمت سے مار کھا گئے۔ امر کی بیوی یورپ کی رہنے والی تھی۔ ہندوستانی تہذیب سے الگ اور سمر کی بیوی سرپھری، بد دماغ تھی، جس نے رفتہ رفتہ سمر کو گولی اور گورکھ سے جدا کردیا۔ شاید امر اور سمر گورکھ سے ورثے میں مجنوں کا جنون لے کر پیدا ہوئے ہوں گے۔ دونوں اپنی اپنی بیوی پر یوں فدا ہوئے کہ ان ہی کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ ان کی زندگی میں گولی اور گورکھ کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ سمر کے لئے کئی رشتہ آئے تھے، مگر شادی جہاں مقدر میں ہوتی ہے وہیں ہوتی ہے۔ سمر کی بیوی کو اپنے والدین سے جتنی محبت تھی گولی اور گورکھ سے اتنی ہی نفرت۔ اکثر گولی زار زار روتی۔ اس معاملے میں قصوروار گورکھ ثابت ہوا۔ اس نے ہی زور لگا کر اپنے دوست کی لڑکی سے جلدی میں رشتہ پکا کردیا تھا۔ شادی کے بعد معلوم ہوا کہ لڑکی بد دماغ، سرپھری اور ضدی ہے۔ امر اور سمر کی شادی سے پہلے گورکھ کے ارمان تھے کہ بہوؤں کو بیٹیاں تصور کرے گا۔ کسی کو مصوری سکھائے گا، کسی کو غزل کا مفہوم سمجھائے گا۔ گولی اور گورکھ جلد ہی سمجھ گئے کہ خواہ وہ کتنی ہی دعائیں کرتے رہیں، منتیں مانگتے رہیں، لیکن نہ تو انہیں بیٹوں کی قربت نصیب ہوگی اور نہ بہوؤں کی۔ دس سال میں گورکھ امر کے پاس تین دن کے لئے ملنے گیا تھا اور سمر کے گھر تو اس کے لئے ایک گھنٹہ بھی ٹھہرنا محال تھا۔ انسان غیروں سے بد کلامی برداشت کر سکتا ہے، لیکن اپنوں سے جنہیں وہ محبت کی نظر سے دیکھتا ہے، ذرا سی بے ادبی برداشت کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہے۔ امر اور سمر سے اسے کوئی شکایت نہ تھی۔ کبھی ملاقات ہو جاتی تو چند فقروں میں تمام ہو جاتی۔ کیسے ہو تم دونوں؟" ہم مزے میں ہیں۔ آپ سنائیں۔" "بڑھاپا بڑھ رہا ہے۔ وقت گزر رہا ہے۔ خدا تمہیں لمبی عمر دے۔" اور گفتگو ختم۔ یہی دستور ہے، آخر ایک خالی پن، ایک تنہائی ہی سلامت رہ جاتی ہے۔ اس کے دو علاج ممکن ہیں۔ ایک قدیم، دوسرا موجودہ۔ قدیم علاج کے مطابق انسان کو پچاس سال کی عمر کے بعد فقیری لے لینی چاہئے۔ زمانے سے کنارہ کش ہو جانا چاہئے۔ اولاد سے رشتہ توڑ لینا چاہئے۔ اور باقی وقت خدا کی پرستش میں گزارنا چاہئے۔ زندگی اور موت کا فلسفہ تجربات کی بنا پر تولنا چاہئے۔ نہ

چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ ایسا تو ہو ہی رہا تھا۔ گولی اور گورکھ اولاد سے تو کنارہ کش ہوئے' اس کے ساتھ ہی رشتہ داروں اور دوستوں کا ساتھ بھی تقریباً" چھوٹ گیا۔ خودداری کو سلامت رکھنے کے لئے' سرگرم رہنا ضروری تھا۔ موجودہ علاج کے مطابق' آج ملکوں کی حکومتیں پچاس سال کے "نوجوان" ہی سنبھالتے ہیں۔ جب تک سانس ہے' تب تک سرگرمی ہے۔ خود کو ناکارہ سمجھ لینا' زندگی سے ہار مان لینے کے برابر ہے۔ ذہن اور دل عمر کے قید سے آزاد ہیں۔ عمر کا بڑھنا ناکارہ ہو جانے کا صرف ایک بہانہ ہے۔ انسان مرتے دم تک کچھ نہ کچھ نیا سیکھ سکتا ہے' کچھ نہ کچھ نیا تیار کر سکتا ہے۔ آرٹ اور سائنس کے کتنے ہی کرشمے ان لوگوں کی یادگار ہیں جنہوں نے عمر کے برسوں کو منزل کی رکاوٹ نہ بننے دیا۔

گورکھ کے دماغ میں دونوں قسم کے احساسات کروٹیں بدلتے رہے۔ ہر دور میں زمانہ کچھ بدل جاتا ہے۔ جوانی بدلتے زمانے کی رگ پہچانتی ہے اور زمانے کے ساتھ چلتی ہے۔ بڑھاپا زمانے کے ساتھ چلنا تو چاہتا ہے' لیکن عہد گزشتہ اور پچھلے تجربات کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اس لئے کئی بار بیچ میں لٹک جاتا ہے۔ لیکن یہ درمیانی راستہ اختیار کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ بہت ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت رہتی ہے کہ کون سا رخ اختیار کیا جائے اور کون سا نظرانداز کر دیا جائے۔ گورکھ کو زمانے کی ناپائیداری کا احساس رہتا۔ یہاں سب رنگ بدل جاتے ہیں۔ اور زندگی کی آخری منزل تو آخر فنا ہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرے۔ اس زور و شور اور خروش سے نہ سہی' لیکن کچھ نہ کچھ سرگرمی تو ضرور قائم رکھے۔

گورکھ گھر کے کاموں میں گولی کا ہاتھ بٹانا چاہتا' لیکن گولی کو یہ دخل اندازی پسند نہ تھی۔ دراصل اسے گورکھ کا کام پسند نہ تھا۔ گورکھ برتن صاف کرتا تو کسی برتن پر دال کا ایک دانہ لگا رہ جاتا' جو گولی کی نظر سے نہ بچ سکتا۔ صفائی کرتا تو غالیچے کے کسی کونے میں کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا مل جاتا۔ گولی بہت صفائی پسند تھی۔ گورکھ بھی صفائی پسند تھا' لیکن صفائی کے معاملے میں انتہاپسند نہ تھا۔ آخر گھر میں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ اگر ذرا کمی بھی رہ گئی تو اگلی صفائی میں پوری ہو سکتی ہے۔ گھر میں کوئی مہمان یا دوست آجاتا تو تعریف کئے بغیر نہ رہتا۔ "اس قدر صفائی اور خوبصورتی' ہم نے بہت کم گھروں میں دیکھی ہے۔" مگر گولی کو تسلی نہ ہوتی۔ کہیں نہ کہیں کچھ چھپی گند گی اسے نظر آہی جاتی۔

زندگی میں کئی نشے ہیں' جیسے دولت کا نشہ' خوب صورتی کا نشہ' لیاقت کا نشہ اور حکومت کا نشہ۔ اگر دو شخص بھی ہمیشہ آپ کے اشاروں پر ناچتے رہیں تو کتنی راحت نصیب ہوتی ہے۔ آدمی کا حکومت کا جذبہ کسی حد تک گھر کے باہر اپنے ماتحتوں پر حکومت چلا کر تسکین پالیتا ہے۔ عورتوں کے اسی جذبہ کی تسکین گھر کے نوکروں سے ہوا کرتی ہے۔ گولی نے بچپن سے گھر میں بہت سے نوکر دیکھے تھے اور وہ نوکروں سے بخوبی کام لے سکتی تھی۔

وہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق گھر کا کام کروا سکتی تھی۔ گورکھ کی دخل اندازی سے نجات پا سکتی تھی۔ وہ ایک تیرہ سالہ لڑکی انجو کو گھر کے کام کاج کے لئے لے آئی۔ دن میں کئی بار انجو گولی اور گورکھ کی گود میں جھول جاتی۔ شاید اسے محبت کم ملی ہوگی۔ اس کے چہرے کے مہاسوں سے کبھی پیپ، کبھی رطوبت نکلتی رہتی۔ جسم پر بھی جا بجا پھنسیاں تھیں۔ جب آئی تھی تو بہت مریل اور کمزور تھی۔ چند ہی مہینوں میں اس کی صحت ٹھیک ہونے لگی اور پھنسیاں بھی دور ہونے لگیں۔ گورکھ اس کے بوسے لینا چاہتا، اسے آغوش میں بٹھانا چاہتا۔ اسے یہ پتہ نہ چل سکا کہ انجو ہر شام کو گولی سے چغل خوری کرتی ہے اور اس کی نیت پر شک کرتی ہے۔ آخر راز کھل گیا۔ ایک روز گولی آفس کے لئے روانہ ہو چکی تھی۔ گورکھ نے مذاق مذاق میں انجو کو بے لباس کرکے، اس کے ہاتھ باندھ کر بجلی کے پنکھے سے لٹکا دیا۔ پنکھے کی گردشوں کے ساتھ انجو کی چیخیں زور پکڑتی اور کمزور ہوتی رہیں۔ یہ تماشا کوئی پندرہ منٹ چلا ہوگا، لیکن اس نے زندگی کے باقی برسوں کا رنگ ہی بدل ڈالا۔

گولی کو گورکھ کے چال چلن پر پہلے ہی شک ہوتا رہا تھا۔ اس تماشے کے بعد اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ انجو واپس چلی گئی۔ اور گولی بھی گھر چھوڑنے کو تیار ہو گئی۔

"تم اس قدر گرے ہوئے انسان ہو، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اچھا ہوا میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ میں ہمیشہ کے لئے انجو کی شکرگزار رہوں گی۔"

"تم ناپاک ہو، جھوٹے ہو، دھوکے باز ہو۔ آج کی بات نہیں، تمام عمر تم مجھ سے دغا کرتے رہے ہو۔"

"زندگی میں اور کچھ تو حاصل نہ تھا، صرف یہ یقین جینے کا سہارا تھا کہ تم وفادار ہو۔ آج وہ یقین بھی مٹی میں مل گیا۔"

جلی کٹی سن کر گورکھ کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ کبھی وہ گولی کی قدم بوسی کرتا، کبھی اس پر برس پڑتا۔ بدکلامی بڑھتے بڑھتے دشنام میں بدل جاتی۔ دل اور دماغ اور زبان پر قابو نہ رہتا۔ ایک لمحہ گالی تو دوسرے لمحے بھکاریوں کی طرح گڑگڑاتا۔ گورکھ کو یقین ہو گیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی گولی کو ساتھ نہ رکھ سکے گا۔ چنانچہ گولی کے اصرار پر ایک نیا فلیٹ خرید لیا گیا اور گولی علیحدہ رہنے لگی۔ گورکھ نے بڑی محنت سے فلیٹ کو رہنے کے قابل بنا دیا۔ گھر کے سامان کا بٹوارا ہو گیا۔

جب گھر میں آگ لگتی ہے تو لوگ تماشا تو دیکھتے ہی ہیں۔ گورکھ کے والدین تک خبر پہنچ گئی۔ چند دوستوں کو پتہ چل گیا۔ گورکھ امرا اور سمرسے بات کرتے ہوئے کترانے لگا۔ جن لوگوں کے سامنے سربلند کرکے چلتا آیا تھا، ان کے روبرو یکایک سر جھک گیا۔

گولی الگ فلیٹ میں دو ماہ کے قریب رہی۔ گورکھ کسی نہ کسی بہانے اس کے فلیٹ پر پہنچ جاتا اور اس سے واپس گھر چلنے کی التجا کرتا۔ وہ یہی سوچتا آیا تھا کہ گولی کے بغیر ایک دن بھی زندہ رہنا مشکل ہے۔ دو مہینے کسی طرح

کٹ گئے۔ آخر گولی واپس آنے پر رضامند ہو گئی۔ مگر اس نے چند شرطیں رکھیں۔
"مجھے تم ہمیشہ کاروبار کرنے سے روکتے رہے۔ اب میں اپنا روپیہ پیسہ کسی بھی کاروبار میں لگاؤں' تم دخل نہ دو گے۔"
"میرے ذاتی معاملوں میں دخل اندازی نہ کرو گے۔ میں اب تک کٹھ پتلی کا ناچ ناچتی رہی۔ اب یہ سلسلہ جاری نہیں رہے گا۔"
"گھر میں کوئی مہمان آئے تو اس سے بحث نہ کرو گے۔ ہو سکتا ہے میرا چچیرا بھائی امریکہ آئے اور ہمارے یہاں قیام کرے۔"
ہمارا رشتہ دوستی کی حد سے آگے نہ بڑھے گا۔ مجھے محبت سے نفرت ہو چکی ہے۔ جب تم مجھے ہاتھ بھی لگاتے ہو تو لگتا ہے کہ جسم میں کیڑے رینگ رہے ہیں۔"
"مجھے سماج سے بھی نفرت ہو چکی ہے۔ میں کسی سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں کروں گی۔"
"اس فلیٹ کا میں جو چاہے کروں' اس پر تمہارا کوئی اختیار نہ ہو گا۔ تم نے فلیٹ خریدتے وقت میری جو مالی مدد کی ہے' وہ رقم میں تمہیں رفتہ رفتہ لوٹا دوں گی۔"
گولی واپس آگئی۔ فلیٹ کا سامان پھر گھر میں آگیا اور گولی نے فلیٹ کرائے پر چڑھا دیا۔ گورکھ کوشش کرتا کہ گولی کو گھر کے کام کے لئے تکلیف نہ ہو۔ جہاں تک ممکن ہوتا' وہ اس کا ہاتھ بٹا دیتا۔
چند ماہ گزرے ہوں گے کہ گورکھ کی طبیعت بدل گئی۔ جو زندگی بھر نہ ہوا' وہ کچھ ہی دیر میں ہو گیا۔ نہ صرف گولی سے' بلکہ کسی سے بھی اس کا ظاہری برتاؤ پہلے جیسا نہ رہا۔ سارا غصہ ختم ہو گیا اور گفتگو میں ایک سلیقہ آگیا۔ اب وہ ہر لفظ تول تول کر زبان سے ادا کرتا۔ گولی تقریباً" آٹھ بجے تک آفس چلی جاتی اور شام کو چھ بجے لوٹتی۔ گورکھ گولی کے آفس چلے جانے کے بعد سو کر اٹھتا۔ اس طرح شام کو صرف دو یا تین گھنٹے اکٹھے گزارتے۔ رات کے آٹھ بجے تک گولی اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ اور گورکھ اپنے کمرے میں۔ چھٹی کے دن ضرور وہ سارا وقت ساتھ گزارتے' لیکن زیادہ وقت گھر کی صفائی اور بازار سے ضرورت کی چیزیں خریدنے میں صرف ہو جاتا۔ گورکھ کو یقین ہو چکا تھا کہ تمثال دار آئینہ ٹوٹ چکا ہے۔ وہ اب دوبارہ نہ جڑ سکے گا۔
ایک دن گولی کہنے لگی : "میری زندگی برباد ہو گئی۔ تم نے مجھے خوب دھوکا دیا' میرے اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ خدا جانے تمہارے کتنے ناجائز تعلقات کس کس کے ساتھ رہے ہوں گے۔"
گورکھ پر سکون لہجے میں بولا۔ "اگر یہ مان لیا جائے کہ میں بد چلن ہوں تو یہ راز تو شادی کے ۲۴ سال بعد اب آ کر کھلا ہے۔ لیکن کل تک جو حقیقت تھی' اگر آج سراب بھی ثابت ہو جائے' تو گزشتہ کل کی لذت تو نہیں بدلنی چاہئے۔"

"تم یہ فلسفہ اپنے پاس ہی رکھو۔ تم کیا سمجھو گے اس دل کی حالت جیسے یہ ۳۴ سال بعد معلوم ہو کہ اس قدر طویل عرصہ تک وہ دھوکے میں رہا۔ جو کچھ بھی تھا' ایک مکر' ایک فریب کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مجھے تو یہ احساس عمر بھر رولائے گا کہ کتنا زبردست دھوکا ہوا۔"

"کیوں اپنی اور میری تقدیر کو گالی دیتی ہو؟ کل تک تم مجھ پر رشک کرتی تھی اور میں تم پر۔ میں تو آج بھی تم پر اتنا ہی فدا ہوں جتنا کل تھا۔ خدا نے ہمیں کتنی خوب صورت' لائق اور فرماں بردار اولاد عطا کی۔ غم' خوشی' تشویش اور فکر کے دن ہم نے ساتھ ساتھ گزارے۔"

"بچے تمہاری شہوت کی پیداوار تھے۔ جب پیدا ہی ہو گئے تو انہیں پالنا ضروری تھا۔ تم نے کبھی بیوی کو بیوی نہ سمجھا۔ میں سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ ایک سراب میں چلتی گئی۔ لیکن اب افسوس کرنے سے بھی کیا حاصل؟"

"یہی مان کر خود کو تسلی دے لو کہ میں نے تمہیں دھوکا دیا۔ اگر تم مجھے اتنا ہی ذلیل اور کمینہ انسان سمجھتی ہو تو تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو کیوں؟"

"یہ آنسو تمہارے لئے نہیں' یہ تو میں اپنی قسمت کو رو رہی ہوں کہ کیا تقدیر لے کر پیدا ہوئی تھی۔"

"کیا اس گناہ گار نے تمہیں ایک لمحہ بھی ایسا نہ دیا جو امڈتے طوفان میں کنارہ ثابت ہو' جو ہزار خاروں میں ایک گل ہو' جو لاکھ اندھیروں میں ایک چراغ ہو' جسے تم یاد کر کے ایک تسکین کی سانس لے سکو؟"

"میں جب تمہاری دغابازی کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ کوئی دوسرا احساس نہیں ہوتا۔" گولی سسک سسک کر روتی رہی۔

گولی اور گورکھ کے اندر اندر کچھ ٹوٹ چکا تھا' گولی اسے صاف بیان کر سکتی تھی۔ گورکھ کے پاس الفاظ نہ تھے۔ وہ دیکھتا کہ وہ گولی کے اب بھی بہت قریب ہے' لیکن پھر بھی بہت دور چلا گیا ہے اور فاصلے روز بروز بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

وقت کے ہاتھوں جب پانسہ پلٹتا ہے تو ہر رخ بدل جاتا ہے۔ یکایک آفس میں کام کی کمی ہونے لگی۔ بہت سے ملازم نکال دیئے گئے۔ وہی تلملاوالی حالت سامنے آنے لگی۔ گورکھ سوچتا کہ گیارہ سال تک بہترین کام سرانجام دیا ہے' شاید کمپنی اس کے لئے اپنے دروازے بند نہ کرے۔ لیکن اگر نوکری چلی گئی تو آگے کیا ہو گا؟

گولی کہنے لگی "میری تو ابھی دس سال کی نوکری باقی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اس عمر میں اتنی اچھی نوکری ملی۔ میرا ہندوستان میں دل نہیں لگے گا۔ میں تو ہر حال میں یہیں نوکری کروں گی" گورکھ سوچنے لگا کہ اس کا کیا ہو گا؟ گولی سے الگ اور بہت دور رہنا پڑے گا۔ اگر امریکہ میں رہا تو یہاں وقت گزارنا کتنا محال ہو گا۔

ہندوستان کی طرح یہاں سڑک پر چلتے مسافر کو روک کر گفتگو بھی نہیں کی جا سکتی۔ اگر آفس سے چار دن کی چھٹی لے لے تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ فلسفہ کی کتابیں بھی ہیں۔ رنگ اور برش بھی ہیں۔ گیت اور غزل کے ہزاروں ٹیپ اکٹھے کر لئے ہیں۔ ہندوستانی فلمیں آسانی سے دستیاب ہیں۔ لیکن ان چیزوں میں بھی اب دل چسپی نہیں رہی۔ بچپن سے یہی سوچتا آیا تھا کہ زندگی کے لئے اتنے شوق کافی ہیں، لیکن وقت نے وہ دل ہی چھین لیا۔ آفس کی کرسی پر پڑے رہنا ہی زندگی تمام کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔ اگر نوکری چلی گئی تو ایک ایسا خلا، ایک ایسی تنہائی کا سامنا کرنا پڑے گا جو کسی صورت برداشت نہ ہوگی مصوری، فلسفے، فلموں اور غزلوں کے ساتھ کچھ اور بھی کرنا پڑے گا۔

دن گزرتے گئے۔ گورکھ کا دل نہ آفس میں لگتا، نہ گھر میں، وہی آفس کا کام جو وہ اتنے برسوں سے کرتا آیا تھا، یکایک بیزار کن ہو گیا۔ باقی شوق بھی لمبی تان کر سو گئے۔ ایک رنگ کیا اڑا، سب ہی رنگ پھیکے پڑ گئے۔ نہ گولی نے گورکھ کی طرف ایک قدم بڑھایا، نہ گورکھ نے۔ گورکھ کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ جس موڑ پر وہ دونوں جا کر کھڑے ہو چکے ہیں، وہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ دو ہی صورتیں درپیش ہیں۔ یا تو وہیں سے کود کر جان دے دی جائے یا اس موڑ سے آگے بڑھا جائے۔ خواہ ماضی کی کشش کتنے ہی دامن پھیلائے، وہ وقت کبھی لوٹ کر نہ آئے گا، جس طرح کمان سے نکلا تیر واپس نہیں آتا۔ کب تک وہ اسی موڑ پر کھڑا راہ تکتا رہے گا، جب کہ تمام راستے بند ہو چکے ہیں؟ کب تک وہ بے روح ماضی کو سینے سے لگائے پھرے گا؟ وہ اسے دوبارہ کبھی زندہ نہ کر پائے گا۔

گورکھ کو پھر کسی محبوب کی آرزو ستانے لگی۔ ایک اور محبوب جو زندگی کے تاریک راہیں روشن کر دے۔ جس سراب میں زندگی اب تک گزری ہے، وہ سراب مسلسل بن جائے اور اس کے رکے قدم پھر اٹھنے لگیں۔ اب کی بار گورکھ ہندوستان گیا تو ایک تیرہ سال کی بھکارن کو اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ دلی کی سڑکوں پر بھیک مانگ رہی تھی۔ گورکھ نے اس کا نام نثار رکھ دیا اور گولی سے الگ رہنے لگا۔ اس نے کہا "الگ رہنے پر بھی ہمارے درمیان دوستی کا ناطہ اتنا ہی مضبوط رہے گا۔ اگر میری کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی۔"

گولی تمام صورت حال تفصیل جانے بغیر ہی سمجھ گئی۔ اس نے گورکھ کو روکنے کی کوشش نہ کی۔ صرف اتنا کہا "جیسے آپ کی مرضی۔ جہاں آپ کو سکون نصیب ہو سکے، رہیں۔"

وقت نے ایک اور کروٹ بدلی۔ گورکھ کو نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ گولی کے چچیرے بھائی کو ویزا مل گیا اور وہ امریکہ آ گیا۔ گولی انجو کو بھی اپنے ساتھ لے آئی۔ گولی نے ایک چھوٹا سا اسٹور خرید اور کاروبار شروع کر دیا۔ جلد ہی کامیابی حاصل ہوئی اور اس کے پاس دولت کی کمی نہ رہی۔

گورکھ اسی کشمکش میں رہا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ چند مہینے شدید الجھنوں میں بیتے۔ امریکہ میں پی ایچ

ڈی کرنے کے لئے عمر کی قید نہیں۔ ایک یونیورسٹی نے گورکھ کو پی ایچ ڈی میں داخلہ دے دیا اور اس کے ساتھ ہی اسے وظیفہ بھی ملنے لگا۔ وہ ذہنی قلابازیاں کھانے سے بچ گیا اور ایک بار پھر طالب علم بن گیا۔

یونیورسٹی میں چار سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران گورکھ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔ نشا نے بارہویں جماعت پاس کر لی۔ گولی' امرا اور سمر سے گورکھ کی اکثر ٹیلی فون پر بات ہو جاتی۔ سال میں ایک' دو بار ملاقات بھی ہو جاتی۔ گولی کا دیدار کرتے ہی گورکھ کی آنکھوں میں آنسو امڈنے لگتے اور انہیں قابو میں رکھنا محال ہو جاتا۔ اب وہ دو الگ الگ راہوں کے مسافر تھے۔ پچھلی زندگی کی یادیں کبھی گورکھ کا تعاقب کرنا نہ چھوڑتی۔ لیکن وقت کا کرشمہ تھا یا ستم کہ گولی کو اپنے قریب محسوس کرتے ہوئے بھی گورکھ اس سے دور' اور مزید دور ہوتا چلا گیا۔ اب وہ دونوں ندی کے کناروں کی طرح تھے' جو شاید صرف سمندر سے ہم آغوش ہو کر ہی ایک ہو سکتے تھے۔ کوئی جذبہ' کوئی طاقت انہیں قریب نہیں لا سکتی تھی۔

گورکھ کو پی ایچ ڈی کئے ہوئے ابھی چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ اس کے سر کے نچلے حصے میں درد رہنے لگا۔ اس نے اپنی ہومیوپیتھی کی مہارت آزما ڈالی' لیکن درد میں کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ جب روز بروز درد کی شکایت بڑھتی ہی گئی تو سمر' امر' گولی اور نشا نے گورکھ سے ڈاکٹری معائنہ کروانے کے لئے اصرار کیا۔ مگر گورکھ ٹالتا ہی رہا۔ ایک رات کو درد اس سے برداشت نہ ہوا تو وہ ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ کیٹ اسکین کے بعد ڈاکٹر کہنے لگا : "آپ کے سر میں ایک ناسور ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کب سے موجود ہے' پھر بھی جانچ کی بنا پر یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاید یہ ناسور بچپن سے ہی موجود ہے یا پیدائشی ہے۔ تعجب ہے کہ یہ دماغ کے ایک ہی حصہ میں پلتا رہا اور باقی حصے صحیح سلامت کام کرتے رہے۔ معلوم ہوتا کہ حال ہی میں یہ کچھ بڑھ گیا ہے۔ شروع سے ہی یہ دماغ کی باقی رگوں پر ضرر رساں دباؤ ڈالتا رہا ہو گا۔"

گورکھ یہ سن کر حیران ہو گیا اور کہنے لگا "میں تو بچپن سے ہی بہت ذہین رہا ہوں۔ شاید آپ یقین نہ کریں گے کہ میں نے ۶۵ سال کی عمر میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اسے ابھی چند ماہ کا عرصہ بھی نہ گزرا ہو گا۔ مجھے اس ناسور نے کبھی تکلیف نہیں دی۔ یکایک اسے کیا ہوا کہ درد کا عذاب بن بیٹھا۔"

ڈاکٹر نے وضاحت کی۔ "شاید یہ بڑھتی عمر میں دماغ پر زیادہ زور دینے سے پھیلنے لگا ہے۔ آپ کو چاہئے کہ دماغ کو پورا آرام دیں۔ اور ہر طرح کے دماغی کام سے باز رہیں۔ لیکن میں ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ بچپن سے ہی یہ ناسور آپ کی دماغ کی رگوں پر کچھ ایسا اثر یا زور ڈالتا رہا ہے جس کی وجہ سے خواب اور حقیقت کی تمیز ختم ہو جاتی ہو گی۔"

گورکھ چپ ہو گیا۔ مگر ڈاکٹر کی بات اس کے دل میں بیٹھ گئی اور وہ سوچنے لگا : "تو یہ ہے حقیقت! یہ

روشنی کے مینار اور ظلمتوں کے غار صرف ایک ناسور کا کرشمہ ہیں۔ وہ تخیل کی اڑانیں اور تصور کے توسن رگوں پر ناروا دباؤ پڑنے کی وجہ سے حقیقی ہیں۔ آہ! جسے وہ خداداد نعمت سمجھتا رہا، جیسے وہ اپنی فطرت تسلیم کرتا رہا، وہ محض ایک رستا ہوا ناسور نکلا!"

ڈاکٹر نے اسے سوچ میں گم دیکھا تو کہا "میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ جلد دماغ کا آپریشن کروالیں اور اس بڑھتے ہوئے ناسور کو نکال باہر کریں۔ میڈیکل سائنس کی ترقی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ امکان کم ہی ہے کہ یہ آپریشن آپ کی جان کے لئے خطرہ بنے۔"

گورکھ پھر خاموش رہا۔ وہ سوچنے لگا : "جو کچھ بھی تھا اور جو کچھ بھی ہے، اگر وہ صرف ایک ناسور کی کرامات ہے، تو زہے نصیب کہ مجھے یہ ناسور ملا۔ دراصل وہ ناسور نہیں وہ بذات خود میں ہوں۔ وہ میرا محبوب ہے، میری فطرت ہے، میرا بادشاہ ہے۔ ۶۵ سالہ زندگی میں جس نے ظلمتوں میں روشنی بخشی، جس نے روشنی میں ظلمتوں کے چراغ جلائے، اس خداداد فرشتہ کو میں ہرگز خود سے جدا نہ کروں گا، اسے ڈاکٹروں کے نشتر کا شکار نہ ہونے دوں گا۔ دو ... ں سب ہی باری باری بچھڑ گئے۔ چند سال ہوئے والدین بھی خدا کو پیارے ہوئے۔ رہ گیا میرا ایک ہمدم، میری تنہائی کا ساتھی، میرا محبوب، ناسور!"

چند ماہ اور گزرے ہوں گے کہ ایک کار چلاتے چلاتے گورکھ خود سے اور ماحول سے بے خبر ہو گیا۔ سامنے آتی ہوئی کار بھی اسے نظر نہ آئی۔ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ہسپتال میں گورکھ کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اس کی نظر گولی پر پڑی۔ وہ آج بھی اتنی ہی حسین تھی جتنی شادی کے وقت پھول مالا پہناتے ہوئے نظر آئی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا : "یہ کسی جوان لڑکی کی آغوش میں آرام سے سر رکھے پڑے ہو۔"

گورکھ نے گولی کے خاموش سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: "یہ نشا ہے۔ میں اسے دہلی سے لے آیا تھا۔ اس نے خوب میرا ساتھ نبھایا۔"

گولی کی نظریں جیسے کہہ رہی تھیں: "بے وفا کبھی باوفا نہیں ہو سکتے۔ انجو تمہیں نہ ملی تو نشا مل گئی۔ میں خواہ مخواہ دیکھنے چلی آئی۔ مجھے کیا معلوم تھا مرتے دم تک محبوب ہی پیدا کرتے رہو گے۔۔"

گورکھ نے جیسے اس کے دل کی داستان پڑھ لی۔ وہ کہنے لگا : "ذرا میرے سرہانے لفافہ اٹھا کر مجھے دینا۔"

گولی نے ایک لمبا سا لفافہ گورکھ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

گورکھ بولا "یہ کیا ہے؟ ذرا اسے کھولنا۔"

نشا نے کہا "یہ کل ہی ملا ہے۔"

لفافہ کھولا گیا۔ گولی کہنے لگی: "یہ تمہاری پی ایچ ڈی کی ڈگری ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔"

گورکھ بولا "اسے میرے سینے پر رکھ دو۔ میرا اشارہ اس لفافے کی طرف تھا جو اس کے ساتھ ہی موجود ہونا چاہئے۔"

گولی نے دوسرا لفافہ گورکھ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ گورکھ اسے گولی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "یہ میری آخری وصیت ہے۔ کچھوے کی چال چل کر بھی میں نے ایک کروڑ روپیہ جمع کر لیا۔ یہ ساری دولت میں تمہارے لئے چھوڑے جا رہا ہوں۔ زندگی میں تمہیں بہت تنگ رکھا۔ امید ہے مجھے معاف کر دوگی۔ اس دولت سے تم جو چاہے کر سکتی ہو۔ کوئی شرط میں نے وصیت میں عائد نہیں کی۔ اس کے علاوہ صرف دس لاکھ روپیہ نشا کے لئے اور دس لاکھ کلپنا کے لئے چھوڑے جا رہا ہوں۔"

گولی نے لفافہ ہاتھ میں تھام لیا۔ اتنے میں گولی کا چچیرہ بھائی کمرے میں داخل ہوا۔ اور گورکھ کی مزاج پرسی کرنے کے بعد گولی کو آنکھ کے اشارے سے باہر لے گیا۔

کچھ دیر بعد دھیرج کمرے میں داخل ہوا۔ وہ نشا کو جی جان سے چاہتا تھا۔ اس نے گورکھ سے بڑی اپنائیت کے ساتھ کہا۔ "آپ ابھی کہیں نہیں جانے والے۔" یہ الفاظ دہراتا ہوا وہ نشا کو آنکھ کے اشارے سے کمرے سے باہر لے گیا۔

گورکھ کمرے کے باہر ابھرتی ہوئی سرگوشیوں کی صدائیں صاف سن رہا تھا۔ گولی کا چچیرہ بھائی کہہ رہا تھا: "یہ تو اچھا ہوا کہ عین موقع پر دولت ہاتھ آئی۔ آج کل کاروبار میں کچھ نقصان چل رہا ہے۔"

ادھر دھیرج نشا سے مخاطب تھا : "تم تو کہتی تھیں کہ بڈھا تمام دولت تمہارے نام چھوڑ کر جائے گا۔ تمہارے ہاتھ تو کچھ بھی نہ آیا۔ خواہ مخواہ بڈھے کی اتنی خدمت اور تیمارداری کرتی رہیں۔" "ذرا آہستہ بولو۔ ابھی وہ ہوش میں ہے۔ سن رہا ہوگا۔" یہ نشا کی آواز تھی۔

"میں تو کہتا ہوں کہ اچھا ہے کم بخت ہمیشہ کے لئے بے ہوش ہو جائے۔ دھوکے باز کہیں کا۔!" دھیرج جیسے جلا بیٹھا تھا۔

رحلت کے وقت یہ سرگوشیاں گورکھ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلا گئیں۔ ایک بے پایاں سکون کا احساس اس پر طاری ہونے لگا۔ چند سوال ابھی تک ذہن میں گشت کر رہے تھے، جن کا وہ جواب چاہتا تھا۔ یکایک اسے ایک جانا پہچانا لمس محسوس ہوا۔ نشا باہر تھی گولی کمرے میں موجود نہ تھی، تو یہ اس کے ناسور بھرے سر کو کس کی آغوش میں راحت مل رہی تھی؟ کس کی انگلیاں اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں!؟ گورکھ نے مشکل سے گردن گھما کر نظریں اٹھائیں۔ "گوکل، تم، یہاں؟ کب آئی، تمہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے؟ کوئی ہماری باتیں تو نہیں سن رہا ہے؟"

گوکل بولی "اب تو دنیا سے ڈرنا چھوڑ دو! کوئی دیکھتا ہے تو دیکھ لینے دو۔ وہی کرو جو دل چاہتا ہے۔ زمانے کا

قرض تو اتار چکے' اب اپنے دل کا بوجھ اتار لو۔"
گورکھ کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "میرے ذہن میں اب بھی بہت سے سوال ہیں۔ آج وہ سب سوال میں تمہارے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن بہت تھک گیا ہوں۔ ذرا آرام کرلوں۔ تم میرے قریب ہی رہنا۔ چلی نہ جانا۔"

"تم سو جاؤ۔ میں یہیں ہوں۔ وعدہ رہا کہ تمہارے پاس ہی رہوں گی۔" گوکل نے اسے اطمینان دلایا۔
گورکھ پلک جھپکتے ہی انبالہ شہر پہنچ گیا' جہاں اس کے بچپن نے آنکھ کھولی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ۶۵ سال کا عرصہ گزار کر گوکل کی آغوش میں لوٹ آیا تھا۔ وہ گوکل سے پوچھنے لگا "کیا میں بہت دیر تک سوتا رہا ہوں؟ تم تھک گئی ہوگی۔ میرا سر آغوش سے ہٹا کر تکئے پر ٹکا دو۔"
گوکل مسکرا دی۔ "تم دیکھ رہے ہو کہ میں بالکل تازہ دم ہوں۔ تم آج سب سوال پوچھ ڈالو۔"
"ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میرے سر میں ناسور پھیل رہا ہے۔ مگر میری زندگی کے بہترین لمحے تو اسی ناسور سے وابستہ ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"
"ڈاکٹر اس راز کو نہیں سمجھ سکتے۔ تمہارے سر میں کوئی ناسور نہیں' بلکہ وہاں ایک ہزار پنکھڑیوں والا' سات رنگوں والا' پھول کھلا ہوا ہے۔ کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ پھول اپنے پورے عروج پر پہنچتا ہے تو قامت میں بھی بڑھ جاتا ہے؟ مشینوں نے اسے ناسور سمجھ لیا ہے۔"
"تم مجھ سے کیوں ناراض ہو کر چلی گئی تھیں؟ کیا اس لئے کہ میں نے بھولی کے لب چوم لئے تھے اور تم نے مجھے بے وفا سمجھ لیا تھا؟"
"تم اگر ہزار لب بھی چوم ڈالو' تو میں کیوں خفا ہونے لگی؟ میری محبت کیوں مرجھانے لگی؟ یہ تمہارا اپنا احساس تھا۔ میں تو اس دور میں بھی تمہارے اتنی ہی قریب تھی جتنی آج ہوں۔ تمہارا دل یہ ضرور مانتا ہے۔"
"میں عمر بھر دنیا سے کنارہ کش ہونے کی سوچتا رہا۔ پھر بھی آخری دم تک دنیا میں پھنسا رہا۔ کیوں فقیری نہ لے سکا؟"

"کوئی شوق' کوئی جذبہ' تمہاری تنہائی کا ہم دم نہیں بن سکا۔ تم خود سے خوف زدہ بھاگتے رہے۔ فقیر بھی تو خانہ بردوش ہوتے ہیں۔ اب مکمل فقیر ہو جاؤ۔ یہ تمہارے بیٹے پی ایچ ڈی کی ڈگری میں اٹھائے ہوں۔"
"جو برتاؤ میں نے انجو کے ساتھ کیا' اس میں کیا ہوس کا پہلو تھا؟"
"نہیں۔ اس میں صرف ضد تھی۔ دنیا کے عزیز ترین رشتے ناطے ریل کی ہموار پٹڑی پر رواں دو پہیوں کی طرح ہیں۔ ناہموار سطح اور الگ الگ رفتار رشتے کی کمان کو توڑ دیتی ہے۔ اے میرے کنارہ کش محبوب! تم بھی یہ بات خوب سمجھتے ہو۔"

"اے میرے حقیقی محبوب اب آخری سوال۔" "میں تمہیں پا کر بھی زندگی بھر کیوں بھٹکتا رہا؟"

"کیوں کہ تمہیں میری حقیقت پر یقین نہیں آیا۔ تم مجھے قیاسی سمجھتے رہے۔ کسی حد تک اب بھی یہی سوچ رہے ہو۔ سوچ رہے ہو کہ میں ابھی تک اتنی حسین کیوں ہوں' ابھی تک اتنی جوان کیوں ہوں؟ وقت میرے لئے بے اثر کیوں ہو گیا؟ کیا خود کو میری نظر سے دیکھنا چاہو گے؟"

"دیکھ رہا ہوں۔ ایک بار وہی عہد طفلی کا سماں پیدا کر دو۔ وہی گردشیں۔ یہ تمہاری آغوش کا گداز' یہ انگلیوں کی لرزش' یہ بل کھاتی گھنگھریالی زلفیں' یہ ریشمی جھالر۔ مجھے اب ان سے جدا نہ ہونے دو۔"

وہ چہرہ مہر تھا کہ ماہ' وہ آغوش خشت زمیں تھی کہ گوشہ ء آسماں' وہ لب مینار تھے کہ غار گورکھ کے ذہن کا ناسور یا گل پھر کبھی خوابوں کے جال نہ بن سکا۔
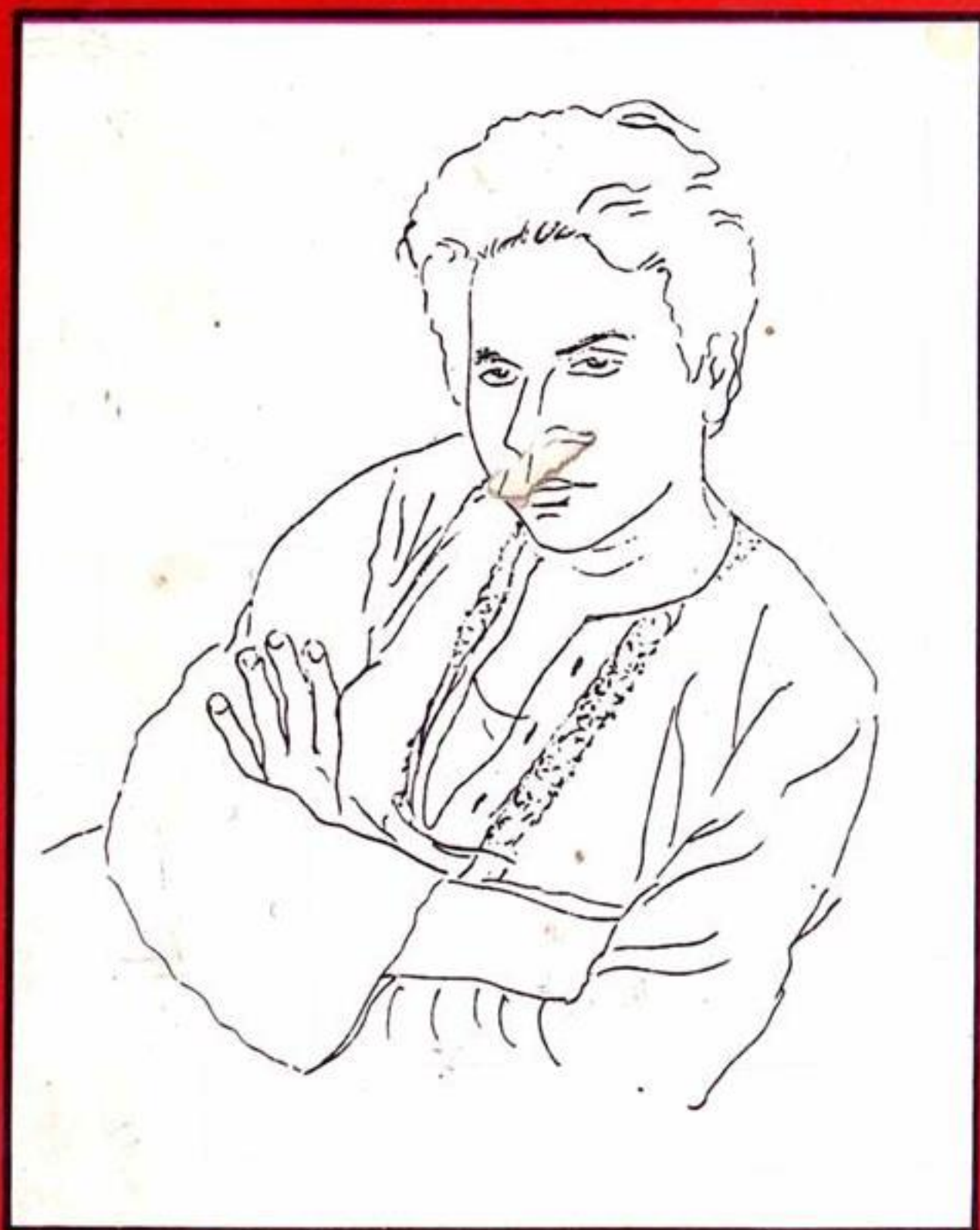
جگدیش (چندر داس) آوَر۔ پیدائش، پنجاب۔ تعلیم، پنجاب اور یو۔ ایس۔ اے۔ انجنیئرنگ پیشے سے وابستہ۔ کافی عرصے سے امریکہ میں مقیم